ماہنامہ
الشجاع
کراچی
ایک رسالہ — گھر کے ہر فرد کیلئے

ان کی آواز کو کیا ہوا؟
ان کا چہرہ کیوں بنا ہوا ہے؟
یہ صورت سردی کے دنوں میں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ موسم کا قصور نہیں۔ مناسب احتیاط برتی جائے اور سعالین کا باقاعدہ استعمال رکھا جائے تو نزلہ، زکام اور کھانسی کا زور نہ ہونے پائے۔ سعالین ان تکلیفوں کا موثر علاج بھی ہے اور ان سے بچاؤ کی بہترین تدبیر بھی۔
سعالین
نزلہ، زکام اور کھانسی کی خصوصی دوا
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چٹاگانگ
برونکس :- گلے، ناک اور سینے پر ملنے سے سوزش اور جکڑن دور ہوکر فوری افاقہ محسوس ہوتا ہے اور مرض کی شدت کم ہوجاتی ہے۔

united

ہمارے نام

متین سروش

الشجاع بہت پسند آیا۔ اس ماہ کا سرورق خاص طور پر دلکش ہے۔ آپ نے بڑی خیال انگیز تصویر چھاپی ہے۔ رسالہ بحیثیت مجموعی خوب ہے لیکن خوب تر بنانے کی گنجائش موجود ہے خصوصاً نظموں کے حصے کو اور اچھا ہونا چاہیئے۔ (پونہ)

ثروت کمار ورما

اس مرتبہ پرچہ دلچسپ اور معیاری ہے۔ "وہ عورت" بہت دلچسپ ہے۔ "تحفہ" پر ابھی اور محنت کی ضرورت تھی۔ اختتام بھونڈا اور جذباتی ہے۔ یوں تو جذباتیت کی یہ فضا پوری کہانی پر چھائی ہوئی ہے۔ جیسے سب کچھ ہماری زندگی سے دور الف کے بارہ ہو رہا ہو۔ سیکڑوں فلمیں بن چکی ہیں اس قسم کی۔ (امرتسر)

عارفہ نیازی

تازہ شمارہ ملا۔ اس بار شعری حصہ خاصا جاندار ہے۔ عبداللہ علیم اور بلراج کومل کی نظمیں بہت خوبصورت ہیں۔ غزلوں میں صرف احمد ہمدانی اور قمر اقبال مجھے متاثر کرسکے باقی غزلیں معمولی ہیں۔ "پرل ہاربر" کی کہانی میں کوئی ناقابل فراموش کیفیت نہیں ہے۔ اسی طرح "ٹوس" سے متعلق مضمون کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر کا مضمون "لمحہ فکریہ ہے" (چاٹگام)

شاعر لکھنوی

الشجاع کے معیار کو آپ کی محنت اور توجہ نے جتنا بلند کیا ہے وہ میری نظر میں ہے اور اس پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ (کراچی)

نوشاد انور

یہ تو الشجاع کی روایت ہے کہ وہ ہمیشہ غیر ملکی مہمانوں کی آمد پر خاصا مواد پیش کرتا ہے۔ بالخصوص "ایران نمبر" کا تو جواب نہیں تھا اسی طرح "الیزبتھ نمبر" بھی خوب تھا۔ توقع تھی کہ مارشل ٹیٹو کی آمد پر آپ ہمیشہ کی طرح بھرپور نمبر پیش کریں گے مگر جنوری کا شمارہ میری توقعات پوری نہیں کرسکا۔ سرورق پر مارشل ٹیٹو کی تصویر اچھی تھی۔ ان سے متعلق مضمون البتہ مجھے پسند نہیں آیا۔ شخصیت کا سرسری خاکہ تھا۔ ضرورت اس کی تھی کہ یوگوسلاویہ کی ترقی۔ انقلاب۔ تاریخی مقامات پر سیر حاصل مضامین پیش کئے جاتے اور یوگوسلاوی ادب کے شہپاروں کو اردو میں منتقل کیا جاتا تاکہ قارئین الشجاع یوگوسلاویہ سے پوری طرح واقف ہوسکتے اور الشجاع کا یہ نمبر بھی یادگار رہتا۔ متمنی ہوں کہ آئندہ آنے والے مہمانوں سے متعلق آپ جب بھی کوئی نمبر پیش کریں وہ ایران نمبر اور الیزبتھ نمبر کے معیار کا ہو۔ (خانیوال)

نعیمہ آفروز

گزشتہ دنوں آپ نے الشجاع میں ڈرامے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا اور چند ڈرامے شائع بھی کئے تھے۔ پھر اچانک یہ سلسلہ ختم ہوگیا نہ جانے کیا بات ہے کہ ہمارے ادبی جرائد ڈراموں کی اشاعت غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس عدم اعتنائی سے اس صنف کو خاصا نقصان پہنچ رہا ہے اور اسٹیج کی ترقی مشکوک ہوتی جارہی ہے۔ آج کے حالات کا تقاضہ ہے کہ آپ الشجاع کے ہر شمارے میں کوئی ڈرامہ یا تمثیلچہ ضرور شائع کریں تاکہ ڈراموں سے شوق رکھنے والوں کے ذوق کی تسکین بھی ہو اور اردو میں اچھے ڈراموں کا اضافہ ہو۔ آپ کے نیک اقدام کی منتظر رہوں گی۔ (ڈھاکہ)

علی اختر کاظمی

اردو کا ہر رسالہ سال میں ایک دو نمبر ضرور شائع کرتا ہے۔ پہلے آپ بھی سالگرہ نمبر شائع کرتے تھے۔ اب کئی سال سے آپ نے کوئی نمبر شائع نہیں کیا اس کی کیا وجہ ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ افسانہ نمبر یا سالگرہ نمبر ہر سال ضرور شائع کیا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ نمبروں کی اشاعت سے الشجاع کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ (لاہور)

عبدالعزیز ہیشتی

اس بار کوئی افسانہ پسند نہیں آیا۔ شعری حصہ میں عبیداللہ علیم، منظر ایوبی اور بلراج کومل کی نظمیں اچھی ہیں۔ احمد ہمدانی۔ حبیب خیرآبادی اور روشن نگینوی کی غزلیں۔ ایک خاص کیفیت کی حامل ہیں۔ پراسرار کہانی کو باقی آئندہ کر کے آپ نے ظلم کیا ہے۔ (پشاور)

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای او/کراچی ۸۹۳-۶۶۶۹
مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

— ترتیب —

ایس ایم غیاث الدین ــــ سلمان الارشد

— طابع و ناشر —

ایس ایم شجاع الدین

— زیر اہتمام —

سلطان کلیم

زرِ سالانہ: پانچ روپے ــــــــ فی شمارہ: پچاس پیسے
فون نمبر: ۵۲۳۳۳ (پریس) ــــــــ ۵۵۲۱۲ (شعبۂ ادارت)

— شعبۂ نشر و اشاعت —

ٹائمز پریس

مینسفیلڈ اسٹریٹ۔ صدر کراچی

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر و پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا

اس شمارے کے چند فنکار

- نقی محمد خاں
- احمد جمال پاشا
- رفعت سروش
- رشیدہ رضویہ
- اشتیاق طالب
- دیوندر اسر
- ایچ آر ٹریور
- شرون کمار ورما
- حسن اجمل مسرت
- منظر ایوبی
- خار انصاری
- صائمہ خیری
- حزیں لدھیانوی
- متین سروش
- احمد صغیر صدیقی
- حمید الیاس
- یٰسین معصوم

ان کے علاوہ اور دوسرے۔

مشرقی پاکستان میں ہوائی ڈاک سے فی شمارہ ۷۵ پیسے۔

التماس

پرچہ پریس جانے کے لئے تیار تھا کہ اچانک اردو کے ممتاز انشا پرداز اور "الشجاع" کے دیرینہ کرمفرما مولانا ارشد تھانوی کے سانحہ ارتحال کی خبر پہنچی۔ اردو کا یہ ضعیف العمر مگر جواں ہمت مجاہد ۲ فروری ۱۹۸۶ء کو سہ پہر کے ساڑھے تین بجے اسّی سال سے زائد کی عمر پاکر راہی دار البقا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مولانا ارشد تھانوی ان گنے چنے چند بزرگ ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے گزشتہ نصف صدی کے دوران اردو ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا صرف ایک ادیب اور منفرد انشا پرداز ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ پائے کے مورخ، نقاد اور معلم اخلاق بھی تھے۔ انھوں نے بے شمار موضوعات پر ان گنت مضامین اور مقالات سپرد قلم کئے۔ بڑوں کے ساتھ وہ بچوں کے بھی ادیب تھے۔ بچوں کے لئے ریڈیو پاکستان کے لئے انھوں نے جو کہانیاں لکھی ہیں صرف ان کی ہی تعداد ایک ہزار سے متجاوز ہوتی ہے۔ مولانا ارشد تھانوی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ایک دور تھے اور جدید و قدیم کا ایک متناسب، دلکش اور حسین امتزاج تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں آنکھ کھولی جب ریلوے انجن جیسی معمولی سی ایجاد کو طلسماتی کارخانہ سمجھا جاتا تھا اور جب یہ جہاندیدہ آنکھیں بند ہوئیں تو تسخیر ماہتاب کی کوششیں کامیابی کے دروازوں تک پہنچ چکی تھیں۔ مولانا نے اپنی لگ بھگ ایک صدی کی زندگی میں زندگی کے ہر شعبے میں عظیم انقلابات کا مشاہدہ کیا۔ یہ انقلاب سیاسی، تہذیبی، فکری اور نظریاتی شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان ادلتے بدلتے حالات اور تغیراتی عمل اور ردعمل نے مولانا کو ایک انتہائی انسان دوست وسیع المشرب اور روشن خیال شخصیت بنا دیا تھا۔ وہ اوصاف حمیدہ کے مالک تھے۔ بڑوں کے ساتھ بڑے اور بچوں کے ساتھ بچے۔ وہ برصغیر کے انتہائی ذہین افراد میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی ادبی بصیرت، ان کی علم دوستی، ان کا ہمہ وقتی مطالعہ، ان کے تحریر و تصنیف کے مشاغل، ان کی انجمن آرائی انہیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ مولانا کے ان مشاغل کا سلسلہ دم آخر تک جاری رہا اور ان کا ذہن ایک طویل علالت کے باوجود آخری لمحوں تک روشن اور فعّال رہا۔ جن حضرات نے مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے وہ اس پر متعجب ہوتے تھے کہ یہ کہنہ سال بزرگ، جن کے ہاتھوں میں سالہا سال سے رعشہ تھا، جن کے لئے چار قدم چلنا دشوار تھا، اپنی زندگی کے جملہ فرائض بڑی ہمت سے انجام دیتے تھے۔ ان کی ضعیف العمری، دوستوں کی خاطرداری، خاندانی امور کی نگہداشت، تصنیف و تالیف اور مطالعہ کے مشاغل میں کبھی حارج نہ ہو سکی۔

مولانا ارشد تھانوی تھانہ بھون کے مردم خیز خطۂ زمین سے تعلق رکھتے تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ ریاست بھوپال میں گزارا۔ وہ برصغیر کے ممتاز ایسے قانون داں وکلاء میں شمار کئے جاتے تھے جو اپنی حق پرستی، صاف گوئی اور اصابت رائے کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

لیکن افسوس کہ زمانہ بڑا ناقدرداں ہے۔ اس کے ہاتھوں بڑے بڑے جوہران خوبی خاک میں ملے ہیں۔ ہمیں یہ سطور لکھتے ہوئے شبہ سا ہو رہا ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہوں گے کہ جو علی برادران، ڈاکٹر انصاری، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر کچلو، سر راس مسعود اور ایسی ہی کتنی اور عظیم ہستیوں کی صحبت سے فیضیاب ہونے والے اس بزرگ سے واقف ہوں گے۔

بہرحال، اردو کے حق میں سال گزشتہ بڑا ظالم ثابت ہوا۔ شاہد احمد نے داغ مفارقت دیا، ادم گئے۔ اب نئے سال کے آغاز پر یہ صدمہ سہنا پڑا۔ بے ساختہ یہ شعر دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ ؎

جو بیچنے والے پہ اڑے تھے اٹھتے جاتے ہیں   کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

مولانا ارشد تھانوی کے سانحہ ارتحال پر ہم کارکنان ادارہ الشجاع کی طرف سے ان کے قابل فرزند اکبر اور الشجاع کے مدیر سلمان الارشد صاحب اور ان کے اہل خاندان سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ خدا ان کو صبر جمیل عنایت فرمائے اور ہمیں ادب اردو کی ایسی ہی خدمت کی توفیق عطا فرمائے جیسے کہ مولانا ارشد تھانوی نے فرمائی۔ ؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سوگوار
شجاع الدین
ناشر

تلخیص و ترجمہ۔ یسین معصوم

تصویری فیچر

جوجوناگ

- وحشی الاؤ کے گرد گھیرا ڈالے ناچ رہے تھے — اس ویرانے میں میرا وجود ایک بھٹکی ہوئی روح کی مانند لگ رہا تھا —
- میں درختوں کی اوٹ میں کھڑا موت کا رقص دیکھ رہا تھا۔ کوئی طاقت مجھے ان کی طرف کھینچ رہی تھی !!

سیاحت کا مجھے بچپن سے شوق ہے، شوق کیا دیوانگی سمجھئے اور صرف یہی سبب تھا کہ میں نے فوج کی ملازمت کو اور تمام ملازمتوں پر ترجیح دی، کیونکہ اس میں دور دراز اور غیر ترقی یافتہ خطوں تک رسائی ممکن تھی۔ چنانچہ فوج کی ملازمت کے دوران میں نے ہمیشہ ان خطرناک اور غیر محفوظ جگہوں پر جانے کی خواہش کی جہاں دوسرے آفیسر خطرے، بے آرامی یا بدہیئت کے سبب نہ جاتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ جب مجھے مغربی افریقہ کے علاقہ میں بھیجا جانے لگا تو مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی۔ افریقہ الشہائع

کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ دنیا میں شاید اس سے زیادہ خطرناک، ہیبتناک اور غیر محفوظ خطہ اور کوئی نہیں ہے۔ پورے افریقہ کے متعلق شاید ایسا صحیح نہ ہو مگر اس کے مغربی کنارے کا حال اس سے مختلف نہیں گھنے جنگلات دشوار گزار راستے خطرناک جنگلی جانور آدم خور شیر قسم قسم کے حشرات الارض تنگ و تاریک گھاٹیاں، اور ان میں بسنے والے وحشی جو تہذیب و تمدن کے نام تک سے ناواقف۔ مگر میری کا مہم جو طبیعت کو یہ جگہ بڑی پسند آئی۔

جس جگہ مجھ تعینات کیا گیا وہ جگہ ہمارے اسٹیشن سے کوئی پچاس میل اندر گھنے جنگل میں تھی۔ جہاں صرف ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس کے وحشی باشندے جن کی طرز بود و باش طور طریقے، رسمیں اور رواج۔ توہمات اور خیالات۔ غرض ہر چیز نہ صرف جدا تھی بلکہ خود ان کے طرزِ زندگی کے مطابق انتہا پسند تھی۔ میرا کام سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا۔ کہ میں اس علاقے میں گھوم پھر کر اپنے ہیڈکوارٹر کو آنے والے کچھ خطرات سے باخبر رکھوں اور اسمگلروں پر نظر رکھوں۔

معمول کے مطابق ایک صبح میں گھنے جنگل میں اپنے راؤنڈ پر تھا کہ اچانک زمین نے جیسے میرے قدم پکڑ لئے۔ میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ میری نگاہیں سامنے پتلی سی پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں ایک چتکبرا ناگ بے خبری کے عالم میں آہستہ خرام تھا۔ سانپ یا دوسرے حشرات الارض کا اس گھنے جنگل میں پایا جانا کوئی حیرت زا بات نہ تھی۔ اور خود مجھے بارہا ان کیڑوں مکوڑوں سے واسطہ پڑا تھا جن سے کبھی میں دامن بچا کر نکل گیا تھا اور کبھی ان کو ختم کر کے اپنا راستہ صاف کیا۔ مگر اس چتکبرے ناگ کو دیکھ کر میں جہاں کا تہاں رہ گیا اس لئے نہیں کہ یہ کوئی بہت خطرناک۔ یا بہت بڑا تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ یہ سانپ کی وہ قسم تھی کہ جو بہت کمیاب تھا اور یہاں کے جنگلی اور وحشیوں کے نزدیک بڑا متبرک اور مقدس۔ چنانچہ وہ اس کو اپنا خدا مانتے اور اس کی پوجا کرتے۔ اور اس کو پکڑنا یا مارنا ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم تھا۔ میں ان لوگوں کے ان تمام خیالات سے واقف تھا اور اس کو ان کے توہمات اور ضعیف الاعتقادی سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ میں سانپوں کو پکڑنے اور ان کو پالنے کا شوقین بھی ہوں لہذا میں نے اس سنہری موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور جیسے تیسے اس جوجو ناگ کو پکڑ کر ڈاک بنگلہ لے آیا۔ اپنے اس خدا کو یہ لوگ "جوجو ناگ" کے نام سے پکارتے تھے۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ دوسرے سانپوں کے برعکس جوجو ناگ بالکل زہریلا نہ تھا۔ بنگلہ پر لا کر میں نے اسے ایک خاص مرتبان میں رکھا۔ اور دن میں ایک دو بار اسے باہر نکال کر پانی کے ٹب میں ڈال دیتا اور اسے چھوٹے چھوٹے کیڑوں مکوڑوں کی خوراک

اشتہار

دیتا۔ میں اسے پالتو بنا رہا تھا۔ دوسرے۔ تیسرے دن کا ذکر ہے کہ میرا واحد ملازم اور باورچی کوفی۔ کمرہ صاف کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ناگ پر پڑی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ مارے خوف اور دہشت کے وہ زرد پتے کی مانند کانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور آواز حلق میں اٹک گئی۔

"کوفی — ارے یہ تمہیں کیا ہوا؟" میں اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"صاحب۔ صاحب۔ یہ۔ یہ۔ جُو۔ جُوٹ" اس نے کانپتے ہوئے بمشکل کہا۔

"ڈرو نہیں یہ زہریلا نہیں ہے۔ میں اسے پال رہا ہوں" میں نے اس کا خوف دور کرنا چاہا۔

"صاحب۔ میں جانتا ہوں۔ یہ زہریلا نہیں۔ مگر صاحب یہ تو جُوجُو ہے۔ ہمارا خدا۔ سب سے بڑا خدا—" وہ ہکلاتے ہوئے بولا—

"ہشت۔ بے وقوف کہیں کا" میں اس کی حماقت پر مسکرایا" کہیں سانپ بھی خدا ہو سکتا ہے"

"مگر صاحب ہم تو اسے خدا ہی کہتے ہیں۔ اسے چھوڑ دیجیے صاحب ورنہ۔ ورنہ ہم پر بڑی مصیبت آئے گی۔ ہم تباہ ہو جائیں گے ہم مر جائیں گے" کوفی کی حالت اب تک ابتر تھی۔

"مگر کوفی۔ میں اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہا۔ نہایت آرام سے رکھا ہوا ہے" میں نے کوفی کو دلیل سے سمجھانا چاہا۔" یہ ہمیں کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے"

"صاحب آپ نہیں جانتے۔ اس کو قید کرنا اچھا نہیں ہوتا بڑی مصیبت ہوتی ہے"

میں نے لاکھ چاہا کہ کوفی کو کسی طرح قائل کر دوں مگر وہ کسی صورت راہ پر نہ آیا۔ اور اپنی ہی ہانکے چلا گیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس وقت سے اس نے میرے بیڈ روم میں بھی آنا چھوڑ دیا۔ مجبوراً اپنے بیڈ روم کا کام میں خود انجام دینے لگا۔

اتفاق کی بات کہ اسی شام ہیڈ کوارٹر سے میرا ایک دوست ایکس بھی آ گیا۔ وہ طویل رخصت پر جا رہا تھا لہٰذا محض مجھ سے ملنے چلا آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اسے جُوجُو ناگ اور کوفی کا قصہ بتایا مجھے امید تھی کہ یہ باتیں سن کر وہ میرا ہمنوا ہوگا اور ان لوگوں کی سادہ لوحی اور ضعیف الاعتقادی پر ہنسے گا۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے بھی وہی روش اختیار کی جو کوفی کی

الشجاع

تھی اور یہی اصرار کرتا رہا کہ ناگ کو میں چھوڑ دوں۔

" یاد رکھو کہ جو چیز تمہارے لئے تمسخر ہے وہی چیز ان لوگوں کے لئے انتہائی اہم اور سنجیدہ ہے۔ جس بات کو تم ضعیف الاعتقادی پر محمول کرتے ہو وہ بات ان کے لئے راسخ عقیدہ ہے۔ اور پھر یہ نہ سمجھو کہ تم انگلستان میں نہیں افریقہ کے ایک دور دراز اور خطرناک جنگل میں ہو اور تمہارا واسطہ ان جنگلیوں سے ہے۔ لہٰذا میری بات مانو اور اس جُو۔ جُو کو رہا کر دو۔"

ایکس دوسری صبح جاتے جاتے بھی مجھے یہی ہدایت کر گیا۔ مگر میں نے اس کی باتوں کو ڈر اور خوف سے تعبیر کیا اور تہیہ کر لیا کہ جُو۔ جُو کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

ایکس کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی ہو گی کہ جنگلی باشندے مع عورتوں بچوں کے اپنے خاص انداز میں ڈرم بجاتے اور ہتھیار ہلاتے ڈاک بنگلہ کی طرف آتے نظر آئے۔ وہ خاصے جوش اور غصہ میں دکھائی دیتے تھے۔ کوفی نے شاید ان تک یہ اطلاع پہنچا دی تھی۔ اور اب وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں اندر بلا لیا۔ کوفی کے ذریعہ میری اور ان کی بات چیت ہوئی۔ مطلب صاف واضح تھا وہ بھی جُو۔ جُو ناگ کی فوری رہائی چاہتے تھے۔ میں نے ان کو بھی دلائل دے کر سمجھانا چاہا مگر بے سود۔ آخر کار وہ ناکام اور مایوس واپس چلے گئے۔ خدا معلوم کوفی اور ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد یہ گروہ دوبارہ واپس آیا۔ اب کی مرتبہ ان کے ساتھ ان کا سردار بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ اب مفاہمت کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔

" تم ہمارے خدا کو قید نہیں کر سکتے۔ لہٰذا فوراً اسے رہا کر دو" سردار نے اپنی گرجدار آواز میں آتے ہی بم چھوڑا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم و جان کا مالک تھا۔ تقریباً برہنہ۔ چہرے اور جسم پر نہایت عجیب و غریب اور خوفناک نقش و نگار بنائے ہوئے گلے اور ہاتھوں میں مردہ کھوپڑیوں اور ہڈیوں کی مالا پہنے ہوئے۔

" مگر وہ تو سانپ ہے اور بڑے آرام اور مزے سے ہے۔"

" ہم اور کچھ سننا نہیں چاہتے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فوراً
الشجاع

جُو۔ جُو کو چھوڑ دو۔" وہ غضبناک ہو کر چلایا

" میں ہرگز ہرگز اسے نہیں چھوڑوں گا۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"
میں گرجا۔

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بہت جلد تباہ و برباد ہو جاؤ گے تم بیمار ہو گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سسک سسک کر مر جاؤ گے۔ اور تمہارے اس بنگلہ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔" وہ جوش غضب سے ناچ اٹھا۔

" بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ" میں دھاڑا اور بندوق کی نالی ان کی طرف کر دی۔

وہ سب کے سب چیختے چلاتے اور نعرے بلند کرتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک فضا ان کے جنگلی نعروں سے لرزتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ خاموشی جنگل میں کوئی انوکھی بات نہیں۔ مگر یہ خاموشی بڑی پراسرار اور ہیبتناک تھی۔ مجھے فضا میں ایک خاص قسم کی گھٹن محسوس ہوئی۔ ہر شے جیسے ساکت و صامت ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ میری بلیاں بھی جو ہمہ وقت کودتی پھاندتی پھرتی تھیں نہ جانے کس کمرے میں چپ چاپ دبکی بیٹھی تھیں۔ جیسے کسی آنے والے خطرے کو سونگھ رہی ہوں۔ جوں جوں شام کا پرچم لہراتا جا رہا تھا تاریکی اور سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور چاروں طرف موت کا سا سکوت طاری تھا۔

اچانک ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ جیسے کوئی بہت بھاری سے نہایت بلندی سے گر کر چکنا چور ہو گئی ہو۔ اور ساتھ ہی شور و غل اور چیخوں کی وحشتناک آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر ان آوازوں میں ڈھول تاشے۔ ڈرم اور جنگلی بگل کا شور بھی شامل ہو گیا۔ رات کا پراسرار اور گہرا سناٹا چھن سے ٹوٹ گیا۔ شور اگرچہ بے ہنگم تھا اور ساتھ ہی خوفناک بھی۔ میں نے فوراً اپنے ملازم کوفی کو بلایا اور اس سے اس شور کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔

" صاحب یہ موت کا جنگلی رقص ہے۔ جب ہم لوگ کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو یہ رقص کرتے ہیں۔ اور منتر پڑھتے ہیں" وہ خاصا سہما ہوا تھا۔

" پھر۔ "

" پھر صاحب اس منتر میں جس کا نام لیتے ہیں وہ چند ہی دن میں مر جاتا ہے۔ ہمارا جُھو۔ جُھو۔ اسے پھر نہیں چھوڑتا۔"

" لیکن تمہارا جھو۔ جھو تو میرے پاس ہے۔" میں مسکرایا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میری یہ مسکراہٹ پھیکی ہے۔

" صاحب اسی لئے تو وہ سب ناچ کر اس کی غضب ناک قوت کو جگا رہے ہیں۔ صاحب آپ میری بات مانیں تو ـــــ" میں سمجھ گیا کہ آگے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا میں نے اسے وہاں سے چلتا کیا دہشتناک چیخوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ ان آوازوں سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا لیکن نہ جانے پھر کیوں ایک خواہش میرے دل میں مچل رہی تھی کہ آخر چل کر ان کا یہ رقص تو دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک پراسرار غیبی طاقت مجھے ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں رکنا چاہوں تو بھی شاید نہ رک سکوں گا۔ چنانچہ میں نے ایک سیاہ لبادہ اوڑھا اور دبے پاؤں آواز کی سمت چلا۔ اس ویرانے میں میرا وجود ایک بھٹکی ہوئی روح کی مانند لگ رہا تھا۔ جوں جوں میں ان کے بڑھتا جا رہا تھا اسی قدر جسم میں سنسنی سی پھیل رہی تھی۔ آخر مجھے الاؤ کی وہ روشنی دکھائی دی جس کے گرد گھیرا ڈالے وہ سب محو رقص تھے۔ میں درختوں کی اوٹ میں کھڑا موت کا یہ رقص دیکھ رہا تھا وہ سب انتہائی جوش اور غضب میں بھرے معلوم ہوتے تھے۔ ننگے ہوئے جسموں اور خوفناک صورتوں۔ اور جسموں پر ہتھیار سجائے وہ نہ جانے کس دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے۔ ننگی نیم برہنہ عورتیں بھی دیوانہ وار ناچ رہی تھیں۔ نہ جانے کب تک میں سُن کھڑا۔ ان کا یہ رقص دیکھتا رہا اور نہ جانے کیسے واپس آیا۔ اور بستر پر پڑ گیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ صبح کو مجھے بخار تھا۔ ذہنی خوف کی وجہ سے یا کسی اور بنا پر اس کا میں فیصلہ نہ کر سکا۔ اس اثنا میں ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ جب میں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو کوئی نہایت خوفزدہ سا دوڑا دوڑا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور مجھے بنگلے کے گیٹ پہ لے گیا۔ خوف کے مارے اس کی آواز بھی نہ نکل رہی تھی

انشجاع

گیٹ پر میں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب نشان بنا ہوا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ مٹی کا ایک بے ڈول سا انسانی جسم سے مشابہ ایک پتلا ہے جس کو صدر دروازے پر چپکا دیا گیا ہے۔

" ہوں۔ تو گویا یہ ان کا پہلا ٹوٹکا ہے، جو انھوں نے ہم پر کیا ہے " میں بڑبڑایا۔

" صاحب۔ یہ بڑا خطرناک ہے۔ صاحب اب میں مر جاؤں گا۔ مر جاؤں گا۔ انھوں نے میری موت کی دعا کی ہے " الفاظ کوفی کے منہ سے بڑی مشکل سے نکل رہے تھے۔

" تم فکر نہ کرو کوفی "۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ " جب تک تم میرے پاس ہو کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

" نہیں صاحب۔ اب میں زندہ نہ بچوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ جُھو جُھو ہم سے ناراض ہو گیا ہے " وہ ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

" اچھا جاؤ تم اپنا کام کرو۔ میں اس معاملے پر پھر غور کروں گا" میں نے مٹی کے اس پتلے کو دروازے سے نکال کر دور پھینکا اور اپنے دورے پر روانہ ہو گیا۔

دوسری رات پھر وہی پہلی رات کا عمل شروع ہوا مگر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان لوگوں کے ہتھکنڈوں سے قطعاً مرعوب نہیں ہوں گا۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا ـــ اگلی صبح معلوم ہوا کہ دروازے پر پھر ایک بے ڈول سا انسانی پتلا چسپاں ہے۔ میں نے چاہا کہ اسے بھی اکھاڑ کر پھینک دوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ عمل تو روز اسی طرح جاری رہے گا۔ لہٰذا میں نے اسے وہیں لگا رہنے دیا۔ کوفی کی نظر شاید اس پر مجھ سے پہلے پڑ چکی تھی۔ وہ ڈرا سہما اپنے بستر پر دراز تھا۔ میں نے اس کی حالت دیکھی اسے واقعی سخت قسم کا بخار تھا اور مارے دہشت کے وہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور خود باہر چلا گیا۔ اگلے چند روز جنگلیوں کا رقص جاری رہا اور کوفی روز بروز زیادہ کمزور اور زرد ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ میں نے اسے اپنے پاس سے بہت سی دوائیاں بھی دیں مگر بے کار۔ وہ کام کرنے کے ناقابل تھا۔ چنانچہ اس عرصہ کے لئے میں نے ایک اور باورچی کا انتظام کر لیا۔ باقی سب کام مجھے خود کرنے پڑتے۔

نئے باورچی کو آئے ہوئے کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ایک صبح کھانا کھاتے ہوئے میرے منہ میں کچھ کنکر سے محسوس ہوئے۔ نوالہ تھوک کر میں نے غور سے دیکھا تو اس میں کسی دھات کے بنے ہوئے سفید سفید چھوٹے ٹکڑے تھے۔ تلاش کرنے پر ڈشی میں سے اور بھی اسی قسم کے ٹکڑے ملے۔ میں سکتے میں آگیا۔ تو گویا ان کا عمل اب مجھ پر بھی شروع ہو چکا تھا۔ یقیناً نیا باورچی جنگلیوں سے ساز باز رکھتا ہوگا تبھی یہ ممکن ہوا کہ میرے کھانے میں سے یہ دھات کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ مجبوراً میں نے نئے باورچی کو چھٹی دے دی۔ اب میرے لئے بڑی مصیبت تھی۔ کھانا پکانے سے لے کر صفائی تک خود مجھے کرنی پڑتی تھی۔ جو میرے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے ہیڈ کوارٹر مراسلہ لکھا کہ میری بیوی کو یہاں آنے کی اجازت دی جائے

جُوجُو سانپ ابھی تک میرے قبضہ میں تھا۔ اور میں اس کی برابر دیکھ بھال بھی کر رہا تھا۔ مگر کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ وہ اپنے مرتبان میں نہیں ہے۔ یہ چیز بڑی تعجب خیز تھی۔ کیونکہ مرتبان کا منہ بند رہتا تھا۔ ہوا کے لئے میں نے اس کی ربڑ کی ڈاٹ میں باریک باریک سوراخ کر رکھے تھے جن سے وہ قطعاً باہر نہ نکل سکتا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مجھے کبھی مرتبان میں نظر آتا اور کبھی نہیں۔ یہ عقدہ ابھی حل نہ ہوا تھا کہ ایک دن کوفی کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی لہٰذا میں نے اسے اپنے ہیڈ کوارٹر کے اسپتال لے جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ اگرچہ وہاں لے جانا کچھ آسان نہ تھا مگر کسی نہ کسی طرح میں نے یہ منزل سر کر ہی لی۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا بھالا اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔

" آپ نے اسے لانے میں بہت دیر کر دی مسٹر وائٹ " ڈاکٹر اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکاتے ہوئے بولا۔

" مگر مجھے امید نہ تھی کہ اس کی حالت اتنی خراب ہو جائے گی۔"

" ہوں۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے " ڈاکٹر گہری سوچ میں غرق تھا۔

" دراصل یہ جسمانی طور پر اتنا بیمار نہیں، جتنا کہ واہمہ اور خوف نے اسے کر دیا ہے "

اشفاق

" واہمہ۔ خوف۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر وائٹ ؟ "
ڈاکٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

" میں صحیح عرض کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسے اس کے ڈر اور وہم نے موت کے کنارے لا کھڑا کیا ہے " اور تب میں نے ڈاکٹر کو پورے واقعہ سے آگاہ کیا۔

" اسی لئے تو میں کہتا ہوں ڈاکٹر کہ اس کا توجہ سے علاج کیجئے۔ یہ یقیناً اچھا ہو جائے گا ــ اور تب اسے معلوم ہوگا کہ جُوجُو کا جادو یہ سب واہمہ ہے " میں نے کہا۔ ڈاکٹر نے اپنی پوری کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ اور میں واپس بنگلہ پر چلا آیا۔ یہ وعدہ کر کے کہ چند دن بعد پھر آؤں گا۔

دو چار روز میں میری بیوی آگئی۔ میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ اگرچہ وہ بھی میری طرح ان واہموں پر یقین نہ رکھتی تھی مگر پھر بھی حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے مجھ پر زور دیا کہ میں جُوجُو کو چھوڑ دوں۔ چنانچہ ایک صبح ہم نے یادگار کے طور پر جُوجُو کے خوب فوٹو لئے اور باغ کے کنارے لا کر اسے آزاد کر دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے آزاد کرنے کا ذکر اگرچہ میں نے کسی سے نہ کیا تھا مگر خدا معلوم کیسے ان جنگلیوں کو یہ بات معلوم ہو گئی یا ان کی چھٹی حس یا عقیدہ نے یہ بات انھیں پر اسرار طور پر بتا دی اور اس رات کے بعد سے کبھی انھوں نے موت کا رقص نہ کیا۔

اگلی صبح میں کوفی کو دیکھنے ہیڈ کوارٹر اسپتال روانہ ہوا۔ دوپہر کے قریب جب اسپتال پہنچا تو دیکھا کہ کوفی پہلے سے بہت بہتر حالت میں ہے۔ ڈاکٹر سے ملا۔ تاکہ اس کا شکریہ ادا کر دوں

" ڈاکٹر آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی توجہ اور مہربانی سے کوفی کی حالت بہتر ہو چلی ہے "

" وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ ایک حیرت انگیز بات ہے " ڈاکٹر نے کہا۔ میں سمجھا کہ وہ یقیناً انکساری سے کام لے رہا ہے۔

" بہرحال ڈاکٹر اگر آپ توجہ نہ کرتے تو ــ " اور ہاں ڈاکٹر شاید یہ سن کر آپ کو خوشی ہو کہ میں نے جُوجُو کو آزاد کر دیا ہے "

" اچھا۔ کب ؟ " ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

(باقی صفحہ ... پر)

پُراسرار کہانی

(۲)

تلخیص و ترجمہ

احمد صغیر صدیقی

انسانوں کا شکار

* ــــــ رینس فورڈ کا دل خوف سے بیٹھنے لگا۔
* ــــــ شیطان اپنے کتوں کو بھی لے آیا تھا اور وہ گھبرا کر ایک کنج میں جا گھسا۔
* ــــــ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آوازوں پر کان لگا دیئے۔
* ــــــ آوازیں لمحہ بہ لمحہ نزدیک تر ہوتی گئیں پھر یک کربیہ چیخ فضا میں گونجی
* ــــــ مگر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی

شیطان کہہ رہا تھا ــــــــ

چاروں طرف چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پگڈنڈی کا پہلا موڑ گھومتے ہی اسے دائیں جانب جنگلات کا گھنا سلسلہ دکھائی دیا۔ بائیں سمت میں سمندر کا نیلا پانی میلوں تک کسی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ سمندر سے دیکھنے والا چٹانوں کی باعث قلعے کو قطعی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

چند لمحوں تک وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا پھر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اسے جنرل نے چار گھنٹے کی مہلت دی ان چار گھنٹوں میں اسے اپنا بچاؤ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی تھی۔ گھنی جھاڑیوں کو روندتا ہوا وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ غالباً ایک بجے تک وہ جھاڑیوں اور جنگلوں میں آگے کانٹوں سے الجھتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ پھر ایک اونچے سے چھتنار درخت کو غور سے دیکھنے لگا چند لمحوں تک وہ اس کے محل وقوع کو ذہن نشین کرتا رہا پھر تیزی سے اسی راستے پر واپس دوڑنے لگا جس پر سے ہو کر وہ واپس ہوا تھا آدھ گھنٹے تک وہ بار بار اسی راستے پر آتا اور جاتا رہا۔ دراصل اس کے ذہن میں لومڑیوں کی وہ ترکیب تھی جس پر عمل کر کے یہ جانور اپنے شکاریوں کو اکثر دھوکا دیتا ہے۔ راستے پر مختلف قسم کے نشانات بنانے کے بعد وہ اسی گھنے درخت کے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ پھر اس پر بڑی احتیاط سے چڑھنے لگا اب وہ جنگلی بلیوں کی ذہانت کو اپنا رہنما بنائے ہوئے تھا اس نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ درخت پر اس کے پیروں کا کوئی نشان نہ بننے پائے۔ پھر وہ اسی احتیاط سے اوپر کی جانب سرکنے لگا آخر کار وہ ایک ایسی جگہ جا بیٹھا جہاں درخت کے پتے گھڑی طرح اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اسے اب پورا اطمینان تھا کہ اسے تیچپسے ڈھونڈھ نکالنا سوائے کسی شیطانی حس والے شخص کے، کسی اور کے لئے قطعی آسان نہ ہوگا

وہیں بیٹھ کر وہ جنرل زروف کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی آنکھیں سامنے کے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔ دوپہر ڈھلی پھر شام کے آثار سے نظر آنے لگے تبھی اس کی رگوں میں جیسے خون کی گردش بےحد تیز ہو گئی۔ چونک کر اس نے سامنے دیکھا دور کسی شخص کا ہیولا نمودار ہوا آہستہ آہستہ محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ٹھیک اسی راستے پر اس کی سمت میں چلا آ رہا تھا۔

رینس فورڈ نے اوپر سے دیکھا وہ جنرل زرد رنگ کا تھا۔
جنرل نہایت چوکنے اور محتاط انداز میں نپے تلے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ
رہا تھا۔ اس کی چمکیلی آنکھیں اپنے قرب و جوار کا پوری طرح جائزہ
لینے میں منہمک تھیں۔ کچلی ہوئی جھاڑیوں سے لیکر ٹوٹے ہوئے درخت
اور زمین پر ابھرے ہوئے نقوش کا ایک ایک حصہ اس کی نظروں
میں تھا وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا ٹھیک اسی درخت کے نیچے آکر رک گیا
رینس فورڈ نے اوپر بیٹھے بیٹھے جیسے اپنا دم سادھ لیا۔ اس کا
دل بڑے زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ جنرل زرد رنگ یقیناً کسی شیطان
سے کم نہ تھا۔ رینس فورڈ کے خیال میں اس کا اتنے کم عرصے میں ٹھیک
اس تک آ پہنچنا یقیناً کسی شیطانی حس کے بغیر ممکن نہ تھا۔ خوف اور دہشت
کے ملے جلے جذبات تلے اس نے محتاط انداز میں نیچے کی جانب دیکھا۔
جنرل چند لمحوں تک وہیں پیڑ کے تنے کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر
اس نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے جھک کر زمین پر کچھ دیکھا اور دوسرے لمحے سیدھا
کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ قرب و جوار کا محتاط انداز میں جائزہ لیتا
رہا پھر اس کی نظریں ایکبارگی درخت کے سرے پر جا ٹکیں
گھبرا کر رینس فورڈ نے اپنا سر پتوں میں چھپا لیا لیکن اس
کی آنکھیں رخنوں کے درمیان سے اب بھی نیچے ہی کی جانب لگی ہوئی تھیں
جنرل چند لمحوں تک اوپر کی جانب گردن اٹھائے دیکھتا رہا
پھر گردن نیچی کر کے اپنی جیب سے سگریٹ کیس نکالنے لگا۔ اس کے ہونٹوں
پر اس وقت ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی ۔
رینس فورڈ نے سوچا کیا اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ کیا جان
بوجھ کر مجھے خوف اور الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں
کہ وہ مجھ سے کھیل رہا ہو۔ وہی کھیل جو بلی اپنے شکار چوہے کے ساتھ
اسے شکار کرنے سے پہلے کھیلتی ہے وہ سوچتا رہا اور اس کی آنکھیں
برابر اس پر جمی رہیں ایک بار اس نے سوچا کیوں نہ کسی چیتے کی طرح
نیچے کود کر جنرل پر ٹوٹ پڑے اس کے ہاتھوں کی گرفت اس خیال کے ساتھ
ہی خنجر پر کچھ اور مضبوط ہو گئی۔ کودنے کی نیت سے اس نے اپنا توازن
درست کیا لیکن یکایک اسے سنبھل جانا پڑا۔ جنرل کے ہاتھ ابھی
کسی ساخت کے بنے ہوئے چھوٹے سے ہتھیار پر کمال ہوشیاری سے جمے
ہوئے تھے اس ریوالور کی موجودگی میں رینس فورڈ نے یہی سوچا
کہ کودنے کا پروگرام ملتوی کر دے اب وہ جنرل کے آئندہ اقدام کا
منتظر تھا۔ جنرل نیچے کھڑا چند لمحوں تک محتاط انداز میں گرد و پیش کا جائزہ
لیتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں الجھن کے سے آثار دکھائی دینے لگے
سوچ میں گم وہ ایک بار مڑا اور پھر تیز قدموں چلتا ہوا اسی راستے پر
روانہ ہو گیا جس پر چل کر وہ ادھر آیا تھا ۔
رینس فورڈ نے اوپر بیٹھے ہی بیٹھے اسے چلتے دیکھا حتیٰ کہ وہ
اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ پھر وہ بڑی تیزی سے درخت سے
اترا ۔
رات سر پر آ پہنچی تھی اور اس اندھیرے میں گھنے درختوں کی دنیا
میں گھسنا موت کو دعوت دینے سے کم نہ تھا۔ رینس فورڈ نے یہ سوچ کر۔
جنرل غالباً رات کو آرام کرے گا یہی مناسب سمجھا کہ اب وہ بھی آرام کیلئے
کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ نکالے چند لمحوں تک وہ بھنویں سکوڑے
سوچ میں ڈوبا کھڑا رہا پھر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ رات جنگل کے بجائے
سمندر کے قریب پھیلی ہوئی ریت پر ہی بسر کرنی چاہیئے۔ پھر وہ ادھر ہی
چل پڑا ۔
رات وہ بڑی کچی نیند سویا۔ لیکن حسب توقع جنرل نے ادھر کا
رخ نہیں کیا تھا۔ منہ اندھیرے ہی وہ بیدار ہو کر ایک بار پھر اپنی جان بچانے
کی تدبیروں میں سر کھپانے لگا۔ جنگل میں گھسنے کے علاوہ اب کوئی چارہ
نہیں تھا وہ جھاڑیوں، پودوں اور گھاس کو روندتا ہوا آگے ہی بڑھتا
رہا اس کے سارے چہرے پر ۲۴ گھنٹوں کی دوڑ کے سارے اثرات
اب پوری طرح نمایاں تھے۔ کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے کے باعث اسے
اپنے جسم میں عجیب قسم کی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا
کے مصداق وہ اس دشوار سفر پر مجبور تھا۔ کچھ دور جنگل کے اندر اسے
ایک چھوٹا سا کشادہ میدان سا دکھائی دیا۔ قریب ہی ایک جڑ سے
اکھڑا ہوا مردہ درخت بھی نظر آیا یہ درخت اپنے ہمسایہ درخت کے شانے
پر سر ٹیکے ہوئے تھا اس کے سارے پتے جھڑ چکے تھے اور صرف خشک
شاخیں ہی رہ گئی تھیں اس پر نظر پڑتے ہی رینس فورڈ کے دماغ
میں ایک عجیب سی ترکیب بجلی کی طرح کوندی دوسرے ہی لمحے وہ کام

شروع کر دیا کوئی گھنٹہ بھر تک وہ مصروف رہا پھر اپنے کام سے مطمئن ہو کر وہ ٹھیک ہی ایک ٹیلے سے گڑھے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

سورج آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا جا رہا تھا کوئی دس یا گیارہ کا وقت ہوگا جب اسے سامنے کی جھاڑیوں میں بنے ہوئے راستے پر جنرل تیز آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس وقت بھی وہ بے حد چوکنا لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول حسب سابق آج بھی دبا ہوا تھا اس کی آنکھیں زمین پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بالکل کسی شکاری کتے کی مانند بو سونگھتا ہوا ٹھیک اُسی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں اس سے کچھ دیر قبل رینس فورڈ نے درخت پر محنت کی تھی۔

رینس فورڈ، جنرل کی ان صلاحیتوں پر حیران حیران سا اب اس بات کا منتظر تھا کہ دیکھیں اس کی، کی ہوئی محنت ٹھکانے بھی لگتی ہے یا نہیں۔ اضطراب کی عجیب سی کیفیت تھی کہ اس پر طاری تھی۔ اس نے دیکھا جنرل جونہی خشک درخت کی زد میں پہنچا اس کا بنایا ہوا مین ٹریپ حرکت میں آگیا مگر جنرل نے بندروں کی سی پھرتی نہ دکھائی ہوتی تو شاید شانے پر معمولی زخم کھانے کی بجائے وہ گرنے والے درخت کی زد میں بری طرح کچل گیا ہوتا۔ درخت اس کے پیروں میں پھنسنے والی بیل کے زور سے اپنے ساتھی کے شانے سے ڈھلک کر بڑی بھیانک آواز کے ساتھ نیچے آرہا تھا۔ لیکن جنرل کے ستارے اچھے ہی تھے۔ وہ مرا نہیں تھا البتہ اس کا شانہ بری طرح زخمی ہوا تھا

رینس فورڈ اپنی تدبیر کو ناکام ہوتے دیکھ کر جیسے کچھ سا گیا۔ اب وہ آئندہ خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن اس کے برخلاف جنرل نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا اس نے اپنے زخمی شانے کو دباتے ہوئے ایکبار ادھر ادھر دیکھا پھر پکارتے ہوئے بولا

"مبارک باد مسٹر رینس فورڈ۔ تم جہاں کہیں بھی ہو میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔ تم واقعی اچھی خاصی ذہانت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ میں ذرا زخمی ہو گیا ہوں۔ اور اب زخم کی ڈریسنگ کے بعد ہی آسکوں گا۔ اس وقت تک کے لئے اجازت دو۔"

پھر وہ مڑ کر لمبے قدموں چلتا ہوا اسی راستہ پر چل پڑا جس پر وہ چل کر وہ ادھر آیا تھا۔

رینس فورڈ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور اطمینان کی لمبی سی سانس لے کر ہانپنے لگا۔

"میرے خدا۔ یہ انسان ہے یا شیطان۔"

وہ آہستہ آہستہ سے بڑبڑایا اور گڑھے سے باہر نکل آیا۔ وہ سست رفتار سے ایکبار گھنی جھاڑیوں کے دشوار گزار راستہ پر پھر چل پڑا خطرہ اب بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔ وہ گرد و غبار سے اٹا ہوا بھاگتا رہا پھر پتہ نہیں کیا ہوا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے نیچے کی زمین بری طرح دھنستی جا رہی ہے بڑی پھرتی سے اس نے خود کو روکا اور ایک لمبی جست لگاتا ہوا مخالف سمت میں آرہا تھا وہ بے خبری میں ریت کی دلدل میں جا گھسا تھا۔ دلدل سے چند گز ہٹ کر کھڑے ہو کر اس نے سامنے کی جانب دیکھا چاروں طرف جھاڑیاں تھیں صرف ایک ہی راستہ تھا۔ پھر زمین کی نرمی نے اسے ایک دوسری ہی ترکیب سجھا دی وہ دوسرے لمحے چاقو لے کر زمین پر پل پڑا۔ جنرل کی آمد سے پہلے وہ کچھ کر گزرنا چاہتا تھا وہ ہر قیمت پر جنرل کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا اگر جنرل کے پاس پستول نہ ہوتا تو شاید پہلے ہی اس سے الجھ گیا ہوتا۔ لیکن یہ ایک بڑی مجبوری تھی اور وہ اب صرف دور ہی رہ کر کوئی کاروائی کر سکنے پر قادر تھا اور بس پھر وہ دیر تک وہیں ایک بڑا سا گڑھا کھودنے میں منہمک رہا۔ قد آدم گہرائی کا گڑھا تیار کرنے کے بعد چند سخت قسم کی جھاڑیوں کی لکڑی لی اور ان کی قلمیں تراشنے لگا۔ پھر ان قلموں کو اس نے گڑھے کے اندر اس طرح گاڑ دیا کہ ان کی نوکیں اوپر کی جانب رہیں اتنا کر چکنے کے بعد وہ تیزی سے اس پر گھاس پھوس لا لا کر ڈالنے لگا۔ کچھ دیر اس نے دور ہٹ کر اسے دیکھا گڑھے کی بجائے وہاں اب ایک جھاڑی سی اُگی نظر آرہی تھی۔ اس راستے پر چلنے والے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس "جھاڑی" کو کچلتا ہوا گزرے پھر وہ بھاگ کر ایک موٹے سے درخت کے پیچھے جا چھپا اب گڑھا اس کی ساری امیدوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور وہ خود جنرل کی آمد کا بے چینی سے منتظر تھا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی کچھ دیر تھی جب اسے کہیں دور سے کتوں کے غرانے کی آوازیں سی سنائی دیں۔

"غالباً وہ شیطان اپنے کتوں کو بھی لے آیا ہے" رئیس فورڈ نے سوچا اور اس کا خوف سے جی بیٹھنے لگا۔ اس جگہ سے وہ کچھ اور ہٹ کر ایک گھنی سی کنج میں جا گھسا۔ اس کا بنایا ہوا گڑھا یہاں سے ٹھیک دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن وہ یہیں ٹھہرنے پر مجبور تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آوازوں پر اپنے کان لگا دیئے۔ لمحہ بہ لمحہ آوازیں نزدیک تر ہوتی گئیں پھر ایک کربیہ چیخ فضا میں گونجی۔ اس کا دل خوشی سے جیسے ناچ اٹھا اس نے چاہا کہ سر نکال کر جھانکے لیکن کتوں کے خوف نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا پھر چند لمحوں بعد اسے جنرل کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی اور اس کی امیدوں پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔ اس نے سنا جنرل کہہ رہا تھا۔

"مبارک باد میرے دوست — میں جانتا ہوں کہ تم کہیں قریب ہی ہوگے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے لئے بنایا ہوا تمہارا "برمیز ٹائیگر پٹ" تمہاری توقعات پوری نہیں کر سکا لیکن میں تمہاری ذہانت کی داد ضرور دوں گا۔ تمہارے اس گڑھے نے میرے ایک چہیتے کتے کی جان لے لی ہے خیر میں دیکھوں گا کہ تم میرے دوسرے کتوں کے لئے کیا کرتے ہو۔ ویسے ایک بار پھر اس کامیابی پر میری جانب سے مبارکباد قبول کرو۔ مجھے اس شکار میں سچ مچ بے حد مزہ آ رہا ہے۔"

جھاڑیوں میں دبکے ہی دبکے رئیس فورڈ نے جنرل کی آواز سنی اور دانت پیسنے لگا — "وہ اب اور کتنے بھی لائے گا" اس نے سوچا اور خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کتوں کی موجودگی میں اس کا بچے رہنا معجزہ سے کم نہ ہوگا۔

چند لمحوں تک وہ منتظر رہا پھر آہستہ سے اس نے باہر کی جانب سر نکال کر جھانکا۔ جنرل آہستہ آہستہ اپنے ایک بچے ہوئے کتے کی زنجیر تھامے واپس جا رہا تھا۔

جھاڑیوں سے باہر نکل کر اس نے چند لقمے خوراک اپنے حلق میں ٹھونسی پھر وہیں رک کر آئندہ کے لئے سوچنے لگا۔ اب اس کے پاس کوئی طریقہ نہیں تھا۔ سامنے صرف دو راستے تھے یا تو وہ وہیں رک کر کتوں کا انتظار کرتا یا پھر بے تحاشہ بھاگ نکلتا۔ دونوں صورتوں میں موت بہرحال یقینی تھی ایک میں، موت ذرا جلدی آتی اور دوسری صورت میں چند لمحوں کے لئے اسے ٹالا ضرور جا سکتا تھا۔ لیکن بہرحال زندگی سے اسے پیارا تھا اور وہ مرنا قطعی نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی فی الحال رات میں خطرہ نہیں تھا۔ رات بھر وہ وہیں پڑا رہا۔ ساری رات اس کی نیند حرام رہی صبح ہوتے وقت وہ خود کو بے حد پژمردہ اور تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا لیکن خطرہ اب بھی بدستور سر پر ہی تھا۔ آج مقابلے کا آخری دن تھا اور نصف شب ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اسے یقین تھا کہ جنرل جلد یا بدیر اسے ضرور ڈھونڈ نکالے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر جیسے بجلیاں سی بھر گئیں دانت بھینچتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کیا اور سمندر کی جانب بُری طرح بھاگنے لگا دوپہر بھر وہ دوڑتا رہا حتیٰ کہ جھاڑیاں آہستہ آہستہ ہلکی ہونے لگیں غالباً وہ جنگل پار کر آیا تھا۔

ایک جگہ رکتے ہوئے اس نے سوچا کیوں نہ ایک آخری کوشش اور کر لی جائے اس نے بھی فیصلہ کیا کہ اسے بھی وہی ترکیب آزمانی چاہیئے جو یوگنڈا کے مقامی باشندے شکار کے سلسلے میں اکثر استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس نے یہ طریقہ انہیں لوگوں سے سیکھا تھا۔ فیصلے کے بعد ہی وہ سرگرم عمل ہو گیا۔ قریب ہی جا بجا پھیلی ہوئی بیلوں کو جوڑ جوڑ کر اس نے ایک رسی سی بنائی پھر اس لچکتی ہوئی لکڑی کے اوپر جھکے ہوئے درختوں پر جا چڑھا وہاں اس نے اپنا شکاری چاقو نکالا اب اس کے ہاتھ بڑی ہنرمندی سے اس کے دستے کو بیل کے رسی میں جکڑ رہے تھے۔ پھر اس نے اتر کر بیل کو زمین پر گھاس کی طرح ہر طرف پھیلا دیا۔ چاقو اب اس تنہا راستے پر عین اوپر لٹکا ہوا تھا۔

پھر اس نے نزدیک کے ایک اونچے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا شاخ پر بیٹھ کر وہ آرام کرنے لگا تقریباً گھنٹے بھر کے آرام کے بعد اب وہ اپنے اندر خاصی توانائی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ دوپہر آہستہ آہستہ ڈھلی جا رہی تھی۔ لیکن جنرل کا ابھی دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ درخت کے اوپر سے جھاڑیوں کے اندر کا راستہ کافی دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔

تبھی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ہی اس کے کان جیسے کھڑے ہو گئے۔ یہ یقیناً بہت سے کتوں کی آوازوں کا ملا جلا شور تھا جو ہوا کے جھونکے کے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ کتوں کا شور چند ہی لمحے میں صاف سنائی دینے لگا۔ اوپر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے دور تقریباً فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ان کا ہیولیٰ ابھرتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں تقریباً آدھ درجن کتوں کی زنجیروں کو تھام رکھا تھا کتے آگے آگے دوڑ رہے تھے پھر ان سب کے پیچھے جنرل

کا سایہ بھی دکھائی دیا۔

وقت ضائع کئے بغیر وہ بڑی تیزی سے نیچے اترا۔ ایک بار اس نے اس پگڈنڈی کی جانب دیکھا جہاں اس نے چاقو کو نصب کیا تھا۔ چاقو پگڈنڈی کے اختتام پر پھیلے ہوئے درخت کی ایک شاخ کے ٹھیک اوپر لٹکا ہوا تھا اس کا دستہ اوپر کی جانب تھا اور نوک نیچے کی طرف پھر وہ جس قدر تیز بھاگ سکتا تھا بھاگ نکلا۔ رینس فورڈ نے سنا۔ کتوں کا جھنڈ کہیں قریب ہی زور زور سے بھونکتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ غالباً انہوں نے اس کی خوشبو پالی تھی اس لمحہ رینس فورڈ کو پہلی بار احساس ہوا کہ بھاگتا ہوا جانور کتوں اور شکاری کے خوف کے زیر اثر کیا محسوس کرتا ہوگا۔

سانس درست کرنے کے لئے ابھی وہ ٹھہرا ہی تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے پیچھا کرتے ہوئے کتے بھی رک گئے ہوں اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول بیٹھا۔ غالباً وہ چاقو کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔۔ اس نے سوچا اور دوڑ کر ایک درخت پر جا چڑھا اس نے نیچے کی جانب نظر دوڑائیں اور پھر جیسے اس کا دل بیٹھ سا گیا اس کی ساری توقعات پر ایکبار پھر پانی پھر چکا تھا۔

اس نے دیکھا۔ جنرل اب بھی اپنے پیروں پر موجود تھا البتہ اوان نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ بیل کے ذریعے اٹکے ہوئے چاقو نے یقیناً تھوڑی بہت کامیابی حاصل کرلی تھی۔ اوان ختم ہو گیا تھا۔

رینس فورڈ مشکل ہی سے ابھی جنگل سے نکل کر میدان میں پہنچا ہوگا کہ ایک بار پھر اسے کتوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ہانپتے ہوئے اس نے اپنے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حوصلہ پیارے رینس فورڈ حوصلہ !!" درختوں کے درمیان ہی اسے پانی کی نیلاہٹ لہریں لیتی دکھائی دیں وہ اسی طرف تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس نے پانی سے بھرے گڑھے کو پھلانگنے کے لئے ایک لمبی سی جست لگائی اور دوسری جانب جا نکلا۔ اب وہ بالکل ہی سمندر کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی ابھری ہوئی چٹان کے نیچے، کوئی بیس فٹ کی دوری پر سمندر کا نیلا پانی موجیں مار رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے سوچ میں پڑا پھر ایک طویل جست کے ساتھ ہی اپنے پیچھے کتوں کی کریہہ چیخوں کو چھوڑتا ہوا وہ نیلے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جیسے ڈوبتا چلا گیا۔

اپنے کتوں کے ہمراہ جنرل زروف جب اس جگہ پہنچا تو سمندر

الشجاع

پہلے ہی کی مانند پرسکوت ہو چلا تھا چند لمحوں تک وہ اس کی بپھری ہوئی نیلاہٹ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولتا رہا۔ اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی، آنکھیں دیر تک اُدھر دیکھتی رہیں پھر اُس نے کاندھے سکوڑ کر ساحل میں پر بیٹھ کر سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ منتخب کرنے لگا۔ دوسرے لمحہ وہ دھوئیں کے مرغولوں کے درمیان آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔

کھانا نہایت شاندار اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اور شراب بھی خاص نفیس اور پرانی تھی لیکن جنرل زروف کچھ کبیدہ خاطر سا لگ رہا تھا۔ اس کی کبیدگی کی دو وجوہات، پہلی یہ کہ اس کا وفادار ملازم اوان اس شکار میں مارا جا چکا تھا۔ فورڈ کے چاقو نے اس کی جان لی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ آج پہلی بار اپنے "شکار" کو پانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے لائبریری میں بیٹھ کر چند لمحوں تک کتابوں سے دل بہلانے کی کوشش کی۔ پھر کوئی دس بجے وہ اپنے شب خوابی کے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ گیا۔ وہ اس وقت اپنے خیال میں بے حد لذت انگیز سی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں کھڑکی کے راستے آتی ہوئی چاندنی کی ہلکی ہلکی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ کھڑکی کے پاس رکتے ہوئے اس نے جھک کر نیچے کی جانب دیکھا۔ باہر صحن میں کتوں کا غول پہرہ دینے میں حسب معمول مشغول تھا۔ اس نے سیٹی بجا کر کتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"شب بخیر دوستو!"

پھر اس نے روشنی کرنے کے لئے قریب لگے بٹن پر انگلی گڑا دی روشنی کے ساتھ ہی اس نے دیکھا۔ پردوں کے پیچھے چھپا ہوا شخص اب اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور جنرل کا ریوالور اس کے ہاتھوں میں تھا۔

"رینس فورڈ۔ !!!" جنرل تقریباً چیختے ہوئے بولا "میرے خدا! مگر تم یہاں کس طرح پہنچ گئے۔ اور میرا یہ ریوالور تم نے کیسے حاصل کیا"

"زندگی بچانے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے جنرل۔ !"

"رینس فورڈ نے جواب میں کہا۔

جنرل نے اس پر نظریں ڈالتے ہوئے ایک لمبی سانس بھری پھر مسکراتے ہوئے بولا "مبارک ہو۔ میرے دوست۔ آخر تم جیت ہی گئے

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

نوشتہ :
ایچ۔ آر۔ ٹریور

ترجمہ :
اختر ملیح آبادی

- ہٹلر پناہ لینے جرمن چانسلری کے زمین دوز تہہ خانے میں محصور ہو گیا۔
- ہٹلر کے آخری ایام کیسے گزرے؟
- شہر برلن کی تباہی اور روسی ٹینکوں اور توپوں کی گولہ باری کے حیرت انگیز اور سچے واقعات

۲۰۔ اپریل ۱۹۴۵ء کو ہٹلر کی سالگرہ کے دن ڈاکٹر گوئیبلس نازی وزیر پروپیگنڈہ نے برلن ریڈیو سے جرمن قوم کے نام بڑی جذباتی اور جوشیلی تقریر کی اور کہا :

"پوری جرمن قوم کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ آج اپنے فیوہرر پر آنکھ بند کر کے یقین و بھروسہ کرنا چاہئے کیونکہ فیوہرر کے سوا کوئی دوسری شخصیت ہمیں موجودہ درد و کرب مصائب و پریشانی سے نجات نہیں دلا سکتی۔ یہ ہمارا یقین کامل ہے اور ہم بحیثیت ایک قوم آج بھی تن من دھن سے اپنے فیوہرر پر بھروسہ و اعتماد کرتے ہیں جو ہمارے کاروان کو منزل تک سلامتی کے ساتھ پہنچانے کا ہمیں یقین دلاتے ہیں اور ہم اس وعدہ پر کل سے زائد بھرپور انداز میں اعتماد رکھتے ہیں اور پوری قوم کی طرف سے ہم اپنے فیوہرر کو اپنی جانیں بہ نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں — فیوہرر زندہ باد نازی ریش زندہ باد۔ جرمن قوم زندہ باد۔۔۔!"

ڈاکٹر گوئیبلس تقریر کر رہا تھا اور روسی ٹینک ٹکریں مار مار کر شہر برلن کا تیزی سے دفاعی مورچہ توڑ کر اندر گھس رہے تھے اور شہر آگ و خون کا شہر بنتا جا رہا تھا اور برلن کے شہری خوف و ہراس و دہشت سے سہمے جا رہے تھے —!

اس خوف و ہراس و دہشت کی وجہ یہ تھی کہ امریکی حملہ آور فوجیں "ایلبی" تک آ چکی تھیں دوسری طرف روسی ٹینک "وڈر" اور "نیسی" کو برباد کرنے کے بعد "ڈریسڈن" اور برلن کے لئے خطرہ بن چکے تھے۔ شمالی محاذ پر برطانوی فاتح فوجیں "ہیمبرگ" اور "بریمن" کو فتح کرنے کے بعد آگے پیش قدمی کر چکی تھیں جنوبی محاذ پر فرانسیسی افواج "ڈانیوب" کے شمال تک آ چکی تھیں۔ ادھر اٹلی کے محاذ جنگ پر اتحادی جنرل فیلڈ مارشل ایلگزنڈر "بولونا" کو فتح کرنے کے بعد وادی پو میں فاتحانہ افواج کو داخل کر چکا تھا۔ ادھر جنرل "پیٹن" بویریا سے الپس پہاڑ کی طرف رواں دواں تھا — الٹی ہوئی شکستہ بساط کے باوجود ڈاکٹر گوئیبلس ریڈیو سے دھواں دھار تقریر کر رہا تھا اور سیاہ کو سفید کر دکھانے کے لئے پورا زور لگا رہا تھا —!

سالگرہ کے دن ہٹلر برلن میں جرمن چانسلری کے صحن میں پچاس فٹ نیچے اپنے بنکر میں موجود تھا اور تیاری میں معروف تھا کہ برلن سے منتقل ہو کر جنوب میں "اوبر سالزبرگ" میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرے اور جنوبی محاذ کی کمان اپنی نگرانی میں کر سکے۔ اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ جنوب سے جنگ کا تختہ اب بھی پلٹا جا سکتا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ اس نے اپنے اسٹاف کو دس روز قبل "اوبر سالزبرگ" روانہ کر دیا تھا تاکہ اس کی رہائش اور استقبال کی تیاریاں کرلیں۔ لیکن پچھلے ہفتے مسلسل ایسے واقعات پے در پے پیش آتے رہے کہ ہٹلر نے اچانک اپنا

کو تج ملتوی کر دیا اور کنکریٹ تہہ خانے ہی میں محصور رہا۔
ہٹلر کے ساتھ تہہ خانے میں اس کی محبوبہ ایکٹریس "ایوا براؤن"
سکریٹری ذاتی محافظ، باورچی اور خادموں کے علاوہ چند جرنل بھی تہہ خانے
میں موجود تھے جنہوں نے ہٹلر کی طرح برلن سے نہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔
"بورمین" اور اس کا اسٹاف آن بھی نازی پارٹی کے دفتر کے زمین دوز
تہہ خانے میں موجود تھا جہاں ایس ایس گارڈ اور آفیسر اس کے محافظ
تھے۔ اسی طرح چانسلری کے صحن میں ایک تیسرا تہہ خانہ چانسلری کے محافظ
کمانڈر "مونچکو" کا تھا۔ ڈاکٹر گوئیبلس نے وزارت خارجہ کی عمارت کے صحن
کے نیچے اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ ان تمام تہہ خانوں سے جرنل اور آفیسر ہٹلر
کے تہہ خانے میں روزانہ آکر حاضری دیتے اس لئے کہ ہٹلر اپنے تہہ خانے میں
محاذ جنگ کی صورت حال پر روزانہ کانفرنس کرتا اور فیصلے صادر کرتا تھا
یہاں تک کہ فیلڈ مارشل "جوڈل" اور فیلڈ مارشل "کیٹل" اپنے مستقروں سے
ہٹلر کے پاس صلاح و مشورہ کرنے اور احکامات لینے حاضر ہوتے تھے۔

۲۰ اپریل کو جب دونوں فیلڈ مارشل ہٹلر کے تہہ خانے میں داخل
ہوتے تو ان کے ساتھ نیا چیف آف جنرل اسٹاف جنرل "کربس" بھی تھا۔ اس لئے
کہ اب جنرل "گوڈرین" اپنے عہدے سے معزول ہو چکا تھا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۵ء
کو ہٹلر کی شدید ناراضگی غصہ و بحث کے بعد بالآخر جنرل گوڈرین نے اس عذر
کے ساتھ استعفا دے دیا تھا کہ اس کا قلب کمزور رہے اور اس طرح جنرل
گوڈرین نے اپنے آقا ہٹلر کی ضد پوری کی تھی۔ "جنرل ہنس کربس" ماسکو میں
عرصہ تک جرمنی کی جانب سے ملٹری سکریٹری کے عہدہ پر مامور رہ چکا تھا۔
وہ قابل تو تھا لیکن فطری طور پر کمزور آدمی تھا یہی وجہ تھی کہ آخر میں اس نے
اپنے روسی دوستوں کے ہاتھوں میں خود کو سونپ دینا ہی مناسب سمجھا۔

غرضیکہ جرمن چانسلری کے زمین دوز تہہ خانے میں جہاں ہٹلر نے خود
کو محصور کر رکھا تھا وہاں سالگرہ کے دن صبح سے آمد و رفت شروع ہو گئی
آنے والوں میں کچھ تو متوقع تھے اور کچھ غیر متوقع لوگ بھی آئے۔ لیکن اتنی بات
برملا کہی جا سکتی ہے کہ سالگرہ کی مبارکباد دینے والوں کی اکثریت خلوص
سے مبرا تھی۔ وہ محض رسم پوری کرنے آئے تھے۔ پھر بھی آنے والے
اوپری دل ہی سے کیوں نہ آتے ہوں ان کا استقبال ہٹلر کے تہہ خانے میں
جوش و جذبے سے ہوا تھا۔ اور ہر آنے والا یہ دیکھ کر متحیر ہوتے بغیر
الشجاع

نہیں رہتا کہ ہٹلر کی پیشانی پر شکن تک نہ تھی وہ اسی جوش و جذبے کا اظہار
کر رہا تھا جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ ہٹلر کی باتوں سے آنے والوں کو یہ سنکر
تعجب ہوتا تھا کہ روسیوں کو برلن کے قریب شکست سے دوچار ہونا
پڑے گا جیسا جوان کی پوری قومی تاریخ میں مفقود تھی۔!

دوپہر میں ہٹلر کو مبارکباد دینے "ہٹلر یوتھ" کے نوجوانوں کا ایک
وفد آیا۔ اس وفد سے ہٹلر نے تہہ خانے میں نہیں بلکہ تہہ خانے سے باہر نکل کر
چانسلری کے باغیچے میں ملاقات کی۔ اس ملاقات کی خصوصیت یہ تھی کہ ملاقات
کے وقت کوئی گارڈ اور کوئی جاسوس محافظ تک نہ تھا۔ وفد کا لیڈر ایک
جوشیلا نوجوان "آرتھر آکس مان" تھا جس نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ ہٹلر
نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو جوشیلے الفاظ سے سراہا اور کہا:۔ "مجھے تم
نوجوانوں پر ناز ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے عزم و
استقلال کی آڑ لے کر میں برلن میں روسیوں کی قبریں کھود دوں گا۔"

وفد نعرے لگاتا چلا گیا اور ہٹلر چانسلری کے باغیچے سے پھر تہہ خانے
میں آ گیا۔ آتے ہی کانفرنس روم میں جا بیٹھا اور باری باری ملاقات کرنے
لگا۔ سب سے پہلے ہٹلر نے امیر البحر "ڈوئنز" کو بلایا۔ پھر فیلڈ مارشل "کیٹل"
اور آخر میں فیلڈ مارشل "جوڈل" سے ملاقات کی۔ اس کے بعد سارے ملاقاتی
حسب دستور قطار میں کھڑے ہو گئے اور ہٹلر نے کھلی ملاقات کا آغاز کیا۔ وہ
ہر ایک سے ہاتھ ملاتا اور گفتگو کرتا رہا جب فیلڈ مارشل "کیٹل" کے پاس پہنچا
تو ہٹلر نے خوش ہو کر اور بڑے جذبے سے کہا:۔ "میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا
تم نے بروقت سازش میں میری جان بچائی اور تم ہی مجھے راستن برگ سے بحفاظت
نکال لائے تھے۔ تمہارے اقدامات ان اوقات میں انتہائی مخلصانہ اور عاقلانہ
تھے۔" ہٹلر کی سالگرہ کی آخری تقریب میں جو چانسلری کے تہہ خانے میں
ہوئی اوروں کے ساتھ "بورمین"، "ربن ٹراپ" اور "اسپیر" بھی موجود تھے۔

ہٹلر نے اپنے عقیدت مندوں کی مبارکباد قبول کرنے اور ملاقات
کے بعد ہی ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو اس غیر معمولی تاریخی و اہم کانفرنس کا آغاز کیا
جس کا سب کو بری طرح انتظار تھا اور جو تاریخ جرمنی میں نئے باب کا آغاز
کرنے والی تھی۔۔۔ اس کانفرنس کی اہمیت یوں تھی کہ کانفرنس جنگ کی بدلتی
ہوئی اور ڈانوا ڈول صورت حال پر اس پس منظر کے تحت غور و خوض کرنے
والی تھی کہ حملہ آور فوجوں نے جرمن دیش کے جغرافیائی وحدت کو پارہ پارہ

کرنا شروع کر دیا تھا اس وحدت کو کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے کہ شاید چند دنوں میں یا بہت ممکن ہے کہ چند گھنٹوں میں وہ تنگ راستہ بھی منقطع ہو جانے والا تھا جو جنوبی جرمنی کو اب تک مرکز سے ملائے تھا۔ جسے بچانے کے لئے تھکے ہارے جرمن سپاہی پورا زور لگا رہے تھے لیکن اتحادیوں کا دباؤ تھا کہ ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔ ایسی خطرناک حالت میں کانفرنس کو فیصلہ کرنا تھا کہ ہٹلر تہہ خانے کو خیرباد کہہ کر جنوبی جرمنی کا رخ کرے یا نہیں ؟۔

غرض کانفرنس کا آغاز ہوا۔ جرمن جرنلوں نے ہٹلر کو بتایا کہ برلن کو روسی قریب قریب محصور کر چکے ہیں اور چند گھنٹوں بعد کسی کے لئے ممکن نہ ہو سکے گا کہ شہر سے باہر جائے۔ جنوب کا تنگ راستہ جو اب تک کنٹرول میں ہے وہ بھی کسی لمحے ہمیشہ کے لئے بند ہو سکتا ہے لہٰذا سب اس رائے سے متفق تھے کہ فیوہرر کو تہہ خانہ چھوڑ کر جنوبی جرمنی میں "ادبرسالبرگ" پہنچ کر ہیڈ کوارٹر فوراً قائم کرنا چاہئے تاکہ جرمن سلطنت کی بقا کی جنگ جاری رکھی جا سکے۔ لہٰذا گوئرنگ کیٹل، ہملر، بورمین، گوئیبلس، کربس، برگ ڈروف سب ہی نے ہٹلر کو مشورہ دیا کہ گرتے ہوئے شہر برلن میں ایک لمحہ بھی رہنا جنگی مصلحت کے منافی ہے "

درحقیقت یہ فیصلہ جو ہٹلر کے تہہ خانے میں ۲۰ اپریل کو ہوا قطعی اچانک یا نیا نہ تھا اسلئے کہ ۱۰ اپریل کی کانفرنس میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ اتحادی فوجوں کی یلغار سے اگر جرمن سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو جائے۔ تو جنگ جاری رکھنے کی غرض سے دو جدا جدا کمانڈ بنا دی جائیں۔ شمالی جنگی کمانڈ اور جنوبی جنگی کمانڈ۔ ان دونوں کمانڈوں کو آزاد رہ کر جنگی فیصلے کرنے اور اقدام کی پوری آزادی ہو۔ دس دن پہلے ہی شمالی کمانڈ کا سپریم کمانڈر ہٹلر نے امیر البحر "ڈونٹز" کو نامزد کر دیا تھا۔ جنوبی کمانڈ کی نامزدگی ملتوی رکھی تھی اس لئے کہ ہٹلر کا عندیہ از خود تھا کہ وہ کمانڈ اپنے ہاتھ میں لے گا۔ لہٰذا آج کا فیصلہ نیا نہ تھا بلکہ پرانے فیصلے کا اعادہ تھا اور اس کی توثیق تھی یہی وجہ تھی کہ جملہ جرنلوں۔ وزیروں اور جانثاروں نے اپنے فیوہرر کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ تہہ خانہ فوراً چھوڑ دے اور جنوب پہنچ جائے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ہٹلر نے اس کانفرنس میں مکمل خاموشی اختیار کر لی اور شبہ تک نہ ہونے دیا کہ اس نے درخواست قبول کی یا کانفرنس کا فیصلہ رد کیا۔!؟

الشجاع

اختتام کانفرنس کے بعد "بورمین" نے اپنے سکریٹری کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "ایک یا دو دن میں فیوہرر جنوبی جرمنی منتقل ہو جائیں گے" لیکن دوسروں کو اس ردعمل کا یقین نہ تھا۔ اسی لئے ہٹلر کے فضائی ایڈجوڈنٹ "کرنل کو آتو" نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا اور "بورمین" کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہو گیا ہے کہ فیوہرر ترک سکونت نہیں کریں گے"

کانفرنس کے اختتام کے بعد جب شرکاء کانفرنس ہٹلر کے تہہ خانے سے چلے گئے تو اس کے فوراً ہی بعد برلن سے لاریوں ٹرکوں اور ٹھیلا ریلوں کی لمبی قطاریں جنوب میں "ادبرسالبرگ" کی طرف بڑھتی نظر آئیں — عام تخلیہ شروع ہو چکا تھا۔ تخلیہ کنندگان میں "لفٹ ولیف" (جرمن فضائی فوج) کے کمانڈر اور ان کا عملہ بھی تھا اور وہ یہ کہتے ہوئے شہر چھوڑ رہے تھے کہ:۔ "انجام خواہ کچھ بھی ہو لیکن ادبرسالبرگ میں کم از کم فیوہرر کے سلوک ناروا سے تو پیچھا چھوٹ جائے گا۔ توہین و ہتک سے تو محفوظ ہو جائیں گے !؟" ورنہ انھیں یقین تھا کہ وہیں برلن میں رہے تو فیوہرر کی ہسٹریائی چیخ و پکار و مغلظات سننے کے بعد ان کی موت یقینی تھی اسلئے کہ ہر شکست پر ہٹلر جھلا کر دو چار کو فوراً گولی مار دینے کا حکم دیتا تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ فیوہرر مغلوب الغضب ہو کر پوری فضائی کمانڈ کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ اسی خدشہ نے "لفٹ ولیف" کو برلن سے بھگا دیا۔ اسی دن شام کو ہٹلر کے نائب اور جانشین ہرمن گوئرنگ نے فیوہرر سے آخری ملاقات کی اور اپنے مستقر واپس جانے کی اجازت لی۔ ان دونوں کی یہ آخری ملاقات تھی اور یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ ہٹلر اور گوئرنگ کی آخری ملاقات رسمی انداز کی تھی۔ گوئرنگ چلا گیا لیکن اپنے دو سینئر آفیسروں کو فیوہرر کے ہیڈ کوارٹر پر جو اب تہہ خانے میں چھوڑ گیا تھا تاکہ اس کی نمائندگی کریں۔ ان میں سے ایک جنرل "کولر" چیف آف اسٹاف اور دوسرا چیف آف ایکشن جنرل "کرسچین" تھا۔ جنرل "کرسچین" ایک نوجوان اور باعزم آفیسر تھا جس نے چھوٹے عہدے سے دیکھتے دیکھتے اس لئے ترقی کی تھی کیونکہ اس نے فیوہرر کی سکرٹری فرالیو ٹین گرا وڈرنو وسکی سے شادی کی تھی اور ہٹلر کا منظور نظر بن گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اپنی بیوی کی وجہ سے ہٹلر کے گھریلو ماحول میں رچ بس گیا تھا برخلاف اس کے جنرل "کولر" منظور نہ تھا یہی وجہ تھی کہ صبح تا شام ہٹلر اس پر سالار لگایا کرتا وہ توہین و ذلت برداشت کرتا اور جان کی دھمکیاں سنا کرتا تھا۔

برلن سے جانے والوں میں ہٹلر کا سابق وزیر صنعت و حرفت البرٹ اسپیئر بھی تھا۔ جو ۲۰ اپریل کو سالگرہ کی مبارکباد دینے نہیں بلکہ ہٹلر کو اس تباہ کن پالیسی سے ہاتھ کھینچنے اور منع کرنے آیا تھا اس لئے کہ چند ہفتوں پہلے اس پر فیوہرر کے خطرناک اور جرمن قوم کے لئے تباہ کن ارادوں کا انکشاف ہو گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اب وہ دل سے ہٹلر کا وفادار نہیں بلکہ جرمن قوم کا خادم بن چکا تھا۔ اس کی تمنا اور کوشش رہی تھی کہ شکست کے باوجود جرمن قوم کو مزید مشکلات اور درد و کرب سے نجات دلانے کی سعی کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک تقریر تیار کی تھی اور ہیمبرگ ریڈیو میں اسپیر نے اسے خفیہ طور پر ریکارڈ بھی کرا لیا تھا جو اس نے اپنے دوست "کوف مین" کو یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ میاں "وُلف ویر" (زمین دوز چھاپہ مار) اگر اسے قتل کر دیں تب ہٹلر کی موت کے فوراً بعد ہی اس کی تقریر کو نشر کر دیا جائے!

اسی جذبے کے تحت تقریر ریکارڈ کرانے کے چند دن بعد اسپیئر برلن سے مشرقی محاذ جنگ پہنچا وہاں جرمن جرنلوں سے اس نے تبادلہ خیال کیا جو اسپیر کے اس جذبے سے متاثر ہوئے کہ شکست کے بعد کوشش کرنی چاہئے کہ جرمن قوم کی مشکلات کم سے کم رہ جائیں۔ اس وقت اسپیر نے لڑنے والے جرنلوں کو مشورہ دیا کہ جب پسپائی کا وقت آئے تب برلن کا رخ کرنے کے بجائے شمال اور جنوب سے کترا کر نکل جاؤ اور برلن کو آگ و خون میں دلتھاڑ و۔ رہا ہٹلر تو اسپیر نے صاف کہہ دیا کہ اس کی شخصیت کو بچانے کی کوشش مذموم فعل ہوگا۔ ہٹلر کو حالات کے ہاتھوں میں سونپ دینا چاہیئے۔ جرنلوں سے وعدہ لے کر اسپیر ۲۰ اپریل کو ہٹلر سے اس کی سالگرہ کے دن ملنے آیا جیب میں اپنی تقریر کا خلاصہ رکھ کر جس میں باقاعدہ الفاظ "ویر ولف" رضاکاروں اور شہریوں سے کہا گیا تھا کہ:-

"ہمیں پوری مردانگی کے ساتھ اس حقیقت کو جو زندہ ہے اور زندہ رہے گی قبول کر لینا چاہیئے کہ جرمنی جنگ ہار چکا ہے اور یہ کہ پوری سلطنت کو جوں کا توں اتحادیوں کے حوالے کر دینا چاہئے۔ تمام کارخانے۔ پلانٹ۔ پل ریلوے لائن۔ اسپتال۔ عمارتیں۔ یہاں تک کہ جبری کیمپ تک۔ تاکہ سکون کے بعد ہماری املاک ہمارے ہی کام آئیں۔"

جبکہ ڈاکٹر گوئبلیس اور خود ہٹلر کا اعلان تھا کہ:۔ "اگر ہم جنگ

الشجاع

ہار بھی گئے تب بھی ہم سر نہیں جھکائیں گے۔ حملہ آور فاتحوں کو ہم مکان کی ایک اینٹ تک سلامت حوالے نہیں کریں گے بلکہ پورا ملک سوختہ و تباہ شدہ حالت میں خاک و سیاہ انھیں ملے گا۔ یہی حملہ آوروں کو ان کی فتح پر ہماری طرف سے نذرانہ عقیدت ہوگا۔"

اسپیر اس سوختہ سوزی کی بھیانک پالیسی کا شدید مخالف تھا۔ کھسیانے ہو کر خود اپنا منہ مسخ کر دینا نہ بہادری تھی نہ عاقبت اندیشی بلکہ یہ ایک ایسی بھیانک سزا تھی جو ہٹلر بخوشی جرمن قوم کو دینا چاہتا تھا جس کی توقع قوم کے کسی فرد کو نہ تھی۔ اسی غرض سے وہ ۲۰ اپریل کو تہہ خانے آیا تھا۔ رسمی طور پر اس نے ہٹلر کو سالگرہ کی مبارکباد دی۔ اور گوئبلس سے ملاقات کی اور اس امر پر اسے راضی کر لیا کہ برلن اور اس کے اردگرد کے علاقے میں پلوں کی عام تباہی کے جو احکامات صادر ہو چکے ہیں انھیں واپس لیا جائے۔ اس لئے کہ برلن میں قحط پڑ جائے گا اور غذا لانے کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا۔ اسپیر کو خوشی ہوئی جب گوئبلس نے اتفاق کیا اور کہا:۔ "احکامات واپس ہوں گے البتہ برلن کے باہر گرد و نواح کے لئے احکام واپس نہ ہوں گے اور ہم برلن کے باہر لڑتے رہیں گے اور پسپائی پر سوختہ سوزی و طور کا رتوڑ پھوڑ کرتے رہیں گے۔" اسپیر نے گوئبلس سے اتفاق کیا۔ چونکہ آخری منظوری ہٹلر کے ہاتھ میں تھی لہٰذا جنرل کریبس کے ذریعہ اسکیم برائے منظوری ہٹلر تک پہنچائی گئی جسے ہٹلر نے منظور کر لیا اور اپنی رضا دے دی۔

فیوہرر بنکر سے ہٹلر کی سالگرہ کے دن شام کو ایک اور شخصیت بھی رخصت ہوئی۔ جانے والی شخصیت ہملر کی تھی جو بات قدرے دیر سے اپنے مستقر قلعہ "زیتھن" پہنچا تو اپنے ماتحت و معتمد "اسکیلن برگ" کو اپنا منتظر پایا۔ "اسکیلن برگ" عرصے سے ہملر کو اکسا رہا تھا کہ ہٹلر کے بجائے خود اسے عنان حکومت سنبھال کر فوری اور دور رس اقدام کرنا چاہیئے۔ ہٹلر کے لئے "اسکیلن برگ" کا مشورہ یہ تھا کہ اسے یا تو زیر حراست کر لیا جائے یا ہلاک اور اگر ان دونوں اقدام میں ہچکچاہٹ ہو تو ڈاکٹروں کے ذریعہ ہٹلر کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے۔ اس صورت میں مغربی اتحادیوں سے فوراً صلح کر لی جائے۔ لیکن ہملر اس مشورہ کو قبول کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہملر نے جب اپنے ماتحت و معتمد کو قلعہ میں اپنا منتظر پایا

تو چونک پڑا، سمجھ گیا کہ وہ کوئی نئی اسکیم لے کر آیا ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔
"اسکیلن برگ" جبکہ ہملر برلن میں فیوہرر کے تہہ خانے میں ہٹلر کو سالگرہ
کی مبارکباد دے رہا تھا اور سانفرنس میں شرکت کر رہا تھا۔ وہ خود
"ہارڈز والڈے" میں بیٹھا بین الاقوامی یہودی ارگنائزیشن سے یہودیوں
کے مسئلہ پر بات کر رہا تھا۔ وہیں اچانک اسے سوئیڈن کے سفارت خانے
سے فون ہوا اور مطلع کیا گیا کہ کل صبح ساڑھے چھ بجے کاؤنٹ برناڈوڈ
"ہوہنلیچن" پہنچ رہا ہے۔ یہی وہ پیغام تھا جو وہ ہملر کے لئے لایا تھا۔
صبح چھ بجے ہملر اپنے معتمد کے ساتھ منزل کی طرف روانہ ہو گیا
اس بار "اسکیلن برگ" کو پوری امید تھی کہ اس کا باس پوری انفرادیت
کے ساتھ کاؤنٹ برناڈوڈ سے صلحنامہ کے متعلق کھل کر گفتگو کرے گا۔
اور فیوہرر سے خوفزدہ نہ ہوگا اور نہ گزشتہ دو ملاقاتوں کی طرح
خود کو فیوہرر کا نمائندہ تصور کرے گا۔ اس لئے کہ قسمت نے خود سے
یہ موقع فراہم کر دیا ہے اور یقیناً اس کے بعد کوئی دوسرا موقع ہاتھ
نہیں آئے گا۔ لیکن "اسکیلن برگ" کی ساری امیدیں منتشر ہو گئیں
جب ہملر نے صلحنامہ کے بجائے غیر اہم معاملات پر گفتگو کی اور چند
پولش نظر بند عورتوں کی رہائی سے متعلق جو جبری محنت کے کیمپ
میں تھیں رہائی کا وعدہ کیا۔ یہاں تک کہ نظر بند عورتوں کی رہائی کے
انتہائی معمولی وعدہ کے متعلق بھی یہ شرط لگائی کہ اجازت بہرحال
فیوہرر کی آخری ہوگی۔ "اسکیلن برگ" کار میں کاؤنٹ برناڈوڈ کے
ساتھ ہو لیا اور باتیں کرنے لگا۔ تب کاؤنٹ برناڈوڈ نے بتلایا اور
کہا: "ہملر چاہتا ہے کہ میں امریکہ جاؤں اور صدر روزویلٹ سے
گفت و شنید کا دروازہ کھلواؤں۔ لیکن اس وقت تک یہ کیسے ممکن
ہے کہ ہملر خود کو اب بھی ہٹلر کا وفادار اور ماتحت سمجھتا ہے۔۔۔
جب تک یہ صورت حال رہے گی اور ہملر مجھے اپنی ذمہ داری پر زبان
نہ دے گا میں اہم معاملہ کا آغاز کیسے کر سکتا ہوں؟" "اسکیلن برگ"
خاموش تھا۔ کاؤنٹ برناڈوڈ نے لمبے وقفہ کے بعد کہا: "مجھے یقین
تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد ہملر اقدام کرے گا اور اختیارات اپنے ہاتھ
میں لے لے گا۔ لیکن وہ فیوہرر سے خوفزدہ معلوم ہوتا ہے۔۔۔ جب تک
کامل اختیارات نہ ہوں ہملر سے مزید ملاقات بے معنی ہوگی۔۔۔۔!"

کاؤنٹ برناڈوڈ کو رخصت کرنے کے بعد جب "اسکیلن برگ"
ہملر سے ملنے قلعہ "زیتھین" پہنچا تو واقعی اس نے ہملر کو لرزہ براندام
پایا۔ اور جب ہملر نے پوچھا: "کیا میں نے موقع کھو دیا؟" "اسکیلن
برگ" نے اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "میرے آقا! اقدام
کرو۔ فوری اور باعزم کی ضرورت ہے۔ فیوہرر کی وفاداری کا جوا
اتار پھینکو۔ مت بھولو کہ تم ہی جرمنی کے نئے فیوہرر ہو اور وقت تم سے
فوری کام لینا چاہتا ہے۔۔۔!" پھر بھی ہملر نے حسب سابق خاموشی
سے مشورہ سنا اور ہضم بھی کر لیا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔!
برلن سے ہٹلر کے علاوہ اور سب ہی تخلیہ میں معروف تھے۔ اسلئے
کہ ہٹلر نے تہہ خانے ہی میں جوابی حملے کی اسکیم بھی کر لی تھی۔ اسی غرض سے
اس نے ہربٹالین کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے کر تہہ خانے سے احکامات
صادر کرنا شروع کر دیئے تھے اور اپنے آخری مقاصد کی تکمیل کے لئے
ہٹلر نے اقدامات کی ساری ذمہ داری ایس ایس جنرل اسٹینر کو سونپ
دی تھی۔ یہ متوقع حملہ جنوبی محاذ پر ہونے والا تھا اور ہٹلر نے جنرل
اسٹینر کو آگاہ کر دیا تھا کہ آخری اقدام میں ہر سپاہی، ہر ٹینک اور ہر طیارہ
کو جھونک دے ساتھ ہی اس نے کھلی دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ کسی
فرد سے بھی اگر کوئی معمولی فروگزاشت ہوئی تب اس کا سر سلامت نہیں
رہے گا۔
۲۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو ہٹلر نے تہہ خانے سے حملہ کے احکامات صادر
کر دیئے کہ حملہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء کی صبح صادق کو شروع ہو جانا چاہئے۔
لہذا ۲۲ اپریل کو سورج نکلتے نکلتے ہٹلر نے تہہ خانے سے فون شروع
کئے کہ فوری اطلاع دی جائے کہ حملہ کا آغاز ہوا یا نہیں؟ دن چڑھے
ہملر کا فون آیا جس میں کہا گیا تھا کہ: "حملہ فیوہرر کے حکم پر شروع
ہو چکا ہے۔" جبکہ کچھ دیر بعد "لفٹ وفے" ہیڈ کوارٹر سے
ہٹلر کو مطلع کیا گیا کہ حملہ کا آغاز نہیں ہو سکا۔"
ہٹلر تہہ خانے میں اضطراب و بے چینی کے عالم میں مصدقہ خبر کا
انتظار کرتا رہا اور جب تین بجے دن تک کوئی باوثوق خبر نہ مل سکی تب اس
نے سانفرنس کا آغاز کیا۔ اس وقت کانفرنس میں بورمن، برگ ڈروف
فیلڈ مارشل کیٹل، فیلڈ مارشل جوڈل اور جنرل کربس موجود تھے۔

ہٹلر کے دونوں اسٹنٹ جنرل "برگیبل" اور "ہیگن" بھی شریک کانفرنس تھے۔ جبکہ امیرالبحر "ڈونٹز" اس وقت شریک کانفرنس اس لئے نہیں تھا کیونکہ وہ رات ہی اپنے نئے ہیڈ کوارٹر جا چکا تھا اور اس کی نمائندگی۔ امیرالبحر "واس" کے سپرد تھی۔ کانفرنس سے ہٹ کر امیرالبحر "واس" دوسرے ایڈ جوڈنٹ، لائزن آفیسر منتظر بیٹھے تھے تاکہ جوں ہی ان کی طلبی ہو وہ کانفرنس روم پہنچ جائیں۔ جنرل کولر، گورنگ" دونوں نے یہ کہہ کر کانفرنس میں آنے سے پہلو تہی برتی کہ۔ "اپنی رسوائی کرانے کون جائے!؟"

غرضکہ کانفرنس کا آغاز جنرل کربس' اور فیلڈ مارشل "جوڈل" کی رپورٹوں سے ہوا۔ رپورٹیں اگرچہ مخالفانہ تھیں لیکن پھر بھی مایوس کن نہ تھیں۔ ٹھیک اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ہٹلر نے فون خود سنا جو مایوس کن تھا۔ محاذ سے فون آیا تھا اور خبر یہ تھی:۔ جوابی حملہ ہوا لیکن پسپا کر دیا گیا"

ہٹلر پر غنودگی کا دورہ پڑا۔ پھر یکے بعد دیگرے خبروں کا انبار لگ گیا۔ "جوابی حملے میں 'لفٹ ویف' نے مطلق شرکت نہیں کی۔ جنرل اسٹینر کی جانب سے کوئی حکم نہیں ملا۔ فوجوں کو شمال کی طرف پسپا کر دیا گیا تاکہ شمالی کمان کو تقویت ملے ... روسی ٹینک شمال میں مورچہ بندیاں توڑ کر اندر در آئے ہیں... شہر برلن خطرے کے منہ میں آچکا ہے... جانی نقصانات بہت ہوئے ..."

اچانک ہٹلر کی غنودگی کافور ہوئی۔ طوفان سے پہلے والی خاموشی دور ہوتے ہی طوفان آیا اور شدت سے ۔ جس نے تہہ خانے کی ۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء کی اس کانفرنس کو تاریخی موڑ دے دیا۔ ہٹلر غصہ۔ اضطراب اور بے چینی کے عالم میں قریب قریب پاگل ہو کر چلانے اور چیخنے لگا اور اپنے جرنیلوں پر غداری کا کھلا الزام عائد کرنے لگا اور اس وقت پہلی بار ہٹلر کی زبان سے سنا گیا۔ "خاتمہ ہو گیا ۔ انجام آگیا!" کانفرنس میں موت کا سناٹا چھایا تھا اور ہٹلر بری طرح گرج رہا تھا اور کہہ رہا تھا:۔ "میں برلن سے ہرگز نہیں جانے کا۔ جس کو جانا ہو وہ چلا جائے میں اپنے انجام کا یہیں تہہ خانے میں انتظار کروں گا۔"

اس اعلان کا ہونا تھا کہ ہٹلر کے وزراء اور جرنل سب ہی یک بیک چیخ اٹھے۔ ہر فرد احتجاج کرنے لگا۔ سب نے یقین دلایا کہ حالات اگرچہ مخدوش ہونے کے باوجود ناگفتہ بہ نہیں۔ مایوسی اور ضد کی ضرورت نہیں۔ اٹلی میں فیلڈ مارشل لیکرنگ کے پاس کافی طاقت ہے جو فیوہرر کو مل سکتی ہے۔ لہذا ہٹلر کو فوراً جنوبی جرمنی جا کر "ابرسالزبرگ" میں ہیڈ کوارٹر قائم کرنا اور جنگ جاری رکھنا چاہئے۔ لیکن ہٹلر نے سنی ان سنی کر دی اور حکم دیا کہ ریڈیو سے خبر نشر کر دی جائے کہ فیوہرر برلن ہی میں رہ کر شہر کا دفاع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اگرچہ کانفرنس ختم ہو چکی تھی اور شرکائے کانفرنس مایوس و بددل گئے تھے لیکن طوفان کے بعد کے جھونکے ابھی ہٹلر کے کمرے میں چل رہے تھے۔ اس لئے کہ ہٹلر نے گوئبلس۔ اس کی بیوی اور بچوں کو تہہ خانے طلب کر لیا تھا۔ ہٹلر کی طرح گوئبلس نے بھی برلن سے نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ لہذا ہٹلر اور گوئبلس مشورہ کر رہے تھے اور اس وقت دونوں نے طے کیا کہ خطرے کے وقت کیا اقدام مناسب رہے گا۔ گوئبلس کی بیوی نے زہر کھا کر شوہر کے ساتھ مرنے کا عہد کیا اور بچوں کے لئے یہی راستہ منتخب کیا گیا۔ تب ہٹلر نے اپنے ایڈ جوڈنٹ کو کاغذات کے ساتھ آنے کی اجازت دی۔ ہٹلر نے کاغذات چھانٹے اور ایڈ جوڈنٹ "جولیس سشاب" انہیں ہٹلر کے حکم سے چانسلری کے باغیچہ میں لے جا کر نذر آتش کر آیا۔

کاغذات تلف کرانے کے بعد ہٹلر نے فیلڈ مارشل کیٹل" اور "جوڈل" کو طلب کیا اور دونوں کو حکم دیا کہ وہ محاذوں پر پہنچ جائیں۔ ہٹلر کے پرائیوٹ میں ان دونوں نے پھر کوشش کی کہ ہٹلر تہہ خانہ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے اور جنوب کی طرف کوچ کرے۔ ان دونوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ برلن پر برطانوی و امریکی قبضہ کرا دیا جائے بجائے اس کے کہ روسی قابض ہوں۔ لیکن ہٹلر برابر انکار کرتا رہا اور کہا:۔ "باب ختم ہو چکا ہے اب نئے باب کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا... میں یہیں تہہ خانے میں اپنے خاتمہ کا انتظار کروں گا... خود کو زندہ یا مردہ اتحادیوں کے ہاتھوں میں نہیں جانے دوں گا... اگر اتحادیوں سے صلح کی گفتگو ضروری ہے تب یہ کام میرے جانشین گورنگ مجھ سے بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے... !"۔ اس فیصلہ کے ساتھ ہی ہٹلر نے 'بورمین' کو حکم دیا کہ وہ فوراً فیوہرر بنکر کا کمرہ خالی کر دے اور فوراً تہہ خانے سے چلا جائے کیوں؟ اس سوال کا جواب کسی کو نہ مل سکا۔ !

(باقی صفحہ ۹۷ پر)

رؤف خیر

آنچل

الٹ رہا تھا پرانی کتاب کے اوراق
کہ اپنی سمت مجھے اک ورق نے کھینچ لیا
بہت ہی غور سے میں دیکھتا رہا جس کو
بڑا حسین تخیل تھا اک مصوّر کا

میں محوِ حسن تھا اور انگلیاں چھُوتی تھیں
خطوطِ جسم — کہ طالب تھے گدگداہٹ کے
نظر کہ مانگ رہی تھی نشانہائے نظیر
لبوں کے جام کہ پیاسے لبوں کے طالب تھے

یہ شاہکار تو تھا لیکن اس کا اک پہلو
مرے مذاقِ نظر پر کبھی قدر تھا گراں
مجھے لگا کہ ہے محتاج ایک آنچل کا
گلابی جسم کا مغرور سینۂ عریاں

مرا خیال صبا نے بھی جیسے بھانپ لیا
الٹ گیا اسی لمحہ کتاب کا صفحہ

قیصر

اے شہر

اے شہر! تیرے قہر سے، تنہائیوں کے زہر سے
کوئی مسافر ہے — حزیں
جس کی شکستہ ہے جبیں
جس کو سکوں ملتا نہیں رہتا ہے جو اندوہگیں
جلتا ہے تیری راہ میں مشعل نما جس کا یقیں

شانوں پہ اپنی لاش ہے اور دل ہے مصروفِ فغاں
جلتا ہوں اور خاموش ہوں مانندِ خورشیدِ تپاں
نیچے جھلستی ریت ہے اوپر دہکتا آسماں

ہر موڑ پہ آزار ہے، ہر راہ رنگِ درد ہے
پیکر پہ غم کا میل ہے چہرہ دکھوں سے زرد ہے
سائے سے بھی لپٹی ہوئی کچھ الجھنوں کی گرد ہے

نوحے فضائیں رچ گئے اک گونج سی ہے چارسو
دوشیزۂ فرقت اٹھی لیکن ہے غوغا در گلو
ایسا نہیں کوئی یہاں کر دے جو زخموں کو رفو

رفعت سروش

○

نہ ذکرِ بادہ کروں اور نہ فکرِ جام کروں
کسی کی یاد میں اشکوں کا اہتمام کروں

کہوں تو کس سے کہوں دل پہ کیا گزرتی ہے
کروں تو کس سے میں تیرے سوا کلام کروں

جلاؤں پلکوں پہ اب انتظار کی شمعیں
اندھیرا گھر ہے، چراغوں کا اہتمام کروں

اِدھر ہیں دیر و حرم اُس طرف ہے میخانہ
کدھر ہے منزلِ آدم کہاں قیام کروں

کسی کی یاد کے آنسو کسی کے ذکر کے پھول
غزل تو ہو گئی منسوب کس کے نام کروں

سروش میری نظر میں اک اور عالم ہے
نگاہِ شوق کو کیوں وقفِ صبح و شام کروں

منظر ایوبی

○

راہِ بت خانہ بُری ہے نہ حرم اچھے ہیں
دنیا اچھی ہے اگر دوست تو ہم اچھے ہیں

تجھ سے مل کر یہی محسوس ہوا ہے اکثر
تیرے احسان سے غیروں کے ستم اچھے ہیں

ہم نے دیکھا ہی نہیں طوق و سلاسل کے سوا
لوگ کہتے ہیں تری زلف کے خم اچھے ہیں

خدشۂ راہزنی اور نہ اندیشۂ سنگ
شیش محلوں سے تو مٹی کے حرم اچھے ہیں

پھرتے ہیں آج بھی ہم مثلِ صبا آوارہ
کیسے مانیں کہ ترے نقشِ قدم اچھے ہیں

نالۂ نیم شبی ہے نہ کہیں نغمۂ صبح
ہم سے اِس دور میں پتھر کے صنم اچھے ہیں

آپ کی ذات سے وابستہ ہیں جذبات ان کے
آپ اچھے ہیں تو اربابِ قلم اچھے ہیں

ہم جو ہنس ہنس کے اڑاتے ہیں ہر اک غم کا مذاق
دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے ہیں

کاش دیکھیں وہ کبھی ڈوبتے دل کا منظر
جن کے نزدیک ترے لطف و کرم اچھے ہیں

حمیدالناس

○

گھٹتی ہے عمر بڑھتے ہیں پر کاروبارِ زیست
دلچسپ کس قدر ہے غمِ روزگارِ زیست

جو کچھ بھی ہو سکا وہ کیا ہم نے عمر بھر
اس خوف سے کہ ہے نہ کوئی شرمسارِ زیست

ہر شخص اپنے آپ سے ڈرتا ہے ان دنوں
لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے اک غمگسارِ زیست

صبحِ ازل سے گم ہیں گرفتِ نشاط میں
ملتا نہیں ہے سلسلۂ شاخسارِ زیست

پھولوں کی شکل ہو کہ لہو کی لکیر ہو
ہر رنگ میں رہے گی مگر یادگارِ زیست

چمکی نہ پھر کبھی کے تعاقب کی آرزو
تھا اک سے اک حسین سرِ رہگزارِ زیست

ہر دل میں ہم نے جھانک کے دیکھا ہے بارہا
الماس سا ملا نہ کوئی بے قرارِ زیست

الطاف شاہین

○

اک سکوتِ سخن آفریں کو یہ کیوں، محرمانِ سخن کی نظر لگ گئی
شمع روشن ہوئی انجمن کے لئے، شمع کو انجمن کی نظر لگ گئی

شام تاریک میں بادۂ غم پیئے، اپنے اشکوں سے خود ہی جلا دیئے
پوچھتے ہو اندھیروں سے اب کس لئے، چاند کو کس کرن کی نظر لگ گئی

رہرو، رہبر و اب صدائے جرس، بند ہے کس لئے مثلِ بابِ قفس
راہ چلتے ہوئے خود رکا کارواں، یا کسی راہزن کی نظر لگ گئی

یہ خلوص و صداقت کی زندہ کسک، جیسی اب ہے کبھی ایسی پہلے نہ تھی
فن کا معیار اتنا حسیں ہو گیا، فن کو اربابِ فن کی نظر لگ گئی

کیا سناؤں تمہیں داستانِ محن، کیا کہوں کیا ہوا پھول کا بانکپن
دستِ گلچیں سے گل کو بچایا مگر، پاسبانِ چمن کی نظر لگ گئی

کیا بتائیں تمہیں کس لئے دوستو، شاہدِ نغمہ گر آج خاموش ہے
کچھ تو اپنی طبیعت سے مجبور تھا، کچھ اسے اہلِ فن کی نظر لگ گئی

متین سروش

○

رقصِ انوارِ مسرت کوئی ہم سے پوچھے
جشنِ آغازِ محبت کوئی ہم سے پوچھے

ہم سے وابستہ ہے گل رنگیٔ صہبائے حیات
نو بہارِ غمِ الفت کوئی ہم سے پوچھے

زندگی بن گئی خود ایک شرابِ رنگیں
چشمِ ساقی کی عنایت کوئی ہم سے پوچھے

جس پہ طاری تھا مرے قلب کی دھڑکن کا فسوں
اُس خموشی کی قیامت کوئی ہم سے پوچھے

ہو گئی جس سے منوّر شبِ تاریکِ حیات
وہ ترے قرب کی ساعت کوئی ہم سے پوچھے

ہم رہے شانہ کشِ زلفِ بہاراں ہر دم
چارہ فرمائیٔ وحشت کوئی ہم سے پوچھے

شعلۂ برق کو دلدار بنایا ہم نے
زندگانی کی حلاوت کوئی ہم سے پوچھے

جس نے یہ زہر پیا ہی نہیں وہ کیا جانے
تلخیٔ زیست کی لذت کوئی ہم سے پوچھے

دل کو ہر وار پہ اک حوصلۂ تازہ ملا
سعیٔ دشمن کی عنایت کوئی ہم سے پوچھے

حزیں لدھیانوی

○

بپا نہیں ہیں سرِ کوئے یار ہنگامے
اُٹھے ہیں آج سرِ رہگذار ہنگامے

جبینِ ناز کی افشاں کا حشر کیا ہوگا
ہر ایک ذرّے میں ہیں بے قرار ہنگامے

صدائے غنچہ، فغانِ ہزار، نالۂ دل
جلو میں لائی ہے کتنے بہار ہنگامے

سکوں ملے تو دو گیسو کے سائے میں کیونکر
بپا ہیں ہم نفسو زیرِ دار ہنگامے

رواں دواں ہی رہا کاروانِ گشتہ سراں
قدم قدم پہ اٹھے بے شمار ہنگامے

حزیں یہ کونسی وادی میں خیمہ زن ہے حیات
اندھیری رات، بلائیں، غبار، ہنگامے

خمار انصاری

○

یہ واردات صرف مرا واقعہ نہیں
زہراب دردِ عشق ہیں کس نے پیا نہیں

بربادیاں ہمیں کو مزا جا رہیں عزیز
اپنی تباہیوں کا کسی سے گلہ نہیں

ہم نے فراقِ دوست کی گھڑیاں گذار دیں
اس مرحلہ کے بعد کوئی مرحلہ نہیں

یہ آپ کا ہے حکم تو اچھا یونہی سہی
ترکِ تعلقات مرا مدعا نہیں

تھوڑے سے حوصلہ کی ضرورت ہے نا صحو
منزل کا کچھ یہاں سے بڑا فاصلہ نہیں

یہ شہرِ زندگی ہے کہ صحرائے مرگ ہے
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

میرے چمن میں نرمیٔ موجِ صبا نہ ڈھونڈھ
میرے چمن میں نرمیٔ موجِ صبا نہیں

اتنی سی بات اپنی خطا بن گئی خمار
جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ ہم نے کیا نہیں

صائمہ خیری

تم سے کہا تھا کیا کیا اس نے پھر دہراؤ اے لوگو
جرم کیا ہے خوش ہونے کا ہم کو رلاؤ اے لوگو

سینے میں تم تھم کے جیسے خار سے لگتے جاتے ہیں
آج بہت زخمی ہیں دیکھو اس کو بلاؤ اے لوگو

مانا کہ وہ دور بہت ہیں مانا وہ اپنے بھی نہیں
خواب سلامت اپنے جھوٹی آس دلاؤ اے لوگو

صحرا ان پلکوں پہ آخر کس نے سجائے تم کو کیا
یہ تو ہے رسم پرانی تم بھی نبھاؤ اے لوگو

اس بستی کے تیشہ تمہاری تاک میں پل پل رہتے ہیں
چھپ جاؤ، دروازہ بھیڑو، خود کو بچاؤ اے لوگو

[illegible] امروی

فسوں طاری نہ ہوتا زندگی کا
بھرم کھلتا ہماری بندگی کا

بڑی تاثیر تھی رسم کہن میں
بڑا رتبہ بڑھایا آدمی کا

نہ تھا اسلاف کا دورِ جہالت
یہ دور اپنا ہے علم و آگہی کا

کوئی صورت نہ تھی جب دوستی کی
سبب کوئی تو ہوتا دشمنی کا

ترے غم میں بھلا کب راس آیا
میسر تھا بھی جو لمحہ خوشی کا

سدا لگتے رہے گو دل پہ چرکے
بھرا کرتے رہے دم دوستی کا

زمانہ ہو گیا سیر ہوا کو
کوئی موقعہ ہو ساقی مے کشی کا

مظفر کیا ہوئی نخوت پرستی
بڑا نشہ تھا حضرت کو خودی کا

رحمٰن جامی

شکستِ خواب

کوچہ شوق میں آوارہ تمنائیں تھیں
اور کب سے درِ مقصود تھا بند
دیر تک دل مرا زنجیر ہلاتا ہی رہا
اور پھر دے کے صدا
منتظر تھا کہ کھلے گا وہ دریچہ جس سے
جھانک کر کوئی مجھے دیکھے گا
اور پہچان کے پھر مجھ کو بلالے گا قریب

اس نے آواز سنی
اور درِ مقصود کھلا
اور پھر پھیل گئی ایک مسرت کی ضیاء
دیپ جلتا رہا ارمانوں کا
یوں ہی روشن رہا امید کا کمرہ کچھ دیر

پھر یکایک کوئی در آیا اسی کمرے میں
اجنبی سایہ، اجالے کا رقیب
بجھ گیا دیپ تو میں تنہا تھا
اس اندھیرے میں پھر اب میری تمناؤں کا دم گھٹتا ہے

یوسف عثمانی

آسودگی ذہن جو پاتا رہا ہوں میں
ہر کذب کو بھی صدق بناتا رہا ہوں میں

دل کی تمام رات عجب کیفیت رہی
لکھ لکھ کے ایک نام مٹاتا رہا ہوں میں

اے دوست مدتوں ترے عکسِ جمیل کو
کمرے میں زاویوں سے سجاتا رہا ہوں میں

تم کیوں مرے فریب سے برہم ہو اس قدر
تم کو وہی دیا ہے جو پاتا رہا ہوں میں

اک پیکرِ جمیل کی قربت کے واسطے
پرچھائیوں سے ربط بڑھاتا رہا ہوں میں

بے روح نیکیوں کی تہوں میں حقیقتاً
اپنے بڑے گناہ چھپاتا رہا ہوں میں

نئی نسل اور پرانے نقاد

ہر عہد کے نقّادوں نے اپنی نئی نسل کی نئی آواز کو پہچاننے سے انکار کیا ہے

اُردو ادب میں سرسید تحریک کے بعد اگر کسی تحریک کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ترقی پسند تحریک تھی۔ جو بیک وقت سیاسی اور ادبی تحریک تھی۔ جس نے ہندوستان کی آزادی کے لئے اہلِ ہند کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کرکے جدوجہد کی۔ کسانوں اور ملوں میں کام کرنے والے مفلوک الحال مزدوروں کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے چنگل سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کی۔ وہیں ادب کو طبقۂ خواص سے نکال کر عام انسانی زندگی کا ترجمان بنایا۔ عام زندگی میں سر ابھارتے ہوئے مسائل، حالات اور ان کے حل کا ذریعہ قرار دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ادب کے موجودہ اور فرسودہ اصولوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ زندگی کے جمود کو توڑ کر اپنی شدّت زائی سے تھرتھراہٹ پیدا کی۔ معاشرے کے کھوکھلے پن، چند دولت مند اور صاحبِ اقتدار لوگوں کی اکثریت پر بھرپور وار کیا۔

ہر تحریک اپنے ابتدائی دور میں شدید ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ چلنے والے جذباتی اور انتہا پسند ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ترقی پسند تحریک اور اس کے علمبرداروں کے ساتھ تھا۔ اس کی نمایاں مثال انگارے [illegible]

ہے۔ جس میں لکھنے والوں نے ماضی کی عظیم اقدار و روایات، تہذیب و معاشرت کو پسِ پشت ڈال کر بھوک، افلاس، ناداری اور جنس جیسے مسائل پر بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ قلم اٹھایا۔ اور جس سے پرانی نسل بوکھلا اٹھی۔ یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے جذباتیت کی رو میں بہہ کر عقائد و مذہب پر بھی ضرب وار کرکے لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑا بلکہ رسم و رواج پر بھی پھبتیاں کس کر احساسات و جذبات کو مجروح کیا۔

اس انتہا پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند حضرات ادب میں کوئی توازن پیدا نہیں کر سکے۔ یہ بھی کہتے رہے کہ ہمارا تعلق قدیم ادب سے بھی ہے ساتھ ہی صحت مند روایات کا اثبات ہماری روایت ہے لیکن عملی طور پر وہ رفتہ رفتہ قدیم ادبی اقدار سے اپنا رشتہ منقطع کرتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب کہ قاری کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ قدیم اور ترقی پسند ادب کے درمیان ایک ایسی نفرت و تضادات کی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ جس کو پاٹنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

یہ مسائل دراصل نئی اور پرانی نسل کے مابین جھگڑوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ان جھگڑوں کی غرض و غایت اور حل ہی ہمارے

> **بچہ اپنی آواز سے**
> سب سے پہلے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن اس آواز کو شخصیت اور کردار میں ڈھالنے والی ذمہ داریاں اس کی اپنی نہیں بلکہ یہ اس کے ذمہ داروں کی ہوتی ہیں —— بالکل اسی طرح
> **ہر نسل کے لئے**
> یہ ضروری ہے کہ جب کوئی نئی آواز ابھرے تو اس کو حقیقت اور صداقت تسلیم کرنے والے موجود ہوں اور وہی اس کو شخصیت اور کردار عطا کر سکتے ہیں۔

سوال کا جواب ہے۔ پرانی نسل اپنے بچپن سے لے کر نوجوانی اور جوانی کے ہنگامہ خیز مراحل طے کرنے کے بعد جب بڑھاپے کے دور میں قدم رکھتی ہے تو اس کے جذبات میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے آرام و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں محدود سے محدود تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس دور میں یہ نسل اس قابل نہیں رہتی کہ وہ زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ اور سماجی ڈھانچہ کی نوعیت سمجھ سکے۔ نئی نسل کے ثقافتی مسائل، حالات اور فکری نظام پرانی نسل کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے پرانی نسل اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نئی نسل کے حالات و مسائل اور ذہنی تغیروں سے آنکھیں بند کر کے ان پر طرح طرح سے دشنام طرازی شروع کر دیتی ہے۔ اُن کے کارناموں میں عیب نکالنا اور ناک بھوں چڑھانا، لغو اور بے معنی بتانا اپنا ایمان سمجھتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان میں نئی نسل کا سا جوش و خروش، ولولہ، حوصلہ، محنت و جانفشانی اور ذوق و شوق سے کام کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ اپنی اس پسپائی کم مائیگی اور شکست خوردہ ذہنیت کو چھپانے کے لئے بغض و عناد سے کام لیتی ہے۔ نئی نسل کی طرح طرح سے دل آزاری کر کے خوش ہوتی ہے۔ پرانی نسل کا نئی نسل کے ساتھ یہ رویّہ فاصلوں کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیتا ہے۔ اگر پرانی نسل اپنی نئی نسل کی صلاحیتوں کو سراہنے کی اہلیت نہیں رکھتی تو اسے اسی کے حال پر چھوڑ دے۔ اگر حوصلہ افزائی نہیں کر سکتی تو دشنام طرازی بھی نہ کرے۔ لیکن ایسا کرنا پرانی نسل اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے۔ دراصل پرانی نسل حقائق کو سنجیدگی سے سمجھنے کے بجائے آنکھیں چرا کر بوسیدہ لبادوں میں اپنے آپ کو چھپائے رکھنا چاہتی ہے تاکہ اس کا بھرم قائم رہ سکے۔ پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے کہ ہر پرانا نظام اپنی صحت مند روایتیں اور قدریں نئے نظام کو سونپ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے ہر پرانی نسل نئی نسل کو اپنا اثاثہ بطور امانت حوالے کر دیتی ہے۔ ان حقائق سے گریز کرنا اصولِ فطرت کے عین منافی ہے۔

یہ دراصل برصغیر کے ان پڑھے لکھے نوجوانوں کی تحریک تھی جو مغربی و مشرقی علوم سے بھی واقف تھی اور ابھرتے ہوئے عالمی سیاسی رجحانات سے بھی۔ جس وقت برصغیر میں یہ تحریک شروع ہوئی اور اس کے اغراض و مقاصد سامنے آئے تو نہ صرف نوجوانوں نے اسے خوش آمدید کہا بلکہ ہماری پرانی نسل کے سربراہ وہ شخصیتوں مثلاً حسرت موہانی پریم چند، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی اور دوسرے حضرات نے بھی اس کے جلسوں میں شرکت کرنا اپنا فرض سمجھا۔ ان جلسوں میں شریک ہو کر اپنی نئی نسل کی صلاحیتوں کو سراہا ان کے احساسات و جذبات، فکر و شعور، حوصلوں، جراءت مندانہ اقدام، بے باکی اور زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کی تعریف کی۔ کیونکہ یہ نسل اپنے ساتھ ایک نئے فکری نظام کو لے کر ابھر رہی تھی۔ نئے رجحانات اور مسائل کو عوام سے روشناس کرا رہی تھی اس نسل نے اپنے عہد کے جبر و قہر، سماج کے کھوکھلے پن اور رجعت پسندی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جس طرح انقلابی نعرہ لگایا اپنے نظریات کے پرچار کے لئے جس جذباتیت اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا اس سے برصغیر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ گوشہ گوشہ میں انقلابی نعرے گونجنے لگے۔ لیکن ترقی پسند یہ بھول گئے کہ اس برصغیر کے لوگ چاہے کتنے ہی ترقی پسند ہو جائیں، تہذیب و ثقافت روایات و اقدار سے بیزار ہو جائیں لیکن اپنے عقائد اور قومی ثقافتی رسم و رواج سے اپنا ناطہ نہیں توڑ سکتے۔ کیونکہ خمیر اس سرزمین سے اٹھا ہے۔ جو عقائد، مذاہب و تمدن کا گہوارہ رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند تحریک اپنے اشتراکی نظریات کے پرچار کی وجہ سے اپنی مقبولیت کھوتی چلی گئی۔ بہ ۱۹۴۲ء تک یہ اپنے شباب پر رہی لیکن اس کے بعد اس کا جوش و خروش اور نعرہ بازی رفتہ رفتہ مدھم ہونے لگی۔ آپس میں نفاق پیدا ہوا راشد، میراجی اور احمد علی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور یہ تحریک خود بخود کمزور ہوتی چلی گئی۔

اس تحریک کی ناکامی میں جہاں اس کے علمبرداروں کی تنگ نظری اور ان کی عصبیت کا ہاتھ تھا۔ وہیں برصغیر کی تحریک آزادی نے لوگوں کو اپنی طرف کچھ اس طرح متوجہ کیا کہ ترقی پسند تحریک کے

ترقی پسند تحریک خاص کر مغرب سے بہت زیادہ متاثر تھی۔

الشہاب

اشتراکی نظریہ کو فائدہ پہنچنے کے بجائے بڑا نقصان پہونچا

دوسری وجہ یہ تھی کہ تحریک ادبی سے زیادہ سیاسی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس تحریک کا بھی وہی حشر ہوا جو ایک سیاسی تحریک کا ہوتا ہے پھر تقسیم کے بعد اس کا رہا سہا نعرہ بھی ٹوٹ گیا۔

ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تحریک میں جہاں شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار اور صحافی تھے وہیں نقادوں کا بھی ایک گروہ شامل تھا۔ اس تحریک کے ادباء و شعراء نے اپنی تخلیقات کی بنیاد جس چیز پر رکھی تھی وہ دراصل انسانی زندگی تھی۔ جس میں پھیلا ہوا کرب، ابتری دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، ناانصافیوں اور بے راہ روی تھی۔ بالفاظِ دیگر ترقی پسندوں نے عظمتِ آدم کے گیت گائے تمام تر سچائیوں اور حقائق کے ساتھ اپنی زندگی کو پیش کیا۔ جس میں فن بھی تھا اور خلوص بھی، صداقت بھی تھی اور مستقبل کی نشاندہی بھی۔ ترقی پسند نقادوں نے ان کی تخلیقات کی فنی عظمت ان کی بصیرت، خلوص و صداقت، فکر و شعور اور رجحانات کو بڑے سلیقے اور موثر انداز میں نہ صرف متعارف بلکہ ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرایا۔ ان نقادوں میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم مجنوں گورکھپوری، احمد علی، آلِ احمد سرور، فراق گورکھپوری، احتشام حسین، محمد حسن عسکری، اختر رائے پوری، حیات اللہ انصاری ممتاز حسین اور مجتبیٰ حسین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کا فکری محور طبقاتی کشمکش، سیاسی و سماجی اور اشتراکی نظریہ تھا۔ انہی دائروں میں رہ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے ہر تخلیق کو انہی اصولوں پر پرکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ جن سے باہر نکلنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ ان اصولوں پر صرف انھیں ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پوری اتر سکتی تھیں جو اس تحریک میں شامل تھے۔ محمد حسین عسکری ترقی پسند ضرور تھے لیکن کسی نظریہ کا شکار نہیں تھے۔ ان کی تنقید کا محور اشتراکی نظریہ نہیں تھا۔ اور نہ انہوں نے ادبی تخلیقات کو اس کسوٹی پر پرکھا بلکہ اس پرکھ میں فطرتِ انسانی احساسات و جذبات اور ذہنی رویہ کو پیشِ نظر رکھا۔ حسن عسکری

اشتراکی ادبی...

کے علاوہ بقیہ نقادوں نے ترقی پسند فنکاروں کو جس قدر بھی سراہا اور غیر ترقی پسند ادبا و شعراء جو بغیر کسی تحریک میں شامل ہوئے خلوص اور سنجیدگی سے ادب تخلیق کر رہے تھے اُن پر رجعت پسندی کا لیبل لگا کر اپنا مخالف بنا لیا۔ اس تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک میں شامل افراد نے معیاری، غیر معیاری اور ہر قسم کا جیسا بھی ادب پیش کیا نقادوں نے اس کو حقیقت میں نظر سے پرکھے بغیر اعلیٰ و معیاری ادب قرار دیا۔ جس سے ادب غیر معیاری صحافتی اور پروپیگنڈہ قسم کا ہو کر رہ گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر کی دو بڑی قوموں نے اپنی زندگی کا ازسرِ نو آغاز کیا۔ دونوں کے سامنے نئے مسائل اور رجحانات تھے۔ نقل آبادی کی وجہ سے زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں ہجرت کا دکھ، تہذیب و تمدن کی پامالی، معاشی بحران اور اجنبیت کا احساس پیدا ہوا۔ معاشی شکنجے میں پھنس کر بہت سے ترقی پسندوں نے حالات سے مصالحت کر لی کیونکہ حصولِ معاش کی خاطر انھیں نہ صرف شہر شہر کی خاک چھاننا پڑی بلکہ پھانکنا بھی پڑی۔ خاندان کی پرورش کی ذمہ داریوں، حالات کی بے رحمی نے انھیں اس قدر تھکا دیا کہ وہ جذباتیت اور انتہا پسندی اور ترقی پسندی کو بھول گئے بعض نے لکھنا ترک کر دیا۔ کچھ حضرات نے اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے سرکاری ملازمت حاصل کر لی۔ دوسری طرف حکومت نے اس تحریک پر پابندیاں عائد کر دیں۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر ہم بآسانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تحریک ختم ہو گئی۔

تقسیم کے بعد ایک اور نئی نسل ابھری جس کی تربیت پرورش کسی نہ کسی طرح تقسیم سے پہلے کے ماحول میں ہوئی تھی اس کے کان ترقی پسندوں کے نعروں سے آشنا تھے لیکن ترقی پسندوں کے رویئے تعصب اور تنگ نظری سے دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنی راہیں خود متعین کر لیں۔ اس نسل میں عزیز حامد مدنی، قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی، ناصر کاظمی، انتظار حسین، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، الیاس عشقی، اے حمید، خلیل احمد، سرشار صدیقی، مصطفیٰ زیدی، سلیم احمد، انجم اعظمی، خالد علیگ اور دوسرے شامل ہیں۔ ان لوگوں نے جو کچھ تخلیق کیا۔ اس پر ترقی پسندی کی چھاپ ضرور نظر

آتی ہے۔ لیکن اس میں جو کرب، احساسات و جذبات، بے چینی ہے ان کی اپنی ہے اور ماحول کی ہے۔ جس نے ان کو انفرادی شان عطا کی ہے۔ مگر ان لوگوں کی تخلیقات کو روشناس کرانے کے لئے ترقی پسند نقادوں نے کچھ نہیں لکھا، کسی بات کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن ان کی تخلیقات میں جو خلوص اور صداقتیں تھیں محرومیاں تھیں اور آرزوؤں کا خون شامل تھا۔ انہی کی بدولت وہ خود بخود متعارف ہو گئے اور ہر شخص یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔ "احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا" اس نسل کا جو غم ہے۔ اگر اس کے پس منظر میں زمانے کی چیرہ دستیاں ناانصافیاں مفاد پرستی، رشوت خوری، سفارشات بے روزگاری، منافقات اور تعصب جیسے گھناؤنے عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جب یہی عوامل تخلیقات کے محرک ثابت ہوں تو ذاتی غم سماجی غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اس نسل کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی فنی کاوشوں اور صلاحیتوں کے ذریعہ اپنے آپ کو تسلیم کرا لیا ترقی پسندوں کی طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت یہ نسل نقادوں کا گروہ اپنے ساتھ لے کر نہیں چلی بلکہ اپنی تخلیقات کی حقیقی چمک دمک گہرائی اور ہمہ گیری کی وجہ سے مختلف الخیال نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا عسکری صاحب کے علاوہ کسی نے بھی ان کی صلاحیتوں کو اجاگر نہیں کیا اور نہ ان کو روشناس کرانے کی زحمت گوارا کی۔ کراچی میں عسکری صاحب نے بے باکانہ اور پرخلوص انداز میں جمیل الدین عالی، ناصر کاظمی اور سلیم احمد پر مضامین لکھے ان کے فکری رجحان کو سراہا۔ لاہور میں عبادت بریلوی اور انتظار حسین نے بھی مضامین لکھے۔ حالانکہ ممتاز حسین اور محمد حسن عسکری جیسے اور دوسرے ترقی پسند نقاد بھی موجود تھے۔ لیکن ان نقادوں نے اپنے اپنے نظریاتی خولوں سے باہر نکلنا گوارا نہ کیا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اب تک جو تخلیقات معرض وجود میں آئیں یا تو وہ بے مقصد تھیں کم معیاری تھیں یا انھیں ادب نہیں کہا جا سکتا یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہمارے بزرگ ترقی پسند نقاد اس نئی نسل کے مسائل اور ان کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ ان کے ذہنی استجماع

رویئے اور رجحانات سے جان بوجھ کر آنکھیں چرا رہے ہیں۔ یا ان کے ذہنی سوتے بالکل خشک ہو گئے ہیں۔ یا پھر احساس جمال مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔

جہاں تک اس نئی نسل کا تعلق ہے۔ اس سے مراد وہ نسل ہے۔ جس نے ۱۹۵۲-۵۳ء سے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی اس کے گردوپیش نت نئے مسائل، اضطراب و بے چینی کا عالم تھا اس کے سامنے سیاسی و اشتراکی نظریہ کے بجائے اپنا ماحول اور سماج نئی زندگی رہی۔ اپنی ذاتی محرومیاں اور ناکامیاں رہیں جو اسے داخلیت کی طرف لے گئیں۔ اس کے سامنے نئی راہیں ہیں۔ وہ نئے افق کی تلاش میں سرگرداں جو اپنے تمام تر ناپختگی اور کچے پن کے باوجود نئی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ نسل نہ سیاست کا شکار ہے اور نہ ترقی پسندوں جیسا طنطنہ اور بلند و بانگ دعوے ان کا مقصد ہے۔ اس کی تخلیقات میں سیاسی دھڑے بندیوں اور تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے اثرات کی جھلک ہے اس نے اپنا رشتہ ماضی سے توڑنے کے بجائے اور استوار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے اس نسل کی آواز میں کرختگی کے بجائے نرمی اور دھیما پن ہے۔ جس سے ہمارے بزرگ نقاد بے بہرہ ہیں۔ کیونکہ اس میں نعرہ بازی کی گلا پھاڑ کر چیخنے کے بجائے مہذب اور سلجھا ہوا انداز شائستگی، سلیقہ اور ٹھہراؤ ہے پروپیگنڈہ کے بجائے محسوسات اور خیالات کے اظہار میں بیباکی اور صداقت کارفرما ہے۔

یہ نئی نسل ذہنی اور جذباتی طور پر اپنے پیشروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا اندازِ فکر اور طرزِ احساس بالکل علیحدہ ہے مگر ماضی کا ادب اس کے لئے ایک متنازعہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ وہ اس ادھیڑ بن میں گرفتار ہے کہ کن اقدار و اثرات کو قبول کرے اور کن کو چھوڑے۔ یہ اس نسل کا سب سے بڑا فکری سوال ہے اسی تنازعہ نے نئے لکھنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک نئی پود کے نام سے لاہور میں ابھری جس نے بہت سے نفسیاتی اور داخلی محرکات کے سبب میراجی اسکول کے اثرات کو قبول کر کے

اس کی نئی تفسیر ڈھونڈی۔ اس میں شہرت بخاری، شہزاد احمد، افتخار جالب، انور سجاد، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، منیر نیازی، افتخار احسن، احمد مشتاق، جیلانی کامران اور دوسرے شامل تھے۔ لاہور کی یہ نئی پود مغرب زدہ، جنسی کجروی اور ابہام کا شکار ہے۔ اس نئی پود کی تشریح و تفسیر کا فریضہ مظفر علی سید، انتظار حسین، ناصر کاظمی اور خود ان شعراء کے بعض مضامین نے انجام دیا۔

اسی طرح کراچی میں نئی نسل وجود میں آئی جس میں فرید جاوید، رسا چغتائی، سجاد باقر رضوی، شاہد عشقی، حمید کاشمیری، رشیدہ رضویہ، احمد ہمدانی، ساقی فاروقی، رخشندہ بہار، جون ایلیا، اطہر حسین، سحر انصاری، نجم فضلی، رشید طیب اور حسن اجمل سرت شامل ہیں۔ کراچی میں نئی نسل پر لاہور کی نئی پود کی طرح مغرب کے اثرات حاوی نہیں ہیں بلکہ ان کی افکار میں مغرب و مشرق دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے تعارف کا فریضہ سلیم احمد، فرمان فتحپوری، شمیم احمد کے علاوہ انجم اعظمی، شاہد عشقی اور سحر انصاری نے انجام دیا۔

یہ تمام ادوار اور نسلیں جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں جیسا بھی ادب پیش کر سکیں اسی کے مطابق انہوں نے اپنے شارح اور نقاد بھی پیدا کئے۔ لیکن جدید تر نسل میں انور احسن، شمی فاروقی، عبید اللہ علیم، نسیم مدنی، افسر آذر، نغیم آروی، نسیم شاد، سعیدہ افضل اور دوسرے شامل ہیں۔

یہ اس لحاظ سے بدقسمت ہیں کہ اب تک انہوں اپنے شارح اور نقاد اس طرح پیدا نہیں کئے جن کا تعلق ان ہی مسائل، اسی نفسیات، اسی زاویہ نظر سے اتنا ہی گہرا ہوا اور جو ہی صداقت اُن کے لئے بھی کوئی معنی رکھتی ہو جو اس جدید تر نسل کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ بچہ اپنی آواز سے سب سے پہلے پہچانا جاتا ہے۔ اور پھر اپنے وجود کو پہلی بار کائنات میں ایک حقیقت اور صداقت کے طور پر تسلیم کراتا ہے۔ لیکن اس آواز کو شخصیت اور کردار میں ڈھالنے والی ذمہ داریاں اس بچے کی نہیں بلکہ یہ اس کے ذمہ داروں کی ہوتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ہر نسل کے لئے یہ ضروری ہے کہ جب کوئی آواز ابھرے تو اس کو صداقت اور حقیقت تسلیم کرنے والے موجود ہوں اور وہی اس کو شخصیت اور کردار عطا کر سکتے ہیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہر عہد کے نقادوں نے اپنی نئی نسل کی نئی اور خوبصورت آواز کو پہچاننے سے انکار کیا ہے۔ اور یہ انکار ان کی تنگ نظری اور مفاہمت سے پیدا ہوا ہے۔ جس کی پرواہ بہرحال وجود میں آنے والی حقیقت اور صداقت کو نہیں ہونی چاہیئے مگر اسی جگہ مجھے اپنی اس جدید تر نسل سے بھی ایک سوال کرنا ہے کہ اس کا عہد اور اس کا عصر آخر کیوں اپنے نقاد اور شارح پیدا نہیں کر سکا۔ وہ کونسی ایسی قوت ہے جس نے اس عہد کے نقاد کو پیدا کرنے میں رکاوٹ ڈال دی ہے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس جدید تر آواز میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ خود کو صداقت اور حقیقت تسلیم کرا لے؟

■ ■

ماضی، حال

اور مستقبل کی مصنوعی تقسیم سے نہ تو زمانہ منقسم ہوا ہے اور نہ انسانی فطرت نہ انسانی فطرت کے مظاہرے اور تقاضوں میں تبدیلی آئی ہے، اور نہ اس کی سرشت اور جبلت میں۔ زمانہ جبری کا انسان بھی ہمدردی، محبت، شفقت، صدق و وفا، خلوص و ریاکاری اور ظلم و جبر سے دوچار تھا۔ اور آج کا انسان بھی۔ فرق صرف مدارج اور پہلوؤں کی شدت کا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیات و کائنات کی قدروں سے ہمکنار ادب ہمہ گیر، پائندہ اور لازوال ادب ہوتا ہے۔ جدید شاعری فرد کی ذات کو نقطۂ آغاز مان کر کائنات کے سفر پر روانہ ہوتی ہے اور جب فرد کی ذات، ذات کا کرب اور کرب کا احساس محور بن جائے تو پھر دوسری تمام حیثیتیں خواہ وہ سماجی ہوں یا سیاسی، اقتصادی، مادی، روحانی بہر صورت ایک ثانوی حیثیت کی حامل ہوں گی اور یہ وہ پہلو ہے جو جدید شاعری کی بقا کا ضامن بن جاتا ہے۔ جدید شاعری اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ فرد اور سماج کے درمیان کوئی ربط باہم نہیں ہے۔ ربط باہم تو ہے مگر اس ربط کا یقین فرد کی ذات کو نقطۂ آغاز مان کر کیا جاتا ہے۔

(صہبا وحید)

بھٹکی ہوئی نیکی

"رانڈ کا سانڈ! جھاڑ د پھرا۔ خدا کی مار اس پہ"
بتولن اسے ہمیشہ یہی گالی دیتی مگر وہ جب بھی گلی میں
داخل ہوتا جان بوجھ کر بتولن کے پان بیڑی کے خوچنے کو دھکا لگا
دیتا اور بتولن کی سلیقہ سے چنی ہوئی سگریٹ
کی ڈبیاں بکھر جاتیں
اور وہ گالی
کھا کر ہنستا ہوا آگے بڑھ جاتا۔
اس کے بعد وہ مجن بی کے ٹاٹ لگے پردے کے سامنے رکتا
اور کانوں میں انگلیاں دے کر اذان دینے لگتا۔ "اللہ اکبر اللہ اکبر"
اس پر مجن بی اسے پردے سے للکارتیں۔ "او نامراد
تجھے خدا سمجھے"۔
مجن بی کی صلواتیں سن کر گلی کے نل کی طرف جاتا جہاں
کریم ٹیلر کی لڑکی بشیرن عموماً کپڑے دھو رہی ہوتی اور بشیرن کو دیکھ کر
اس کی شریر آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی۔ "بشیرن۔ جھیم جھیم۔
"تیری ماں جھیم جھیم۔ تیری بہن جھیم جھیم۔"

> • اس کی جیب میں پیسے ہوتے تو وہ بشیرن کو کبھی نہیں بھولتا۔
> کبھی وہ اس کے لئے بندے لے آتا۔ کبھی کنگھی۔ کبھی چوٹی۔
> لیکن اس کے دینے کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے وہ خود سے کوئی تحفہ خرید کر نہ لایا ہو بلکہ اسے کوئی چیز پڑی مل گئی ہو۔

اس کے علاوہ وہ اور آگے بڑھتا اور گیند کھیلتے ہوئے بچوں کے
پاس رک جاتا۔ اور جیسے ہی کوئی بچہ گیند اچھالتا وہ لپک کر گیند
ہتھیا لیتا اور اب آگے آگے وہ ہوتا اور پیچھے پیچھے شور مچاتے ہوئے
بچے حتیٰ کہ وہ اپنی کھولی میں گھس جاتا اور اندر سے دروازہ بند
کر لیتا باہر بچے آسمان سر پر اٹھانے لگتے اور اندر وہ مزے سے
اپنے بینڈ باجے والے جھانجھ بجانے لگتا۔ یوں پوری گلی میں ایک
قیامت برپا ہو جاتی اور عورتیں اسے منہ پھیر پھیر کر
کوسنے لگتیں۔
یہ ہنگامہ گلی میں روز
کا معمول تھا اور اس ہنگامہ کے پیچھے جو
شخصیت تھی اسے سب مستانہ کہتے تھے اور یہ مستانہ صرف دو
فٹ کا بونا تھا!۔
بونے جسمانی طور پر عموماً بے ڈول اور ذہنی طور پر ٹھوس ہوتے
ہیں مگر مستانہ میں یہ بات نہیں تھی۔

اس کے اعضاء وونٹ کی جسامت کے اعتبار سے متناسب تھے اور وہ اپنے معصوم خد وخال کی وجہ سے صرف چار پانچ برس کا بچہ نظر آتا تھا حالانکہ اس کی عمر بیس بائیس برس سے کم نہیں تھی۔ ذہنی طور پر وہ بے حد چلبلا تھا۔ بندر کی طرح پھرتیلا اور شریر۔۔ اور گلی میں اس طرح داخل ہوتا تھا جیسے مٹھائی کی دکان میں لنگور گھس آیا ہو۔۔ ایک ہنگامہ ہوتا جو اس کی آمد کے ساتھ ساتھ گلی کے اس سرے سے اس سرے تک پھیل جاتا اور دور دور کے گھروں تک یہ بات پہنچ جاتی کہ مستانہ گھوم پھر کر لوٹ آیا ہے شرارت مستانے کی رگ رگ میں سموئی ہوئی تھی اس کے ہاتھ پیروں میں ہر وقت چل ہوا کرتی اور جب تک وہ بتولن کی گالیاں، جمن بی کی لعن طعن اور محلے کی دوسری عورتوں کے کوسنے نہ سن لیتا اس کا کھانا ہضم نہ ہوتا۔ گالیاں کھا کر اسے وہی مزہ آتا تھا جو جسم کے کسی خارش زدہ حصے کو کھجانے سے آتا ہے۔۔!

مستانے کا کوئی نہیں تھا وہ کسی دوسرے شہر سے بھٹک کر یہاں آ گیا تھا اور کلن بینڈ ماسٹر نے جس کے کوئی اولاد نہیں تھی اسے بچہ سمجھ کر گود لے لیا تھا مگر جب اس بچے نے ایک کمرے والے مختصر سے مکان میں کلن اور کلن کی بیوی کا جینا حرام کر دیا تو کلن نے گلی میں اسے ایک علیحدہ کھولی دلا دی اور اس کھولی سے دن کے کسی نہ کسی حصے میں ہنگامے جاگنے لگتے۔ شروع شروع میں جب بینڈ والے کلن ماسٹر کے گھر فالتو اوقات میں کسی نئی دھن کی مشق کرتے تو وہ بڑے انہماک سے بینڈ سنتا اور پھر دوپہر کے وقت گلی کے بچوں کو جمع کر کے اپنا بینڈ تیار کرتا۔ بچے خالی کنستر بجاتے اور وہ کلن کی نقل میں منہ سے بینڈ باجے کی آواز نکالتے ہوئے ان کی قیادت کرتا۔ "دھم دھم جھیم جھیم۔۔ ڈھم ڈھم جھیم جھیم"

ایک دن بشیرن کے سر میں درد تھا تو اس نے مستانہ کو ڈانٹا۔ اور جھیم جھیم کے ہنگے۔

[illegible] کر حوصلہ شکنی کر لی۔۔

جہاں بشیرن نظر آتی وہ نعرہ لگاتا۔ "بشیرن جھیم جھیم"

اور بشیرن اس کی ماں بہن کو جھیم جھیم کر کے رکھ دیتی۔

آہستہ آہستہ کلن ماسٹر نے اسے تربیت دینا شروع کی۔ کلن چاہتا تھا کہ وہ کوئی ہلکا پھلکا ساز بجانا سیکھ جائے مگر اسے تمام سازوں میں بس جھانجھ ہی سے رغبت تھی۔ یہ ساز پیتل کی طشتری نما جوڑی پر مشتمل ہوتا ہے اور اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر ٹھکرانے سے واقعی "جھیم جھیم" کی آواز نکلتی ہے۔

چنانچہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں بڑی مہارت سے جھانجھ بجانے لگا۔ اب شادی بیاہ میں مستانہ بڑی شان سے بینڈ والوں کی ننھی منی سی رنگین وردی پہن کر شریک ہوتا اور اس انمول اضافہ سے کلن بینڈ کی مانگ بڑھ گئی شادی بیاہ کے موقع پر ایک ننھے سے بونے کو جھانجھ بجاتے دیکھ کر عورتیں اور بچے بڑے محظوظ ہوتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ براتی خوش ہو کر اسے بخشش دیا کرتے۔ مگر شرارت سے وہ ایسے موقعوں پر بھی باز نہیں آتا تھا، عموماً جب بینڈ کا نغمہ عروج پر ہوتا وہ جان بوجھ کر الٹے سیدھے جھانجے پیدا کرنے لگتا اور سر بگڑ جاتا اس پر کلن ماسٹر شہنائی بجاتے ہوئے اسے گھور گھور کر دیکھتا مستانہ جانتا تھا کہ کلن ماسٹر اسے نہ فوری طور پر ڈپٹ سکتا ہے اور نہ مار سکتا ہے بس منہ پھلا پھلا کر گھور ہی سکتا ہے۔ اور کلن کی یہی بے بسی دیکھنے کے لئے وہ جان بوجھ کر الٹے سیدھے تال دینے لگتا اور دل ہی دل میں محظوظ ہوتا۔

ایک مرتبہ کسی شادی میں ایک غیر ملکی جوڑا بھی مدعو تھا خاتون نے اسے ... رنگ برنگی وردی میں بڑی مہارت سے ساز بجاتے دیکھا تو حیران رہ گئی اور جب نغمہ ختم ہوا اس نے پیار سے مستانے کو گود میں اٹھا لیا۔ "واٹ اے نبے بی"

اور بے بی نے موقع پا کر چٹاخ سے خاتون کے رخسار پر پیار کر لیا جس پر وہ خاتون تحیر خیز خوشی سے چیخ اٹھی۔۔ اور جب کلن نے اس حرکت پر گھور کر مستانے کو دیکھا تو اس نے کلن کو آنکھ مار دی۔

بعد میں جب اس خاتون کو بتا دیا گیا کہ جسے وہ بے بی سمجھ کر

گود میں چڑھائے ہوئے تھی وہ بیس بائیس برس کا لونا تھا تو وہ
اپنے شوہر کے شانے پر سر رکھ کر اتنا ہنسی۔ اتنا ہنسی کہ اس کے
آنسو نکل آئے اور اس کے شوہر نے مستانے کو دس کا نوٹ تھما کر
اس کے رخسار تھپتھپائے "یونانی ٹیل بیسٹ"

اگلی صبح جب وہ گلی میں داخل ہوا تو اس نے حسب عادت
بتولن کے خونچے کو ٹھیس لگائی اور بتولن نے سگریٹ کی بکھری ہوئی
ڈبیاں سمیٹتے ہوئے اسے گال دی — "رانڈ کا سانڈ۔"

گالی کھا کر وہ آگے بڑھا تھا کہ اس کے آستینوں میں دبے
ہوئے سگریٹ کے کئی پیکٹ زمین پر گر پڑے اور بتولن نے اسکی
گردن پکڑ لی۔

"او بد معاش۔ اچکے ڈاکو" اور اس نے مستانے سے
سارے پیکٹ چھین کر خونچے پر سجا لئے۔

اس کے بعد وہ جمن بی کے دروازے پر پہنچا ——

"اللہ اکبر اللہ اکبر"

"او مستانے کے بچے نامراد"۔ جمن بی نے ہانک لگائی اور
جب مستانہ اس کے باوجود بھی آگے نہیں بڑھا تو انہوں نے پوچھا"
اب کاہے کو میری چھاتی پر سوار ہے۔"

اور مستانے نے جیب سے ایک تسبیح نکال کر انہیں
تھما دی۔ "جمن بی یہ لو۔ اللہ اللہ کرو۔"

"یہ کہاں سے اڑا لایا کمبخت"؟

اور مستانے نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔ "مسجد سے امام
صاحب کی ہے۔ سیدھی جنت میں جاؤ گی جمن بی۔"

نل پر بشیرن کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس
جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کے بندے تھے —
جنہیں وہ الٹ پلٹ کر بے تعلقی سے دیکھ رہا تھا۔

بشیرن نے چور نظروں سے بندوں کی طرف سے دیکھا
مگر کچھ بولی نہیں۔

پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگا — پتہ نہیں سونے کے ہیں
یا پیتل کے، شادی میں پڑے ملے تھے — مگر میرے کس کام
کے ہیں۔ پھینکو سالوں کو۔"

اور اس نے بندوں کو بشیرن کے سامنے کیچڑ میں ڈال دیا
اور اٹھ آیا — پھر جیسے ہی بشیرن نے کیچڑ میں ہاتھ ڈال کر بندے
اٹھائے اس نے پلٹ کر نعرہ لگایا۔ "جھیم جھیم"

اس کے بعد اس نے لڑکوں کی گیند اچک لی۔ اور اپنی
کھولی میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اور باہر لڑکوں کی
فوج واویلا کرنے لگی پھر ایک ایک کر کے اس نے چار گیندیں کھولی
سے باہر اچھال دیں اور لڑکوں میں چھینا جھپٹی اور مار پیٹ شروع
ہو گئی اور وہ اپنی کھولی میں مزے سے جھانجھ بجانے لگا — یوں
روز کی طرح گلی میں قیامت جاگ اٹھی اور عورتیں منہ بھر بھر کے
اسے کوسنے لگیں۔

مستانے کی آمدنی عموماً اس طرح صرف ہوتی مگر پھر بھی پوری
گلی اس سے نالاں تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی آمد کے
ساتھ ساتھ گلی میں ہنگامے جاگ اٹھتے تھے لیکن پھر بھی ایک
عجیب بات یہ تھی اس کی بڑی سے بڑی شرارت پر کوئی اسے سنجیدگی
سے تنبیہ نہیں کرتا تھا مرد اس کی بات کو ہنس کر ٹال دیتے تھے
بچے اس سے کتراتے تھے اور رہیں عورتیں وہ اسے کوس پیٹ کر
بیٹھ جاتی تھیں مگر اس کوسنے میں اب غم و غصے کے جذبات نہیں
ہوتے تھے بس یہ ایک عادت تھی جو مستانے کی شرارتوں نے پختہ
کر دی تھی۔

بہر حال عورتیں اسے اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتیں نہ معلوم کب
شرارت کر بیٹھے اور بچے اس سے گھبراتے وہ ان میں گھلنے ملنے کی
کوشش کرتا تو وہ سہمے سہمے سے رہتے انھیں اپنی گیند کی
سلامتی کی فکر پڑ جاتی مرد ان شرارتوں سے محظوظ ضرور ہوتے
مگر اس سے برابری کا برتاؤ نہ کرتے اور اسے اپنی محفلوں میں ٹکنے
نہ دیتے۔ رات کو فرصت کے اوقات میں جب کلن بینڈ کے افراد
جھلنگے پلنگ گلی میں ڈال کر جمع ہوتے اور بیڑیاں سلگا کر ایک
دوسرے کو اپنی جوانی کی باتیں بڑھا چڑھا کر سناتے تو مستانے کا

بڑا جی چاہتا کہ وہ ان کی باتوں میں شریک ہو مگر ایسا نہ ہو پاتا کلن ہمیشہ اسے وہاں سے کھسکا دیتا "جانے جاؤ کھیلو بیٹا"

کبھی کبھی جب کلن موجود نہ ہوتا تو وہ لاکھ کہنے کے باوجود وہاں سے نہ ٹلتا۔ تب مرد بے تکلفی سے احتراز کرتے اور گول مول الفاظ میں باتیں کرنے لگتے اور جب ان گول مول الفاظ میں کوئی اپنی جوانی کی حکایت ساتھیوں کو سناتا تو اس کی سمجھ میں بس سننے والوں کے استفہامیہ جملے ہی آتے۔

"ابے نہیں!!"

"چل بے میں نہیں مانتا!"

"ابے کیوں گپ ہانک رہا ہے میرے یار"

اور جن باتوں پر یہ استفہامیہ جملے کہے جاتے اور جو باتیں دوسروں کو گپ معلوم ہوتیں وہ لاکھ کوشش کے باوجود مستانے کی سمجھ میں نہ آتیں پھر وہ بد دل ہو کر ان کی محفل سے اٹھ آتا اور بشیرن کے گھر پہنچ جاتا اور ایسے موقعوں پر بشیرن کا باپ کریم ٹیلر کلن اینڈ پارٹی کے ساتھ گپ بازی میں مشغول ہوتا تھا۔ لیکن مستانہ آدمیت کے جلسے میں رہتا۔ بشیرن اگر کرتے ترپ رہی ہوتی تو وہ اس کی سوئی میں تاگہ ڈالنے کا انتظار کرتا رہتا یا اس کے ساتھ مل کر قمیضوں میں بٹن ٹانکنے بیٹھ جاتا کبھی کبھی جب بشیرن کو فرصت ہوتی تو وہ اس کے ساتھ لوڈو کھیلتا اور جب شرارت سوجھنے لگتی تو کھیل میں ایسی کھلی کھلی بے ایمانی کرتا کہ بشیرن تپ جاتی اور اسے گھر سے نکال دیتی۔

دو چار منٹ وہ ادھر ادھر ٹہلتا پھر دبے پاؤں بشیرن کے دروازے پر آتا اور اس کے باپ کے انداز میں کھانستے ہوئے دروازہ پر دستک دیتا۔

"کون؟"

اور وہ کریم ٹیلر کے لہجے کی ہو بہو نقل اتارتا "کھولو"

بشیرن دروازہ کھول دیتی تو وہ بندروں کی طرح جست لگا کر اندر داخل ہوتا۔ پھر بلا وجہ کسی چیز سے ٹکرا کر گرتا اور اس طرح جیسے اسے بہت شدید چوٹ آئی ہو کراہنے لگتا۔

یہ اکثر ہوتا اور بشیرن ہر بار دھوکا کھا جاتی۔ "اللہ خیر کیا ہوا مستانے۔ چوٹ تو نہیں لگی؟"

"بڑی سخت چوٹ لگی ہے ۔۔۔ یہاں" اور مستانہ کراہتے ہوئے بشیرن کا ہاتھ اپنے سینے یا سر پر رکھ لیتا اور درد سے مچلنے لگتا

تب بشیرن اسے اپنے آنچل سے ہوا دیتی ۔۔۔ اس کی چوٹ کو سہلاتی اور وہ بنا پڑا رہتا۔ پھر جب بہت دیر ہو جاتی تو وہ اچانک ہنس کر اٹھ بیٹھتا۔ اور بشیرن کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتا "جھیم جھیم۔"

اور بشیرن اس کی ماں بہن کو جھیم جھیم کر کے ایک بار پھر اسے گھر سے نکال دیتی۔

اور یہ وقت عموماً کریم ٹیلر کی واپسی کا ہوتا۔

لیکن بشیرن اسے چاہتی بھی تھی ۔۔۔ اتنا زیادہ کہ اگر کبھی مستانہ کسی بارات میں گیا ہوتا اور رات گئے تک واپس نہ آتا تو اسے نیند نہ آتی۔ مگر اس کی یہ چاہت مستانے کے اندر رچ بس جانے والے اس مرد سے وابستہ نہیں تھی جو دو فٹ کے قالب میں گڑمڑایا ہوا جی رہا تھا۔ بلکہ اسے تو ننھا منا سا مستانہ ہی اچھا لگتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایک بچے کی طرح وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی کلن بینڈ جب کسی نئی جگہ مدعو ہوتا تو اس کی ننھی منی سی وردی بشیرن ہی رگڑ رگڑ کر صاف کرتی ۔۔۔ تھانوں سے کپڑے بچا کر اس کے لئے ننھے منے کرتے سیتی۔ اور جب کوئی نئی چیز پکاتی تو اسے کبھی نہ بھولتی ۔۔۔

اور مستانہ بھی پوری گلی میں اگر کسی سے مانوس تھا تو وہ بشیرن تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بشیرن نے دوسروں کی طرح اسے کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

مستانے کو اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ بشیرن اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ جب کبھی وہ کسی بارات سے لوٹتا اور اس کی جیب میں پیسے ہوتے تو وہ بشیرن کو کبھی نہ بھولتا۔ کبھی وہ اس کے لئے بندے لے آتا۔ کبھی کنگھی۔ کبھی

کبھی چوٹی ـــ لیکن اس کا دینے کا انداز ہمیشہ ایسا ہوتا جیسے وہ خود سے بشیرن کے لئے کوئی تحفہ خرید کر نہ لایا ہو بلکہ اسے کوئی چیز پڑی مل گئی ہو ـــ اور بشیرن اس کی اس عادت سے مانوس ہو چکی تھی۔

رہی ان کی آپس کی نوک جھونک تو اس میں بشیرن کا نہیں صرف اس کا قصور ہوا کرتا ـ وہ اپنی شرارتوں سے اس قسم کے حالات پیدا کر دیتا کہ بشیرن زچ ہو کر اسے گھر سے نکال دیتی۔ اور یہ بات مستانہ اچھی طرح جانتا تھا کہ گھر سے نکالے جانے کے بعد جب وہ لوٹ کر اس کے باپ کے انداز میں دروازہ پر دستک دیتا ہے تو بشیرن دھوکا نہیں کھاتی بلکہ یہ سمجھ کر دروازہ کھولتی ہے کہ آنیوالا مستانہ ہے اور جب وہ ٹھوکر کھا کر گرتا اور بشیرن اس کی چوٹ کو دھوتے ہوئے سہلاتی تب بھی اسے دھوکا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مستانہ بن رہا ہے۔

بشیرن کی طرح گلی کے دوسرے افراد بھی مستانے کی حرکتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے بتولن جانتی تھی کہ مستانہ جان بوجھ کر اس کے خونچے کو دھکا لگاتا ہے اور اگر وہ گالی نہیں دیگی تو مستانہ کا دل دکھے گا۔ اور رجن بی بی جب مستانے پر برسنے لگتیں تو اس خیال سے کہ اگر انہوں نے مستانہ کو نظر انداز کر دیا تو دوسرے دن سے وہ ان کے دروازہ پر اذان دینا چھوڑ دے گا حتیٰ کہ گلی کے بچے بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ مستانہ ان کی گیند چھین کر تھوڑی دیر بعد خود بخود واپس کر دے گا مگر اس کے باوجود بھی وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو مستانہ انہیں نئی گیندیں لاکر کبھی نہیں دے گا۔ وہ سب جانتے تھے کہ مستانہ شریر ہے اور اس کی ہر حرکت کا محرک ایک معصوم شرارتی جذبہ ہوتا ہے۔

چنانچہ جب بشیرن کی شادی کا دن آیا اور مستانہ بغیر کسی کو بتائے ہوئے غائب ہو گیا تب بھی گلی والوں نے یہ سمجھا کہ وہ کسی نئی شرارت کے لیے موقع کی تلاش میں ہے اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے شرارت نہیں کرنے دیگی۔ گلی کی لڑکی کی شادی تھی اس لئے کلن ماسٹر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بارات میں مفت بینڈ مہیا کرے گا اور ظاہر ہے کہ مستانہ کے بغیر بینڈ مکمل نہیں ہو سکتا اور مستانے کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ لہٰذا کلن اینڈ پارٹی اس کی تلاش میں نکلی اور انہوں نے دیکھا کہ مستانہ میونسپل پارک میں گھاس پر اوندھا پڑا سو رہا تھا چپکے چپکے وہ آگے بڑھے اور انہوں نے مستانے کو اپنے حلقے میں لے لیا پھر کلن نے مستانے کا شانہ ہلایا تو وہ وحشی جانور کی طرح بدک اٹھا۔

"مستانے چلو بیٹا"، کلن نے اسے چمکارا۔

"نہیں جاؤں گا" مستانے نے کہا اور بینڈ والوں کے حلقے سے نکلنے کے لئے بندر کی طرح اچھل کود کرنے لگا۔

پھر باقاعدہ جد وجہد کے بعد بینڈ میں نفیری بجانے والے نے مستانے کو دبوچ کر اپنے کندھے پر لاد لیا اور اس پر ایک مشترکہ قہقہہ لگا۔

"بولو بیٹا" اب تو چلوگے؟" اس نے مستانے کو چھیڑا۔

"نہیں جاؤں گا" ــ "نہیں جاؤں گا" اور مستانہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

مگر وہ اسے لاد سے ہی لائے ـــ پھر انہوں نے مستانے کے مچلنے اور چلانے کی پرواہ کئے بغیر اسے زبردستی وردی پہنائی اور اس کے ہاتھوں میں جھانجھ تھما دئے اور جب باراتیوں نے ایک ننھے سے بونے کو بڑی مہارت سے ساز بجاتے دیکھا تو عورتیں بڑی محظوظ ہوئیں اور بچے تالیاں بجانے لگے ـ اور بشیرن کی برات رخصت ہو گئی۔

اور کلن ماسٹر کو حیرت تھی کہ اس روز مستانے نے ہمیشہ کی طرح سر بگاڑنے کے لئے کوئی شرارت نہیں کی ـــ اور اگلی صبح جب وہ گلی میں داخل ہوا تو بتولن نے ہمیشہ کی طرح اسے گالی دینے کے لئے زبان کھولنا چاہی مگر اس روز مستانے نے اس کے خونچے کو دھکا نہیں لگایا ـــ وہ رجن بی کے گھر کے سامنے سے بھی چپ چاپ گذر گیا اس نے رک کر نل کی طرف دیکھا مگر وہاں بشیرن نہیں تھی اور خالی نلکے سے دھل دھل پانی بہہ رہا تھا ـ اور وہ خاموشی سے

آگے بڑھ گیا ـــــ اس نے بچوں کی گیند بھی نہیں چھینی اور چپ چاپ اپنی کھولی میں داخل ہو گیا ـــ اور اس روز اس کی کھولی سے بے ہنگم باجے کی آواز بھی نہیں آئی ۔

لیکن دوسری صبح گلی میں قیامت جاگ اٹھی ۔

کلن ماسٹر بلک بلک کر رو رہا تھا ـــ "ہائے میرا مستانہ ارے دوڑو میرے مستانے کو کیا ہوا !!"

عورتیں، مرد، بچے ـــ سبھی اس کے گرد جمع ہو گئے، اور انہوں نے دیکھا کہ کلن ماسٹر مستانے کے ننھے منے جسم کو اپنے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھا اور مستانے کی ناک اور منہ سے نیلا نیلا پانی بہہ رہا تھا ـــ بتولن نے لپک کر اپنا پلنگ بچھایا اور مستانہ کو اس پر لٹا دیا ۔ جمن بی نے سنا تو ننگے سر باہر نکل آئیں ۔ اور بچوں میں سے کوئی ڈاکٹر کو لینے دوڑ گیا ۔

"ارے یہ تو نے کیا کر لیا مستانے ؟" بتولن نے اپنے میلے کچیلے آنچل سے اس کا منہ پونچھتے ہوئے کہا اور پھر وہی پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی ـــ"

مگر مستانہ چپ چاپ پڑا رہا ـــ وہ خالی خالی نظروں سے ایک ایک چہرے کو تک رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو ۔

بشیرن کو خبر لگی تو وہ بھی عروسی جوڑا پہنے، دوڑی چلی آئی ـــــ اور اس کے آتے ہی مستانے کی نظروں نے بھٹکنا چھوڑ دیا ـــ

بشیرن اس کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئی ـــ "کیا ہوا مستانے ؟"

"بہت زور کی ـــ چوٹ لگی ہے ـــــ یہاں ! اور اس نے بشیرن کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں ـ

بشیرن اپنی حنا آلود انگلیوں سے اس کا سینہ سہلانے لگی مگر مستانے کی ناک اور منہ سے زہریلی رطوبت بہنا بند نہ ہوئی ـــ وہ آہستہ آہستہ بجھتا جا رہا تھا ـ پھر اس نے آنکھیں کھولیں بشیرن کے ہاتھ کو اپنی ننھی سی مٹھی میں تھاما اور اس طرح جیسے وہ بشیرن سے کوئی بات کہنا چاہتا ہو اسے قریب آنے کا اشارہ کیا

بشیرن اس پر جھک پڑی تو اس کی آنکھوں میں آخری بار چمک پیدا ہوئی ـــ "بشیرن ـــ جیجیم ـــ جیجیم ۔"

اور دوسرے ہی لمحے اس کی ننھی سی گردن ایک طرف ڈھلک گئی ۔

اور آج اس بات کو ایک مدت ہو چکی ہے ۔ مگر اب بھی جب کوئی بچہ تیزی سے گلی میں داخل ہوتا ہے تو بتولن چونک کر اٹھتی ہے اور پھر دل مسوس کر رہ جاتی ہے ـــ کوئی دوسرا اس کی گالی کیوں سنتا !! اور جمن بی کے دروازے پر جب کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی ہے تو وہ لپک کر پردے تک آتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر واپس لوٹ جاتی ہے ـــ اور اب بھی جب نئے تھان آتے ہیں تو بشیرن ننھے منے کرتوں کے لئے ٹکڑے بچا لیتی ہے اور گلی کے بچے جب طویل دوپہروں میں کھیلتے کھیلتے اکتا جاتے ہیں تو مستانے کی کھولی کے بند دروازہ پر امیدواروں کی طرح جاتے ہیں جیسے انہیں اب بھی یہ امید ہو کہ مستانہ ان کے لئے اندر سے گیندیں اچھال دے گا ۔

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مستانہ اپنے ساتھ گلی کی زندگی بھی لے گیا ہے ۔

> ## دنیا میں
>
> جب لوگ بھوکے ہوں تو ادب کا کیا مقصد ہو سکتا ہے ؟ اخلاقیات کی طرح ادب کو بھی آفاقی (کون و مکاں کی پابندی سے آزاد) ہونا چاہیئے تاکہ وہ فاقوں کی شکار اکثریت کا ساتھ دے سکیں ۔ قلم کار اگر چاہتا ہے تو وہ تمام انسانوں سے ہمکلام ہو سکے اور وہ تمام اس کی تخلیقات پڑھ سکیں تو قلمکار کو فاقہ زدہ لوگوں کی اکثریت کا ساتھ دینا چاہیئے بصورت دیگر وہ مراعات یافتہ طبقے کا خادم ہوگا اور اس لحاظ سے وہ استحصال کرنیوالوں کی صف میں شامل ہوگا ۔
>
> (ژاں پال سارتر)

رشیدہ رضویہ

ہمارا گھر ہمیں واپس دو

جب جلوس شارع ۲۷ یولیو پہ پہنچا۔ تو عام لوگ بھی اس میں آ شامل ہوئے۔ اور جلوس تین میل لمبا نظر آنے لگا۔ خالد اور قاسم کو جلوس کی قد آوری یا طوالت سے قطعی کوئی خوشی نہ ہو رہی تھی بس یہی محسوس ہوتا تھا۔ کھجور کا ایک بے ہد لمبا درخت بے برگ و ثمر بے مقصد زمین پہ سر اٹھائے کھڑا فلک کو چھونے کی کوشش کر رہا ہے چلا چلا کر لڑکوں کے حلق خشک ہو گئے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے یہاں تک برابر نعرے

حلق میں لعاب نگل کر اور زبان سے ہونٹوں کو تر کر کے خالد اپنے دوست کی طرف پلٹا۔ گویا احوال دریافت کرتا ہو۔

" یوں محسوس ہوتا ہے۔ صحرائے سینا میں چل رہے ہیں۔"

" تمہارا تخیل تو اسرائیل کی جنگی تیاریوں کی مانند زرخیز ہے یار!"

" صحرائے سینا اور جنگ کے نتائج زرخیز نہیں ہیں۔ ابھی۔"

قاسم کے چہرہ پہ بیزاری اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات تھے:

وہ دونوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جبکہ ہجوم آگے

●— اس نے زرد اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بالوں میں زرد سکارف بندھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بحر ابیض بہتا تھا اور رخساروں پر تیل کی کپاس کھلی تھی۔ دونوں نے دل کڑا کر کے آخر لڑکی کو دیکھ لیا۔

لڑکی کے چہرے پر چاندنی پھیلی اور تمام شوخ و روشن کرنیں ہونٹوں پہ اتر آئیں۔!

نکلتے آ رہے تھے۔ اور اب مارے پیاس کے زبان باہر نکلی جا رہی تھی۔ گویا سال بھر سے برابر روزے رکھتے چلے آ رہے ہوں۔ وہ بڑی شدت سے یہی چاہتے تھے کہ کوئی حلق میں ٹھنڈا ٹھنڈا مشروب انڈیل دے۔ انھوں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں کوکا کولا یا سیون اپ کا کوئی کیبن نظر آ جاتا۔ لیکن کیبن بند تھے۔ ان کے مالک یا تو جلوس میں شامل تھے۔ یا پھر یہودیوں کا مشروب ہونے کی وجہ سے بند کر دیئے گئے تھے۔

الشباع

حلق کی آخری حدوں پہ کھڑا چلا رہا تھا۔ لیکن اتنے بڑے ہجوم کی رہنمائی کرتے کرتے یہاں شارع ۲۷ یولیو پہ پہنچ کر دفعتاً خالد نے محسوس کیا تھا کہ یہ تمام گورکھ دھندا محض ایک فریب ہے۔ اس سے نہ قوم کو فیض پہنچ سکتا ہے۔ نہ وطن کو۔ نہ کسی فرد واحد کو!۔ یہ سب جذبات کی ایک رَو کا نتیجہ ہے۔ اور جذبات کی اس رو کے پیچھے کتنی تباہیاں مضمر ہیں۔ ان پہ کوئی غور نہیں کرتا۔ جذبات کی ایک فضول و ناکارہ رَو اور یہ نعرے جو عرب میں

سرسبز وادیوں اور ہرے بھرے کھیتوں۔ بھرے پُرے شہروں کو کیونکر ختم کر کے رکھ دیتے ہیں؟ خالد کے چہرہ پہ کرب سا پھیل گیا اور چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ تاحد نگاہ انسانی اجسام اور آوازیں تھیں۔ ہجوم کی وجہ سے ٹریفک معطل ہو چکی تھی اور مکانات کی گیلریوں۔ دریچوں اور چھجوں پہ بھی انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔

" یا اللہ"۔ خالد کا سر جھکا گیا۔ یہ چیختے چلاتے انسان فکرِ فردا سے بے نیاز، مستقبل سے لاپرواہ جذبات کے ایک دھارے پہ بہے چلے جا رہے تھے۔

یہ عوام تھے۔ مصر کے عوام!۔ جو فراعنہ کے زمانوں سے اسی طرح نعرے لگاتے آ رہے تھے۔ جو صدیوں پیشتر افرودیتی یا دیوی آئی سس (دریائے نیل) کے عذاب سے مرتے تھے یا جنگوں میں ختم ہو جاتے تھے۔ اب پھر صدیوں کی تاریخ دہرا رہے تھے۔

ہجوم برابر "جنگ جنگ" کے نعرے لگا رہا تھا۔ اس قوم کے اعصاب پہ جنگ مسلط تھی۔ اور اسے اپنی فتح کا یقین کامل تھا۔

" اگر جنگ ہوئی۔ تو یہ خوبصورت زندگی اور یہ ہشاش بشاش چہرے ختم ہو جائیں گے"۔ قاسم بڑبڑایا۔

" ہاں۔ اس حقیقت سے گریز خود فریبی ہے"۔ خالد ایک مرتبہ پھر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اور اس لمحہ دونوں دوستوں کے دل میں ایک ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ذرا خواتین کی جانب دیکھا جائے۔ خصوصاً اس لڑکی کی جانب کچھ توجہ دی جائے جس نے زرد اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اور بالوں میں زرد سکارف باندھا تھا جس کی آنکھوں میں بحیرہ ابیض بہتا تھا۔ اور رخساروں پہ نیل کی کپاس کھلی تھی۔ اور وہ مصر و لبنان کا ملا جلا حسن نظر آتی تھی دونوں نے دل کڑا کر کے آخر لڑکی کو دیکھ ہی لیا۔ لڑکی کے چہرہ پہ چاندنی پھیلی۔ اور تمام شوخ و درخشاں کرنیں ہونٹوں پہ اتر آئیں۔ اس نے اپنا سکارف اتار کر بڑے جوش سے لہرایا تو وہ ہلکے ایک خفیف سے جھونکے کے ساتھ نیچے خالد کے سر پہ آگرا۔ خالد نے سکارف کو بوسہ دیا۔ اور گلے میں باندھ لیا۔ لڑکی شفقی رنگ ہو کر ایک خاتون کے پیچھے چھپ گئی۔

جلوس اب آگے بڑھنے لگا تھا اور خالد و قاسم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ حتیٰ کہ جلوس چلا گیا اور شارع ۲۶ یولیو پہ محض تماشائی رہ گئے۔ تماشائی بھی رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے تھے۔ خالد اور قاسم کے دل میں ایک مرتبہ پھر زرد سکارف والی لڑکی کو دیکھنے کی خواہش ہوئی لیکن لڑکی اوپر گیلری میں نہیں تھی۔ وہ دونوں یک لخت اداس ہو گئے۔ وہ سرشاری اور سرمستی۔ جو اتنے ہجوم میں اس ایک لڑکی کے وجود سے ہوئی تھی۔ بے کیفی میں بدل گئی اور وہ سر جھکائے، تھکے ہارے، ہزیمت خوردہ فوجی کی مانند گلی کوچوں میں بھٹکنے لگے۔ چلتے چلتے وہ شارع فواد پہ آگئے۔ ریفولی میں شادیہ کی کوئی پرانی فلم چل رہی تھی جس میں شادیہ ایک گڑیا کو سینہ سے لپٹا کر لوری سناتی ہے۔ تماشائی اس لوری پہ داد و تحسین کے نیل و فرات بہا دیتے تھے۔ خالد اور قاسم نے یہ فلم تین مرتبہ دیکھی تھی اور ہر بار نیا لطف حاصل کیا تھا۔ لیکن اب انہیں شادیہ میں بھی کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا آگے بڑھ گئے اور چلتے چلتے شارع کورنیش نیل پہ پہنچ گئے۔

بھوک اور تھکن سے ان کا برا حال تھا۔ دریائے نیل کو چھو کر آنے والی ہوائیں زندگی اور تازگی کا پیغام دے کر بھوک چمکا رہی تھیں مگر وہ چاہتے تھے کہ جی بھر کر۔ ٹانگوں کو گرم گرم پانی سے دھو کر فوراً بستر میں گھس جائیں۔ چل چل کر پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے اور ٹانگوں کی تمام رگیں کھنچی جاتی تھیں۔

وہ ایک چھوٹے سے ریستوران میں گھس گئے۔ جو دریا کنارے تھا۔ کچھ لوگ باہر کرسیوں اور لمبی لمبی بنچوں پہ بیٹھے استکان پی رہے تھے۔ اور کچھ لوگ ریستوران کے اندر بیٹھے تھے۔ یہ ریستوران کیا تھا۔ اچھا خاصا کیبرے تھا۔ جو ایک کشادہ ہال پہ مشتمل تھا۔ سامنے ایک چبوترہ سا بنا تھا جس پہ دو رقاصائیں تالی بجا بجا کر کچھ گا رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ تالی بجا کر چبوترہ سے نیچے اترتیں۔ گول گول گھوم کر جسم کے نچلے حصہ کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر پھر چبوترہ پہ چڑھ جاتیں۔ اور ان کی اس ادا پہ طاؤلی کھیلتے بوڑھے بہ آواز بلند نعرہ ہائے تحسین کی تکرار کرتے۔ ان بوڑھوں کو نوجوانوں کے ہنگاموں اور جلوسوں

سے کچھ مطلب نہ تھا یہ تسبیح گھماتے تھے۔ استکان پیتے تھے۔ لاؤڈ سپیکر پہ کھیل تھے۔ گانا سنتے تھے۔ ناچ دیکھتے تھے اور نجاۃ صغیر و صباح کی آواز کی باریکیوں پہ بحث کرتے تھے۔ جنگ اور سیاست ان کا مسئلہ نہ تھا۔

خالد اور قاسم بھی بوڑھوں کے قریب بیٹھ گئے۔ بوڑھوں نے گھور کر ناگواری سے انہیں دیکھا۔ یہ نوجوان اپنا وقت ضائع کرنے وہاں کیوں چلے آتے تھے؟ وہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پہ بولنے لگے۔ جب وہ جوان تھے تو انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے تھے۔ اور یہ آج کے نوجوان ــــ؟

لیکن خالد اور قاسم اپنے بزرگوں کی تنقید سے بے خبر قہوہ گھونٹ گھونٹ پینے میں مصروف تھے اور رقاصائیں بدستور گا رہی تھیں اور تھرک رہی تھیں۔ ان کی آوازوں اور جسم میں کسی قسم کی کوئی کشش نہ تھی۔ بے ڈول۔ بھدے جسم۔ موٹی موٹی تھرکتی پنڈلیاں اور پیٹ۔ اور ان کا فراک بھی گھٹنوں سے کافی اونچا تھا۔ جب وہ گول گول گھومتیں تو بالکل ان چڑیلوں کی مانند نظر آتیں جو قبرستان میں کسی قبر پہ عریاں کھڑی ناچ رہی ہوں۔ کم بختوں کی آنکھیں بھی ٹیڑھی تھیں۔ اور اتنے ڈھیروں کحل (کاجل) سے آنکھیں سیدھی کرنے کی کوشش میں زیادہ بدنما ہو گئی تھیں۔ اور ان کی آواز بھی پھٹی پھٹی سی تھی۔ ان میں اگر کوئی کشش تھی تو یہی تھی کہ وہ کسی طور نظر فریب نہ تھیں۔

وہ زور و شور سے گا رہی تھیں۔

اَلف لیالی ــ اَلف لیالی

وہ بار بار اسی ایک لفظ کی گردان کر رہی تھیں۔ خالد اور قاسم کو گمان ہوا کہ بغداد کی راتوں کا ذکر کر رہی ہیں۔ بغداد کی راتوں کے قاہرہ میں بڑے چرچے تھے۔ گو قاہرہ کی راتوں میں بڑی حلاوت اور خوبصورتی تھی۔ لیکن لوگ دجلہ کے نام پہ ہی سحر زدہ ہو جاتے تھے۔ لہٰذا ریستوران کے بوڑھے بھی تالیاں بجا کر اُلف لیالی کی تکرار کرنے لگے۔

" یہ تو سب کے سب دیوانے ہو گئے ہیں۔ ہزار راتوں میں جانے کیا لطف مل رہا ہے کہ آگے بڑھتے ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے بچے بیٹھے ایک لفظ یاد کر رہے ہیں۔" قاسم ہنسا۔

" کیا خیال ہے۔ گانے کو آگے بڑھایا جاتے۔" خالد نے لمحہ بھر کے لئے تامل کیا۔ اور جب اُلف لیالی کی تکرار قدرے بند ہوئی اور موسیقی بجنے لگی۔ تو خالد نے اسی دھن میں نعرہ لگایا

اُلف لیالی۔ حیرۃ مِن جمالی

یا قلب گلابی

" اللہ اللہ!" بوڑھے خوش ہو کر چلائے اور خالد کو چبوترہ پہ آکر گانے کی دعوت دی۔ لیکن رقاصاؤں کی پیشانی پہ بے شمار بل پڑ گئے۔

" افوہ۔ ایسے کونسے یوسفِ ثانی ہو۔ کہ دلوں کا دل بھی تمہارے حسن سے متحیر و سحر زدہ ہو کر رہ جائے۔" رقاصاؤں نے طنز کا بھر پور وار کیا۔ اور پھر گانے لگیں۔

حیرۃ مِن جمالک

یا الٰہی ۔ یا الٰہی

(اے اللہ ہم تیرے حسن و جمال سے متحیر ہیں)

خالد اور قاسم ہنسنے لگے کہ یہ رقاصائیں تو تصوف کی ماری جان پڑتی ہیں۔ معرفت کی باتیں کرتی ہیں۔ لیکن رقاصاؤں نے یا الٰہی کے عنوان سے رجزیہ گیت شروع کر دیا تھا۔

" جنگ ۔ جنگ ۔ اوہ ہر جگہ۔ ہر مقام پہ جنگ ــ بابا صاحب (ناصر) کی ایک آواز پہ ہم یقیناً جیش التحریر (فوجِ آزادی) میں شامل ہو جائیں گے۔ صبح جب ہم طلبا کو جلوس کے لئے میدان التحریر میں جمع کر رہے تھے تو ہم نے عہد کیا تھا کہ ابو خالد (ناصر) کی پکار پہ جنگ میں کود پڑیں گے۔ لیکن جنگ اگر ہوئی تو وہ لڑکی ہمیں دوبارہ نظر نہ آئے گی جو شارع ۲۶ یولیہ کے ایک مکان کی بالکونی میں کھڑی دیوی آئی سس کی مانند پیغام حیات دیتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں امید کا اجالا تھا اور جب وہ سر ہلاتی تھی تو گویا وقت کا ہر ہر لمحہ اس کے ساتھ گھوم جاتا تھا۔ وہ بہار کی ایک روشن شام تھی۔ یہ شام دوبارہ کبھی نصیب ہو یا نہیں۔ کون جانے؟ ــ خالد نے جلدی سے استکان کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ قہوہ گرم تھا۔ حلق میں جا کر پھنس گیا۔ لیکن خالد تو گویا زندگی کی ہر ہر بوند اسی ریستوران میں پی لینا چاہتا تھا۔

الشجاع

"ہاں میرے دوست۔ یہ ناچتی گاتی زندگی، کائنات کا سحر و حسن اور یہ خوبصورت رقاصائیں، جنھوں نے زندگی کا رشتہ آواز اور تال سے قائم کر رکھا ہے، نیل کی وہ آہستہ خرام لہریں اور روشنیاں سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ جنگ کس قدر ہولناک چیز ہے کوئی ہم سے دریافت کرے، ہم ۱۹۵۶ء میں بھی ایک جنگ دیکھ چکے ہیں۔ بھلا ہماری جوانی کو جنگ اور موت سے کیا تعلق؟" وہ بڑبڑایا۔

"جوانیوں کی قربانی ہی ایک وطن کو آزاد اور سر بلند رکھتی ہے۔"

"ہاں ــ" استکان ختم کر کے خالد نے میز پہ دھرا اور آنکھیں مسلنے لگا۔ اس کے تمام تر جذبات آنکھوں میں اتر آئے تھے

آنسو قاسم کی آنکھوں سے بھی بہتے تھے۔ اس کا تمام جسم غم و غصہ سے پھٹ کر چیخ رہا تھا۔ اس کے جسم کی کھال بھی خالد کی طرح جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اور جسم کا ننگا حصہ اس ذبح شدہ بکرے کی مانند نظر آتا تھا جس کی کھال ادھیڑ لی گئی ہو۔

ان کی آنکھوں سے پانی اس طرح بہتا تھا گویا بینائی ختم ہو رہی ہو۔ سورج کی تیز شعاعیں آنکھوں کے عین آگے بھوت بن کر ناچتی تھیں اور تمام صحرا اس طوائف کی مانند پھیلا پڑا تھا جس کے در سے کسی کو کچھ فیض نہ پہنچے۔ اور محض بیماریاں ملیں۔ وہ تین میل لمبا جلوس شارع ۲۶ یولیو کی دلربا اور وہ موٹی رقاصائیں اور ان کے گیت اور طاولی کھیلتے بوڑھے سب کے سب الف لیلیٰ کی ایک شب پارینہ بن چکے تھے۔ اور یہ لڑکے وقت کے ایک شدید جھٹکے سے نیل کی خنک شاموں بہت پیچھے چھوڑ کر وقت کے کسی نامعلوم گوشہ میں بھول کر یہاں صحرائی دھوپ میں آ گئے تھے۔ اور اذیت کے طویل تجربے سے گزر کر اب جلتی ریت پہ رینگ رہے تھے۔

اور نہیں جانتے تھے کہ وہ کس ریت پہ بھٹک رہے ہیں؟ منزل بھی نامعلوم تھی۔ وہ محض سائے کی اور ایک گھونٹ پانی کی جستجو میں تھے آلِ علی بھی پانی اور سائے کی تلاش میں یونہی میدانِ کربلا میں تڑپتی بلکتی رہی تھی۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ اپنے کٹے پھٹے جسم آگے بڑھا رہے تھے اور ان کے سروں پہ دو گدھ کب سے منڈلا رہے تھے۔ یہ گدھ لڑکوں کے ہمت ہارنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ گدھ یہاں کہاں سے آ گئے تھے۔؟

"یہ گدھ نہیں ہیں۔ ہمارے وہ ہم وطن ہیں جنھوں نے غداری کر کے ہمیں اس حالت پہ پہنچایا۔" آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا سایہ کر کے خالد پوری قوت سے ریت سے اوپر اٹھا۔ اور مٹھی بھر ریت اٹھا کر گدھوں کی طرف پھینکی۔ گدھوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ لیکن اپنے مقام سے نہیں ہٹے۔ اگر لڑکوں کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا۔ تو یقیناً گدھوں کو مار ڈالتے۔ جن کا قہقہہ بار بار ایک ہی لفظ بن کر تمام صحرا میں گونجتا تھا۔

"غداری ــ غداری ــ غداری ــ!"

صحرائے سینا میں زبردست غداری ہوئی تھی۔ العریش کے فوجی گورنر نے مقابلہ کی زحمت گوارا کئے بغیر صلح کا پرچم لہرا دیا تھا۔ اور اسرائیلی جنرل ابراہیم یوفی کی فوجیں شرم الشیخ پہ نیلا اور سفید نجم داؤدی لہراتی آ بناتے طیران سے ابو اغلیہ تک بڑھ گئی تھیں ابو اغلیہ سے جنرل شرون کی فوجیں مصری افواج کے سروں پہ قدم دھرتی فتح کے ڈنکے بجاتی نخل تک پہنچ گئی تھیں۔ جہاں مصر کے سٹالین دبابات مقابلہ کے لئے موجود تھے۔ نخل میں دبابات کی زبردست جنگ ہوئی اور مصری بریگیڈیئر احمد عبدالنبی بڑی آسانی سے سگریٹ پیتا دشمن کے ہاتھ آ گیا۔

"شکست۔ شکست۔ شکست ــ!" ریت کا ایک ایک ذرہ بآوازِ بلند کہتا تھا۔ اور لڑکوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ قاسم غصہ سے ریت پہ ایڑیاں رگڑنے لگا۔ گویا تمام ریت اپنے قدموں سے کچل دینا چاہتا ہو۔ جب ابراہیم کے بیٹے اسمٰعیل نے صحرا میں ایڑیاں رگڑی تھیں۔ تو دریائے یردن کے اس پار بطرہ کے مقام پہ چشمۂ خیر پھوٹ پڑا تھا۔ لیکن قاسم نے ایڑیاں رگڑیں تو تمام پاؤں ہی زخمی ہو گئے۔

یہ غیر تربیت یافتہ اور راستوں سے ناواقف نوجوان جنگ سے چار روز پیشتر ہی جیش التحریر میں بھرتی ہو کر ابو اغلیہ آئے تھے۔

ایسے ہی ناتجربہ کار نوجوان لڑکر کٹ مرے تھے اور وہی اسرائیلی تعذیب کا نشانہ بنے تھے۔ ورنہ فوج میں زبردست غداری ہوئی تھی عام سپاہیوں کو اعلیٰ افسران نے راستہ سے بھٹکا دیا تھا۔ اور خود لڑنے کے بجائے وطن کی شکست کا تماشا دیکھا کئے تھے دیگر بے شمار لڑکوں کی مانند خالد اور قاسم کو بھی دشمن باندھ کر ہمراہ لے چلا تھا اور ان کے جسم کا ایک ایک رؤاں نوچتا تھا۔ اور ابلتے پانی میں غوطے دیتا تھا کہ "لو آبنائے طیران اور نہر سوئیز کے پانی کا لطف اٹھاؤ۔"

وہ تو لڑکوں کو مزید اذیت دینے اور لطف اندوز ہونے کے لئے نخل تک لے جا رہے تھے لیکن نخل میں دبابات کی جنگ چھڑی تھی لہٰذا یہ لڑکے بھی راستہ میں پھینک دیئے گئے۔ اور اب لڑکے اسی سینا میں سرگرداں تھے جہاں بنی اسرائیل اپنے گھر کی تلاش میں ایک مدت تک آنسو بہاتی رہی۔ جہاں کئی فاتح اعظم آئے۔ اور ایڑیاں رگڑتے چلے گئے ۳۳۲ قبل مسیح سکندر اعظم یہاں بھٹکتا پھرا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں نپولین کی فوجیں یہاں "جنگ فراعنہ" لڑنے آئیں یہیں مملوکوں نے اپنا پرچم لہرایا۔ اور یہ وہی ابدی سینا تھا۔ جو افریقہ کو ایشیا سے قطع کرتا ہے اور بحر ابیض کو بحر ہند سے الگ کرتا ہے۔ جہاں تپتی ریت پہ محض ہوا کی آواز گونجتی ہے۔ جہاں سراب ہر نقش پا کو مٹا دیتے ہیں۔ وہاں دو لڑکے اپنا راستہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"پانی۔ پانی"، خالد دھیرے سے کراہا۔ اس میں قاسم کی طرح اوپر اٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ اس کی زبان باہر لٹکتی تھی اور آنکھیں ابل رہی تھیں۔ اس کے گلے میں وہی سکارف بندھا تھا۔ جو شارع ۲۶ یولیو کے ایک گھر سے ایک لڑکی کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ گھر اب بھی موجود تھا۔ یا نہیں؟ — نہیں — انسان کا گھر کہیں بھی نہیں رہا تھا۔ وہ لڑکی کہاں گئی۔؟

خالد کو سامنے ریت پہ لڑکی کی صورت نظر آئی۔ اور وہ اپنی تمام تر طاقت جمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن لڑکی ایک جھلک دکھا کر سراب کی دیوی کی مانند غائب ہو گئی تھی۔ خالد نڈھال ہو کر ریت پہ گرنے کو تھا کہ قاسم نے اپنے کمزور ہاتھوں سے تھام لیا۔
الشہابؔ

"ہمت سے کام لو۔ دوست۔ ورنہ اسی صحرا میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے۔ اور پھر کبھی اس شارع ۲۶ یولیو کی دلربا کو نہ دیکھ پاؤ گے۔"

"میں ابھی ابھی اسے یہاں دیکھ چکا ہوں۔ وہ دیکھو، وہ پھر نظر آ رہی ہے۔ وہ سامنے کھڑی ہنس رہی ہے۔ اور مجھے بلا رہی ہے۔" خالد بچوں کی طرح چلا کر اپنے قدموں پہ کھڑا ہو گیا۔ قاسم نے آنکھوں پہ ہاتھوں کا سایہ کر کے سامنے دیکھا جہاں خالد نے اشارہ کیا تھا لیکن وہاں محض سیاہ سیاہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ قاسم نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑ ڈالیں۔ لیکن سیاہ دھبے بدستور نظر آ رہے تھے۔

غالباً یہ سیاہ دھبے وادیٔ قمر کے درخت تھے یا پھر کوئی پناہ گاہ تھی۔ قاسم کو خیال آیا کہ وادیٔ قمر بھی یہیں کہیں قریب ہی تھی۔ خوشی سے وہ بے خود ہو گیا اور منزل کی امید سے خود کو دفعتاً ہلکا پھلکا اور صحت مند محسوس کرنے لگا۔ وہ خالد کا ہاتھ تھام کر پوری قوت سے سیاہ دھبوں کی طرف دوڑنے لگا۔

وہ آنکھیں بند کئے اندھا دھند ایک ہی سمت دوڑتے چلے جا رہے تھے کہ کسی شئے سے ٹکرا کر اور ہانپ کر وہ نرم اور بھیگی زمین پہ اوندھے منہ گر پڑے۔ رسیلی ریت ان کے منہ میں بھر گئی۔ ان پہ منڈلاتے گِدھ تو ان کا تعاقب کرنے کے بجائے غائب ہو گئے تھے لیکن وہ وادیٔ قمر میں نہیں بلکہ "وادیٔ موت" میں پہنچ گئے تھے۔ ان کے چاروں طرف جلتے ٹینک اور لاشیں اور خون ہی خون پھیلا تھا۔ وہ نخل کے علاقہ میں پہنچ گئے تھے اور آبادی کے قریب آ گئے تھے لیکن ان کے ارد گرد موت کی آبادی تھی۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا اور آگ و خون سے بچتے بچاتے رینگتے رینگتے آگے بڑھنے لگے۔ جہاں ایک درخت کے سایہ میں ایک پناہ گاہ سی بنی تھی۔ وہ پناہ گاہ کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ یہ دراصل مورچہ تھا۔ جس میں بدستور زندگی کی حرارت اور انسانی وجود کی گرمی کا احساس تھا۔

زخمی آنکھیں کھول کر انھوں نے مورچے کا جائزہ لیا۔ اور آنکھوں سے نکلا دم دوبارہ آنکھوں میں آ گیا۔ مورچے میں پانی کا ایک چھاگل۔ کچھ کچا پکا گوشت اور کھجوریں پڑے تھے۔

"کھجور کے بسکٹ ــ پانی اور گوشت سے جسم کو حرارت پہنچانے کی خاطر انھوں نے بسکٹ اٹھائے۔ یہ بسکٹ یہاں کہاں سے آگئے ؟۔ تنور میں بنے کھجور کے بسکٹ محض اہلِ بغداد و بصرہ بناتے تھے۔ غالباً اس مورچہ میں کوئی عراقی سپاہی مقیم تھا۔ لیکن نہیں۔!

خالد اور قاسم کے ذہن کو جھٹکا سا پہنچا۔ عراقی سپاہی بھلا یہاں کہاں سے آگیا ؟ عراقی فوج تو یہاں کسی طور نہ آئی تھی۔ وہ اردن میں لڑ رہی تھی۔ اور عراق و اردن کی سرحدوں کی حفاظت کر رہی تھی۔ یہ مورچہ یقیناً کسی ایسے اسرائیلی کا تھا۔ جو عراق سے اسرائیل پہنچا ہو۔ اور کچھ عرصہ پیشتر تک عراق میں بیٹھا عربوں کی جاسوسی کرتا ہو۔ عراق میں کئی یہودی عورتیں مسلمان بھی تو ہو گئی تھیں۔ کون جانے وہی خواتین جاسوسوں کی مدد کرتی تھیں۔

ذہن تیزی سے سوچنے لگا تو انھوں نے آنکھیں بھی پوری طرح کھول دیں۔ وہ آخر کہاں تھے ہم۔ اپنی زمین پہ۔ اپنے گھر میں۔! لیکن اس زمین ــ اس گھر پہ تو اغیار قابض ہو گئے تھے۔ سامنے ایک جلسی عمارت پہ نجمِ داؤد لہرا رہا تھا۔ اور دور سے قہقہوں اور گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فاتح قوم اپنی فتح کا جشن منا رہی تھی۔

وہ آوازیں سنتے رہے اور پرچم کو دیکھتے رہے۔ پھر ایک جذبہ کے تحت اٹھے، اور ملبہ پہ گرتے پڑتے پرچم تک پہنچ گئے۔ یہ پرچم یہاں کیوں تھا ؟۔ کیوں تھا آخر۔ ؟

اس پرچم کے بجائے وہ زرد سکارف یہاں کیوں نہ تھا۔؟ خالد نے گلے سے سکارف اتار کر فضا میں لہرایا۔ یہ سکارف اس کپاس سے بنا تھا جو مصر کی زمین پہ اگتا تھا۔ نیل کے پانی سے سیراب ہوتا تھا۔ اور فلّا حین کے ہاتھوں پروان چڑھتا تھا۔ یہ کپڑے کا ایک ٹکڑا نہ تھا۔ یہ مصر کے محنت کش عوام تھے۔ یہ مصر کی زمین تھی اور یہ خالد اور قاسم کا گھر تھا۔

وہ دونوں نجمِ داؤد نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ نہ جانتے تھے کہ ابو اغیلا اور وادئ قمر کی جانب سے آنے والے راہ بھٹکے جوانوں کے شکار کے لئے غاصب ملبہ کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں۔ گولیاں دونوں کے سینہ میں پیوست ہو گئیں اور وہ نجمِ داؤد کے ساتھ نیچے گرم ریت پہ آگرے۔ اسی ریت سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔ دم توڑتے توڑتے بھی انھوں نے نجمِ داؤد کی جگہ وہ زرد سکارف لہرا دیا، جو ان کے خون سے تر تھا۔

اور خون کا ہر قطرہ ٹپک ٹپک کر کل عالم سے یہی کہہ رہا تھا

"ہمارا گھر ہمیں واپس دو"

صفحہ ۲۲ کا بقیہ ــــــ انسانوں کا شکار

میں وعدے کے مطابق نہایت فراخ دلی سے اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں ــ جنرل نے دیکھا، ڈینس فورڈ اب بھی اسی طرح کھڑا ہے۔ وہ مسکرایا بھی نہیں۔ انتہائی سرد لہجے میں اس نے جنرل کو گھورتے ہوئے کہا

"نہیں پیارے جنرل۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی بازی ختم نہیں ہوئی۔ کھیل کا رنگ تو اب جمے گا۔ کچھ شکار کا لطف مجھے بھی تو اٹھانے دو۔"

جنرل کسی درندے کی طرح چونکا۔ وہ اس کے بے حد نزدیک تھا۔ پھر قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"خوب، بہت خوب۔ میں تمہارے خیال کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا بہتر ہے تھکے ہوئے کتوں کی ضیافت کا کچھ تو انتظام ہونا ہی چاہیئے۔ اچھا تو مسٹر ڈینس فورڈ ــ" یکایک وہ اپنی آواز بلند کرتے ہوئے غرایا ــ" ہوشیار ۔۔۔!! پہلے گولی کی آواز سنائی دی اور پھر ایک کربناک چیخ بلند ہوئی۔ پھر دوسری گولی کی آواز سنائی دی۔

"پچھلے لمحات بھی کتنے بھیانک تھے میرے خدا ــ" ڈینس فورڈ نے جنرل کے نرم و گداز بستر پہ بیٹھ کر سوچا۔

اس کے قدموں کے قریب ہی جنرل کا لاشہ مردہ جسم اوندھے منہ فرش پہ پڑا تھا۔

ہندی کہانی

نوشتہ: شکتی پال

ترجمہ: ساجدہ عابد

احمق

میں لکھنے کی میز پر بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔
میں نے وہیں سے پکارا۔ کون صاحب ہیں؟ دروازہ کا پردہ ہٹا اور ایک صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں نے پوچھا فرمائیے۔

"اجی فرمائیں کیا خاک"۔ وعدہ خلافی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں فرمایا۔ "دیکھئے نا میں شمس الدین صاحب سے ملنے چوتھی بار آیا ہوں۔ مگر وہ حضرت ہیں کہ ذرا بھی وقت کے پابند نہیں۔ واللہ مل جائیں تو ایمان کی سطح برابر کردوں۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ صاحب میرے پڑوسی شمس الدین سے ملنے آئے ہوں گے۔ وہ بے حد غصہ میں تھے۔ میں نے انہیں ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔ ان کے نام کوئی پیغام ہو تو دیتے جائیں۔ میں انہیں پہنچا دوں گا۔"

"اسی لئے تو حاضر ہوا ہوں۔" یہ کہکر انہوں نے کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے تہہ کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے رسماً ان کا نام پوچھا تو فرمایا۔

"خاکسار کو احمق حیدرآبادی کہتے ہیں۔"

"تو گویا حیدرآباد میں بھی احمق ہوتے ہیں؟"

"یہاں کے احمق ہی تو مشہور ہیں — وہ اپنی اس بات پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"واہ احمق صاحب! کیا اچھی بات کہی آپ نے۔ آپ کو پسند ہے؟"

"بے شک۔"

"آداب عرض۔" انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو الو کی طرح گھمایا اور پھر فرمایا۔ اس سلسلہ میں ایک شعر عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اگر احمق صاحب نے شعر و شاعری کا سلسلہ شروع کر دیا تو صبح سے شام ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں میں اپنا

میں نے پہلی نوکری اس لئے چھوڑی کہ مالک ہر روز دس منٹ لیٹ آتا تھا۔ دوسری اس لئے چھوڑی کہ منیجر میرے شعر گنگنانے پر اعتراض کرتا تھا۔ تیسری اور چوتھی سے محض اس لئے ہاتھ دھونا پڑا کہ انتظامیہ کے لوگ ہر وقت ناک کو انگلیاں لگاتے رہتے تھے۔

مضمون پورا نہ کرسکوں گا۔ اور بیگم صاحبہ الگ ناراض ہوں گی۔ اللہ جانے انہیں شاعری سے کیوں نفرت ہے۔ لہٰذا میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔ زہے نصیب۔ آپ شاعری کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ لیکن کبھی فرصت کے وقت تشریف لائیں تو.....؟

وہ فوری بول اٹھے۔ فرصت پر ایک شعر یاد آگیا ہے۔

یہ سہانا موسم اور اس پر فرصت میں تیرا آنا
جیسے موسم برسات میں پیاسے کو پیاس کا لگنا

"سبحان اللہ۔ لیکن شعر تو بے وزن ہے۔"

"زندگی بے وزن ہو تو شعر میں وزن کہاں سے آئے۔"

میں لاجواب ہوگیا۔ پھر بات کا رخ بدلنے کے لئے پوچھا۔ احمق صاحب آپ شوق کیا فرماتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ.....؟

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ میں ۲۴ نوکریاں کرچکا ہوں۔ لیکن اب دو مہینے سات دن سے بیکار ہوں۔"

میں نے بیزاری کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نوکری کرنے اور چھوڑنے کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

"نہیں بلکہ قصور لوگوں کا ہے۔ پہلی نوکری اس لئے چھوڑی کہ مالک ہر روز دس منٹ لیٹ آتا تھا۔ میں نے اسے جھڑکا اور کام چھوڑ دیا۔ دوسری اس لئے چھوڑی کہ وہ میرے شعر گنگنانے پر اعتراض کرتا تھا۔ تیسری اور چوتھی سے محض اس لئے ہاتھ دھونا پڑا چونکہ وہ لوگ ہر وقت ناک کو انگلی لگاتے رہتے تھے۔ پانچویں اس لئے چھوٹ گئی کہ میں ایک روز دیر سے نیند سے بیدار ہوا اور گیا ہی نہیں۔ کیونکہ میں وقت کا پابند ہوں۔ چھٹی ملازمت اس لئے گئی کہ وہ میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔"

"مطلب" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری شاعری کو اندھے کے ہاتھ کا ڈنڈا کہتا تھا۔ نامعقول۔"

اس کے بعد ایک گھنٹہ تک احمق صاحب مسلسل اپنی نوکریوں کی داستان سناتے رہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ صاحب نہ صرف باتونی ہیں بلکہ ان کے دماغ کی کوئی نہ کوئی چول بھی ڈھیلی ہے۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا۔

اشتہاع

"آپ چائے کا شوق نہیں فرماتے؟"

میں ان کی بیباکی پر دل ہی دل میں کٹ سا گیا۔ مگر بظاہر افسوس کرتا ہوا بولا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ میں آپ کی باتوں میں اتنا کھو گیا کہ آپ سے پان اور چائے کے لئے پوچھ ہی نہیں سکا۔" میں نے نوکر کو بلا کر اندر سے چائے لانے کی ہدایت کر دی۔

"ساتھ ہی کچھ کھانا بھی لانا" یہ احمق صاحب تھے۔

"آپ کافی زندہ دل معلوم ہوتے ہیں۔ میری اس بات پر انہوں نے زور کا قہقہہ لگایا اور زندہ دلی پر ایک شعر بھی پڑھ دیا۔ اس بن بلائے مہمان نے ایک گھنٹہ تک میرا دماغ چاٹا۔ اور چائے پی کر کھسک گیا۔

اس کے جاتے ہی بیگم نے کمرے میں قدم رکھا اور ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔ "یہ موا صبح ہی صبح کون آمرا تھا"

"بیگم تمہاری ایسی ہی باتیں دل کو جلا کر خاک کر دیتی ہیں۔ وہ ایک شریف آدمی تھا۔" شاعر"

"یہ لو اور سنو۔ شاعر اور شرافت میں کیا تعلق؟" یہ کہہ کر انہوں نے کمرے کی ہر چیز کو غور سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

شام میں شمس الدین صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ احمق صاحب کا نام سنکر خوب زور سے ہنسے۔ میں نے کھسیانا سا ہو کر پوچھا ـــ حضرت بات کیا ہے؟

"آپ کو معلوم ہو جائے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے جدا ہوگئے۔ تین دن بعد میں بازار سے گزر رہا تھا۔ اچانک کسی نے پکارا۔ امین صاحب۔ اجی امین صاحب ـــ میں نے گھوم کر دیکھا سامنے احمق صاحب کھڑے تھے۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"اوہ۔ آپ ـــ آداب بجا لاتا ہوں۔"

احمق صاحب نے آداب کا جواب دئیے بغیر دریافت کیا۔ "کیا آپ بہرے ہیں؟"

"جی ـــ جی نہیں۔"

"قبلہ میں نے آپ کو چار بار آوازیں دیں۔ مگر آپ نے سنا ہی نہیں۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ شور کی وجہ سے ...... وہ فوراً بات کاٹ کر بولے۔ قصور آپ کا نہیں، لوگوں کا ہے۔ چلتے چلتے باتیں نہیں کرتے بلکہ چیخیں مارتے۔ میرا بس چلے تو سب کو بہرا کر دوں۔"

"......جی؟"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ گونگا کر دوں۔ دیواروں پہ بورڈ لگوا دوں۔ "بازار میں بات کرنا منع ہے۔" پھر بولے کیسی کہی؟"

"بہت خوب۔ تو آئیے اسی بات پر چائے کا ایک دور ہو جائے"

"بہت بہت شکریہ۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔

"امین صاحب۔ ان کے لہجہ میں شکایتی پہلو نمایاں تھا۔ اتنے سنگدل مت بنئے۔ میرا بھی تو آپ پر کچھ حق ہے۔"

"کیوں نہیں، لیکن ــــ"

"تو بس میری دعوت قبول کیجئے اور چلے آئیے۔" دوسرے ہی لمحہ وہ میرا بازو پکڑ کر ایک ہوٹل میں لے گئے۔ بیرا آرڈر لینے آیا تھا کہ اسے دیکھ کر احمق صاحب نے ایک ہلکی سی چیخ ماری، جلدی سے اُٹھے اور دوسرے ہی لمحہ وہ ایک چھلانگ میں سڑک پر تھے۔ آس پاس کے لوگ ان کی اس حرکت پر مسکرانے لگے۔ میں خود حیران تھا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ پانچ چھ گز کی دوری پر کھڑے ہو کر وہ مجھے اپنی طرف بڑھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے نزدیک جا کر پوچھا۔ کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟

"بدتمیز، نامعقول۔" میرے کان سے منہ لگا کر انہوں نے کہا "بیرا ناک کو انگلی لگا رہا تھا۔ مجھے ان کی کمزوری یاد آ گئی اور میں نے بے ساختہ ہنسی پر فوری بریک لگا دیئے۔ اس کے بعد وہ کئی ہوٹلوں میں گھومے اور کہیں بھی نہ بیٹھ سکے۔ ایک ہوٹل سے تو وہ صرف اس لئے واپس آ گئے کہ انہیں اس ہوٹل کا نام پسند نہیں آیا۔ وہ مجھے اپنے پرانے اڈے پر لے جانا چاہتے تھے۔ جہاں کوئی ناک کو انگلی نہیں لگاتا۔ چائے میں ان کے شعروں کا مزہ ہے۔ اور جس کا نام انہوں نے سینے چلی بتایا تھا مگر میں انکار کر رہا تھا۔ وہ مجھے کچھ نہ کچھ کھلانا چاہتے تھے۔ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک خوانچہ والے کے پاس جا کر بولے۔

"آلو کی ٹکیہ کیسے دوگے؟"

"ایک آنہ میں۔"

"اصلی گھی کی ہے؟"

"ایک آنہ میں اصلی گھی ملتا ہے۔"

"تو آلو اصلی ہوں گے؟"

خوانچہ والے نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور وہ فوراً آگے بڑھ گئے۔ قریب سے ایک بس گزری تھی۔ احمق صاحب نے آداب عرض کیا اور ایک ہی چھلانگ میں چلتی بس میں سوار ہو کر یہ جا وہ جا ہو گئے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ چلو پیچھا تو چھوٹا!

دوسرے دن شام میں میں دفتر سے واپس آیا تو بیگم صاحبہ نے کہا۔ آپ کے دوست آئے تھے احمق صاحب۔ بیگم کی زبان سے ان کا نام سنکر حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ آپ سے کچھ بات ہوئی؟۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ نوکر گھر سے باہر تھا۔ میں نے پردے کی آڑ سے بات کی۔ وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے واپس ہو گئے۔ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

یا اللہ یہ کیسا انقلاب ــــ زندگی میں پہلی بار بیگم کے منہ سے اپنے کسی ملنے والے کی تعریف سن رہا تھا۔ آخر احمق صاحب نے کونسی جادو کی چھڑی سے کام لے کر یہ کرشمہ کر دکھایا؟ ــــ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک آواز آئی۔

آداب عرض ہے۔

آئیے احمق صاحب آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ میں پہلے بھی آیا تھا مگر آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ بیگم صاحبہ سے گفتگو ہوئی۔ کیا ادبی ذوق پایا ہے۔ ہلتے پردہ کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ بیگم اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی ہیں۔ احمق صاحب نے بولنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ میاں میں بھی کہوں کہ آپ اتنا اچھا لکھ کیسے لیتے ہیں؟ بھئی آپ خوش قسمت ہیں جو ایسا اچھا ادبی ذوق رکھنے والی بیوی آپ کو ملی۔ ورنہ عورت ذات تو اچھے خاصے گھر کو جہنم بنا دیتی ہے۔ میری طرف جھکتے ہوئے انہوں نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ میری عمر ۴۸ سال ہے۔ شادی محض اس لئے نہیں کی کہ نہ جانے آنے والی کا مزاج کیسا ہو گا۔

کھٹ کھٹ کا کلام پر بھی اثر پڑتا ہے۔

وہ بولتے رہے اور میں جی ہاں، جی ہاں کرتا رہا — اندر سے چائے اور نمک پارے بھی آ گئے۔ اچانک چائے پیتے ہوئے احمق صاحب اچھل پڑے اور جھومتے ہوئے بولے - واہ واہ کیا موقع سے یاد آیا۔ آج میں چڑیا گھر دیکھنے گیا تھا۔ ایک نظم لکھی ہے وہاں سے متاثر ہو کر۔ سنئے گا — اور یہ کہہ کر پوری نظم سنا دی

پردہ کے پیچھے سے دبی دبی ہنسی کی آواز ابھری۔ میں نے بات کا رخ پلٹا اور آمد کی وجہ معلوم کی تو یکایک سنجیدہ اور غمزدہ ہو کر احمق صاحب نے فرمایا — قبلہ امین صاحب، بڑی مصیبت میں ہوں۔ پچاس روپے کی سخت ضرورت آ پڑی ہے۔

"مگر...... دیکھئے ہیں"

"اچھا پچاس نہیں پچیس ہی دے دیجئے، اس میں کام چلا لوں گا"

"لیکن ......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بیس روپے سے ایک پائی کم نہ لوں گا"

اندر سے بیگم نے آواز دی — سنئے تو — جب میں اٹھ کر اندر گیا تو انہوں نے دریافت کیا کیا بات ہے؟

"احمق صاحب کو بیس روپے کی ضرورت آ پڑی ہے"

تو دیدو نا۔ اللہ جانے کس مصیبت میں ہیں جو مصیبت میں دوسروں کے کام آتے ہیں اللہ ان پر مہربان رہتا ہے۔ احمق صاحب بیس روپے لے کر چلے گئے۔ ایک ادھورے مضمون کی تکمیل کے لئے میں میز پر جا بیٹھا اتنے میں بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں اور مشورہ دیا آپ گھوڑے اتنے لمبے لمبے مضمون کیوں لکھتے ہیں۔ کوئی ہلکی پھلکی چیزیں لکھئے۔ مطلب؟ جیسی احمق صاحب نظمیں لکھتے ہیں۔

میں دل ہی دل میں کٹ کر رہ گیا۔

کچھ دنوں بعد مجھے احمق صاحب کا ایک خط سنٹرل جیل سے ملا جو ایک ہفتہ قبل پوسٹ کیا گیا تھا۔ لکھا تھا کہ میں ان کی ضمانت کا انتظام کروں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی، سیدھا سادا آدمی تو وہ ایسے نہیں ہیں آخر کیا کر بیٹھے۔ میں فوراً شمس الدین صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے بتلایا کہ ایک پولیس انسپکٹر سے کسی بات پر جھگڑا کر بیٹھے۔ پھر اس بات پر اڑ گئے کہ پولیس انسپکٹر ان سے اظہار معذرت کرے انسپکٹر نے انہیں گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ اور وہاں سے کوئی ضمانت نہ ملنے پر جیل بھیج دیئے گئے۔ اب کیا کیا جائے۔

کچھ نہیں پولیس نے عدالت میں چالان پیش کیا جہاں مجسٹریٹ نے کل ہی ان کو شریف آدمی سمجھتے ہوئے چھوڑ دیا۔ اب وہ انسپکٹر کے خلاف اسمبلی میں سوال اٹھانے کے لئے ارکان اسمبلی کی کوٹھیوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ یہ کہہ کر شمس الدین صاحب ہنسنے لگے اور میں واپس آ گیا۔

ایک روز میں دفتر سے واپسی میں چائے پینے کے لئے "کافی ہاؤس" میں چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ احمق صاحب ایک ٹیبل پر چار پانچ آدمیوں میں گھرے بیٹھے ہیں اور وہ سب ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ احمق صاحب چیخ رہے ہیں۔ ڈانٹ رہے ہیں اور اچھل رہے ہیں۔ میں چپ چاپ ایک کونے والی میز پر بیٹھ گیا۔

ایک صاحب نے سوال کیا۔ آپ جیل گئے تھے لیکن کیوں؟"

"آپ کی عقل چرالی تھی"۔

میں بھی آپ کی عقل چرا لیتا لیکن آپ کے دماغ پر تو تالا لگا ہے۔ شور بہت تھا میں مزید کچھ سن نہ سکا۔ دیکھا کہ احمق صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور اس کے ساتھ ہی کرا کر کے بھری چائے کی میز الٹ گئی۔ ٹوٹی پیالیوں پر ایک نظر ڈال کر انہوں نے چوکڑی بھری اور کافی ہاؤس سے باہر چل دیئے۔

ایک آواز آئی۔ پولیس

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کافی ہاؤس کے بیرے اس کا مالک اور بہت سے تماشائی ان کے پیچھے بھاگے۔ ملی جلی آوازیں ہجوم میں سے ابھریں۔

پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔

احمق صاحب آگے آگے تیز تیز دوڑتے ہوئے چیخ رہے تھے خبردار اگر کوئی نزدیک آیا تو اسمبلی میں سوال اٹھوا دوں گا۔

میں نے بہتیرا کہا۔ انہیں تنگ کیوں کرتے ہو؟ جانے دو یہ پرانے وقتوں کے لوگ ہیں۔ لیکن کسی نے سنا ہی نہیں۔

دیویندر اسر

تاثرات

انٹی نیکوڈمل بننے کے لئے سگرٹ، چائے، کافی یا شراب پینا ضروری ہے! افیون، چرس اور بھنگ کا اب رواج نہیں رہا۔ لیکن اگر انٹی لیکچوئل کے ساتھ ساتھ ادیب بننے کا شوق بھی چرایا ہو تو کچھ نفسیاتی عادتوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً انتہائی درجہ کی خود پرستی اور خود نمائی کچھ انداز بوہیمیانہ، اور کچھ کجروی جینیانہ، اور اگر حالت جینیس بننے تک پہنچ جائے تو پھر قہوہ خانوں میں دنگا فساد، شراب پی کر سڑکوں پر اوندھے منہ پڑ جانا، پاگل خانے کی سیر اور انجام کار خودکشی تک نوبت پہنچنی چاہیئے۔

اور یہ سب کچھ اس لئے عمل میں لایا جاتا ہے کہ کچھ ماہرین نفسیات، چند تحلیل کار ادیبوں اور آج کل کے چند نقادوں نے ادیبوں کو خبر دی ہے کہ

> **نوجوان ادیب** بے راہ روی اور لاابالی پن کو بطور فیشن قبول کرتے ہیں۔ انھیں فخر ہے کہ وہ ابنورمل ہیں کیونکہ وہ ادیب ہیں۔ وہ عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ وہ فرسودہ رسوم اور منافقانہ سماج کے خلاف ہیں۔ وہ کسی قسم کے قاعدے قانون کے پابند نہیں رہ سکتے۔

ادیب ابنورمل ہوتا ہے اور جینیس کے لئے جنون لازمی ہے۔ ویسے بھی یہ بڑا رومانٹک خیال ہے۔ سینی ٹوریم میں ٹی بی کا مریض ہونا یا کسی پاگل خانے میں تخلیقی ادیب کرنا۔ سنا ہے کہ شاعر ECCENTRIC نہ ہو تو وہ شاعر ہی نہیں۔ عام لوگ بھی یہی تصور کرتے ہیں۔ شاعر کا تصور بھی ان کے ذہن میں کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ شاعروں کی ہیئت کو دخل ہے اور کچھ ان کے طرز عمل کو۔

کیا نورمل ادیب ممکن نہیں۔ یوں تو کوئی بھی آدمی پوری طرح نورمل نہیں ہوتا لیکن جس حد تک اس لفظ کا استعمال ممکن ہے جیسا کہ گرم برف یا انسانیت پرست نازی۔

الشہاع

ہرملر صاحب مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ انھوں نے پاگلوں کا معائنہ کیا ہے اور شاعروں کا بھی۔ ان کی نظر میں ہر ادیب خود آزار، سادیت پرست، انا پسند، نمائش پرست اور تانک جھانک کرنے والا ہوتا ہے۔ رومانی افسردگی اس کے مزاج میں شامل رہتی ہے اور اپنے لئے جذبۂ ترحم کو تحریک دینا اس کے لئے فطری ہے۔

تحلیل نفسی میں یقین رکھنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ادیب اپنے میلان سے ہی اعصابی خلل (نیوراسس) کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن فنکار ہونے کے ناطے سے وہ اس خلل کے حسرتناک انجام سے بچ جاتا ہے۔ یعنی پاگل خانے جانے سے بچ جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ کچھ ادیب اس بات پر ایمان لے آئے کہ اگر وہ نیوراسس کا شکار ہیں بھی تو وہ اپنا علاج نہیں کروانا چاہتے کیونکہ اگر وہ صحت یاب ہو گئے یا ان کا ذہنی توازن قائم ہو گیا تو وہ فنکار نہیں رہیں گے۔ ان کی تخلیقی قوت ختم ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں نیوراسس ہی سرچشمہ ہے ان کی تخلیقی قوت کا۔

ایسے ادیب اور ان کی سائنٹیفک طور پر پشت پناہی کرنے والے ماہرین نفسیات اپنے کلینکی تجربے اور چند مشہور ادیبوں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بغیر نیوراسس کے تخلیق ممکن ہی نہیں۔ ڈائلن ٹامس کے نیوراسس اور جینیس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ایمل زولا کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے پندرہ

ماہرین نفسیات سے اپنے ذہن کا معائنہ کرایا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تخلیق کا سرچشمہ اس کے مزاج کا نیوراتی عنصر ہے۔ ادب اور فن کے شعبے میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جب کہ ادیب یا فنکار کسی نہ کسی ذہنی یا جسمانی مرض کا شکار رہا ہے۔ مالیخولیا، میگولومینیا۔ پرانویا مونیمینیا۔ سکوزوفرینا جیسے ذہنی امراض کے ساتھ ساتھ ٹی بی۔ دمہ اور جنسی بیماریوں تک ایک سلسلہ ہے امراض کا جن کا شکار ادیب اور فنکار رہے ہیں۔ گیٹے فلابیر بالزاک اور وکٹر ہیوگو نے مالیخولیا کے مریض ہونے کا اقبال کیا ہے۔ روسو اور شیلر اس کا شکار اس حد تک ہوئے کہ انھوں نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ ایسے ادیبوں پر دیوانگی کے دورے پڑتے تھے۔ نیوٹن سوفٹ، سون برن، کامٹ، ارشمیدس، پاسکل۔ ڈیماس وان گو اور موپساں پر ایسے دورے کئی بار پڑے ہیں۔ اور یہ دیوانگی تو سمبالسٹ شعرا کی خصوصیت میں شمار ہونے لگی۔ ورلین، بودلیر اور ریلبو اس کی مثالیں ہیں۔ فرائیڈ نے اپنے مضمون دوستو وسکی اور پدرکشی۔ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دوستووسکی کی شخصیت اور فن میں چار عناصر کارفرما رہے ہیں۔ تخلیقی فن کار۔ نیوراتی۔ اخلاق پرست اور گناہ گار نطشے جیسا نامور فلاسفر بھی اس سے بچ نہیں سکا اور ہیگل نے تو اپنے آپ کو یسوع مسیح تک مشہور کر دیا تھا۔ ادب کی تواریخ کے صفحات پلٹیے جائیے ایسی کتنی ہی مثالیں ملیں گی۔

دوسرے درجے کے ادیبوں کا سہارا ایسی ہی مثالیں ہیں ان میں تخلیقی قوت تو کم موجود ہوتی ہے لیکن نفسیاتی الجھنیں بدرجہ اتم جن میں سب سے بڑی الجھن ہے۔ میگولومینیا۔ نپولین اور ہٹلر کا مرض (جناب کولن ولسن صاحب کے نظریئے کے مطابق ہٹلر اسی لئے قابل تحسین ہے کہ آؤٹ سائڈر ہے)

یہ مسئلہ اہم اس لئے نہیں کہ ادیب نیوراسس کا شکار ہوتا ہے کیونکہ ادیبوں کے علاوہ دوسرے عام لوگ بھی انہی اور دوسرے جسمانی اور ذہنی امراض کا شکار رہتے ہیں۔ نیوراسس ادیبوں کو ہی ودیعت نہیں ہوا لیکن وہ سب لوگ فن کار کیوں نہ بن گئے۔ ایسے ادیب بھول جاتے ہیں کہ اگر وان گو نیوراسس کا شکار تھا تو وہ پہلے تخلیقی فنکار تھا۔ جب تک اس کی تخلیقی قوت اس کے نیوراسس پر حاوی رہی وہ فن تخلیق کرتا رہا۔ لیکن جب نیوراسس اس پر حاوی ہو جاتا تو اس کی تخلیقی قوت سلب ہو جاتی تھی۔ اور اس کا حسرتناک انجام خودکشی کی صورت میں رونما ہوا۔ خطرہ تو اس بات کا ہے کہ نوجوان ادیب ان ادیبوں کے طرز عمل کی نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور بے راہ روی اور لاابالی پن کو بطور فیشن قبول کرتے ہیں۔ انھیں فخر ہے کہ وہ ابنارمل ہیں کیونکہ وہ ادیب ہیں وہ عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ وہ فرسودہ رسوم اور منافقانہ سماج کے خلاف ہیں۔ وہ کسی قسم کے قاعدے قانون کے پابند نہیں رہ سکتے۔ وہ آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی لبن کے کیو' میں نہ کھڑے ہونا ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ آزاد ہیں۔ سماجی ماحول سے ہم آہنگی کو وہ فیلسوفی اور بورژوا قرار دیتے ہیں۔ فرسودہ سماجی اداروں۔ روایات اور تعصبات سے بغاوت ضروری ہے۔ لیکن نئی اقدار کی اشاعت کے لئے نہ کہ ذاتی نفسیاتی دفاعات کے لئے۔ ستم تو یہ ہے کہ یہ باغی ادیب سماج سے مطالبہ کرتے ہیں کہ سماج ان کی حرکات کو نہ صرف برداشت کرے بلکہ انھیں ADORE بھی کرے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی بغاوت بھی بغیر کسی اعلیٰ آدرش کی تکمیل کے مصنوعی حملہ آوری کے سوا کچھ نہیں۔

ارسطو نے جینیس اور جنون کا مسئلہ کھڑا کیا اور کچھ ماہرین نفسیات نے فتوے دے دیا کہ جینیس اور جنون میں کوئی نفسی فرق نہیں سیموئل نے جینیس میں جنون کی تلاش کی۔ سرریلزم اور دادا ازم کے اثر کے تحت ۱۹۲۰ء میں پاگلوں میں تخلیقی قوت کو ڈھونڈھا جانے لگا۔ بقول شلنگ جینیس اور جنون ذہن کی دو متضاد کیفیتیں نہیں بلکہ ایک ہی کیفیت ہے کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ لیکن ہر اعلیٰ ادیب میں جنون ملتا ہے۔ ہر نیوراسس اگر ایک طرف جینیس کو جسمانی یا ذہنی مرض میں مبتلا کر دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی نعم البدل جسمانی یا ذہنی قوتوں کو بیدار بھی کر دیتا ہے۔ ایڈمنڈ ولسن نے تو اس رشتے پر ایک مکمل مکتبہ تنقید کی بنیاد ڈال دی۔ ان کے خیال میں نیوراسس کے بغیر ادیب کی تخلیقی قوت بروئے کار نہیں آ سکتی۔ فیلوکٹٹس کی مثال دیتے ہوئے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا اچوک حربہ بغیر کسی گھناؤنے اور لاعلاج مرض کے ممکن نہیں۔ زخم اور کمان میں اسی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ادیب کسی نہ کسی جسمانی یا روحانی زخم کا حامل

ہوتا ہے۔

چارلس لیمب جس کی دو بہنیں پاگل تھیں۔ پاگل پن کے بارے میں کافی معلومات رکھتا تھا اور خود بھی اعلیٰ درجہ کا ادیب تھا۔ اس نے اس سوال پر اپنے ایک مضمون میں اس بات کو غلط ثابت کیا ہے کہ تخیل کی فراوانی ایک طرح کا جنون ہے۔ پریزدم نے پاگلوں کے معائنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں دو فیصدی سے کم میں تخلیق کا رجحان پایا جاتا ہے، کلینکی تجربہ بتاتا ہے کہ آرٹ ایک جمالیاتی فعل ہے جو کہ اناکی سالمیت سے وابستہ ہے۔ آرٹ ایسے لوگوں کے لئے علاج کا ذریعہ ہے اور ان کی شخصیت کو INTEGRATE کرتا ہے۔

لائنل ٹرلنگ نے اپنے مقالے فن اور نیوراسس میں اس دلیل کو غلط ثابت کیا ہے کہ کمان کا عوضانہ زخم ہے یا بغیر زخم کے کمان نہیں چل سکتی یا اس کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہ فیلوسٹس کی داستان سے کسی بھی طرح واضح نہیں ہوتا۔ یعنی زخم کمان حاصل کرنے اور اس کو استعمال کرنے کی صلاحیت کے لئے لازمی نہیں۔ یہ صلاحیت اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ نیوراسس کی موجودگی یا عدم موجودگی محض اتفاقیہ ہے۔ نیوراسس تو موجودہ سماج کی ایک عام علامت ہے۔ اسے ادیبوں اور فن کاروں تک محدود کر دینا درست نہیں۔ اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ ہر نیوراتی تخلیق کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور ایک ادیب دوسرے سے نیوراسس کے باعث نہیں تخلیقی صلاحیت کے باعث مختلف ہوتا ہے۔ کارل ڑونگ کا خیال درست ہے کہ تخلیقی عمل کو نیوراسس کے سرچشمہ تک لے جانا شاعرانہ جینیس کے عمل کو ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ منٹو اور مجاز کا حسرتناک انجام اس کا بین ثبوت ہے۔ کاش سمرسٹ ماہم کا THE MOON AND SIXPENCE اور جیرد کیری کا THE HORSE'S MOUTH محض ناول ہوتے۔ آرٹسٹوں کی سوانح حیات نہیں تو بہت سے دوسرے درجے کے ادیب JUVENILE DELINGENT ہونے کے بجائے پختہ کار فن کار کا درجہ حاصل کر لیتے۔

ہٹلر کے تہہ خانہ میں ـــــ صفحہ ۲۲ کا بقیہ

ہٹلر نے فیلڈ مارشل کیٹل کو ساتھ لیا اور پرائیوٹ کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ میز پر شہر برلن کا نقشہ پھیلا دیا گیا اور ہٹلر برلن کو بچانے کا منصوبہ بنانے لگا۔ فیلڈ مارشل 'کیٹل' کے ساتھ غور و خوض کے بعد ہٹلر نے طے کیا کہ برلن کے جنوب مغرب محاذ پر کمان کرنے والے جنرل "وینک" کو حکم دیا جائے کہ اپنی بارھویں جرمن ڈیویژن کے ساتھ 'پوسٹڈام' آئے اور برلن کو بچانے کی کوشش کرے۔ فیلڈ مارشل 'کیٹل' نے اپنی خدمات پیش کیں، تب ہٹلر نے کیٹل کو یہ کہہ کر روک لیا کہ وقت ہو چکا ہے پہلے وہ کھانا کھائے اور تب اس کا پیغام لے کر جنوب مغرب محاذ پر جنرل 'وینک' کے پاس جائے۔ بالآخر ہٹلر کے ساتھ کھانا کھا کر فیلڈ مارشل کیٹل فیوہرر کا پیغام لے کر تہہ خانے سے باہر چلا گیا۔

۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء کی اہم کانفرنس اور اس کے بعد کے واقعات کا علم جب ہملر کو ہوا تب اچانک اس کی زبان سے نکلا "کیا برلن میں سب کے سب پاگل ہو چکے ہیں"۔ ٹھیک اس وقت ہملر کو ہٹلر کا فون ملا۔ ہٹلر فون پر ہملر سے مسلح افواج نیز ایس ایس جرنلوں کی بے وفائی کا ذکر کرتا رہا۔ ہملر نے اسے تسکین دینے کی کوشش کی لیکن ہملر کو محسوس ہوا کہ ہٹلر جسقدر مایوس ہے اسی قدر ضد بھی کر رہا ہے اس لئے کہ وہ اب تک تہہ خانے سے نہ نکلنے کے فیصلے پر اٹل تھا۔

فون کے بعد ہملر "اسکیلن برگ" کو بلایا اور کہا "اسکیلن برگ! تمہارا خیال درست ہے کہ مجھ کو ادھر یا ادھر اقدام کرنا چاہئے"۔ جب 'اسکیلن برگ' نے ہملر کی زبان سے پہلی بار اپنے خیال کی تائید سنی تو خوش ہوا اور کہنے لگا "میں اسی وقت 'کاؤنٹ برنا ڈوٹ' سے ملنے جا رہا ہوں کہوں گا کہ ہملر گفت و شنید کے آغاز پر آمادہ ہے"۔ یہ کہہ کر "اسکیلن برگ" تیزی سے باہر نکلا اور کار پر بیٹھ کر چلا گیا۔ (باقی آئندہ)

نہلے پہ دہلا

ندیم "(تیز لہجہ میں) میں پوچھتا ہوں تم نے بیگم صاحبہ سے یہ کیوں کہا کہ میرے دوست چھ بجے گئے ہیں۔"

کریم "(گھبرائے ہوئے لہجہ میں) میں نے تو نہیں کہا صاحب"

ندیم "(غصہ سے) اگر تم نے نہیں کہا تو پھر انھیں کیسے معلوم ہوا؟"

کریم "(آہستہ سے) میں کیا جانوں صاحب!! انھیں کیسے معلوم ہوا۔"

ندیم "(غصہ سے) انھوں نے تم سے ضرور پوچھا ہوگا کہ صاحب کے دوست کس وقت گئے تھے۔"

کریم "(آہستہ سے) پوچھا تو تھا صاحب۔"

ندیم "(سوالیہ لہجہ میں) پھر تم نے کیا جواب دیا۔؟"

کریم "(سادگی سے) میں نے کہا مجھے نہیں معلوم میں تو اس وقت انگیٹھی سلگا کر چائے کے لئے پانی رکھ رہا تھا"

{قدموں کی چاپ}

عقیلہ "میں نے کہا یہ گھر کیوں سر پہ اٹھا رکھا ہے۔ اور یہ کریم یہاں کیا کر رہا ہے؟"

کریم "(آہستہ سے) صاحب بلا وجہ خفا ہو رہے ہیں۔ آپ بتلایئے بیگم صاحب میں نے آپ سے کب کہا تھا کہ صاحب کے دوست چھ بجے گئے ہیں۔"

عقیلہ "(تیز لہجہ میں) میں پوچھتی ہوں آخر آپ اس غریب کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔"

ندیم "(غصہ سے) آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے اس کی یہ ہمت کہ یہ میری شکایتیں آپ سے کرے۔"

عقیلہ "یہاں کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے جا باہر جا کر صاف کر

{قدموں کی چاپ}

ندیم "(غصے سے) آپ کا یہ طریقہ سارا مجھے قطعی پسند نہیں ہے بیگم کہ آپ ـــــــ"

عقیلہ (تیز لہجہ میں) یہ رات کی ہار کا غصہ مجھ پر نہ اتاریئے۔ یہ تاش تو کم بخت میری جان لیں گے۔"

ندیم "(غصے سے) آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟"

عقیلہ "(تیز لہجہ میں) میری اس گھر میں چلتی کب ہے جو کچھ میں چاہوں ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ منحوس کھیل مجھے پسند نہیں مگر آپ کو تو مجھ سے جیسے ضد ہے۔"

ندیم (تیز لہجہ میں) میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ دنیا جہاں کے مرد کلب جاتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں اور میں ـــ"

عقیلہ "(بات کاٹ کر) مگر اس طرح رات کو دو دو بجے تک تاش نہیں کھیلتے۔"

ندیم "(تیز لہجہ میں) کیا فرمایا رات کو دو دو بجے تک میں تاش کھیلتا ہوں۔"

عقیلہ "(تیز لہجہ میں) کہہ دیجئے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

ندیم "(طنزیہ لہجہ میں) نہیں صاحب۔ جھوٹا تو میں ہوں مکار ہوں فریبی ہوں۔"

عقیلہ "میں نے تو یہ کبھی نہیں کہا۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ تاش کا کھیل بہت منحوس ہے ایسے ہی تاش کھیلتے کھیلتے آدمی جوا کھیلنے لگتا ہے"

ندیم (تیز لہجہ میں) کیا فرمایا میں جواری ہوں قمار باز ہوں اور

مستقبل قریب میں جیل جاؤں گا۔"

عقیلہ "(جلدی سے بات کاٹ کر) یہ میں نے کب کہا خدا نہ کرے آپ جیل جائیں۔"

ندیم "اور کس طرح کہیں گی۔ صاف تو کہہ دیا۔ {قدموں کی چاپ}

عقیلہ "(غصے سے) کہاں جا رہا ہے منے! ادھر آ دو گھنٹے سے کہاں تھا۔"

پپّن "(آہستہ سے) جی ۔۔ امی"

عقیلہ "یہ جیب میں کیا ہے چھپا کیوں رہا ہے۔ ہاتھ ہٹا۔"

پپّن "کچھ بھی تو نہیں ہے امی۔"

عقیلہ "(زور سے) گولیاں (غصے سے) یہ گولیاں تیرے پاس کہاں سے آئیں۔ میں نے کیا دیکھ رہے ہیں۔ آپ! ۔ صاحبزادے گولیاں کھیلنے لگے ہیں۔"

پپّن "(آہستہ سے) ہماری تھوڑی ہیں شاہد نے ہمارے پاس رکھوائی تھیں۔"

عقیلہ (طنزیہ لہجہ میں) جب باپ ہی کو فکر نہ ہو تو لڑکا گولیاں نہیں کھیلے گا۔ تو اور کیا کرے گا۔ اور ابھی کیا گیا ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔؟

ندیم "(ناصحانہ لہجہ میں) پپّن بیٹے اچھے لڑکے گولیاں نہیں کھیلتے بری بات ہے۔"

پپّن "(آہستہ سے) ابو ہم اکیلے تھوڑی کھیلتے ہیں شاہد بھی کھیلتا ہے پپو بھی کھیلتا ہے۔"

ندیم "(سمجھاتے ہوئے) گولیاں برے لڑکے کھیلتے ہیں بیٹے تم تو اچھے لڑکے ہو آئندہ کبھی گولیاں نہ کھیلنا۔ سمجھ گئے۔"

پپّن "(آہستہ سے) ابو آپ ہمیں منے منے تاش لا دیجئے۔ پھر ہم گولیاں نہیں کھیلیں گے۔"

عقیلہ "(طنزیہ لہجے میں) سن لیا آپ نے کیا فرما رہے ہیں صاحبزادے پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ رہے ہیں۔"

ندیم "لاحول ولا قوۃ۔ اس گھر میں تو میں اپنے لڑکے سے بھی بات نہیں کر سکتا۔"

عقیلہ (طنزیہ لہجے میں) لڑکے سے بات کرنے کے لئے آپ کے پاس وقت ہی کہاں ہے دوستوں اور تاش کے کھیل سے فرصت ملے تو گھر کی خبر لیں۔ کتنے دن سے چیخ رہی ہوں۔ کہ برتنوں پہ قلعی کرا دیجئے۔ لحاف میں روئی ڈلوا دیجئے۔ اسٹو الگ خراب پڑا ہے۔"

ندیم "(آہستہ سے) بیگم کسی وقت تو ہنس کر بات کر لیا کیجئے۔ بخدا آپ کے غصے کی وجہ سے گھر میں آتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

عقیلہ (طنزیہ لہجے میں) آپ گھر کو گھر کب سمجھتے ہیں آپ کے لئے تو یہ سرائے ہے۔ شام کو چھ سات بجے آئے جلدی جلدی کھانا کھایا پھر دوست آگئے بس شروع ہوگئے تاش رات کو بارہ ایک بجے آکر سوئے صبح جلدی جلدی ناشتہ کیا اور دفتر چلے گئے آپ کی بلا سے کوئی مرے یا جئے لڑکا واہی تباہی پھرتا ہے پھرا کرے۔

(دروازے پہ دستک)

ندیم "بیٹے جا کر دیکھو کون ہے۔" {قدموں کی چاپ}

عقیلہ "کتنے دن سے باجی بلا رہی ہیں ہر اتوار کو جانے کا ارادہ کرتی ہوں مگر جاؤں کس کے ساتھ۔"

ندیم "آپ نے تو مجھ سے کبھی نہیں کہا۔"

عقیلہ "اس منحوس کھیل سے آپ کو فرصت ہی کب ملتی ہے جو بات کروں۔" {قدموں کی چاپ}

پپّن "ابو۔ افضل چچا کے گھر میں سب لوگ جمع ہیں۔ آپ کو بلایا ہے۔"

عقیلہ "بس اب آپ شام کی خبر لیں گے۔"

ندیم "وارڈ کمیٹی کی میٹنگ ہے گھنٹہ بھر میں آتا ہوں۔"

عقیلہ "(آہستہ سے) آپ کے گھنٹہ بھر میں بس آج کا اتوار بھی گیا۔"

{قدموں کی چاپ}

منظر بدلتا ہے

{پس منظر میں مختلف آوازیں ون اسپیڈ۔ ٹو ڈائمنڈ
لو بٹ۔ ٹو نو ٹرمپ۔ چال چلئے۔ سوچ کیا رہے ہیں}

نفیسہ "(آہستہ سے) یہ شوق دولہا بھائی کو کب سے ہوا ہے عقیلہ بہن! پہلے تو وہ تاش نہیں کھیلتے تھے۔"

عقیلہ " (ٹھنڈی سانس لے کر) کیا بتاؤں نفیسہ۔ سال بھر سے میں اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ رات کو آٹھ بجے سے جو تاش کھیلنے بیٹھتے ہیں تو بارہ بج جاتے ہیں۔ اور سنیچر کی رات کو تو جیسے رتجگا ہوتا ہے۔ میں تو چار بناتے بناتے عاجز آجاتی ہوں۔"

نفیسہ " اے تو تم نے سمجھایا نہیں۔"

عقیلہ " بہن میں تو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لڑکا الگ بگڑ رہا ہے خود ان کی صحت گرتی جا رہی ہے اور میں تو جیسے قیدی بن کر رہ گئی ہوں۔ گھر سے نکل ہی نہیں سکتی

{ دور سے مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کیا دیکھ رہے ہو جا دید نہلے پہ دہلا مارو۔ شاباش۔ قہقہے }

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) عقیلہ تم بھی نہلے پہ دہلا مارو جبھی دولہا بھائی ٹھیک ہوں گے۔"

عقیلہ " (آہستہ سے) میں نے تو یہ سوچا ہے نفیسہ۔ کہ بیتن کو لے کر کچھ دن کے لئے اماں کے ہاں چلی جاؤں۔"

نفیسہ " اس سے کیا ہوگا اس طرح تو وہ اور بھی آزاد ہو جائیں گے۔"

عقیلہ " بہن یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں بھائی جان سے جا کر کہوں کہ وہ ان کو سمجھائیں۔"

نفیسہ " نا بہن یہ مشورہ تو میں بھی نہیں دوں گی۔ شوہر کی شکایت اپنے میکے والوں سے کبھی نہیں کرنا چاہیے۔"

عقیلہ " میں تو خود روز روز کی لڑائی سے تنگ آ گئی ہوں۔ بے حد چڑچڑے اور بدمزاج ہو گئے ہیں۔"

نفیسہ " (چٹکی بجا کر) وہ مارا نہلے پہ دہلا۔"

عقیلہ " (تعجب سے) نہلے پہ دہلا کیا مطلب۔"

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) یاد کریں گے دولہا بھائی بھی اللہ قسم۔ پھر جو کبھی بھول کر بھی تاش کا نام لیں۔"

عقیلہ " (بیتابی سے) بھئی اللہ ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ" { قدموں کی چاپ }

بیتن " امی! ابو کہہ رہے ہیں جلدی سے چھالیہ لی جائے بنا دیجئے۔"

عقیلہ " سن لیا نفیسہ۔ صبح دس بجے سے جو جمے ہیں تو جانے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں یہ چھٹی بار چائے طلب کی جا رہی ہے۔"

نفیسہ " کوئی بات نہیں آج اور صبر کر لو (گھڑی پانچ بجاتی ہے)۔ اچھا عقیلہ اب مجھے اجازت دو۔"

عقیلہ " وہ نہلے پہ دہلے والی بات تو رہ ہی گئی بہن!"

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) اس معمے کا حل کل پانچ بجے شائع ہوگا۔ اچھا خدا حافظ { قدموں کی چاپ۔ دروازہ بند ہونے کی آواز }

منظر بدلتا ہے

{ پس منظر میں باتیں کرنے کی مشترکہ آوازیں۔ نفیسہ اور عقیلہ کے قہقہے پھر عقیلہ کی آواز ابھرتی ہے۔ }

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) ترکیب تو لاجواب ہے مگر یہ کھیل تو میرے خاک سمجھ میں نہیں آیا۔"

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) سمجھنے کی کیا ضرورت ہے بھائی جان نے جو جملے اس پرچے پر لکھ دیئے ہیں۔ جب دولہا بھائی آئیں تو انھیں پڑھنے لگنا۔"

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) اسے کیا کہتے ہیں۔" ؟

نفیسہ " اس کا نام رُخ ہے اور یہ فرزین ہے اسے وزیر بھی کہتے ہیں۔"

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) پرچے میں لکھا ہے گھوڑا ڈھائی گھر چلتا ہے۔"

(دروازے پر دستک)

نفیسہ " شاید دولہا بھائی آ گئے۔ تم نہ جانا۔ بیتن سے کہو جا کر دروازہ کھولے۔"

عقیلہ " (زور سے) بیتن جا کر دروازہ کھولو"

نفیسہ (ہنستے ہوئے) کاغذ سامنے رکھ لو زور زور سے بولنا تاکہ دولہا بھائی سن سکیں۔ { قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے }

عقیلہ " (زور سے) جی نہیں چال واپس نہیں ہوگی۔"

نفیسہ " (زور سے) واہ بہن میں نے چال چلی کب ہے۔"

{ قدموں کی چاپ قریب آتے }

عقیلہ " (زور سے) اندر نہ آیئے گا۔ پردہ ہے۔ بیتن بیٹے اپنے ابو سے کہو وہ دالان میں بیٹھیں۔ میں ابھی آتی ہوں"

نفیسہ " (زور سے) کیا سوچ رہی ہو عقیلہ بہن چلو چال۔"

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) یہ لیجئے رخ بچایئے۔"

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) بھئی اللہ کس قیامت کی چال چلی ہے ابھی چھ دن بھی نہیں ہوئے شطرنج سیکھے اور عالم یہ ہے کہ کہنا پڑتا ہے کہ دوڑو عقیلہ چال قیامت کی چل گئی ۔

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) باتیں بعد میں بنایئے گا پہلے رخ بچایئے "

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) (زور سے) عقیلہ بہن میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں سمجھ رہی ہوں آپ کی چال "

عقیلہ " (زور سے) میں تو تمہارے فائدے کی بات کہہ رہی تھی۔ نہ بچاؤ رخ۔ میرا کیا جاتا ہے "

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) میں خوب سمجھتی ہوں۔ میں رخ بچاؤں تو آپ دوسری چال میں فرزیں ماریں "

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) تو سرکار یہ گیا آپ کا رخ اب چلئے کیا چلتی ہیں "

ندیم " (آواز دور سے) بیگم ذرا یہاں تو آیئے ۔"

عقیلہ " (زور سے) ابھی آتی ہوں بازی ختم ہونے والی ہے۔ "

نفیسہ (ہنستے ہوئے) پیدل بچاؤ عقیلہ بہن ۔

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) پیدل تو بعد میں بچاؤں گی۔ آپ شہ بچیئے "

نفیسہ (تعجب سے) ارے ــــ یہ کیا (ایک لمحے کے توقف کے بعد) ادھر رخ کی شہ پڑ رہی ہے۔

عقیلہ " اور اس خانہ میں بھول کر نہ آیئے گا ادھر فرزیں کی شہ ہے۔

نفیسہ " (زور سے) یہ لیجئے بس یہی ایک گھر ہے۔ "

عقیلہ (قہقہہ لگا کر) شے یہ لیجئے ــــ پیدل مات (قہقہہ لگا کر) بہت ناز تھا آپ کو اپنی چالوں پر (مشترکہ قہقہے)

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) کھیل میں تو ہار جیت ہوتی ہی رہتی ہے مگر تمہاری ذہانت کی میں قائل ہو گئی "

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) تسلیم۔ ذرہ نوازی ہے آپ کی ورنہ بندی کس قابل ہے "

نفیسہ " (ہنستے ہوئے) سچ عقیلہ جمال بھائی کی بیگم درجہ اول کی کھلاڑی ہیں۔ انھیں تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں شطرنج سیکھے ہوئے ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ اچھا بہن اب اجازت دو "

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) میں نے کہا کل اپنی رقیہ آپا کو ضرور لے کر آنا۔ ذرا ان سے بھی دو چار بازیاں ہو جائیں "

اشتہار

نفیسہ (ہنستے ہوئے) ان سے تم نہیں جیت سکتیں۔ ان کے میاں شطرنج کے مشہور کھلاڑی ہیں۔ اچھا چل کر پردہ کرا دو {قدموں کی چاپ}

عقیلہ " (زور سے) آ جاؤ نفیسہ بہن وہ اس طرف منہ کئے بیٹھے ہیں "

{قدموں کی چاپ}

نفیسہ " کل دو بجے تک آؤں گی کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا {قدموں کی چاپ}

ندیم " (سوالیہ لہجے میں) یہ محترمہ کون تھیں ــ ؟ "

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) اے انھیں نہیں جانتے آپ! مجو بھائی کی بیوی نفیسہ تھیں "

ندیم " (رکھائی سے) یہ آپ کو شطرنج کا شوق کب سے ہوا ہے محترمہ ؟ "

عقیلہ " (ہنستے ہوئے) ابھی تو آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ مگر آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ آپ کی اس کنیز نے تین دن میں وہ مہارت حاصل کی ہے کہ پرانی کھیلنے والیاں بھی مجھ بندی کے مقابلہ میں اپنا سا منہ لیکر رہ گئیں۔ آج نفیسہ کو آٹھ ماتیں دی ہیں۔ "

ندیم " واہیات کھیل ہے تضیع اوقات "

عقیلہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بڑا دلچسپ کھیل ہے بادشاہوں کا کھیل ہے پورا قلعہ بنانا پڑتا ہے۔

ندیم " (تلخ لہجہ میں) جی قلعہ اور محل بعد میں بنایئے گا۔ پہلے مجھے چار بنا دیجئے۔ "

عقیلہ " (ناز سے) اللہ قسم میں تو سمجھی تھی کہ آپ میری کامیابی کی خبر سن کر خوش ہوں گے "

ندیم " (جلدی سے بات کاٹ کر) خوش ہونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے پہلے چار بنا دیجئے پھر اپنے منہ میاں مٹھو بنئے گا "

عقیلہ " (ٹھنڈی سانس لے کر) وہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے خوش نہیں دیکھ سکتے اور اس میں آپ کا بھی کوئی قصور نہیں یہ تو میری قسمت کا قصور ہے۔ ایک جمال صاحب کی بیوی ہیں۔ کہ ان کے میاں انھیں نئی نئی چالیں بتلاتے ہیں۔ نقشے لا کر دیتے ہیں جب وہ جیت کر آتی ہیں۔ تو مٹھائی لاتے ہیں۔ "

ندیم " (تیز لہجہ میں) آج معلوم ہوتا ہے چار میری قسمت میں نہیں ہے "

عقیلہ " (محبت بھرے لہجہ میں) اے خوشی کے وقت تو غصہ نہ کیجئے۔

دو گھڑی تو ہنس کر بات کر لیا کیجئے۔ کل رقیہ آ رہی ہیں دعا کیجئے
کہ میں جیت جاؤں بہت بڑی کھلاڑی ہیں۔"

ندیم " لاحول و لاقوۃ۔ لعنت ہے اس گھر پر میں کسی ہوٹل میں جا کر
چائے پی لیتا ہوں۔ { تیز تیز قدموں کی چاپ }

منظر بدلتا ہے

{ رات کا وقت کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، خراٹوں
کی آواز پھر عقیلہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ }

عقیلہ " (خوفناک لہجہ میں) چال واپس نہیں ہوگی "

ندیم (زور سے) بیگم بیگم

عقیلہ " (بڑبڑاتے ہوئے) فرزیں سے شہ بچئے۔ اب کہاں جائیں گی ــــ
شہ مات۔"

ندیم " (درشت لہجہ میں) بیگم (زور سے) بیگم۔"

عقیلہ " (چونک کر) کیا ہوا ؟"

ندیم " خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔"

عقیلہ " اے واہ یہ بھی خوب رہی آدھی رات کو لڑنے کے لئے اٹھایا
ہے مجھے۔"

ندیم " میں پوچھتا ہوں کیا اب میں اس گھر میں رہ بھی نہیں سکتا۔ ؟"

عقیلہ " (تعجب سے) اے ہے میں نے کب منع کیا، یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے۔"؟

ندیم " (طنزیہ لہجہ میں) جی مجھے تو کچھ نہیں ہوا البتہ آپ کا دماغ ضرور
خراب ہو گیا ہے۔"

عقیلہ " (تیز لہجہ میں) میرے دشمنوں کا دماغ خراب ہو۔"

ندیم بھلا یہ بھی کوئی بات ہے سوتے میں شطرنج کھیل رہی ہیں۔ گھوڑا
بڑھا لیئے پیادہ گیا ــ پیلے کے زور میں ہے شہ ــ مات۔"

عقیلہ (ہنستے ہوئے) بھئی اللہ کیا بتاؤں وہ بیگم اخلاق ہیں نا وہ اتوار
کو آنے والی ہیں سنا ہے آج تک انھیں کسی نے مات نہیں دی۔

ندیم " لاحول ولاقوۃ۔ تنگ آ گیا ہوں ان بیگمات کا ذکر سنتے سنتے۔ بیگم
جمیل۔ انجمن آرا۔ محترمہ ضیا خالدی۔ پروین حمید۔ وغیرہ وغیرہ

عقیلہ (خوشی کے لہجے میں) سنئے اب کی اتوار کو آٹھ دس مشہور کھیلنے والیاں
آ رہی ہیں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر کھیل کے دوران ایک دو بار
چار بنا کر آپ بھیج دیجئے گا۔"

ندیم " (غصہ میں) کیا فرمایا۔ میں چار بناؤں گا۔ گویا میں خانساماں ہوں
کہ بیگم صاحبہ شطرنج کھیلیں اور میں چار بنا کر بھیجوں۔ میں پوچھتا
ہوں آخر آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

عقیلہ " اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے آخر میں بھی تو آپ کے دوستوں کو
چائے بنا کر بھیجتی ہوں میں نے تو کبھی انکار نہیں کیا۔"

ندیم " (تیز لہجہ میں) اب آپ مجھے سونے بھی دیں گی یا گھر سے نکل جاؤں۔
صبح مجھے دفتر بھی جانا ہے۔"

عقیلہ " سو خود نہیں رہے ہیں، الزام مجھ پر لگا رہے ہیں نہ جانے آپ کو
کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

ندیم " (چیخ کر) خدا کے لئے خاموش رہیئے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا"

عقیلہ " (روہانسے لہجہ میں) ہائے میری قسمت۔ نہ جانے کیا سوچ کر اماں
ابا نے مجھے جیتے جی اس جہنم میں دھکیل دیا۔

(سسکیاں تیز ہو کر موسیقی میں مدغم ہوتی ہیں)

منظر بدلتا ہے

{ بچے کے رونے کی آواز پھر عقیلہ کی آواز بلند ہوتی ہے }

عقیلہ " (اس معصوم نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو اسے روئی کی طرح
دھنک ڈالا۔"

ندیم " (غصے سے) صاحبزادے کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے گولیاں
کھیلتے دیکھا ہے۔"

عقیلہ " (خوشگوار لہجہ میں) اے ہے بچہ ہی تو ہے دل بہلا رہا تھا۔ آخر وہ
بھی کیا کرے۔"

ندیم " (غصے سے) آپ کو کیا پرواہ صاحبزادے جائیں بھاڑ میں آپ کو شطرنج
کھیلنے سے فرصت نہیں ہے۔"

عقیلہ " (تیز لہجے میں) وہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے خوش نہیں دیکھ سکتے"

ندیم " (طنزیہ لہجے میں) جی ہاں بڑی خوشی کی بات ہے کہ بیگم صاحبہ دن
رات شطرنج کھیلتی ہیں۔ سہیلیاں اکٹھا رہتی ہیں۔ خرچ دگنا
ہو گیا ہے لڑکا فاسد ہو رہا ہے۔"

عقیلہ " خدا کا شکر ادا کیجئے میں صرف شطرنج کھیلتی ہوں۔ ورنہ [illegible]

کی عورتیں سینما دیکھتی ہیں۔ زیورات خریدتی ہیں۔ کپڑے بناتی ہیں۔ میک اپ کا سامان لاتی ہیں۔"

ندیم "(طنزیہ لہجہ میں) جو ہاں آپ کے پاس نہ کپڑے ہیں نہ زیورات نہ پوڈر نہ کریم نہ چوڑیاں۔"

عقیلہ "(زور دے کر) قسم لے لیجئے جو اس دو مہینے میں کوئی کپڑا بنایا ہو۔ پوڈر کریم خریدے بھی مدت ہو گئی۔ البتہ اس مہینے اٹھارہ روپے کے شطرنج کے مہرے ضرور خریدے تھے۔"

ندیم "(چیخ کر) کیا فرمایا شطرنج کے مہرے اٹھارہ روپے کے خریدے ہیں"

عقیلہ (سمجھاتے ہوئے) اٹھارہ روپے میں بھی سستے ہیں ہاتھی دانت کے ہیں۔"

ندیم "(غصے سے) اب اس گھر کی تباہی میں کوئی کسر نہیں رہی۔ اللہ رحم کرے مجھ پر۔"

عقیلہ " وہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ کو اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ تین دن میں ایک پونڈ چائے اور ڈھائی سیر شکر کیوں خرچ ہو گئی۔ یہ نہیں دیکھتے کہ مہمان کتنے آتے ہیں۔"

ندیم " (زور سے) کیا فرمایا مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا ہے۔"

عقیلہ " وہ تو میں خوب سمجھ رہی ہوں آپ کے غصے کی وجہ شاید دودھ والے کے بل پر آپ کی نظر پڑ گئی ہے۔ اب ڈیوڑھا بل ہے تو میں کیا کروں جب دن رات چائے بنے گی تو ڈیڑھ سیر دودھ تو روز آئے گا۔"

ندیم "(طنزیہ لہجہ میں) آج تو آپ کانوں میں شہد گھول رہی ہیں۔"

عقیلہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں اگر گھی دکان سے قرض نہ منگاتی تو کیا کرتی نانی اماں آ رہی تھیں۔"

ندیم "(غصے سے) ابھی کوئی اور خوشخبری سنانا باقی ہے {قدموں کی چاپ}

کریم بیگم صاحب ٹال والا تقاضہ کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اگر کل تک پیسے نہیں آئے تو میں گھر آؤں گا۔"

ندیم (چیخ کر) میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔؟"

عقیلہ "(روہانسے لہجہ میں) آپ ہی بتایئے میں کیا کروں دو تین مہینے سے خرچ بڑھ گیا ہے۔ آپ کے دوست اور میری سہیلیاں جب ہر اتوار کو آئیں گی تو کھانا تو کھلانا ہی پڑے گا۔"

ندیم (غصے سے) آپ کیا کریں میں ابھی بتاتا ہوں {تیز تیز قدموں کی چاپ}

عقیلہ " ارے ارے! ۔ یہ آپ تاش اور شطرنج کے مہرے کیوں اٹھا لائے۔"

ندیم (زور سے) مٹی کے تیل کی بوتل اٹھا کر لاؤ کریم (زور سے) جلدی سے لاؤ (قدموں کی چاپ) ڈال دو ان پر۔"

عقیلہ (گھبرا کر) ارے ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ہائے اللہ آگ لگا دی۔ ہائے میرے ہاتھی دانت کے مہرے {سسکیاں}

ندیم "(مطمئن لہجہ میں) نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری نہ آج سے آپ شطرنج کھیلیں گی اور نہ میں تاش۔"

بچے (زور دے کر) ابو! ہم بھی گولیاں نہیں کھیلیں گے۔"

{ مشترکہ قہقہہ موسیقی میں مدغم ہو جائیں }

(فیڈ آؤٹ)

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

ایک بہت بڑے تاجر نے انکم ٹیکس آفیسر کو لکھا۔ "۔ جناب عالی! جب سے میں نے ۱۹۶۵ء کے حسابات داخل کئے ہیں میری پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ذہنی سکون مفقود ہے۔ ڈاکٹروں کی قیمتی دواؤں سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ راتوں نیند بھی غائب ہو گئی ہے۔ خواب آور گولیوں سے بھی مجھے نیند نہیں آتی۔ ایک ماہر نفسیات کو دکھایا۔ اس کا کہنا ہے کہ نیند نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ چنانچہ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے فرضی حسابات پیش کر کے حکومت کو جو دھوکا دیا ہے اس کی وجہ سے میری نیند اڑ گئی ہے۔ لہٰذا میں آپ کو دس ہزار روپے کا چیک بھیج رہا ہوں۔ اور اگر اب بھی مجھے نیند نہیں آئی تو پھر بقایا رقم بھی ادا کر دوں گا۔"

شادی

کہتے ہیں اللہ میاں کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ لیکن یہ آفت بینڈ باجوں کے ساتھ بھی آتی ہے یا لوگ اسے شادی، کہتے ہیں مرزا غالب نے کہا ہے کہ ——— ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ——— مرزا کو معلوم تھا کہ لوگ، عورت کے پاؤں تلے جنت کے قائل ہیں، اس لئے انہوں نے بڑے سلیقے سے بات سمجھادی۔ مرزا کی بات لوگوں کی دیر میں سمجھ آتی ہے۔ اس لئے لوگ دھڑا دھڑ شادیاں کر رہے ہیں۔ کچھ تو با قاعدہ بیویوں کا پولٹری فارم کھول لیتے ہیں۔

کہنے عام تو شادی کو خانہ آبادی، ہی کہا جاتا ہے اور اپنے ہاں ہندوستان میں تو اس کا ثبوت اس قدر عام ہے کہ گھبرا کر کانگریس نے سوشلزم کا پروگرام ہی تہہ کر کے رکھ دیا ہے اور پولیس کو لاٹھی چارج کرنے اور گولی چلانے کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ خانہ آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ آبادی ہی آبادی ہو گئی ہے، خانہ، تلاش کئے نہیں ملتا یہی حال رہا تو خانہ خراب سمجھئے۔

ہمارے ہاں خاوند کو سرتاج وغیرہ کے علاوہ مالک بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سے شوقین حضرات تو صرف مالک بننے کے لئے ہی شادی کرتے ہیں۔ ویسے اگر ان سے کان میں پوچھا جائے تو بڑی سنجیدگی سے کہتے ہیں ——— یار سچ تو یہ ہے کہ سزا بھگت رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے خطرناک اور سنگین سزا آج تک ایجاد نہیں ہوئی۔

یوں تو ہر شخص کچھ نہ کچھ بننے کی فکر میں رہتا ہے۔ خاوند بننے کا شوق ہر ایسے غیرے (محاورہ مکمل کر لیجئے) کو ہوتا ہے جیسے کانگریس ہر صوبے میں ہر طریقے پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ شوہر بننے کے لئے کسی خاص صلاحیت کی بھی شرط نہیں اس لئے جلدی ——— کامیابی کا سہرا بندھ ہی جاتا ہے۔ یہاں لوگ ——— شاعر یا ادیب ہونے سے زیادہ خاوند، ہونا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو بھی ایک شام کوفی ہاؤس کے بیروں سے چھٹی لینی ہی پڑتی ہے۔ یہاں تو ہر وہ شخص جو ایسے تا ثم نیبل اور ٹیلی فون ڈائرکٹری دیکھ ——— ہے، خود کو انٹلیکچول سمجھتا ہے۔ اور نہایت فخر سے "بندہ کچھ نہیں ہے"، کا ورد کرتا ہے، لیکن، خاوند، ہونے کا اعلان ضرور کرتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں بار بار کہتا ہے، اچھا اب چلتا ہوں، بیگم انتظار کر رہی ہوں گی۔ دکھ والوں کے دل جگر پہ چھریاں چل جاتی ہیں، بے چارے بیوی اور محبوب کے انتظار میں فرق

> ناکام شوہر وہ ہے جو شادی کے بعد بھی دوستوں سے ملتا ہے۔ اور بیوی کے سامنے اس جرم کا اقبال کر لیتا ہے۔ ناکام شوہر سے زیادہ قابلِ رحم چیز دوسری نہیں۔

جو نہیں جانتے) لیکن یہ بتانا دانستا بھول جاتے ہیں کہ اس عالم میں محترمہ کے ہاتھ یا زبان پر (یا دونوں پر) کیا ہوگا۔ اوپر سے ہنس کر ٹالتے ہیں کہ خاوند ہونے کا آرٹ اس میں ہے کہ آپ کیا کیا دانستا بھول سکتے ہیں۔ ویسے یہ درست ہے کہ بیگم آرٹسٹک خاوند سے زیادہ خاوندانہ آرٹ کو پسند کرتی ہے اور یہ تو آپ سے چھپا نہیں کہ آرٹ کے معنی ہے جھوٹ کو خوبصورت ایکٹنگ سے سچ بنانا۔

آموں کی طرح خاوندوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ پیوندی قلمی، اچاری، چوسے جانے والے، کہنے پر تو خاوندانِ وطن، شائد بھڑک اٹھیں (ویسے بے چارے بھڑک کر بھی کیا کرسکتے ہیں۔ کوئی مزدور تو ہیں نہیں کہ یونین بنا کر ہڑتال کر ڈالیں) خاوندوں میں کامیاب، ناکام، ذمہ دار، زن مرید ایسی قسمیں ہیں۔ جو ادھر مشرق میں مچھروں کی طرح عام ہیں۔ فارن ایڈ میں شائد کبھی کوئی مغربی قسم آجائے۔ وہاں کی بہترین قسم درست ہے۔

کامیاب شوہر وہ ہے جو دوسری عورت کے پہلو میں بیٹھ کر بیوی (اپنی) کو یقین دلا سکے کہ وہ صرف اسی کے لئے زندہ ہے۔ اور ناکام شوہر وہ ہے جو شادی کے بعد بھی اپنے دوستوں سے ملتا ہے اور بیوی کے سامنے اس جرم کا اقبال کرلیتا ہے۔ خاوندوں میں زن مرید سب سے اچھے رہتے ہیں۔ اُن کی زندگی کے ہر بارڈر پر امن و امان رہتا ہے۔ ناکام شوہر سے زیادہ دنیا میں قابلِ رحم چیز دوسری نہیں۔ ناکام عاشق تو تڑپ ہار کر صحراؤں میں بھٹک سکتا ہے۔ خودکشی کرکے جدید شاعری کا ہیرو بن سکتا ہے۔ لیکن ناکام شوہر تو بے چارہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

شادی کے موقع پر لڑکی کی خوشی تو سمجھ میں آتی ہے کہ اُسے آزادی نصیب ہوتی ہے دوپٹے سے لے کر جوتی کے آزادانہ استعمال کی۔ لیکن دولہا میاں، جن کی قید با مشقت، شروع ہوتی ہے، کی باچھیں کھلی دیکھ کر تو اس جاٹ کی یاد آتی ہے۔ جو مجسٹریٹ سیشن اور ہائی کورٹ کے سامنے قتل کا الزام اور سزائے موت سن کر صرف ہنس دیا تھا۔ اور جس نے ایک پریس رپورٹر کے اصرار پر بتایا تھا کہ اس نے قتل نہیں کیا ہے وہ تو پولیس کو بے وقوف بنا کر مزہ لے رہا ہے۔ دولہا میاں کی خوشی پر تحقیق کے بعد صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ۔ کیونکہ لغت میں الشہادہ شادی کے معنی خوشی کے ہیں۔ اسی لئے وہ خوش ہیں۔

بائیں بازو کے کمیونسٹوں کی طرح نفسیات کے ماہرین میں بھی انتہا پسندوں کا کہنا ہے کہ والدین بچوں کی شادی کرکے دراصل اُن سے اس ظلم کا بدلہ لیتے ہیں۔ جو اُن پر ان کے والدین نے کیا تھا۔ یہ بات فرائڈ نے کہنے کے لئے سوچی تھی۔ لیکن اچانک موت نے اس کی زبان بند کردی۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ فرائڈ کی موت سے قوم و ملک کا ہی نہیں کل دنیا کا نقصان ہوا ہے۔ دعا کیجئے کہ آئندہ کوئی کبھی وفات نہ پائے۔ آمین

مجھے بیگم نے پھر آواز دی ہے
گلے مل لیجئے اب جا رہا ہوں

صفحہ ۱۱ کا بقیہ ——— جوجونانگ

"کل۔ کل صبح۔ اپنی بیوی کے کہنے پر۔ دراصل ——"

"کل؟ کل صبح؟۔ کتنے بجے؟"۔ ڈاکٹر نے میری بات کاٹ کر بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کل صبح۔ یہی کوئی آٹھ بجے کا عمل ہوگا"

"آٹھ بجے۔ کل صبح آٹھ بجے۔ تعجب۔ حیرت"۔ ڈاکٹر جیسے خود سے بول رہا تھا۔

"کس بات کا تعجب ڈاکٹر۔ کیسی حیرت؟ آخر کچھ تو بتائیے"

"مسٹر وائٹ۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے آپ کے ملازم کو لی کو لاعلاج اور موت سے قریب سمجھ کر اس کی قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اب توجہ اور دوا کا وقت گزر چکا ہے مگر کل صبح آٹھ بجے سے اس کی حالت میں اچانک تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور اسی لمحہ سے وہ رو بہ صحت ہونے لگا"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"۔ میں تقریباً چیخ پڑا۔

"ممکن اور ناممکن کا مجھے علم نہیں۔ مگر مسٹر وائٹ واقعہ یہی ہے۔" ڈاکٹر نے خلا میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اور یہ عقدہ ابھی تک عقدہ ہے کہ ایسا کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟۔ اور کیا واقعی یہ ممکن ہے؟"

نقی محمد خان خورجوی

کشف القبور

قبروں کے حالات معلوم کرنے کو کشف القبور کہتے ہیں۔ اس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں مثلاً جب انسان کا جسم گل سڑ کر مٹی ہو گیا تو اس کی روح کا بیرونی دنیا کے لوگوں سے کیا تعلق باقی رہتا ہے۔ اس بارے میں جو کچھ میں نے معلومات حاصل کی ہیں یا بعض ذاتی واقعات سے نتیجہ اخذ کیا ہے وہ دلچسپی رکھنے والوں کے لئے پیش کرتا ہوں۔

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ انسان کا جسم دو اجزاء سے مرکب ہے۔ مادی جسم اور (غیر مادی) روح۔ روح کی تشریح الفاظ کے ذریعہ سے اہل تصوف نے انا۔ میں۔ اور خودی سے کی ہے۔ اور مذہب اسلام نے اس کو "قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی" یعنی خدا کے حکم سے تعبیر کیا ہے اور یہ سب ایسے الفاظ ہیں کہ ظاہر پرست انسان جو ہر چیز کو حواس خمسہ کی مدد سے سن کر۔ دیکھ کر۔ چھو کر۔ چکھ کر اور سونگھ کر ہی معلوم کر سکتا ہے روح کی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن اللہ نے انسانی جسم کو ایسا مکمل بنایا ہے کہ وہ چشم باطن سے ہر اس چیز کا مشاہدہ کر سکتا ہے جس کے دیکھنے سے چشم ظاہر بین قاصر ہے وہ ان آوازوں کو سن سکتا ہے جن کو ہمارے کان نہیں سن سکتے۔ لیکن آج کتنے انسان ایسے ہیں جو روحانی ریسرچ اور ترقی کے واسطے اپنی زندگی کو وقف کر چکے ہیں؟

یہ زمانہ مادی ترقی کا ہے جس نے ہمیں چاند تک پہنچا دیا یقین جانئے کہ جن لوگوں نے روحانی ترقی کی وہ "وہاں پہنچے کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا"۔ روحانی قوت مادی قوت سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ بحث تو طویل ہے مجھے تو اس مضمون میں حیات بعد الموت کے سلسلہ میں کشف القبور کے حالات پر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ لیکن یہ بات صرف اسی حالت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب حیات بعد الموت کے وجود کا یقین ہو اور اس کا انحصار صرف عقیدہ پر ہے۔ عقیدہ واقعات پیدا کرتے ہیں بشرطیکہ وہ قابل اعتماد ہوں۔ میں جو واقعات بیان کروں گا، وہ میرے ذاتی مشاہدات ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جسم فانی اور روح غیر فانی ہے اگر روح کو فانی تصور کر لیا جائے تو نہ جزا اور سزا کی اصلیت باقی رہتی ہے اور نہ مذہب کا وجود باقی رہتا ہے۔ "فورسائیکک ریسرچ سوسائٹی" جو ۱۸۶۱ء میں لندن میں قائم ہوئی تھی وہ آج بھی موجود ہے اور وہ لوگ ارواح سے گفتگو کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ روح غیر فانی ہے۔ جو چیز ایک مرتبہ پیدا ہو گئی وہ شکلیں تو تبدیل کرتی رہتی ہے لیکن کامل فنا نہیں ہوتی۔ ارواح محبت کی آرزومند

میرے چھوٹے بھائی کے انتقال کو کئی سال گزر گئے تھے۔ برسات کے موسم میں ایک دن میں نے خواب میں اپنے بھائی کو دیکھا اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ "میری قبر میں ایک سوراخ میں سے پانی آرہا ہے جس کی وجہ سے میں بے چین ہوں۔" میں نے فوراً اپنے عزیز کو وطن خط لکھا۔ اس نے جا کر دیکھا تو واقعی ایک بڑا سا سوراخ ان کی قبر میں تھا۔ جس کے ذریعہ سے پانی اندر جاتا تھا۔

ہیں۔ مرنے کے بعد ارواح اسی دنیا میں رہتی ہیں اور اپنے پیارے اور عزیزوں سے ملتی ہیں اور ملنے کے مختلف ذرائع اختیار کرتی ہیں مثلاً خواب کی حالت میں یا کسی میڈیم کے ذریعہ سے اس حالت کو روح کی اسٹرل باڈی کہتے ہیں۔ ایک خاص مدت کے بعد ارواح اسپرچول باڈی میں منتقل ہو جاتی ہیں اور پھر دنیا سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اسلامی اصطلاح میں اس حالت کو اعراف یا عالم برزخ کہتے ہیں۔

یہی ذرات خاکی جن کو ہم مردہ خیال کرتے ہیں سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان ذرات میں حرکت اور قوت لامتناہی موجود ہے غرضکہ روح جس قوت کا نام ہے وہ ہر چیز میں جاری اور ساری ہے۔

واقعات اور حالات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ جو روح مادی جسم کے ذرات سے وابستہ رہ چکی ہے جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی اس کا تعلق ایک معینہ مدت تک اس جسم سے قائم رہتا ہے، مثال کے طور پر پہلا تجربہ مجھے یہ ہوا کہ میرے چھوٹے بھائی کے انتقال کو کئی سال گذر گئے تھے برسات کے موسم میں میں نے خواب میں اپنے بھائی کو دیکھا اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری قبر میں پانی سوراخ میں سے آ رہا ہے جس کی وجہ سے میں بے چین ہوں، چونکہ خوابوں کے ذریعہ سے اکثر صحیح حالات مجھے معلوم ہوتے رہے ہیں اس لئے میں نے اپنے ایک قریبی عزیز کو وطن خط لکھا۔ انھوں نے قبر کو جا کر دیکھا تو واقعی کافی بڑا سوراخ ان کی قبر میں تھا جس کے ذریعہ سے پانی اندر جاتا تھا۔ اس کی مرمت کرا دی گئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب سنہ ۱۹۲۰ء میں ریاست دتیا میں۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری قبر شہر کے قلعہ کی خندق میں ہے جو درختوں اور خودرو جھاڑیوں سے پوشیدہ ہے۔ شکستہ ہو گئی ہے اس کی مرمت کرا دی جائے۔ اصلیت یہ تھی کہ مہاراج کے حکم سے شہر پناہ کا ایک حصہ توڑا جا رہا تھا اور اس کے بڑے بڑے پتھر شہر پناہ کی خندق میں گرائے جا رہے تھے۔ یہی خواب ایک روز قبل ایک فوجی

الشجاع

سوار نے بھی دیکھا تھا۔

میں نے جب اس خواب کا ذکر مہاراج سے کیا تو انھوں نے اس محلہ والوں اور فوجی سپاہیوں کی مدد سے پتھروں کو ہٹوا کر اور جھاڑیوں کو صاف کروا کر دیکھا۔ نہ معلوم کس زمانہ کی ایک قبر پختہ خندق کے ایک گوشہ میں بنی ہوئی تھی جس کا کچھ حصہ پتھروں کے گرنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ مہاراج نے اس کی مرمت کرا دی چہار دیواری بنوائی اور اہل قبر نے مجھے اپنا نام "رضا شاہ" خواب میں بتلایا تھا چنانچہ ان کے اس نام کا کتبہ مزار پر لگوا دیا گیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ قبر کس زمانہ کی اور کس کی تھی۔

تیسرا واقعہ جو میرے مشاہدہ میں آیا وہ یہ ہے کہ ریاست دتیا میں جو کوٹھی مجھے رہنے کے واسطے دی گئی تھی یہ قبرستان کی زمین پر بنی تھی۔ ایک ہندو متعصب دیوان ریاست نے قبرستان میں ہل چلوا کر قبرستان کو میدان بنا دیا تھا اور وہاں کوٹھی تعمیر کرائی تھی چند قبروں کے پختہ بڑے چبوترے ان کے تعویذ تڑوا کر اپنے ملازموں کے واسطے چھوڑ دیئے تھے اور زبان حال سے ان مزارات کی ارواح یہ کہہ رہی تھیں!۔

خدا ہی اس جبر کی داد دے گا۔ انھیں مزارات میں ایک پختہ قبر مہاراج کی ایک مسلمان طوائف کی تھی جو بیحد مخیر اور عبادت گذار مشہور تھی اور لب سڑک اس کا چھوٹا سا سنگ مرمر کا جالی دار مقبرہ تھا جو سنگ دل دیوان ریاست نے مسمار کرا کر پتھروں کا ڈھیر بنا دیا تھا، چونکہ ارواح سے رابطہ قائم کرنے اور ان سے گفتگو کرنے کا مجھے شوق تھا جس کے جداگانہ طریقے ہیں۔ مجھے خواب میں وہ عورت نظر آئی اور اپنے مقبرہ کی دوبارہ تعمیر کرانے کی خواہش ظاہر کی اور یہ خواہش میں نے دھولپور کے ایک متمول مسلمان ٹھیکہ دار سے پوری کرا دی۔

یہ واقعات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ مرنے کے بعد ارواح کا اپنے جسم کے ذرات سے تعلق باقی رہتا ہے۔ جو حالات مجھے روحانی تجربات سے معلوم ہوتے ہیں ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ روح جسم سے نکل کر اسی دنیا اور اسی ماحول میں رہتی ہے۔

وہ ایک خاص مدت کے بعد جب اسٹرل باڈی میں رہ کر اس کی مادی کثافت دور ہو جاتی ہے تو وہ روح عالم لاہوتی میں چلی جاتی ہے اور پھر اس مادی دنیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ وہ ہر قسم کی قیود سے آزاد ہوتی ہے یہ ارواح وہ ہوتی ہیں جن کو ہم اپنی مطلاح میں بزرگان دین یا اولیائے کرام کہتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اسپری چولزم کے ذریعہ سے جن ارواح سے گفتگو کی جا سکتی ہے وہ صرف وہ ارواح ہوتی ہیں جو کثافت نفس کی وجہ سے عالم بالا تک نہیں جا سکتیں اور اسی مادی دنیا میں انکا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ وہ میڈیم کے ذریعے سے اپنے پیغامات اور خواہشات کو مختلف طریقوں سے اپنے عزیزوں دوستوں اور پیاروں تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں ان میں ایک ذریعہ خواب کا بھی ہے، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خواب میں دراصل اصلی روح نظر آئی تھی یا محض اس روح کا خیال تھا۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خواب دیکھنے والا خواب میں اگر اس روح کو زندہ خیال کرتا ہے تو وہ محض خیال ہے اور اگر خواب کی حالت میں بھی خیال کرتا ہے کہ یہ شخص مر چکا تھا تو وہ خواب ہے۔ میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں ان میں زیادہ حصہ میرے ذاتی تجربات کا ہے۔

یورپ میں جو روحانی کلب قائم ہیں اور میڈیم کے ذریعہ سے ارواح کو بلا کر میڈیم کے الفاظ میں ارواح سے بات چیت کی جاتی ہے ان کے واقعات بھی مشہور ہیں اور سر آرتھر کانن ڈائل چیرلیو۔ اور مس میرٹ وغیرہ۔ اسپر یچول سائنس والوں کی کتابیں بھی میں نے پڑھی ہیں اور انھیں طریقوں پر عمل کر کے ارواح سے بات چیت بھی کی ہے۔ بعض واقعات صحیح بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس ترکیب کو قابل بھروسہ اس وجہ سے خیال نہیں کرتا کہ جو حالات معلوم ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر اثر اسپری چولسٹ کے اپنے ذاتی خیالات ہوتے ہیں جس کو وہ خود بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ جو طریقہ اسلام میں کشف کے ذریعہ سے اہل القبور سے معلوم کرنے کا ہے وہ زیادہ موثر اور قابل اعتماد ہے۔ کشف القبور کے بارے میں ایک واقعہ جو میرے مشاہدہ [illegible] میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ جو خورجہ میں نو وارد تھے شہر سے باہر رات کے وقت اسم ذات کا ورد کیا کرتے تھے۔ راستہ قبرستان میں سے تھا۔ ایک روز واپسی کے وقت جب قبرستان میں سے گذر رہے تھے میں نے ان سے ایک خام پکی قبر کے بارے میں دریافت کیا کہ اہل قبر کی حالت معلوم کیجئے۔ ان نووارد بزرگ کو معلوم نہ تھا کہ یہ قبر کس کی ہے۔ وہ وہاں بیٹھ گئے اور دیر تک مراقبہ کرنے کے بعد انھوں نے بتلایا کہ یہ احمد خاں کی قبر ہے جو حافظ قرآن، حاجی اور نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ بعد میں جب میں نے جانچ کی تو جو کچھ انھوں نے بتلایا تھا وہ صحیح تھا۔

طریقہ اس کا یہ ہے کہ قبر پر جا کر فاتحہ کے بعد مراقبہ کرنا چاہئے اور اس میں اتنا غرق ہو جانا چاہئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہے یہ کمال محویت بہت مدت کی مشق کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اسی کمال کو کشف القبور کہتے ہیں۔ مزارات پر فاتحہ پڑھنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ عالم محویت طاری کی جائے۔

حاصلِ مطالعہ

اِس عنوان کے تحت اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

احمد جمال پاشا

ڈھل مل بھائی

● ڈھل مل بھائی ؟
ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔
"انسان کو پیدائش سے موت تک ہر قدم پر بڑھئی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پالنے سے قبر کے تختوں تک"

اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ نفع کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ دوسرے میرا من پسند کام ہے۔

ڈھل مل بھائی بالکل ڈھل مل یقین ہیں۔ جب وہ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے تو انھوں نے دسویں درجے کے امتحان کی بڑے زور شور سے تیاری کی۔ سب کو پکا یقین تھا کہ فرسٹ آئیں گے۔ لیکن جب امتحان دینے گیا تو کہیں نظر نہیں آئے امتحان دیکر ان کے یہاں پہنچے تو دیکھا بے خبر سو رہے ہیں۔ جگایا تو بڑی مشکل سے اٹھے۔ امتحان کے بارے میں پوچھا تو بولے :۔

" امتحان دینے سے فائدہ ؟ - آرٹس میں کچھ رکھا نہیں۔ یہ دنیا اور زمانہ سائنس کا ہے اس لئے سمجھو میں نے اب تک جو کچھ پڑھا وہ گدھے پر لاد دیا۔ اب میں پوری تیاری کر کے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دوں گا۔"

یہ سن کر ہم نے سر پیٹ لیا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح جمے رہے۔ اور برابر ثابت کرتے رہے کہ "مجھے ڈاکٹر یا انجینیر بننا ہے۔ اس لئے سائنس میرے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا آدمی کو زندہ رکھنے کے لئے پانی اور ہوا۔" چونکہ مجھے اگلے پرچے کی تیاری کرنا تھی اس لئے الجھن ہوا کھانا چھوڑ کر چلا آیا۔

انھوں نے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دیا اور فرسٹ آئے۔ اب ہم کو یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ڈھل مل بھائی ڈاکٹر، انجینیر یا سائنس داں بن کر اپنی قابلیت کی دھوم مچا دیں گے۔ لیکن جب ہم کالج پہنچے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ داخلے کا فارم لئے دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں اور کامرس میں نام لکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کچھ پوچھنے کا موقع نہ دیتے ہوئے بولے یہ عہد تجارت کا ہے۔ آجکل بزنس میں بڑی ترقی ہے اس لئے میں کامرس پڑھوں گا۔ چونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ حضرت بلا کے اڑیل ہیں۔ اس لئے ہماری ہمت انکیں کامرس پڑھ کر ترقی کرنے سے روکنے کی نہ ہوئی۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے آئی کام کر لیا اس کے بعد وہ ایک دن ہمیں یہ بتانے آئے کہ "میرا ارادہ وکالت یا بیرسٹری کا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "لیکن آپ تو بزنس میں دلچپی رکھتے تھے۔" بولے "دلچپی ختم ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا بزنس مین بھی وکیلوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ جب وکالت ہی کرنا ہے تو بی کام سے فائدہ کیوں نہ بی اے کریں۔ ایک تو بی کام میں کوئی سوشل لائف نہیں دوسرے بی کام کریں پھر ایم کام کریں پھر پچاس ہزار روپیہ کہیں سے لا کر لگائیں تو بزنس شروع ہو اور پھر اس میں بھی آپ جانتے ہزاروں خطرے۔ بے پناہ کمپٹیشن۔ چلی نہ چلی۔ دیوالیہ ہونے کی صورت میں سوائے خودکشی کے چارہ نہیں۔ اس لئے بی اے کریں۔ ایل ایل بی کریں اور کھٹ سے وکالت چمکا لیں۔" ہم نے عادتاً

ہال میں ہاں ملائی اور اپنے کلاس میں واپس چلے گئے۔

جب بی اے کا امتحان شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ڈھل مل بھائی نے امتحان سے ڈراپ کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے "حاضریاں کم ہیں اس لئے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ مل سکے گی۔" ہم نے پوچھا "کتنی کم ہیں؟" بولے "سنٹ پرسنٹ" ہم نے پوچھا "کیا آپ ایک دن بھی کلاس میں نہیں گئے۔؟" بولے "سوشل اتنا ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی تو پابندی سے ٹھیک وقت پہ پہنچ جاتا مگر یار دوست اور جلسہ جلوس۔ پارٹیاں۔ پالیٹکس۔ کینٹین کی بیٹھک بازی میں ایسا لگ جاتا کہ کبھی درجہ تک پہنچنے کی نوبت نہیں آنے پاتی۔" یہ سن کر ہم خاموش ہو گئے۔

پھر ہم نے سنا کہ وہ پرائیوٹ امتحان دے رہے ہیں۔ پھر سنا کہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ ایک دن ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ پڑھنے میں غرق ہیں۔ بڑی بے رخی سے بولے۔ "امتحان بعد آیئے گا" اس کے بعد پھر رٹائی شروع کر دی۔ مجبوراً ہم اٹھ کر چلے آئے۔

کچھ دن بعد نتیجہ نکلا۔ وہ پھر فرسٹ آگئے۔ مبارکباد دینے گئے اور باتوں باتوں میں پوچھا۔ "شاید اب آپ ایل ایل بی جوائن کریں۔؟" بولے۔ "وکالت میں کیا دھرا ہے۔؟ اب میرا ارادہ کھیتی کرنے کا ہے۔"

ڈھل مل بھائی نے کھیتی کے لئے زمین کا انتظام کیا۔ ابھی وہ زمین جوتنے کے انتظامات مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ایک رات اچانک آگئے اور مجھے سوتے سے جگا کر مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا۔؟" بولے "خزانہ مل گیا خزانہ"۔ خزانہ کا نام سن کر میرے دونوں کان کھڑے ہو گئے اور ایک دم سوالیہ نشان بن گیا۔ اور پوچھا۔ "کیا کھیت جوتتے میں کچھ نکل آیا؟" بولے۔ "کھیت! اوہو۔ اماں یار تم کب کی بات کر رہے ہو۔؟ کھیتی ویتی سب بیکار ہے اب میں مچھلیاں پالوں گا اور چند دن میں لکھ پتی ہو جاؤں گا۔ تمہارے پاس موٹر پر آیا کروں گا۔ سمجھے موٹر پر۔" پھر خود ہی جھینک کر بولے۔ "اس وقت جلدی میں ہوں کسی دن میرے تال پر آؤ۔ عالم باغ میں لب سڑک ہے بس سے اترو گے تو سامنے کی سائٹ میں الشہاع

مجھے پا دگے۔" یہ کہہ کر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئے۔ اور ہم سو گئے۔

کئی دن بعد ہمیں بھی ڈھل مل بھائی کا خزانہ دیکھنے کا شوق چرّایا۔ بس سے عالم باغ پہنچے وہ کا نج میں لنگوٹ باندھے جھاڑو لئے صفائی میں معروف تھے اور ان کے چاروں طرف مرغوں کے ڈابے دربے اور جالیاں تھیں۔ جن میں سے کٹ کٹ کٹاک۔ ککڑوں کوں اور چوں چوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہم نے انھیں اس حلیئے میں دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا خزانہ اور موٹر کہاں ہے اور یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔" ہنس کر بولے۔ "اب میرا یہی خزانہ ہے۔ اور اسی میں سے موٹر برآمد ہو گی۔ مچھلیوں کے کاروبار میں سب سے بڑا خطرہ مچھلیوں کے مر جانے کا ہوتا ہے۔ پھر اس میں تو ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔"

انھوں نے چلتے وقت ایک درجن انڈے ہمارے ساتھ کر دیئے اور گھر آنے کا وعدہ لیا۔ دوسرے دن ہم ان کے گھر گئے تو دیکھا کہ مکان پہ انھوں نے سفید سے اور تارکول سے خوشنما حروف میں "مرغ ہاؤس" لکھوا رکھا ہے جس کے دونوں طرف دو امیل مرغ بنے ہوئے تھے۔ وہ ہم سے بہت دیر تک یورپ اور امریکہ میں مرغبانی کے جدید ترین رجحانات پہ بات چیت کرتے رہے۔ اس کے بعد ہم چلے آئے۔

کچھ دن بعد ہم ان کے پولٹری فارم پر گئے تو ایک اینگلو انڈین صاحب بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے بتایا کہ ڈھل مل بھائی نے فارم ان کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اب وہ ادھر نہیں آتے۔ یہ سن کر ہم چلے بھئے ان کے گھر پہنچے اور ان سے پوچھا کہ "یہ جما جمایا کاروبار کیوں ختم کر دیا۔؟" تو ہنس کر بولے۔ "پولٹری میں کیا رکھا ہے میرے بھائی۔ سائکل کے کاروبار میں بڑا نفع ہے۔ سوچتا ہوں ٹائر ٹیوب کی ایجنسی لے لوں۔ یوں کئی کام ایک ساتھ ذہن میں ہیں۔ بھٹے کے کام میں بھی اندھا نفع ہے۔ دوسرے اگر آپ کہیں سے سیمنٹ اور لوہا لنگڑ لے آئیں اور آپ کے پاس خالی زمین ہو تو مفت میں کوٹھی کھڑی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اینٹیں اور مزدور تو گھر کے ہوں گے۔" ہم سمجھ گئے کہ اب یہ سائیکل کی ایجنسی اور بھٹے کا کاروبار کئی ہفتہ تک کرتے

رہے تھے۔

اس وقت تو ہم چلے آئے لیکن دو چار دن کے بعد انھیں سمجھانے کے لئے جب ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ پورا گھر ورکشاپ ہو رہا ہے اور ہر طرف سے گھرر گھرر اور کھٹ کھٹ کی آوازیں آرہی ہیں جا بجا بڑھئی لگے ہوئے ہیں اور لٹھوں اور تختوں کے چٹے لگے تھے اور ڈھل مل بھائی کان میں پنسل لگائے نیکر پہنے ایک تختے پر دونوں ہاتھ رکھے مستری کو آفس ٹیبل کی نئی ڈیزائن سمجھا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے " انسان کو پیدائش سے موت تک ہر قدم پر بڑھئی کی ضرورت پالنے سے قبر کے تختوں تک پڑتی ہے " اس بار انھوں نے ہمیں یقین دلایا کہ اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ نفع کا کوئی ٹھکانہ نہیں دوسرے میرا من پسند کام ہے " اور میں یہی زور دیتا رہا۔" بھائی کم از کم اسی پہ جمے رہیئے "!

کچھ دن بعد میں اپنے آفس سے لوٹتے میں ایک صاحب کے ساتھ ایک ریسٹوران میں گھسا تو دیکھا کہ ڈھل مل بھائی کاؤنٹر پر بیٹھے کیش میمو کاٹ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا :-

" خیریت ۔؟ " ہنستے ہوئے بولے ۔" آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ ہم بڑھئی خانے سے چائے خانے تک کیسے پہنچے تو بات بالکل صاف ہے جو نفع اور ٹھاٹھ ہوٹل کی بزنس میں ہے اس کا " وڈ ورکس " میں سرے سے سوال کہاں ۔" تھوڑی دیر بیٹھ کر میں گھر چلا آیا۔

کچھ دن بعد مجھے ایک کام سے شملے جانا ہوا ۔ وہاں میں ایک ہوٹل سے نکل رہا تھا کہ دیکھا سامنے سے ڈھل مل بھائی چلے آرہے ہیں سوٹ پہنے بو لگائے ایک بیگ دبائے پائپ کے دھوئیں اڑاتے بڑے ٹھسے سے وہ آرہے تھے ۔ انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، انگریزی میں خیریت پوچھی اور کچھ وقت ساتھ گذارنے کی درخواست کی چنانچہ ہم لوگ ہوٹل کے لاؤنج میں جم گئے اور کافی کا دور چلا باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ " ہوٹل کے دھندے میں دھوئیں اور گندگی کے سوا رکھا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے دواؤں کی ایک بہت بڑی فرم جوائن کر لی۔ اور اس کے وہ اب چیف ریپریزینٹیٹو ہیں "

اس کے بعد طے ہوا کہ شام کو ملا جائے اور ساتھ سینما

الشجاع

دیکھا جائے۔ مگر حسب عادت وہ دیئے ہوئے وقت پر نہیں آئے ۔ مجبوراً میں اکیلا سینما چلا گیا ۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ انھوں نے عین وقت پر فیصلہ کیا کہ " اس وقت سینما دیکھنے سے زیادہ لطف اسکیٹنگ کرنے میں آئے گا اور جب وہ رنگ پر پہنچے تو بلیرڈ کھیلنے میں ایسا محو ہوتے کہ اسکیٹنگ کرنے اور فون پر مجھے تبدیلی پروگرام سے مطلع کرنے کا بھی ہوش نہ رہا ۔ دوسرے دن جب میں ان سے شکایت کرنے گیا تو وہ بیرے سے مشورہ لے رہے تھے کہ " اس وقت کھانا کھایا جائے یا ناشتہ کیا جائے ۔؟ " میں نے ان سے کہا کہ " ناشتے کا وقت ہے اس لئے میں ناشتہ پسند کروں گا۔ رہا آپ کا معاملہ تو آپ ٹاس کر لیجئے ۔ لیکن سن تیلی سے بھی فیصلہ اس لئے نہ ہو سکا کیونکہ سکہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے میرے لئے ناشتہ منگایا اور خود نہانے چلے گئے کیونکہ ابھی تک فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ ناشتہ کروں یا کھانا کھاؤں۔

کچھ دن بعد میں شملہ سے واپس چلا آیا ۔ ایک دن میں حضرت گنج سے گذر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ڈھل مل بھائی کھڑے ہوئے ایک عالیشان عمارت نیلام کروا رہے ہیں۔ پیشہ کے ساتھ ان کا حلیہ، لباس اور شخصیت کچھ تبدیل ہو چکی ہے۔ مجھے دیکھ کر کوئی خاص حیرت نہ ہوئی ۔ انھوں نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا ۔ میں ٹھہر گیا ۔ نیلام ختم ہونے کے بعد وہ مجھ سے بولے : " بھائی آپ سے ایک بہت اہم مشورہ کرنا ہے " میں نے کہا فرمایئے۔ انھوں نے کتوں کا فارم کرنے اور اعلیٰ نسل کے کتوں کے بچے سپلائی کرنے کے کام کے سلسلے میں مجھ سے بڑی دیر تک صلاح مشورہ کرتے رہے ۔ میں نے جل کر کہا " یہ کباڑ اور موٹر کی مرمت کے کام میں بھی بہت نفع ہے " وہ بولے ۔ ہاں ہاں ان دونوں کاموں کے بارے میں ، میں بہت دن سے خود بھی غور کر رہا ہوں مگر فی الحال تو کتوں کا کام مجھے زیادہ نفع بخش نظر آرہا ہے "

ڈھل مل بھائی سے جب بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے تو وہ ہمیں کسی نہ کسی بالکل نئے دھندے میں الجھے یا سلجھے سلجھائے کام کو الجھاتے نظر آتے ہیں اور وہ اپنے ہر کام کو چھوڑ کر اگلے یا کسی نئے کام میں الجھے نظر آتے ہیں۔ وہ کتوں کے بارے میں مشورہ لیکر گئے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بکریاں چرا رہے ہیں۔ اور بکریوں کی توقع میں ملے گئے تو بیچ گاڑیاں بنانے لگے غرض ان کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ کب کونسا کام ختم یا شروع کر دیں ۔ (بلٹز بمبئی)

ہونہار شہری

پیارے ساتھیو!

کئی ماہ سے تمہارے صفحات شائع نہیں ہو رہے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہونہار شہری خود اپنے صفحات سے دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ مگر گذشتہ ماہ تم نے جو شکایتی خط لکھے ہیں۔ اور نئے جوش و خروش سے اپنے صفحات کو دلچسپ بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ ان کی بناء پر اس ماہ سے تمہارے صفحات از سر نو شامل کئے جا رہے ہیں۔ (نگران ہونہار شہری)

شریف آذین

علامہ اقبال

کی نظر میں انسانی اقدار

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ادیب اور عالم دونوں کا مشن ایک ہی ہوتا ہے۔ دونوں مفسرِ حیات بھی ہوتے ہیں اور ترجمانِ حیات بھی۔ لیکن دونوں کے طریقِ کار میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ ادیب یا شاعر اپنے تجربۂ حیات و رتخیل الوکھے انداز و اسلوب سے پیش کر کے یہ مقصد پورا کرتا ہے۔ جب کہ عالم مخصوص اور متعین راہِ عمل کی تشریح و ترجمانی۔ لہٰذا انسانی زندگی اپنے اندر جس قدر اہم اور پیچیدہ مسائل سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا تعمیری تجزیہ کرنا اور راہِ عمل کی نشاندہی کرنا ایک عظیم ملی خدمت ہے لیکن اگر ہم حالات ادبی سرمائے کا محاسبہ کریں تو گنتی کے چند اہلِ قلم کو چھوڑ کر باقی ادباء اور شعراء نے جو زندگی کی ترجمانی کی ہے اسے دیکھ کر از حد مایوسی ہوتی ہے —— اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ

{چاٹگام کا ایک منظر ——— عکاس:۔ سعد الرحمٰن چاٹگام}

ہمارے دانشور اپنی تخلیقات میں فلسفۂ حیات و دین کی رنگ آمیزی کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ کیونکہ مذہب کو اپنی نگارشات میں سمونا ایک نازک مسئلہ ہے۔ ماضی کا ادب جو ہمارا ادبی ورثہ ہے اس میں بھی بیشتر ساغر۔ مینا۔ ساقی اور بلبل جیسے موضوعات کی بھرمار ہے۔ پھر بھی ماضی میں چند نام ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جن کی حیثیت منارۂ نور کی ہے ان شخصیتوں میں علامہ اقبال کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے بکمالِ حسن و خوبی شاعری میں مذہب کی روح پھونک کر ایک نیا فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔ اُن کا موضوع مروجہ روایت سے ہٹ کر ہے چنانچہ ان کی تمام شاعری عظمتِ انسانی کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خود پیامِ مشرق میں ایک جگہ لکھا ہے۔

" زندگی اپنے احوال میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود

ہونہار شہری کے نئے ممبر

شوکت حسین کراچی

پہلے انسانوں کے ضمیر میں مشکل ہو مقام انسانیت کے لئے وہ جو فلسفہ پیش کرتے ہیں وہ ہے ان کا فلسفۂ خودی ۔ جس کا واضح مقصد یہ ہے کہ انسان اطاعت ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی کے منازل طے کرتا ہوا خودی کی بلندی پر پہنچ جائے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔
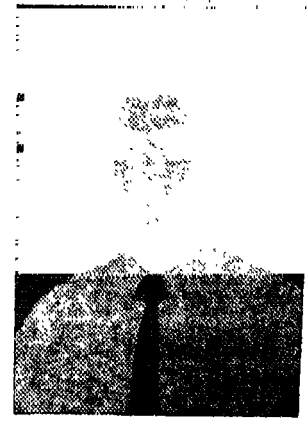
"فکری صلاحیت کا ارتقاء اس وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے ۔ جب کہ نظریاتی و تصوراتی طور پر انسان یہ سمجھے کہ اس کی بقاء صرف حیوانی جبلت اور سماجی حس کے تابع نہیں بلکہ اس کی انا ـــ نفس کے استوار کرنے میں بھی ہے ۔"

اس کی مزید وضاحت ان کے اس شعر سے بھی ہو جاتی ہے

زندگی ہے صدف ـــ قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر نہ کر سکے

نطشے نے بھی زرتشت کی زبان سے انسان کی عظمت اور وسعتِ جستجو کے بارے میں ایک مقام پر کہا ہے ۔

"اگرچہ میں دیروز اور امروز ہوں لیکن مجھ میں کچھ ایسی چیز بھی پوشیدہ ہے ۔ جو فردا اور مستقبل سے متعلق ہے ۔"

شاعر مشرق خود آگہی کے اس دقیق مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"انسان کی قوت تخلیق صرف مادہ کو شکل کرنے تک ہی محدود نہیں ہے ۔ بلکہ اس میں اتنی استعداد بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی دنیائے نفس کی تعمیر کر سکے ۔ چنانچہ وہ ایسے ذرائع ڈھونڈ لیتا ہے ۔ جو اسے بے پایاں مسرتوں کے ساتھ ساتھ آگہی نفس سے بھی ہمکنار کریں گے مگر انسان کا قدرت کے ساتھ بڑا نازک اور پاکیزہ رشتہ ہے ۔ جس کو ذرا سی بھی غیر صالح خواہش ٹھیس پہنچا سکتی ہے ۔ جب کہ پاک جذبہ انسان کو روحانی رفعتوں سے وابستہ کر سکتا ہے ۔"

حکیم الامت کی اس جامع تشریح میں قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد کتنا برجستہ نظر آتا ہے ۔ کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ ـــ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ۔

آج کا انسان جدید تہذیبی اور سائنسی رجحانات کے زیر اثر جس طرح روحانیت سے دور ہوتا جا رہا ہے ۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ۔

ہونہار شہری کے نئے ممبر

سردار علی پشاور

"عہد جدید کے انسان کو اس کے مختلف فلسفہ ہائے تنقید اور سائنس دانی نے جہاں اسے ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے ۔ وہیں اس کی طبعی خصوصیات نے اسے کائناتی قوتوں پر ایک بے مثال

ہونہار شہری کے نئے ممبر

شفیق قریشی لائل پور

امتیاز عطا کیا ہے۔ مگر اس نے اس کے مستقبل کی امیدوں اور ایقان کو چھین لیا ہے۔ اور یہ اس کی عقلی کارگزاریوں کا تاریک پہلو ہے کہ اب اس کی زندگی میں روحانیت کا کوئی دخل نہیں رہا پھر یہی نہیں، دنیائے فکر میں بھی خود اس کا اپنی ذات سے تنازعہ ہے۔ معاشی اور سیاسی زندگی بھی کچھ کم ہنگامہ خیز نہیں ہے۔ وہ دوسروں سے جھگڑتا ہے۔ اور ایسا کرنے میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اس کا بڑھتا ہوا حرصِ زر، امتیاز جائز و ناجائز کو مٹا کر اس کے جذبۂ محنت کشی کو مسلسل کچل رہا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب وہ زندگی کی حقیقتوں سے اکتا چکا ہے۔"

عصرِ حاضر ملک الموت ہے ترا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

اپنے مذہب سے غفلت برت کر اور سائنس کی غلط تاویلوں کے باعث آج انسانیت جس دوراہے پر کھڑی ہے وہ دانشوروں کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اپنی تہذیب و ثقافت کو پامال ہونے سے بچانے کے لئے ہمارے ادبا، و شعراء ایک نئے ولولے، ایک نئے اعتماد اور ایک نئے زاویۂ فکر اور عزم راسخ کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس دور میں مغربی تہذیب و تمدن کے نقوش بڑی تیزی سے نوجوان طبقہ کے اذہان پر ثبت ہو رہے ہیں۔ اور مغرب کی جو اندھا دھند تقلید کی جا رہی ہے۔ اگر ان کے خلاف ہمارے قلم حرکت میں نہ آئے تو لازمی طور پر ہماری تہذیب و ثقافت کا انجام ناگفتہ بہ ہوگا بلکہ مستقبل میں لکھے جانے والے تاریخ کے اوراق بھی ہمیں کسی اچھے پیرائے میں پیش نہیں کریں گے۔

شوکت حسین

کراچی کے ہوٹل

میرے بہت سے دوست جب کراچی آنے کا ارادہ کرتے ہیں تو مجھے لکھتے ہیں کہ میں انھیں یہ بتاؤں کہ کراچی میں کون کون سے تفریحی مقامات ہیں۔ ان دوستوں کو میں جواب دیتے دیتے عاجز آگیا ہوں۔ اس لئے یہ سوچا کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھ دوں تاکہ اس کے پڑھنے سے کراچی آنے والے سارے دوستوں کا بھلا ہو اور یہ مضمون سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے

میں اپنی معلومات کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ کراچی آنے والے ہاکس بے، سینڈز پٹ اور کلفٹن کے بجائے اگر صرف کراچی کے چھوٹے بڑے ہوٹلوں کی سیر کر لیں تو پھر ان کو کراچی میں اور کوئی جگہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کیونکہ یہ ہوٹل بجائے خود تفریح کا اتنا سامان مہیا کرتے ہیں۔ کہ پھر کسی انسان کو کراچی میں اور کچھ دیکھنے کی خواہش نہیں رہتی۔ ہاں تو جناب آیئے میں آپ کو کراچی کے

ہونہار شہری کے لئے ممبر

ابوالحسن رنگ پور

ہوٹلوں کی سیر کرائیں۔

یہاں کا کوئی فٹ پاتھ تک ایسا نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی حضرت ایک دیگچے میں پانی کھولاتے اور چند رنگ برنگی پیالیاں رکھے نظر آئیں، پیالیاں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ کسی کی آدھی کنگار غائب تو کسی کا کنڈا ندارد اگر کوئی کیفے ذی فٹ پاتھ زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے تو ہوٹل کے مالک کے ساتھ ایک بیرا یا یوں کہیئے کہ اسسٹنٹ ضرور ہوگا۔ جس کی حلیہ دیکھ کر تو ہنسی آئے۔ بدن پر ایک عدد گندی بنیان، شوخ تہبند، رنگ برنگی پٹے دار چپل۔ مگر ہاتھ میں ایک عدد کھڑی ضرور ہوگی۔ اور وہ برجستہ اپنے مالک سے یوں مخاطب ہوگا: "صاحب! لال کوٹھی کے نیچے والی دکان پر کریم کو ایک سنگل" سا گر پان والے کو ایک ڈبل، دودھ کم پتی زیادہ" اور پھر وہ جلدی جلدی سب آرڈروں کی تعمیل کردے گا۔

یہ تھے فٹ پاتھ کے مناظر۔ اب ایسے ہوٹل دیکھئے جو کیبنوں میں ہوتے ہیں۔ ان ہوٹل کے مالکان زیادہ تر ملباری پاندھی ہوتے ہیں۔ جب آپ ان ہوٹلوں میں داخل ہوں گے تو چند بلیاں ٹوٹی پھوٹی میزوں کے نیچے بیٹھی آپ کا شاندار استقبال کریں گی۔ ابھی آپ کرسی پر بیٹھے نہیں پائیں گے کہ آپکے اردگرد چکر کاٹنے لگیں گی اور ایک قطرہ چائے یا بسکٹ کے ایک ٹکڑے کی خواہش کریں گی۔

چند ایک کرسیاں ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہونگی جو دھوتی باندھے اور مع جوتے کے کرسی پر پاؤں چڑھائے بیٹھے نظر آئیں گے۔ آیئے اب ذرا بڑے ہوٹلوں میں چلیں۔

ان بڑے ہوٹلوں میں چند حضرات ایسے بھی نظر آئیں گے جو بڑے اطمینان سے اسی اشتہار کے نیچے سگریٹ نوشی فرمارہے ہوں گے جس پر نمایاں طریقے پر یہ الفاظ درج ہونگے "ہوٹل میں تمباکو نوشی منع ہے۔"

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی کچھ ایسی آوازوں کے راگ بھی آپکے کان سے ٹکرائیں گے۔ مثلاً سوٹ والے صاحب المشتہر ایک ڈبل مارو، ٹوپی والے صاحب کو دودھ پتی، وردی والے صاحب کو چاپ وغیرہ وغیرہ۔

چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں مالکان بیرے کی جگہ پارٹ ٹائم بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اگر وقت پڑے تو باورچی کا بھی کام انجام دیتے ہیں۔

یہاں پر ہر چائے خانے کی آغوش میں ایک چھوٹی سی کیبن پان والے کی ضرور ہوگی جس کا شوخ لال کپڑا آپ کو پان میں بنتا ہوا کتھہ پونچھنے کے لئے آپ کو دعوت دے گا۔

ایرانی ہوٹل دوسرے ہوٹلوں کی مقابلے میں کچھ بہتر ہوتے ہیں۔ مثلاً بہتر کا مطلب یہ ہے کہ وہ آنے والی چائے کی پیالی یہاں آدھی ملے گی، تھوڑی بہت صفائی ان ہوٹلوں میں ضرور ہوتی ہے مگر نہ ہونے کے برابر۔

یہاں پر چھوٹے چائے خانوں کے علاوہ بڑے بڑے ریسٹورانٹ بھی ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جیب خود بخود بڑے ہی اطمینان سے ہلکی ہوجاتی ہے۔ آپ کو کسی جیب کترے کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑتی۔

کراچی کے مضافات میں بھی اسی قسم کے ہوٹل پائے جاتے ہیں۔ بس اسٹاپ سے نیچے اتریں نزدیک ہی چند مربع گز زمین پر چہار دیواری کھینچی ہوگی۔ جس میں تیز آواز سے ریڈیو بجنے کی صدا سنائی دے گی اور ایک کونے میں بڑے سے دیگچے میں پانی چڑھا ہوگا۔ ایسے ہوٹلوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ غربا پروری بھی کرتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں اگر دو وقت کھانا کھالیں تو پھر انشاء اللہ آپ کو کبھی ڈاکٹروں کے مطب کے چکر لگانے سے فرصت نہیں ملے گی۔ یہاں کی چائے پی کر نزلہ، زکام، کھانسی سے تو آپ کی ایسی دوستی ہوجائے گی کہ پھر آپ عمر بھر ان سے دوستی ترک نہیں کرسکیں گے۔

کراچی آنے والے حضرات کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے وہ کراچی میں خواہ اور کچھ دیکھیں یا نہ دیکھیں مگر ان ہوٹلوں میں ضرور جائیں تاکہ کراچی کی سیر عمر بھر آپ کو یاد رہے۔

بازگشت

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے۔ ان میں مرزا زاہد بیگ کراچی کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق اس ماہ سے ان کے نام ایک سال کے لئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

فریدہ ممنون سلہٹ

س ۱۔ بھارت میں اردو زبان کو مٹانے کے لئے فرقہ پرست اب انسانی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں، مختلف شہروں میں اردو کے نام پہ بھیانک فسادات ہو چکے ہیں۔ رانچی میں وحشت اور بربریت کا جو مظاہرہ ہوا ہے وہ صدیوں فراموش نہیں کیا جا سکے گا ان حالات میں اردو کے ان ادیبوں کا جو عظیم کہلاتے ہیں یہ فرض تھا کہ وہ فرقہ پرستوں کے خلاف محاذ قائم کرتے اور اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے تن من دھن قربان کر دیتے مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان عظیم ادیبوں نے بیانات کے علاوہ کوئی تعمیری کوشش نہیں کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ادارتی مصالح سے بے نیاز ہو کر جواب دیجئے۔ عظیم ادیبوں سے میری مراد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ سے ہے۔

ج ۱۔ محترمہ، یہ حقیقت ہے کہ ہمارے عظیم ادباء نے ابتدا میں اردو کے لئے بڑے پیمانے پر کوئی کام نہیں کیا لیکن جب اردو کے نام پر فسادات ہوئے تو یہ عظیم ادباء چونکے اور خاموش نہیں رہ سکے۔ چنانچہ رانچی کے اردو دشمن فسادات پر گزشتہ دنوں جو نظمیں کہی گئی ہیں وہ اسی احساس کی رہین منت ہیں، یہ خوشی کی بات ہے کہ آخر اردو کے تمام بڑے ادیبوں کو بھی مسئلہ کی سنگینی نوعیت کا پوری طرح اندازہ ہو گیا ہے اور اب وہ اجتماعی طور پر اردو کا جائز حق حاصل کرنے کے لئے سعی کر رہے ہیں بمبئی میں سرکردہ ادیبوں پر مشتمل اردو کمیٹی قائم ہو چکی ہے، کرشن چندر اس کمیٹی کے صدر، راجندر سنگھ بیدی اور ملک راج آنند نائب صدر ہیں، کمیٹی نے پہلا بھی کل ہند کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے ادیبوں کے تعاون سے اردو کے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے موثر کارروائی کرے گی۔ ان اعلانات سے اردو دوستی کی امید کی ایک کرن نظر آنے لگی ہے لیکن یہ توقع نہیں ہے کہ بھارت کا برسر اقتدار طبقہ اور بڑے بڑے نیتا اردو کے ساتھ انصاف کر سکیں گے کیونکہ وہ فرقہ پرستوں سے بہت خوف زدہ ہیں اور ان کو ناراض کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ فرقہ پرستوں کی دشمنی کا لازمی نتیجہ اقتدار سے محرومی ہے۔

شفیق احمد خاں پشاور

س ۱۔ عبدالحلیم شرر کے عہد سے نسیم حجازی کے عہد تک سینکڑوں تاریخی ناول لکھے جا چکے ہیں، ان کو مکمل طور پہ تاریخی تو نہیں کہا جا سکتا پھر بھی ان میں تاریخ کا عکس ضرور ہوتا ہے اور ان کے مطالعہ سے ہم اپنے تابناک ماضی سے واقف ہوتے ہیں، یہ ایک صحت مند نظریہ تھا، فرض یہ تھی کہ نئی نسل بھی اس روایت کو سلیقہ سے آگے بڑھاتی مگر یہ اردو ادب کا المیہ ہے کہ نئی نسل کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے چنانچہ اب تاریخی ناول نہیں لکھے جا رہے ہیں کیا نئی نسل کے فنکار اس ضمن میں قابل ملامت نہیں ہیں۔

ج ۱۔ شفیق صاحب! جہاں تک شرر سے لے کر نسیم حجازی کے دور تک لکھے جانے والے تاریخی ناولوں کی تاریخی حیثیت کا سوال ہے وہ بجائے خود ایک تفصیلی مضمون کا متقاضی ہے، ویسے اس موضوع پر کافی مضامین لکھے جا چکے ہیں، پھر بھی ہم اس موضوع پر کسی ممتاز نقاد کا مضمون آئندہ پیش کریں گے۔ اب رہا آپ کا یہ ادعا کہ نئی نسل کو تاریخ سے دلچسپی نہیں اور تاریخی ناول نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ وہ درست نہیں ہے۔ اگر آپ نے نئی نسل کے ممتاز ادیب ڈاکٹر عبدالستار کا ناولٹ "دارا شکوہ" یا نیا ناولٹ "صلاح الدین" جو ماہنامہ صبا میں شائع ہوا ہے پڑھا ہوتا تو آپ کو نئی نسل سے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ ان دونوں ناولٹوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان پر صحیح معنوں میں "تاریخی ناولٹ" کا اطلاق ہوتا ہے۔

حبیب اللہ بیگ

انسانیت کی موت کے دروازے پر

نظریاتی جنگیں ہمیشہ سے انسانوں کی فلاح و بہبود کے نام پر لڑی گئی ہیں مگر

ویت نام کی جنگ

انسانیت دوستی کے نظریات اور اصولوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کر دینے کے واسطے لڑی جا رہی ہے۔

ویت نام کی جنگ جس خطرناک مرحلے میں داخل ہو گئی ہے وہ محض اس جنگ کے فریقین کے لئے ہی نہیں سارے عالم انسان کے لئے تشویشناک ہے۔ اب مسئلہ صرف یہ نہیں رہ گیا ہے کہ جیت جنوبی ویت نام کی سرکار اور ان کی اتحادی فوجوں کو حاصل ہو گی یا ویت کانگ کے مجاہدین آزادی کو بلکہ یہ ہے کہ جنگ ویت نام کا یہ فیصلہ کن خطرناک مرحلہ کسی عنوان سے ایک اور عالمی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے!

تاریخ کے ہر دم آگے بڑھتے طاقتور دھارے کی ہر کروٹ پر زمانے کے انداز بدلتے آئے ہیں۔ کل کی اچھائیاں آج کی برائیاں اور کل کی برائیاں اچھائیاں بن چکی ہیں لیکن تاریخ انسان عالم میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ جنگ و جدل۔ کشت و خون اور تخریب و تباہ کاری کو سراہا گیا ہو اور بنی نوع انسان کی ترقی و خوشحالی اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے لئے امن و سلامتی کی اہمیت و ضرورت کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ اور اگرچہ تاریخ کا کام واقعات کو محفوظ کرنا ہے ان پہ تبصرہ کرنا نہیں لیکن امن اور جنگ کے موضوعات کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔

> ویت نامی قوم
> اپنے خون میں اس طرح نہلا دی گئی ہے کہ
> یہ خون ان کا قدرتی رنگ بنتا جا رہا ہے

تاریخ میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ امن دوستوں اور جنگ پرستوں کو ایک درجے میں رکھا گیا ہو۔ یا کسی خونخوار کو کسی مظلوم پر امتیاز دیا گیا ہو۔ یہی انسانی ضمیر کی دیانت کا ثبوت ہے انسانی ضمیر جسے بالآخر فتحیاب ہونا چاہیئے۔

ویت نام گذشتہ تیس سال سے میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کا ۱۹۴۵ء میں اختتام ساری دنیا کے لئے ایک عارضی امن کا پیغام تھا لیکن ہند چینی کے اس علاقے کے لئے ایک طویل۔ اندوہناک اور صبر آزما دور کا پیش خیمہ تھا۔ جنگِ عالمگیر کے بعد دنیا کے گوشے گوشے میں نوآبادیاتی اور استعماری نظام کے خلاف ہمہ گیر تحریکوں اور آزادی کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ویت نامی عوام نے بھی محکومی سے آزادی پانے کے لئے ایک پر عزم جد و جہد کا آغاز کیا زبردست قربانیاں دینے کے بعد ویت نامی عوام نے دو علیحدہ مملکتوں کی صورت میں آزادی جیتی۔ شمالی ویت نام کو عرصۂ دراز تک فرانسیسی استعمار سے جنگ آزما رہنا پڑا۔ جو بالآخر ۱۹۵۴ء میں ڈین بن پھو کے تاریخی معرکے کے بعد عوامی

جنرل گی اپ - شمالی ویٹ نامی فوج کا سپریم کمانڈر جس کی غیر معمولی جنگی صلاحیتوں کا مغرب کے فوجی مبصر بھی اعتراف کرتے ہیں -

محض پر جنگ اختتام پذیر ہوئی - جبکہ جنوبی ویت نام میں آنجہانی صدر نگو ڈین ڈیم کے برسر اقتدار آنے کے بعد اندرونی خلفشار، بدنظمی اور سیاسی عدم استحکام کا دور شروع ہوا۔ شمالی اور جنوبی مملکتیں باہمی نظریاتی اختلاف کی بنا پر الجھ پڑیں۔ اس تصادم میں بیرونی شاطران سیاست کا ملوث ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

مشرق و مغرب کے طاقتور بلاکوں نے مشرق کی اس سرسبز و شاداب اور زرخیز زمین کو نہ صرف آگ و خون کی بھٹی میں جھونک دیا بلکہ امن عالم کے لئے بھی ایک زبردست خطرہ پیدا کر دیا۔

جنوبی مملکت میں ویت نام کی تحریک آزادی جو دراصل مغرب کی سیاسی اور اقتصادی بالادستی کے خلاف تھی آناً فاناً زور پکڑ گئی اور اسے صدر نگو ڈین ڈیم کی حکومت کی بہیمانہ پالیسیوں اور بدھوں اور عیسائیوں کے باہمی تصادم نے اور زیادہ تقویت پہنچا دی۔

صدر ڈیم کا قتل۔ فوجی انقلاب اور اس کے بعد ویت کانگ کی سرکوبی میں ایک بیرونی طاقت کے دستے ہوئے فوجی مشیروں۔ اور فنی ماہروں کی معاونت۔ ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور آج عالم انسانیت کو جو ہیروشیما اور ناگاساکی کے المناک واقعات کے صدمے سے بمشکل ہی جانبر ہو سکا تھا ایک اور تباہ کن ایٹمی جنگ کے دروازے تک کشاں کشاں ڈھکیلا جا رہا ہے۔

نظریات — افراد اور قوموں سے - بہت زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ انسان خود نظریات کی تخلیق کرتا ہے اور خود ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن نظریاتی جنگیں ہمیشہ سے انسانوں کی فلاح و بہبود کے نام پر لڑی گئی ہیں۔ مگر ویت نام کی جنگ انسانیت دشمنی کے نظریات اور اصولوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کر دینے کے واسطے لڑی جا رہی ہے۔

ویت نام کی اس جنگ میں لاکھوں انسانی جانوں کا اتلاف ہو چکا ہے۔ ویت نامی قوم اپنے ہی خون میں اس طرح نہلا دی گئی ہے کہ یہ خون ان کا قدرتی رنگ بنتا جا رہا ہے۔ ویت نام میں ایسے جوانوں کی کمی نہیں ہے جو توپوں کی گھن گرج اور پھٹتے ہوئے بموں کے دھماکوں کی گونج میں پیدا ہوئے۔ مارچ کرتی فوجوں اور گلی کوچوں میں دست بدست جھڑپوں کو دیکھتے بچپن گذارا اور جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہوتے خود کو کسی محاذ پر صف آرا پایا۔

یہ ویت نامی امن اور خوشحالی کی اصطلاح اور اس کے مفہوم تک سے واقف نہیں۔ انھوں نے ایک ایسے میدان جنگ میں جنم لیا جو ان کی قوم کی لاشوں سے پٹا ہوا ہے۔ اور جس میں بالآخر انہیں خود بھی خون میں نہا کر گرنا ہے۔

ویت نام کو اس جیتے جاگتے جہنم میں کس نے

تبدیل کیا۔؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب کسی نکسی کے لئے اختلاف کی گنجائش پیدا کرسکتا ہے ۔ لیکن دنیا بھر کے انسانیت دوست اور امن پسند اس پر متفق ہیں کہ ویت نام میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سارے عالم انسانیت کے لئے اس دور کا سب سے بڑا المیہ بنتا جا رہا ہے۔

ویت نام کی موجودہ جنگ کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۱ء میں ہوا تھا۔ امریکہ کے دیئے ہوتے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس جنگ میں ۶۱ء سے لے کر ۶۷ء تک پچیس ہزار تین سو پچاس امریکی سپاہی، چھ نسٹھ ہزار دو سو بہتر جنوبی ویت نامی سپاہی، تین لاکھ انتالیس ہزار پانچسو چھیالیس ویت کانگ اور چوبیس ہزار استی شہری باشندے۔ کل چار لاکھ ترپن ہزار دو سو اڑتالیس افراد مارے جا چکے تھے۔ اگر اس تعداد میں ۶۱ء سے گزشتہ اور حالیہ لڑائیوں میں ہلاک ہونے والے افراد کے اعداد جمع کئے جائیں تو کل تعداد بڑی آسانی سے دس بارہ لاکھ سے زیادہ تک پہنچ جائے گی۔

ویت نام جیسے چھوٹے ملک کے لئے جو سدا سے قدیم بودھ تہذیب اور ثقافت کا ایک حسین و دلکش گہوارہ رہا ہے۔ اتنا بھاری جانی۔ مالی۔ تہذیبی۔ ثقافتی اور سب سے بڑھ کر "انسانی" نقصان۔ ناقابل تلافی ہے۔ اور یہ نقصان صرف ویت نامیوں کا نہیں ہے۔ ساری دنیا کے انسانوں کا ہے..... اور ہونا بھی چاہئے۔ لیکن افسوس! اس ہولناک اور خوں آشام جنگ کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے تو بہت کچھ ہو رہا ہے۔ اور یہ طے کیا جا رہا ہے کہ انسانوں کے بنیادی اور پیدائشی حق خود ارادی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کر دینے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوگا۔ مگر قیام امن اور انسانیت کی بقا کی کوششیں اب تک ابتدائی مرحلوں کو طے نہ کر پائی ہیں۔

ویٹ نام میں تقریباً چھ لاکھ امریکی فوج کا سپریم کمانڈر جنرل ویسٹ مور لینڈ۔

شمالی ویٹ نام کے ایک غیر معروف گاؤں میں امریکی بمباری کے نتیجے میں ایک نو عمر بچہ بیسا کھی کے سہارے چل رہا ہے۔

قیام امن تو اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے
حق حیات۔ خود ارادیت اور زندہ رہنے کے حق کو ہمیشہ کے
لئے فنا کر دیا جائے یا پھر انسانیت کے ان مقدس اصولوں کا
خلوص دل سے احترام کرتے ہوئے خون آشام تلواروں کو
توڑ دیا جائے۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ خوشحال دنیا کی عشرت
گاہوں میں دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے
ان بدنصیب ویت نامی بچوں کا خیال نہ آئے جو شیر مادر سے
بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اور معصوم طفلانہ مسکراہٹ سے
بھی ــــ ان تباہی کا شکار انسانوں کا تصور نہ بندھے جو درندوں
کی یلغار کے آگے جان عزیز کی خاطر آگ اور پگھلے ہوئے سیسے
کی بارش میں سرگرداں رہنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔

یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ لوگ اپنی اپنی محنتوں کے
گلشنوں کو کھلتے پھولتے دیکھیں اور انھیں دنیا کے محکوم
عوام کے مرغزاروں کے اجڑنے کی کوئی پرواہ نہ ہو ــــ ؟

بہر حال ایسا ہو رہا ہے ــــ اور یہ احساس ایک
دوسرے احساس کو جنم دے رہا ہے ــــ انسانیت موت
کے دروازے پر پہنچ چکی ہے !!!
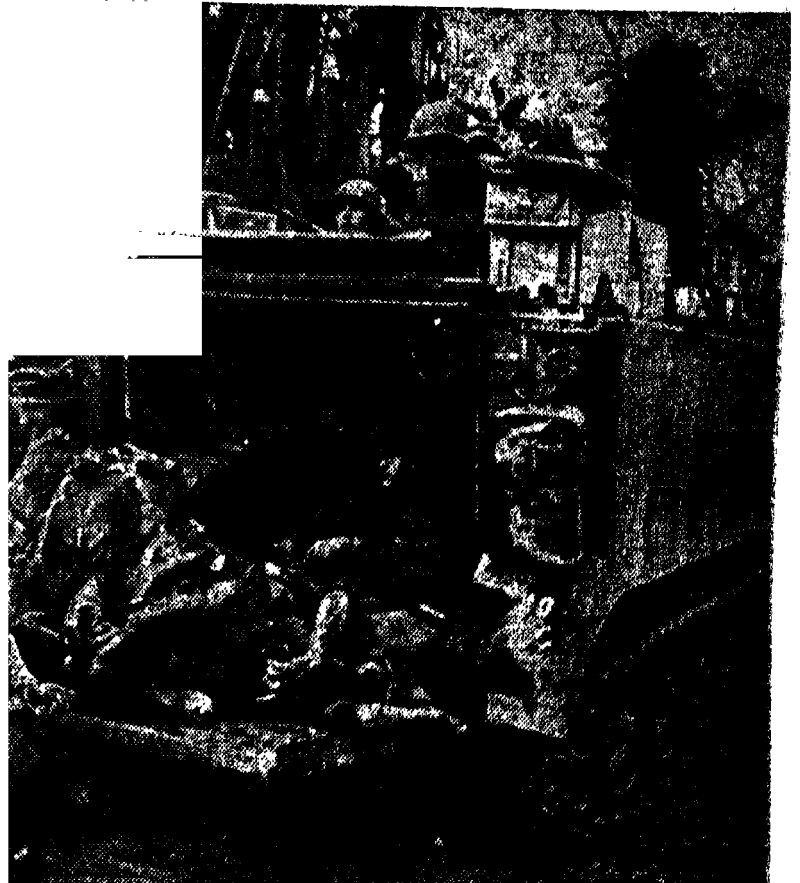
ویٹ کانگ سے جھڑپ کے بعد امریکی فوجی لاشیں ایک فوجی گاڑی میں
ڈال کر اپنے مستقر لے جا رہے ہیں۔

ہز مجسٹی شاہ حسین والئی اردن کے دورہ پاکستان کی چند یادگار تصاویر
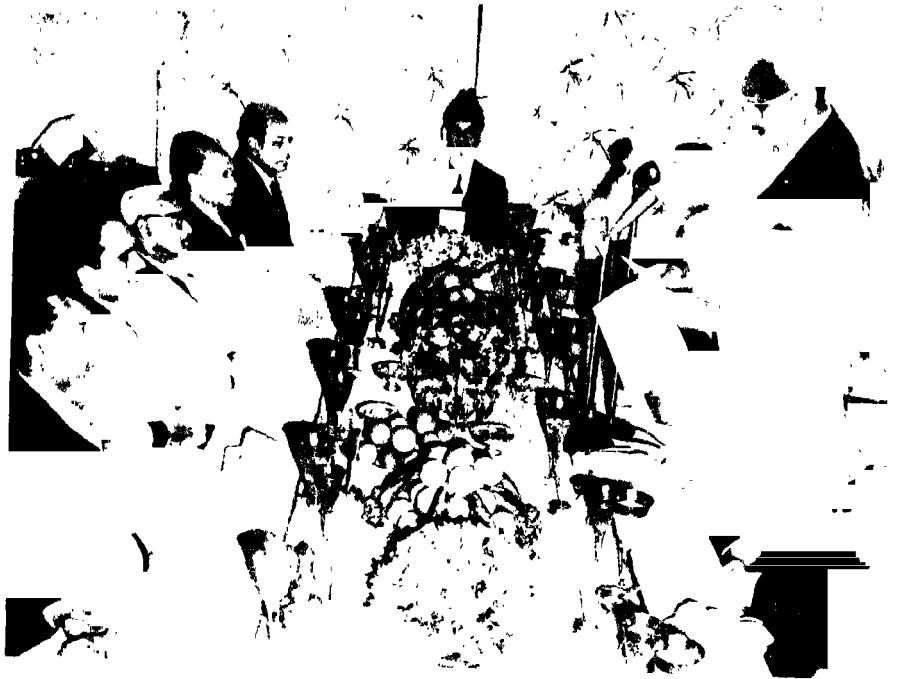
شاہ حسین کے اعزاز میں دئے گئے عصرانہ میں صدر پاکستان تقریر فرما رہے ہیں -

شاہ حسین کی کراچی میں آمد کا ایک منظر

شاہ حسین کی کراچی سے واپسی کا ایک منظر، شاہ پاکستان کے وزیر خارجہ شریف الدین پیرزادہ سے رخصت ہو رہے ہیں -

مسرت مرزا

وادی سہران کی نو عمر مصورہ

وادی سہران جو ہزاروں سال قبل تہذیب وثقافت کا گہوارہ تھی، آج بھی اہل دل کی سر زمین ہے۔ مصورہ مسرت مرزا بھی آغوش سہران کی پروردہ ہیں، ان کو فنون لطیفہ سے لگاؤ ورثہ میں ملا ہے اور ان کے خاندان کے بیشتر افراد کسی نہ کسی صورت فنون لطیفہ سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ سکھر سے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسرت مرزا نے جامعہ پنجاب کے شعبہ فنون لطیفہ میں داخلہ لیا اور مصوری کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد اب سکھر میں رہائش پذیر ہیں۔

بظاہر عام سیدھی سادی لڑکیوں اور مسرت مرزا میں یہی فرق نظر آتا ہے کہ چولہے ہنڈیا اور گھر کے کام کاج سے جو وقت بچ رہتا ہے مسرت مرزا اسے تصاویر بنانے میں صرف کرتی ہیں۔ مگر انکی ذہنی ذہانت اور اسراری خوبیاں انکی تصاویر میں فوراً ہی نظر آجاتی ہیں۔

ان کی بیشتر تصاویر میں ان کے اپنے ماحول کے کردار — کبھی سراپا نور و نکہت، کبھی مجسم حسن و یاس — ان کے موضوع ہیں۔ ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات تقریباً اصلی شکل میں ان کی تصاویر میں اجاگر ہوتی ہے، کہیں کہیں وہ اشکال کو مکعبی تاثر دیتی ہیں لیکن یہ تبدیلی اتنی برائے نام ہوتی ہے کہ مجموعی تصویر کے روپ پر اثر پذیر نہیں ہوتی۔ البتہ اس معمولی تبدیلی سے موضوع اور اظہار میں تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال آپ کے سامنے یہ تصویر ہے جسے 'مظلوم' (victim)

سہران [illegible] اس میں عوام کے دکھ درد کو بڑی خوبصورتی سے کینوس پر منتقل کیا گیا ہے، اور [illegible] شکل دیکر حزن و یاس کا ماحول اجاگر کیا گیا ہے جدید فن کی اس تکنیک کے

(دیکھئے سرورق کا صفحہ ۳)

ہمارے نام

رشید عثمانی :-

الشجاع میں شائع ہونیوالے تنقیدی مضامین کی خوبی یہ ہے کہ وہ عام تنقیدی مضامین کی طرح خشک اور طویل نہیں ہوتے ہیں اس لئے میں ان مضامین کو سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ تازہ شمارے میں جناب اشتیاق صاحب کا مضمون میں نے بڑے شوق سے پڑھا۔ انہوں نے نئی نسل کے مسائل اور پرانے نقادوں کے رویہ پر جس بیباکی سے لکھا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ البتہ اس مضمون میں انہوں نے نہ جانے کس مصلحت سے بہت سے ناموں کو نظر انداز کردیا ہے۔ مثلاً تقسیم کے بعد جو نسل ابھری ہے ان میں ڈاکٹر وزیر آغا۔ انور عنایت اللہ ابن انشا، حمایت علی شاعر، احمد فراز اور ادا جعفری کے ناموں کے بغیر یہ جائزہ مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح لاہور کی نئی پود میں کئی نام غائب ہیں۔ کراچی کی جدید ترین نسل میں سشیلا ترین، انیسہ جلال ناصر بغدادی وغیرہ کے ناموں کی شمولیت ضروری ہے۔ مضمون محنت سے لکھا گیا ہے پھر بھی بعض گوشے اجاگر ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی مضامین لکھے جائیں۔ (ملتان)

ڈاکٹر عزیز عارف :-

اشتیاق طالب نے نئی نسل اور پرانے نقاد میں نئی نسل سے نقادوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی کا ماتم تو کامیاب طریقے سے کیا ہے۔ مگر نئی نسل کے ذہنی انتشار پر کچھ نہیں لکھا۔ نئی نسل کو شکایت ہے کہ ممتاز نقادوں نے نئی نسل کی آواز کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں نئی نسل اور اس کے وکلا سے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ نئی نسل کے فنکار ابھی تک اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ کیوں پیدا نہیں کرسکے۔ دراصل نئی نسل کا المیہ یہ ہے کہ اس کی تخلیقات میں انتشار، احساس تنہائی اور زندگی سے اکتاہٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ تخلیقات اپنے قارئین کو زندگی برتنے کا نہ تو حوصلہ دیتی ہیں نہ ان تحریروں میں مستقبل کی بشارت ہے اور نہ بہتر زندگی گزارنے کی نوید ظاہر ہے ایسی مایوس کن اور زندگی سے فرار کی نمائندگی کرنے والی تحریریں قارئین کو کبھی متاثر نہیں کرسکتیں۔

(اجمیر)

نیاز عباسی :-

مارچ کے شمارے میں شعری حصہ کافی کمزور اور آپ کی خصوصی توجہ کا محتاج ہے رفعت سروش اور متین سروش کی غزلیں البتہ جاندار ہیں۔ نظموں میں آنچل اور اے شہر فنی نقطہ نظر سے کمزور ہیں "ہٹلر کے تہہ خانے میں" اور ریڈیائی تمثیلچہ قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ (چاٹگام)

شاہد لا اخلاق :-

الشجاع کے سرورق بالعموم دلکش اور معنویت کے مظہر ہوتے ہیں۔ لیکن مارچ کے شمارے کا سرورق جو ویٹ نام سے متعلق ہے صوری و معنوی معیار کی بلندیوں کو چھو رہا ہے یقیناً ان امن دشمنوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے جو ویٹ نام میں انسانی خون سے ہولی کھیل کر انسانیت کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ اس اچھوتے سرورق کی اشاعت نے الشجاع کے صوری حسن کو بے انتہا نکھار دیا ہے (ڈھاکہ)

شمیم فراز :-

تازہ شمارے میں حسن اجمل مسرت اور رشیدہ رضویہ کے افسانے بہترین کے مفہوم سے قریب تر ہیں۔ اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ نئے ذہین فنکار جو ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ عصر حاضر کے تقاضوں کا آئینہ دار ہے۔ ریڈیائی تمثیلچہ پڑھنے میں جب اتنا دلچسپ ہے تو ریڈیو پر تو اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہوگا۔

شرون کمار کا مزاحیہ "شادی" پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ جس طرح اچھے افسانہ نگار ہیں اسی طرح وہ ایک کامیاب مزاح نگار بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ (راولپنڈی)

رفعت عرفانی -

ناقابل فراموش اور اسلامی تہذیب کے گہوارے کے تحت جو مضامین شائع ہو رہے ہیں ان سے معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور تاریخ کے اوراق گمشدہ بھی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس دور میں اس قسم کے مضامین عام پڑھنے والوں کے پست مذاق کو بلند کر سکتے ہیں۔

(کوئٹہ)

منظور شدہ محکمہ تعلیمات بموجب سرکلر [illegible] کراچی ۴۴۴۹ - ۸۹/۲

مورخہ ۳ مارچ ۱۹۶۹ء

—— : ترتیب : ——

ایس ایم غیاث الدین —— سلمان الارشد

—— : طابع و ناشر : ——

ایس ایم شجاع الدین

—— زیرِ اہتمام ——

سلطان کلیم

زرِ سالانہ: پانچ روپے —— فی شمارہ: پچاس پیسے

فون نمبر: ۵۲۳۳۳ (پریس) —— ۵۵۲۱۲ (شعبۂ اشاعت)

—— شعبۂ نشر و اشاعت ——

ٹائمز پریس

مینسفیلڈ اسٹریٹ۔ صدر، کراچی۔

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر و پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا۔

اس شمارے کے چند فنکار

- رَوِش صدّیقی
- ڈاکٹر قاضی عبدالستار
- جاں نثار اختر
- اختر ملیح آبادی
- عنوان چشتی
- اثر فاروقی
- حزیں لدھیانوی
- جمیل زبیری
- خواجہ جمیل احمد
- نعیم اقبال
- حزیں لدھیانوی
- منظر الوٰحی
- احمد صغیر صدیقی
- اِن کے علاوہ:-
- اور دوسرے

الشجاع
مشرقی پاکستان میں
ہوائی ڈاک سے: ۶۵ پیسے

تصویری فیچر

تاریخ

ناقابلِ فراموش

تحقیق و تنقید

شعری ادب

افسانے

پراسرار کہانی

فکر و خیال

تمثیلچہ

حاصلِ مطالعہ

ہونہار شہری

گزشتہ دو سال سے "تحقیق و تنقید" اور "فکر و خیال" کے عنوانات کے تحت علمی ادبی مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اسے نہ صرف قارئین الشجاع نے پسند کیا بلکہ علمی ادبی حلقوں نے بھی ان مضامین کو پسند فرماتے ہوئے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس بار بھی ان عنوانات کے تحت دو فکر انگیز مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ مضامین بھی عام پڑھنے والوں کے ذوق سے ہم آہنگ ہوں گے۔ گزشتہ شمارے میں جناب اشتیاق طالب کا ایک مضمون "نئی نسل اور پرانے نقاد" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ہمارے بیشتر پڑھنے والوں نے اس مضمون کو پسند کیا۔ لیکن چند حضرات نے اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مضمون یقیناً چونکا دینے والا ہے لیکن صاحب مضمون نے پرانے نقادوں کے احترام کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اشتیاق صاحب نے نئی نسل کی وکالت فرماتے ہوئے ممتاز نقادوں پر الزام تراشی فرمائی ہے۔" معترضین نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ اس قسم کے مضامین کی اشاعت سے الشجاع کی غیر جانبدارانہ روایت مجروح ہوتی ہے اس لئے ایسے تلخ و ترش مضامین آئندہ شائع نہ کئے جائیں

اس مضمون کے سلسلہ میں ہم معترضین سے صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اس مضمون کا مطالعہ جذباتی انداز میں کیا ہے۔ ہماری رائے میں اس میں کوئی جملہ یا فقرہ ایسا نہیں ہے جس سے محترم نقادوں کی عظمت مجروح ہوتی ہو۔ جہاں تک نفس مضمون سے اختلاف کا سوال ہے اس کا حل یہ ہے کہ معترضین اس موضوع پر علمی انداز میں بحث کریں۔ تعمیری تنقید سے غور و فکر اور تحقیق و تجسس کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔ اور تخلیقی کاموں میں تیز رفتاری پیدا ہوتی ہے۔

ایک بار ہم پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں کہ الشجاع کسی خاص مکتبہ خیال کا ترجمان نہیں ہے۔ اس کے صفحات ہر لکھنے والے کے لئے حاضر ہیں۔ اس بار نعیم اقبال، اثر فاروقی اور جمیل زبیری کی کہانیاں افسانوی حصہ کی زینت ہیں۔ موضوع اور فن کے اعتبار سے یہ کہانیاں کس معیار کی ہیں اس کا صحیح فیصلہ آپ کر سکیں گے۔ شعری حصہ میں بہار کوٹی، عنوان چشتی، منظر ایوبی، حزیں لدھیانوی، عنبر چغتائی، علی عباس امید کے نام اس بات کے ضامن ہیں کہ ان کی تخلیقات آپ کے ذوق سے ہم آہنگ ہوں گی۔

ہمیشہ کی طرح اس شمارے کے بارے میں بھی ہم قارئین کی آراء کے منتظر رہیں گے۔

آپ کا مخلص
شجاع الدین
ناشر

تلخیص و ترتیب عبدالجلیل قریشی

ملایا کے جنگلوں میں

"یہ کون ہوسکتا ہے ؟"

شاٹ گن ہاتھ میں لئے ہوئے ڈسٹرکٹ آفس کے برآمدے میں کھڑا ہوا سنتری دریا کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔

اس کے سامنے وسیع دریائے پیرا بہہ رہا تھا۔ دوسرے کنارے پر کیلن سا گھنا جنگل تھا۔ اسی جنگل میں سے یہ قبائلی ڈونگے سے دریا پار کر کے اس کنارے پر پہنچا تھا۔ اس نے خاموشی سے ڈونگے کو درخت سے باندھا اور کھڑے ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اور جب اپنے ماحول سے مطمئن ہو گیا تو قدم اٹھاتا ہوا ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔

حکومت برطانیہ کی جانب سے انتظامی امور کے لئے ملایا کے علاقہ میں کئی ڈسٹرکٹ آفیسروں کے ہیڈ کوارٹر تھے جن کو باقاعدہ حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ ہیڈ کوارٹر شہر سے دور جنگلوں میں قائم کئے گئے تھے۔ ڈسٹرکٹ آفیسروں کو حکومت برطانیہ کی جانب سے ہر قسم کی کارروائی کرنے کے وسیع اختیارات حاصل تھے۔

کیلن ٹن کے علاقہ میں قدیم قبائلی آباد ہیں۔ ان لوگوں نے ٹکڑیوں کی صورت میں جگہ جگہ جھونپڑیاں ڈال کر مسکن بنائے ہیں۔ یہ قبیلے مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ ان میں ہی ایک خانہ بدوش قبیلہ ساکائی بھی ہے جن کی آبادی کئی جگہ پر ہے۔

دریا پار کر کے آنے والا شخص بھی ساکائی قبیلے کا تھا۔ اس

کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ کبھی کبھی وہ چونک کر گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف غور سے دیکھتا اور پھر اطمینان ہونے پر چلنے لگتا۔ وہ ڈسٹرکٹ آفیسر کے ہیڈ کوارٹر پر پہنچنے کے بعد برآمدے میں کھڑے ہوئے پولیس مین سے آہستگی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

"کیا بات ہے۔؟"

"تو آن ۔۔ ساکائی قبیلے کا ایک آدمی آیا ہے جو آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

پولیس مین کا جواب سن کر ہکلے کے چہرے پر یکایک فکر کے آثار پیدا ہو گئے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ قبائلیوں میں کوئی شخص

ساکائی دیہاتی پولیس والا اس سے سوالات کرنے کے بعد اس کو برآمدے میں چھوڑ کر ڈی او کے کمرے میں داخل ہوا۔

ڈسٹرکٹ آفیسر ہکلے اس وقت کمرے میں بیٹھا ہوا اہم کاغذات دیکھ رہا تھا۔ سپاہی کے اندر داخل ہونے پر اس نے نظریں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

صرف اسی وقت اس سے ملنے کی خواہش کرتا تھا جبکہ معاملہ سنگین نوعیت کا ہو۔

"اس کو اندر بھیج دو۔" ڈی او نے اپنے کاغذات ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں کے بعد ایک شخص دروازہ کھول کر ڈی او کے

کمرے میں داخل ہوا۔ برکلے نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ بھٹکے خدو خال۔ پانچ فٹ کا قد، مضبوط جسم لیکن آنکھوں سے فکر اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ انتہائی خوف زدہ ہے
ڈی او نے اس سے آنے کا سبب پوچھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتہائی دہشت زدہ ہے۔ اس لئے کوشش کے باوجود جواب دینے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ ڈی او نے اس کو تسلی دیتے ہوئے اطمینان دلایا کہ یہاں اس کے علاوہ اور کوئی شخص نہیں ہے جو ان کی باتیں سنے۔ اس کے دلاسا دلانے پر کچھ دیر کے بعد ساسائی نے لڑکھڑا کر کے اپنی کہانی سنائی کہ وہ ساسائی قبیلے کا سیمبو ہے۔ اس کا گاؤں یہاں سے دریا پار کر کے دو گھنٹے کے راستہ پر جنگل میں ہے قبیلے کے پاونگ (جادوگر) تاجین نے اس کی روح کو ایک چھوٹی سی ڈبیا میں قید کر دیا ہے۔ جادوگر رقم کے علاوہ کچھ عرصہ کے لئے اس کی بیوی کو بھی لینا چاہتا ہے۔ اور جب تک وہ یہ دونوں مطالبے پورے نہیں کرے گا پاونگ اس کی روح کو آزاد نہیں کرے گا
ڈی او برکلے۔ تاجین کو پہلے سے جانتا تھا۔ وہ اس سے کئی مرتبہ مل بھی چکا تھا۔ اس کو خود بھی تاجین پر شبہ تھا کہ وہ اپنے جادو کو غلط طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ ایک بار اس نے جادوگر کو گرفتار کرنے کا ارادہ بھی کیا لیکن ثبوت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ قبائلی اسقدر خائف رہتے تھے کہ اس سے نالاں ہونے کے باوجود بھی وہ ایک حرف بھی اس کے خلاف کہنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے ہی ڈی او بھی خاموش ہو جاتا تھا۔

برکلے خاموشی کے ساتھ سیمبو کا بیان سنتا رہا۔ اس کو یقین تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے۔ تاجین نے اس کی روح کو ضرور ڈبیا میں قید کیا ہو گا۔ اسلئے کہ پانچ سال قبل بھی ایک ایسا کیس اس کے علم میں آیا تھا جس میں عظیم پاونگ نے ایک قبائلی کو بلیک میل کیا تھا۔

روح کو قید کرنے کے لئے پاونگ کے سحر کا طریقہ بالکل انوکھا تھا۔ وہ جس کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا تو پہلے اس کے بدن کی کچھ چیزیں مثلاً ناخن۔ یا بالوں کی لٹیں حاصل کر کے کسی ڈبے میں محفوظ کرتا۔ پھر ان چیزوں پر سحر کرتا۔ رات کی تاریکی میں وہ ان کو لئے ہوئے اپنے گرو کی قبر پر جاتا۔ اسے کھولتا اور ڈبہ کو گرو کے ڈھانچے کے سینہ پر رکھ کر عمل پڑھنا شروع کر دیتا۔ دوسری رات وہ پھر یہی عمل کرتا لیکن اس رات کو وہ اپنے ساتھ ایک سیاہ مرغ بھی لے کر جاتا۔ گرو کے ڈھانچہ پر ڈبہ رکھ کر عمل پڑھتے ہوئے مرغ کے پر کھینچ کھینچ کر کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب پھینکتا جاتا۔ اور جب کافی دیر کے بعد مرغ کے تمام پر کھینچ چکتا تو پھر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے

بعد تین بار چھری اس کے پیٹ میں داخل کرتا۔ خون کو ایک پیالے میں جمع کر کے کھڑے ہو کر پی جاتا۔ پھر تیسری رات کو وہ اپنے ساتھ ایک سیاہ کتا لے کر جاتا۔ قبر میں گڑو کے ڈھانچہ پر ڈبہ رکھتا اور عمل پڑھتا رہتا۔ پچھلی رات کو عمل ختم کرنے کے بعد کتے کو مار کر اس کا دل نکالتا اور تین ٹکڑے کر کے کچا کھا لیتا۔ اس طرح اس کا سحر پورا ہوتا۔

جس پر وہ جادو کرتا عمل کے دوران اس شخص کی حالت میں تبدیلی ہوتی جاتی۔ اس شخص کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی روح کو کوئی بدن سے کھینچ کر کسی ڈبیہ میں قید کر رہا ہے۔ بعد میں عظیم پا ونگ تاجین خود اسے آکر بتاتا کہ اس نے اس کی روح کو قید کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنا مطالبہ پیش کرتا جو زیادہ تر نقد رقم ہی ہوتا۔ بعض وقت وہ جانور بھی مانگتا۔ چند بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی عورت یا لڑکی کو اپنی خدمت کے لئے طلب کرتا۔ ان مطالبوں کی عدم تعمیل کی صورت میں اس شخص کی موت یقینی تھی۔ کوئی شخص بھی اس کے جادو کا توڑ نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ خود پا ونگ اس کو نہ اتارے۔

اس بار برکلے کو تاجین کے جادو سے متعلق ایک اور نئی چیز معلوم ہوئی تھی کہ جادوگر نے سیمبو کے پاؤں کے نیچے کی مٹی بھی لی ہے اس نے یہ مٹی بانس کے خول میں محفوظ کر لی ہے اور جس وقت پا ونگ اس نلکی سے پھونک مار کر اس پر وہ مٹی اڑا دے تو وہ مر جائے گا۔

سیمبو نے بتایا کہ گو وہ جادو کے زیر اثر ہے لیکن اس نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پانے کی بہت زیادہ کوشش کی ہے اور وہ پہلا شخص ہے جو مدد حاصل کرنے کے لئے ڈی او کے پاس آیا ہے ورنہ اس سے قبل قبائلیوں کو مرنا گوارا تھا لیکن ڈی او سے مدد لینے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔

برکلے اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ ساباٹی قبیلہ کا پا ونگ بدمعاش آدمی ہے وہ نقد رقم، جانور اور عورتوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے قبیلے کے آدمیوں پر جادو کرتا ہے۔ ورنہ اور دوسرے قبیلے کے پا ونگ اپنے اپنے قبیلے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنے روحانی کمالات کی وجہ سے ان کی جنگلوں میں امداد کرتے ہیں۔ وہ ادویہ اور الشبابۃ

جراحی سے لوگوں کا بہت اچھا علاج کرتے ہیں اور اس صورت سے ان کو آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے۔

یہ لوگ جڑی بوٹیوں سے ایسے زود اثر زہروں کے تیار کرنے کے ماہر تھے جن کو مہذب دنیا کے ترقی یافتہ کیمسٹ ابھی تک معلوم نہیں کر سکیں ہیں۔

برکلے نے سیمبو کے تمام حالات سے باخبر ہونے کے بعد فوراً اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ پا ونگ تاجین کی طاقتوں کو کچلنے کے لئے یہ بہترین موقع ہے۔ اگر وہ اس کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو قبیلے کے دلوں پر سے وہ پا ونگ کی حکومت ختم کر دے گا۔ اس لئے اس نے تیزی کے ساتھ تیاری کی اور ایک گھنٹے کے اندر ہی دو پولیس والے اپنے ہمراہ لے کر لانچ کے ذریعہ روانہ ہو گیا۔

لیکن اس کے روانہ ہوتے ہی جنگلی ٹیلی فون فوراً ہی حرکت میں آگیا اور برکلے جب دوپہر کے بعد ساباٹی گاؤں پہنچا تو گاؤں میں سردار مع دوسرے لوگوں کے اس کے استقبال کے لئے پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ وہ خاص چٹائی بھی تھی جو برکلے کو بیٹھنے کے لئے پیش کی جاتی تھی۔

برکلے کے پہنچنے پر سردار اور دوسرے لوگوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا اور بیٹھ کر گفتگو کرنے کے لئے اسے خصوصی چٹائی پیش کی۔ وہ چٹائی پر بیٹھنے کے بعد تجسس بھری نظروں سے ہر شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس تجسس کو دیکھ کر سردار اسے بے چینی محسوس کرنے لگا۔

کھڑے ہوئے لوگوں میں برکلے نے تاجین کو بھی دیکھا لیکن جادوگر دوسرے قبائلیوں کے ساتھ مل کر کھڑے ہونے کے بجائے سب سے ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ برکلے نے بغور جائزہ لیا۔ وہ چھریرے بدن کا تھا عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ چہرے سے عیاری اور آنکھوں سے سختی ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ سختی بالکل ایسی تھی جیسے قاتلوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے اس وقت بھی برکلے کے خلاف نفرت برس رہی تھی۔

یکایک سردار نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "تمہارا یہاں آنا ...

جھونپڑیوں میں آپ آتے ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔"

برکلے کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر اس نے سردار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ سردار کے کمپونگ (گاؤں) میں اس لئے آتا ہوں کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں ایک شیطانی روح داخل ہوئی ہے"
اور پھر چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔
"میں اس بدروح کو تباہ کر دوں گا۔ تاجین کو میرے سامنے لاؤ"

تاجین نے اپنا بلاوا سنا اور کچھ کہے بغیر برکلے کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ڈسٹرکٹ آفیسر نے اس کو بغور دیکھا۔ جادوگر کے گلے میں ایک ہار پڑا ہوا تھا۔ یہ ہار آنتوں سے بنایا گیا تھا اور اس میں چھوٹی چھوٹی ہڈیاں بھی پروئی ہوئی تھیں۔ اس کے کاندھے پر ایک تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس قسم کے تھیلے عام طور پر جادوگر اپنے کاندھوں پر لٹکائے پھرتے تھے۔

"یہ مجھے دو"۔ ڈی او نے تھیلے پر ہاتھ مارتے ہوئے جادوگر سے کہا۔

تاجین نے برکلے کے تھیلے پر ہاتھ مارنے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ تھیلا دینے کے بجائے خونی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب اس پر حملہ کرنے ہی والا ہے۔ یکایک جادوگر نے ان دو پولیس والوں کو دیکھا جو برکلے سے ایک قدم دور ہر قسم کے حالات سے نپٹنے کے لئے تامی گن لئے ہوئے تیار کھڑے تھے۔ حالات کی نزاکت کا اندازہ کرنے کے بعد اس نے آہستگی سے تھیلا اپنے کاندھے سے اتار کر ڈی او کے قدموں میں رکھ دیا۔

اس منظر کو دیکھ کر تمام قبائلیوں کی سانسیں رکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ سب کے سب خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ برکلے نے تھیلے کو پھاڑنے کے انداز میں کھول کر اس کی چیزوں کو دیکھنا شروع کیا کہ شاید کسی قسم کا ثبوت مل جائے۔

تھیلے میں کچھ ہڈیاں تھیں جن پر دیوتاؤں کے نشانات تھے۔ یہ ہڈیاں غیب کا حال بتاتی تھیں۔ دو تین شیشیاں تھیں جن میں بدبودار تیل بھرا ہوا تھا۔ ایک یا دو موم کی بنی ہوئی انگلیاں تھیں جن میں بلبل کی ہڈیاں چھیدی گئی تھیں۔ کچھ چھیلوں۔ کوؤں۔ اور الوؤں اشیاء

کے پر تھے۔ چند بانس کی پونگیاں اور چند مٹی کی چھوٹی ڈبیاں تھیں۔ ان ہی ڈبیوں میں وہ لوگوں کی روحیں قید کئے ہوئے تھا۔

برکلے نے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور ڈبیوں کو ہاتھ میں لے کر ان کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو یہ وہ ڈبیاں ہیں جن میں روحیں قید ہیں۔ لیکن اب میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ ان ڈبیوں میں روح کے بجائے صرف مٹی ہے۔ تاجین جھوٹا جادوگر ہے اس کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔"

اس نے ڈبیوں کو کھول کر ان میں محفوظ مٹی کو زمین پر گرایا اور پھر پیر سے رگڑنا شروع کر دیا۔ بعد میں ڈبیوں کو اچھی طرح سے توڑ کر کھڑے ہوئے لوگوں کی جانب پھینک دیا۔

ساکائیوں کے مجمع نے ایک لمبی سانس کھینچی اور خاموش ہو گئے۔ ڈی او یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ یہ سانسیں ڈر کی وجہ سے نکلی تھیں یا تاجین کے جادو سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی بنا پر۔

"تاجین"۔ اس نے جادوگر سے کہا۔ "اگر دوبارہ مجھ تک شکایت پہنچی کہ تم نے کسی پر جادو کیا ہے تو اس بات کو یاد رکھو کہ تم کو پکڑ کر ایک ایسی چھوٹی کوٹھری میں بند کر دوں گا جہاں سے تم پھر کبھی نہیں نکل سکو گے۔"

اپنے خیال کے مطابق برکلے نے قبیلے والوں کو مطمئن کر کے ایک بڑی بلائی سے ان کا پیچھا چھڑا دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پاونگ اب اس قابل نہیں رہا ہے کہ دوسروں کو بلیک میل کر سکے۔ اس نے جادوگر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔ لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنا کام ختم کر کے لانچ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہیڈکوارٹر پہنچنے کے بعد وہ مطمئن تھا کہ ایک ایسا بڑا کام کر آیا ہے جس سے ساکائی کے لوگ اب اطمینان کے ساتھ رہ سکیں گے اور اب اس بات کا امکان بھی نہیں رہا تھا کہ تاجین ان سے کسی طرح کا بدلہ لے سکے۔

ایک مہینے تک کسی واقعہ کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ لیکن ایک رات وہ اپنے اسسٹنٹ جیپسن کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ یکایک باہر مدھم روشنی میں ایک سایہ دکھائی دیا۔

اور پھر چند لمحوں کے بعد پولیس والے ایک عورت کو پکڑے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عورت جوان اور پرکشش تھی۔ اس کے سڈول بدن پر جگہ جگہ سے کپڑے پھٹے ہوئے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کپڑے خاردار جھاڑیوں میں الجھنے کی وجہ سے پھٹے ہیں۔ عورت اس وقت ہسٹریا میں مبتلا تھی۔

" جناب۔ ہم نے اس عورت کو یہاں سے بھگانے کی کوشش کی لیکن یہ کسی صورت سے جانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ رات میں ہی آپ سے ملنے کے لئے اصرار کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ سخت مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے "۔

" لیکن یہ ہے کون ؟ "۔ ڈسٹرکٹ آفیسر نے پوچھا۔

" اس کا نام سرائی ہے اور اپنے آپ کو سیمبو کی بیوی بتاتی ہے "۔ پولیس والوں نے جواب دیا۔

سیمبو کا نام سن کر برکلے ایک دم اچھل پڑا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

" سیمبو کہاں ہے ؟ "۔

" متائی کا "۔ عورت نے آہیں بھرتے ہوئے کئی بار یہ الفاظ دھرائے۔

" اس کا مطلب یہ ہے کہ سیمبو مر چکا ہے "۔ برکلے نے اپنے دل میں کہا۔

ڈی او نے پولیس والوں کو باہر جانے کا حکم دیا اور عورت کو لے کر دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں اس کو آرام سے بٹھا کر تسلی دیتے ہوئے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

کافی دیر کے بعد عورت کو سکون ہوا تو اس نے واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ مجھے یاونگ تاجین اور میرے خاوند سیمبو کے تمام حالات معلوم ہیں۔ یاونگ اسے بلیک میل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کئی بار اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے پاس رہوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے اس نے سیمبو کی روح کو قید کر لیا۔

تنہا سے واپس آنے کے بعد وہ کئی دنوں تک خاموش رہا

آخر ایک روز اس نے تمام گاؤں والوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ میں بالکل تباہ ہو گیا ہوں اور یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ ایسا کس کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اپنا انتقام ضرور لوں گا۔ دوسرا چاند لوپا نکلنے تک وہ آدمی ضرور مر جائے گا۔

کچھ روز کے بعد سیمبو شکار سے واپس آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بیمار ہے۔ روز بروز وہ تیزی کے ساتھ سوکھ رہا تھا۔ آخر چھ سات دن بیمار رہ کر وہ آج مر گیا۔ اور میں فوراً ہی جنگلوں میں دوڑتی ہوئی یہاں پہنچی ہوں۔

عورت کا بیان ختم ہونے کے بعد برکلے کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ آخر اس نے اپنے اسسٹنٹ جیپسن کو بلا کر تمام واقعات بتلاتے اور فوراً اس کو تیار ہو کر روانہ ہونے کے لئے حکم دیتے ہوئے کہا۔ " میں چاہتا ہوں کہ تم جا کر اس کیس میں ہوشیاری کے ساتھ کام کرو۔ تاجین کوئی معمولی قبائلی نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ قتل کا ذرا بھی ثبوت نہیں چھوڑے گا۔ سرائی نے جو واقعات بتلائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیمبو کو زہر دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جیلانگ زہر ہو جس کو شمالی سیمنگ کے قبیلے والے بناتے ہیں۔ یہ زہر کھلایا نہیں جاتا بلکہ بانس کی ایک پتلی نلکی سے پھونک مار کر کسی پر بھی اڑایا جا سکتا ہے۔ اس زہر کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو فوراً سکھا دیتا ہے اور وہ ہفتہ عشرہ میں ہی مر جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب میں نے تاجین کا جادو کا تھیلا کھولا تھا تو اس میں کچھ سفوف اور نلکیاں تھیں اسی لئے میں تم کو بتا رہا ہوں کہ کام بہت ہوشیاری سے کرنا ہوگا "۔

دوسرے دن صبح جیپسن دو پولیس کے سپاہیوں کو اپنے ہمراہ لے کر لانچ میں روانہ ہو گیا۔ گاؤں میں پہنچنے کے بعد اس نے تاجین کو تلاش کیا اور جیسی کہ اسے امید تھی کہ جادوگر اسے نہیں ملے گا۔ بالکل یہی ہوا۔ گاؤں میں کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے ایک پولیس مین کو فوراً لانچ پر واپس بھیج دیا کہ وہ اس کو دریا میں اور اس کے آس پاس تلاش کرے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ٹھہر کر کیا کرے ؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا

تاجین یہاں سے فرار ہو کر بہت دور چلا گیا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ ساکائی قبیلے کے دو گاؤں یہاں سے بہت دور اسی علاقہ کی سرحد پر ہیں۔ گو یہ گاؤں ڈی او بسلے کی سرکل میں تھے لیکن دوسرے ڈسٹرکٹ کی حدود بھی قریب ہونے کی وجہ سے قبائلی قانون کی زد سے بچنے کے لئے چھپ کر سرحد پار کر لیتے ہیں۔

جیپسن بڑی دیر تک حالات پر غور کرتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اس کو طویل مسافت طے کرنے کے بعد ان مواضعات میں پہنچ کر ہر حالت میں تاجین کو گرفتار کرنا چاہئے۔ وہ فوراً ہی اپنے ساتھ سپاہی کو لے کر روانہ ہو گیا۔ دو دن تک پیدل سفر کرنے کے بعد آخر وہ سرحدی گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس نے سردار کو بلا کر تاجین کے بارے میں دریافت کیا لیکن سردار نے بالکل لاعلمی ظاہر کی۔ جیپسن نے خصوصیت سے سردار کے حرکات و سکنات کو دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ سردار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس لئے اس نے وہاں رات کو قیام کرنا ضروری سمجھا۔

سردار کو جب یہ معلوم ہوا کہ جیپسن اور اس کا ساتھی یہاں رات کو ٹھیریں گے تو وہ ان لوگوں کو ایک جھونپڑی میں لے گیا۔ یہ زمین سے چار فٹ اونچی تھی۔ ملایا کے جنگلوں میں اور بالخصوص کیلن ٹن کے جنگل میں گاؤں والے اپنی جھونپڑیاں شیروں وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لئے زمین سے اونچی بناتے ہیں۔ جھونپڑیوں میں جانے کے لئے سیڑھی یا مضبوط رسی استعمال کی جاتی ہے اور رات کو یہ رسی یا سیڑھی اوپر کھینچ لی جاتی ہے۔

معلوم نہیں کتنی رات گذری تھی کہ جیپسن یکایک سوتے سوتے بیدار ہو گیا۔ آنکھیں کھلنے کے بعد اس کو کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔ پوری جھونپڑی میں بدبو پھیلی ہوئی تھی، ہوا اسقدر بھاری تھی کہ سانس مشکل سے لی جا رہی تھی۔ اس نے چٹائی پر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن محسوس ہوا کہ تمام اعضا ایسے مفلوج ہو چکے ہیں جن کو ہلایا بھی نہیں جا سکتا ہے۔

ہوا ہر لمحہ بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ اعضا کام نہیں کر رہے تھے۔ آخر سارا سدھ چلانے کی کوشش کی لیکن آواز بھی نہیں نکل سکی۔ گلے

الشجاع

سے بمشکل غرغراہٹ اس طرح نکلی جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔ بڑی کوشش کے بعد اس کو اندازہ ہو سکا کہ وہ اپنا سیدھا ہاتھ چٹائی پر حرکت دے سکتا ہے۔ اس نے جھونپڑی کے دروازے کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچنا چاہئے ویسے دروازہ اس سے کچھ دور نہیں تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس کو بھی دور سمجھ رہا تھا۔ اس لئے ہمت کر کے اچھے ہاتھ کی مدد سے دروازے کی جانب بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کام انتہائی دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ یکایک دروازہ خود بخود کھلا۔ جیپسن بہت حیران ہوا۔ باہر کی ہلکی روشنی میں اسے ایک قبائلی کا سر دکھائی دیا۔ برکلے نے جو حلیہ ساکائی جادوگر کا بتایا تھا۔ باہر والا قبائلی بھی بالکل اسی طرح تھا۔ سیاہ رنگ کا چھ فٹ کا آدمی جو ساکائی قبیلے میں سب سے زیادہ لمبا تھا۔ اس کے سامنے موجود تھا۔

" تو یہی ہے وہ جادوگر تاجین جس نے ساکائی قبیلے میں دہشت پھیلا رکھی ہے " جیپسن نے اپنے دل میں سوچا۔

وہ اپنے اچھے ہاتھ کو زور دے کر ریوالور کی تلاش میں چٹائی پر پھیرنے لگا۔ سونے سے قبل اس نے ریوالور بستر سے نکال کر چٹائی پر رکھ لیا تھا۔ ادھر ادھر ہاتھ پھیرنے پر ریوالور کی نال اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے گرفت مضبوط کی۔ زور لگا کر ہاتھ سیدھا کیا اور بغیر نشانہ لئے ہوئے جادوگر پر فیر کر دیا۔

جیپسن کو اتنا یاد تھا کہ اس کے فیر کرنے کے بعد جادوگر فرار ہو گیا۔ جنگل میں دور تک اس کے دوڑنے کی آواز آتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ لمحوں کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی اسے کھینچ کر جھونپڑی سے باہر لے گیا اور کھلی جگہ میں ڈال دیا۔

بڑی دیر تک تازی ہوا میں پڑے رہنے کے بعد اس کے اوسان بحال ہوئے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف کھڑے ہوئے گاؤں والوں سے ٹھنڈا پانی منگوا کر پیا۔ منہ اور ہاتھ دھوتا رہا۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد اس کے اعضا مکمل طور پر کام کرنے لگے۔

جیپسن کے ساتھ ساتھ گاؤں والے جھونپڑی میں سے

پولیس کے سپاہی کو بھی کھینچ لائے تھے وہ بھی وہیں پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس پر زیادہ اثر معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے دن دوپہر کو کہیں جا کر اس کے ہوش و حواس بحال ہوتے لیکن اعضا پھر بھی بیکار تھے اس لئے جیپسن نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کو لے کر ہیڈ کوارٹر روانہ ہو جائے۔

ہیڈکوارٹر پہنچنے کے بعد ڈی او برکلے نے تمام واقعات خاموشی سے سنے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جیپسن سے کہا: "تم واقعی خوش قسمت تھے جو بچ گئے ورنہ ایسی حالت میں کوئی امید نہیں تھی۔ میرے خیال میں تم پر جو زہر کا سفوف استعمال کیا گیا ہے۔ وہ دھتورے سے تیار کیا ہوا تھا۔ سپاہی کو صحت یاب ہونے میں ابھی کچھ دن لگیں گے۔ یہ تم نے اچھا ہی کیا کہ اس کو یہاں لے آئے۔

اب تمہارا اس کے تعاقب میں جانا بیکار ہوگا۔ اس لئے کہ تاجین اپنے علاقہ میں نہیں ملے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب ٹریگانوں کے علاقہ میں ہو۔ میں وہاں کے ڈسٹرکٹ آفیسر کو لکھتا ہوں کہ وہ اس پر نظر رکھے۔"

جیپسن عمر رسیدہ برکلے کے تجربات پر بہت بھروسہ کرتا تھا اس لئے وہ کسی معاملہ میں اختلاف نہیں کرتا تھا۔ اور ہوا بھی یہی کہ معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ تاجین اس علاقہ سے فرار ہو چکا ہے اور پھر کئی مہینوں تک اس کی پتہ رسی نہ ہو سکی۔

تاجین کے خلاف تفتیش برابر جاری تھی۔ یکایک دوران تفتیش ایک انوکھا واقعہ سامنے آیا۔ ایک روز ایک شخص برکلے کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس شخص کا نام ہورڈ تھا اور یہ شیروں کا شکار کھیلتا تھا۔ اس نے برکلے سے قبائلیوں کی عجیب عادات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ "میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں قبائلی میری عزت کرتے ہیں۔ اور شیروں کے شکار کے سلسلہ میں اطلاعات بہم پہنچانے کے علاوہ ہر صورت سے مدد بھی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ گذرا کہ مجھے خبر ملی تھی کہ شمال میں تقریباً سو میل دور تانم گاؤں کے پہاڑوں میں ایک آدم خور شیر وارداتیں کر رہا ہے۔ میں یہ فاصلہ طے کر کے جب گاؤں میں پہنچا تو گاؤں والوں نے میرے ساتھ بڑی بے مروتی برتی اور کوشش کے

اشتعاع

باوجود کسی نے پہاڑوں میں شیر سے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو میرا وہاں پہنچنا ناگوار گذرا ہے جس کی وجہ سے وہ تعاون کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں وہاں کسی قسم کی غلط کارروائی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ گاؤں میں میری موجودگی کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ مجبوراً مجھے شیر کو ایک نظر دیکھے بغیر ہی واپس ہونا پڑا۔

برکلے بڑی دیر تک حالات پر غور کرتا رہا۔ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ تاجین نے اب اپنی سرگرمیوں کے لئے دور دراز علاقہ منتخب کیا ہے۔ اور گاؤں والوں نے اس کے ڈر کی وجہ سے ہورڈ کی موجودگی کو پسند نہیں کیا۔

دوسرے دن صبح وہ اپنے ہمراہ جیپسن کے علاوہ دو پولیس کے سپاہی اور ایک کھوجی سیمنگ کو لے کر لانچ سے تانم روانہ ہو گیا۔ کھوجی سیمنگ کو اس لئے اس نے اپنے ساتھ رکھا تھا کہ جنگل میں نشانات کے ذریعہ تاجین کی پتہ رسی کر سکے۔

اس نے لانچ کی رفتار بہت سست رکھی تاکہ کسی کو شک و شبہ نہ ہو سکے۔ تیز رفتاری کی صورت میں قبائلیوں کا حلیہ فوراً ہی حرکت میں آ جاتا اور ان کے پہنچنے سے قبل ہی تاجین باخبر ہو جاتا۔

پانچ روز تک سفر کرنے کے بعد جب وقت لانچ تانم کے کنارے پر پہنچی تو برکلے نے دونوں پولیس والوں کو کنارے پر کھڑی کشتیوں کو فوراً اپنے قبضہ میں لینے کے لئے روانہ کر دیا۔ جیپسن اور کھوجی کو جنگل میں روانہ کیا تاکہ وہ گاؤں سے جنگل میں جانے والے راستہ کی ناکہ بندی کریں۔ اور خود جھونپڑیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

برکلے کے گاؤں میں یکایک پہنچنے پر گاؤں والوں کو سخت تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس کے پہنچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ڈسٹرکٹ آفیسر نے فوراً سردار کو دریافت حال کے لئے طلب کیا۔

سردار کے چہرے پر نہایت ناخوشگوار تاثرات تھے۔ تاجین کا نام لینے پر اس کے چہرے پر مردنی چھانے لگی۔ اس نے بمشکل برکلے کو باور کرانے کی کوشش کی کہ تاجین یہاں پر نہیں ہے۔ لیکن

برکلے خوب جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

ابھی وہ مسز مار سے سوال کر ہی رہا تھا کہ یکایک لسے رائفل چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اسی جانب سے آئی تھی جہاں جیپسن اور کھوجی نے ناکہ بندی کی تھی۔

برکلے تیزی سے دوڑتا ہوا اس جگہ پر پہنچا جہاں پر جیپسن اور کھوجی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیپسن نے برکلے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تاجین میرے سامنے سے اتنی تیزی سے گذر کر جنگل میں غائب ہو گیا ہے کہ مجھے خود بھی تعجب ہو رہا ہے۔ لیکن اسے گئے ہوئے دو ہی منٹ ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ہم اس کا پیچھا کر کے ابھی پکڑ لیں گے۔"

تینوں جنگل میں فوراً ہی داخل ہو گئے۔ کھوجی آگے آگے جا رہا تھا۔ برکلے اور جیپسن اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک چلنے کے بعد کھوجی نے انھیں بتایا کہ جادوگر ہر لمحہ ہم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ برکلے بھی اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ تاجین کو جنگل میں جو سہولت حاصل ہے وہ اسے نہیں ہے پھر بھی اس نے تعاقب جاری رکھا۔

سورج ڈوبنے میں تھوڑی دیر تھی۔ برکلے سوچ رہا تھا کہ اگر ہم اس وقت تاجین کو گرفتار نہیں کر سکے تو پھر اس کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہو گا۔ رات میں ہم کسی طرح بھی تعاقب جاری نہیں رکھ سکتے۔

یکایک کھوجی سیمنگ نے کھڑے ہو کر نشانات کو دیکھنا شروع کیا۔ اور پھر نشانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی کے پیچھے شیر کے پنجے کے بھی نشانات ہیں برکلے سمجھ گیا کہ شیر بھی تاجین کا پیچھا کر رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ شیر وہی آدم خور ہو جس کے بارے میں ہوررڈ نے بتایا تھا۔

ایک میل اور چلنے کے بعد کھوجی سیمنگ نے نشانات کو دیکھ کر پھر بتایا کہ آدمی اور شیر میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ انھوں نے تیزی سے قدم بڑھانے شروع کئے۔ ابھی
الشجاع

وہ کچھ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ یکایک انھیں چند سو گز کے فاصلہ سے تاجین کی بلند اور کرخت چیخ سنائی دی تینوں نے تیزی سے دوڑنا شروع کیا اور پھر چند لمحوں کے بعد ہی ان کے سامنے شیر تھا جو تاجین کی لاش کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔

شیر اور برکلے کے درمیان بہت معمولی فاصلہ تھا شیر نے بھی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے لاش زمین پر چھوڑ دی اور کھڑے ہو کر ان کو دیکھ کر غرانے لگا۔ برکلے نے دیر کئے بغیر رائفل سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی ٹھیک نشانہ پر لگی اور چند لمحوں میں شیر بھی لاش کے برابر مرا پڑا تھا۔

برکلے چند منٹ تک اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کے بعد آگے بڑھا اور تاجین کی لاش اور مردہ شیر کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ دونوں میں سے زیادہ خطرناک کون تھا ۔۔۔؟

آج بھی

مجموعی طور پر اردو ادب پر روایت کا اثر زیادہ ہے ۔ اس میں تجربات کی لے کم ہے۔ آج بھی ہمارا ادب مجموعی طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ آج بھی ہماری شاعری پر غزل کی ریزہ خیالی اور تغزل کے لطیف ابہام کا اثر زیادہ ہے اور ہماری نثر آج بھی شاعری کے سحر سے پوری طرح رہا نہیں ہو سکی ہے۔ ہماری زبان کا سرمایہ جذبے کا ساتھ تو دے سکتا ہے۔ تخیل کی پرواز میں تو خاصا کامیاب ہے۔ مگر جب علوم خصوصاً جدید علوم کی عکاسی کا سوال آتا ہے تو قدم قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں۔

مالی نوسکی نے کہا ہے کہ کوئی زبان کسی دوسری زبان سے صلاحیت کے اعتبار سے کم تر نہیں ہوتی۔ چھوٹی سے چھوٹی ابتدائی زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اعلیٰ ترین خیالات اور معلومات کو ادا کر سکے مگر اس کے لئے وقت اور کوشش اور مواقع کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صلاحیت کے اعتبار سے اردو کے متعلق بھی کوئی شبہ نہیں کرنا چاہئے۔

(آل احمد سرور)

نیشاپور

ایران کے مشہور مردم خیز صوبے خراسان کے پانچ شہروں نے تاریخ اسلام میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ان شہروں کے نام طوس، بلخ، ہرات، مرو اور نیشاپور ہیں۔

نیشاپور جو خراسان کا صدر مقام رہ چکا ہے، اپنی خوشگوار آب و ہوا اور شادابی کے لئے سارے ملک میں مشہور تھا یہ ایران کے سب سے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔

اسلام سے قبل شاہان ساسانی کے عہد میں بھی یہ ایک مشہور شہر تھا جسے اردشیر اول کے بیٹے شاہ پور اول نے آباد کیا تھا اس شہر کی شمالی مغربی پہاڑی پر ساسانیوں کا ایک مشہور مندر تھا جس کا شمار ان کے تین سب سے زیادہ متبرک مندروں پر ہوتا تھا۔

عہد اسلامی کے ابتدائی زمانہ میں نیشاپور گمنامی کے پردہ میں چھپا رہا۔ اس کی شہرت اور خوشحالی کے آفتاب ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں چمکا اور نویں صدی عیسوی میں ابوالعباس عبداللہ کے عہد حکومت میں اس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں نیشاپور حاکم (گورنر) خراسان کا مستقر تھا۔

مسلمان سیاح جو اس زمانہ میں نیشاپور آئے انھوں نے نیشاپور کی عظمت اور خوشحالی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کے قول الشباع کے مطابق نیشاپور کا شہر ۴۲ وارڈوں (حصوں) میں منقسم تھا اور تقریباً چھ میل لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کی جامع مسجد شہر کے نواحی علاقے میں شاہان صفوی کی تعمیر کردہ تھی اور اپنی عظمت نیز خوبصورتی کے لئے دور دور مشہور تھی۔ شہر کے چار عظیم باب (دروازے) تھے اور ۵ کشادہ سڑکیں تھیں جو ایک دوسرے سے متوازی تھیں یا ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر کاٹتی تھیں۔ ان سڑکوں کے دونوں جانب خوبصورت عمارتیں اور دکانیں تھیں جن پر ہر قسم کا سامان دستیاب اور فروخت ہوتا تھا۔ ہزاروں اونٹوں کے قافلے دریائے سفادر کے ساتھ ساتھ نیشاپور کی جانب رواں دواں نظر آتے تھے۔

یہ دریا جو ستر میل کی مسافت طے کر کے نیشاپور کے قریب سے گزرتا تھا، ساکنان شہر کو وافر مقدار میں پانی فراہم کرتا تھا۔ نہروں کے ذریعہ یہ پانی شہر کے مختلف حصوں میں پہنچایا جاتا تھا اس سے نیشاپور کے سینکڑوں باغ سیراب ہوتے تھے۔

یہ عظیم شہر بھی امتداد زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ سنہ ۱۱۵۱ء میں یہ قحط سالی کا شکار ہوا جس میں یہاں کی بہت سی جانیں تلف ہو گئیں سنہ ۱۱۵۳ء میں بیرونی حملہ آوروں نے اسے تاراج کیا۔ اور اس کے باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ اس کی بہت سی آبادی جان بچا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کے علاوہ یہاں شدید

ملک شاہ سلجوقی نے ایک بار اپنے وزیر اعظم نظام الملک طوسی سے کہا۔
"آپ جو روپیہ تعلیم پر صرف کرتے ہیں اس سے ایک بڑی فوج تیار ہو سکتی ہے آپ جن لوگوں کے ساتھ فیاضی کرتے ہیں۔ ان سے کیا کارہائے نمایاں کی توقع رکھتے ہیں؟"
عاقل وزیر نے جواب دیا۔
"تمہارے تیر انداز جو تیر پھینکیں گے وہ تیس گز سے آگے نہیں جا سکیں گے۔ لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کی دعاؤں کے تیروں کو آسمان بھی نہیں روک سکتا ہے!"

زلزلے آئے ان میں سنہ ۱۱۴۵ء، سنہ ۱۲۰۸ء اور سنہ ۱۲۸۰ء کے زلزلے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان سے اس عظیم شہر کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مشہور عرب سیاح یاقوت جو سنہ ۱۲۱۶ء میں نیشاپور گیا تھا۔ لکھتا ہے کہ جنگ اور زلزلوں کی تباہ کاریوں کے باوجود نیشاپور خراسان کا بہترین شہر ہے۔

دوسرے زلزلے کے بعد جو بہت شدید تھا یہاں کے باشندوں نے قدیم شہر کو چھوڑ کر اسی کے قریب ایک نیا شہر بسایا۔ سنہ ۱۲۲۱ء میں چنگیز خان نے نیشاپور کو تاراج کیا اور اس کے باشندوں کا قتل عام کیا۔ سنہ ۱۳۵۰ء میں جب شہرہ آفاق مسلمان سیاح ابن بطوطہ یہاں آیا تو نیشاپور اپنی تباہی سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔

نیشاپور ۳۶٫۱۲ ڈگری شمالی عرض البلد اور ۵۸٫۵۵ ڈگری مشرقی طول البلد پر واقع ہے ایک وسیع میدان کے مشرقی جانب پھیلا ہوا ہے اور تین جانب پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ نیشاپور کے شمال کی جانب ایک پہاڑی اسے طوس سے جدا کرتی ہے اور مشرق کی جانب جو پہاڑی واقع ہے وہ اسے مشہد سے علیحدہ کرتی ہے۔

اس شہر کے جنوب مشرق میں دنیائے اسلام کے مشہور ریاضی داں اور شاعر عمر خیام اور شہرہ آفاق صوفی حضرت فریدالدین عطار کے مقبرے واقع ہیں۔

حکیم ابو عبداللہ نیشاپوری نے اس شہرہ آفاق شہر کی تاریخ آٹھ جلدوں میں مرتب کی ہے۔ حکیم صاحب کا انتقال سنہ ۱۰۱۴ء میں ہوا تھا۔ مشہور سیاح یاقوت اور حاجی خلیفہ نے اس تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔

نیشاپور دنیائے اسلام کے دو عظیم ترین تعلیمی مرکزوں میں سے ایک تھا۔ اور بغداد کے بعد یہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز تسلیم کیا جاتا تھا۔ سب سے پہلی اسلامی یونیورسٹی نیشاپور میں قائم ہوئی اور مشہور سلجوقی وزیر نظام الملک طوسی نے پہلی نظامیہ یونیورسٹی نیشاپور میں سنہ ۱۰۶۶ء میں قائم کی۔ حضرت امام الحرمین جو امام غزالی کے استاد رہ چکے ہیں اس یونیورسٹی

الشجاع

کے صدر (پرنسپل) مقرر ہوئے۔ امام غزالی نے بھی اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور ۳۴ سال کی عمر میں نظامیہ یونیورسٹی بغداد کے صدر (پرنسپل) مقرر ہوئے۔ علامہ ابن خلقان کے مطابق دنیائے اسلام میں نظام الملک پہلے شخص ہیں جنہوں نے باقاعدہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔

نظامیہ یونیورسٹی نیشاپور اور بغداد میں دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم خصوصاً سائنسوں اور فنون کی مکمل تعلیم دی جاتی تھی۔

نظام الملک طوسی نے اپنے ممالک محروسہ میں اعلیٰ مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ سب سے پہلی نظامیہ یونیورسٹی انھوں نے نیشاپور میں قائم کی۔ بعد ازاں بغداد میں دوسری نظامیہ یونیورسٹی قائم کی۔ اس کے علاوہ خراسان۔ عراق اور شام کے مختلف حصوں میں بھی نظام الملک طوسی نے بڑے بڑے مدرسے قائم کئے۔

نظام الملک نے شاہی خزانے کے دروازے تعلیمی ترویج اور ترقی کے لئے کھول دیئے۔ ملک شاہ سلجوقی جو اپنے استاد اور وزیر اعظم نظام الملک طوسی کی بڑی عزت کرتا تھا ایک بار ان سے اس طرح مخاطب ہوا۔

" میرے پیارے باپ۔ آپ جو روپیہ تعلیم پر صرف کرتے ہیں اس سے ایک بڑی فوج تیار ہو سکتی ہے۔ آپ جن لوگوں کے ساتھ اتنی فیاضی کرتے ہیں ان سے کیا کارہائے نمایاں کی توقع رکھتے ہیں۔؟ "

عاقل وزیر نے جواب دیا۔ " میرے پیارے بیٹے۔ میں اب ضعیف ہو گیا ہوں لیکن تم ماشاء اللہ ابھی جوان ہو۔ لیکن تمہیں اگر بازار میں نیلام کیا جائے تو مشکل سے تیس چالیس دینار ملیں گے۔ اس کے باوجود خدا نے تمہیں ایک بڑی سلطنت کا مالک بنا دیا ہے۔ کیا اس کے لئے تمہیں اس کا شکر گذار نہیں ہونا چاہئے ؟۔ تمہارے تیر انداز جو تیر پھینکیں گے وہ تیس گز سے آگے نہیں جا سکیں گے لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کی

دعاؤں کے تیر ملا کو آسمان بھی نہیں روک سکتا ہے "

ملک شاہ سلجوقی اپنے دوراندیش اور عاقل وزیر اعظم کے جواب سے بہت متاثر ہوا اور فی الفور کہا۔ "بہت خوب میرے باپ! آپ ایسی فوج جلد از جلد تیار کریں"

نظام الملک طوسی کی پیروی میں اس کے ممالک کے امراء اور روساء نے بھی تعلیم کی ترویج اور ترقی میں ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر حصہ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایران، ترکستان، عراق اور شام کے دور دراز علاقوں میں مدرسوں اور کالجوں کا جال بچھ گیا۔

دنیائے اسلام میں تعلیمی مرکز کی حیثیت سے نیشاپور کا درجہ بغداد کے بعد دوسرا ہے۔ سنہ ۵۵۲ ہجری میں جب یہ شہر اندرونی بغاوت اور خانہ جنگیوں سے تباہ ہو گیا تو اس کے ۲۵ بڑے بڑے مدرسے اور سرائے بھی مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئے۔ سلطان محمود غزنوی کے بھائی امیر نصر نے سیدہ نامی ایک کالج یہاں تعمیر کیا تھا۔ نیشاپور کے باشندوں نے مشہور عالم و فاضل ابوبکر فرنح کو مدعو کیا تھا اور جب وہ نیشاپور تشریف لائے تو وہاں کے باشندوں نے چندہ کر کے ایک بڑا مدرسہ تعمیر کیا جس کا صدر انھیں بنایا گیا۔ مشہور سپہ سالار ابومسلم خراسانی نے عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد خلافت میں ایرانی طرز کی دو عظیم الشان مساجد مرو اور نیشاپور میں تعمیر کی تھیں۔

ملک شاہ سلجوقی اور ان کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے ۱۰۷۴ء میں نیشاپور میں ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کی جس میں عمر خیام اور عبدالرحمٰن الخازنی نے فلکیات کی تحقیق شروع کی۔ اور اس طرح ایک تقویم تیار کی جو مشہور عیسائی مصنف سیڈیلیٹ کے قول کے مطابق گریگورین کلنڈر سے ۶۰۰ (چھ سو سال) قبل مکمل اور اس سے زیادہ صحیح اور قابل اعتبار ہے۔ عمر خیام نے جو تقویم تیار کی اس کا نام اپنے سرپرست جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے نام پر "التاریخ جلالی" رکھا۔ یہ تقویم گریگورین کلنڈر سے زیادہ صحیح ہے۔ گریگورین کلنڈر میں ۳۳۰۰ سال میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔ جبکہ عمر خیام کی بنائی ہوئی تقویم میں پانچ ہزار سال میں ایک دن کا فرق پڑتا ہے۔

یوں تو نیشاپور کے مردم خیز شہر نے سینکڑوں بڑے بڑے علماء، فضلاء، مفکرین اور فنکاروں کو جنم دیا ہے لیکن ان میں عمر خیام اور خواجہ فرید الدین عطار کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے مزار بھی اسی شہر میں واقع ہیں۔

خواجہ فرید الدین عطار مشہور صوفی گزرے ہیں جن کی مشہور تصنیف "منطق الطیر" مولانا جلال الدین رومی کی شہرہ آفاق "مثنوی معنوی" کے بعد اپنے زمانہ کی سب سے مشہور صوفیانہ تصنیف ہے جس میں تیس چڑیاں ہدہد کی قیادت میں "سیمرغ" کی تلاش میں نکلتی ہیں اور تلاش، عشق، علم، علوی، اتحاد، تحیر اور بے خودی کی وادیوں کی سیر کرنے کے بعد انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ خود ہی سیمرغ ہیں۔

عمر خیام جو مغرب میں بحیثیت شاعر زیادہ مشہور ہے اور جس کی زندہ جاوید مثنویوں کو فٹز جیرالڈ نے انگریزی میں ترجمہ کر کے مغرب سے روشناس کرایا ہے ایران میں بحیثیت ریاضی اور ہیئت داں کے زیادہ مشہور ہے۔ عمر خیام ۱۰۴۸ء میں نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کے ہم جماعت سلجوقی وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے اسے نیشاپور میں تعمیر کردہ فلکیاتی رصدگاہ میں تحقیق پر مامور کیا اور آخرکار عمر خیام کی تحقیقی کوششوں سے شہرہ آفاق تقویم "تاریخ الجلالی" عالم وجود میں آئی جو چھ سو سال بعد مرتب کئے جانے والے گریگورین کلنڈر سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی۔

عمر خیام کا شمار زمانہ وسطیٰ کے عظیم ریاضی دانوں میں ہوتا ہے اور ڈی منورسکی کے قول کے مطابق عمر خیام زمانہ وسطیٰ کا عظیم ترین ریاضی داں تھا جس نے الجبرے کی سائنس کو بڑی ترقی دی اور یونانیوں نیز خوارزمی کے الجبرے پر بھی اضافہ کیا۔ جیومیٹری میں بھی اس نے بڑا اضافہ کیا ہے اور میکس میر ہاف کے قول کے مطابق "جیومیٹری میں اس کا اضافہ اس کے ادبی کارناموں سے کسی طرح کمتر درجہ کا نہیں ہے۔" علم طبیعات میں اس نے تحقیق کے ذریعہ سونے اور چاندی کے صحیح اوزان معلوم کئے اور دھاتوں میں جڑے ہوئے پتھروں کو جدا کئے بغیر ایسی دھاتوں کے اوزان کا طریقہ دریافت کیا۔ ان کی موت کے متعلق ایک قصہ "نظام الارواح" میں درج ہے۔ اپنی موت کے دن عمر خیام مشہور فلسفی اور حکیم ابن سینا کی کتاب "الشفاء" کا مطالعہ کر رہا تھا پڑھتے پڑھتے جب اس کے باب "ایک یا ایک سے زیادہ" پر پہنچا تو خیام نے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

الشجاع

ناقابلِ فراموش ——— قسط نمبر ۲

تلخیص و ترجمہ

اختر ملیح آبادی

ہٹلر کے تہہ خانے میں

- ۲۴ اپریل ۱۹۴۵ء کو جبکہ روسی ٹینکوں نے ہٹلر کے تہہ خانے کا محاصرہ کیا اور برلن کو ساری دُنیا سے منقطع کر دیا۔

اِس سے قبل کی سچی روئداد

- بورمن اور ہملر کی طاقت و اقتدار کے لئے رسہ کشی۔ گورنگ کے زوال اور گرفتاری کی سچی داستان
- آخری وقت میں ہٹلر کا غیض و غضب

برلن کے دفاع کی تفصیلات

اسکیلن ہمگ جانے کے بعد برلن کے تہہ خانے سے دوسرا فون آیا۔ اس بار "فیچی لین" بول رہا تھا۔ اس نے ہملر کو جملہ حالات بتلائے اور کہا کہ یا تو فیوہرر کو تہہ خانہ چھوڑنے پر آمادہ کرو کسی نہ کسی طرح یا پھر چانسلری اور تہہ خانے کی حفاظت کا انتظام کرو۔ جس پر ہملر نے کہا کہ وہ برلن سے چل کر نوائن آئے۔ ہملر نے خود وہاں پہنچنے کا وعدہ کیا۔ وقت مقررہ پر ہملر اس سے اپنے ایڈجوڈنٹ گروتھ مین کے ساتھ نوائن کی سمت "فیچی لین"

الشجاع

سے ملنے اور آئندہ کا پروگرام طے کرنے پہنچ گیا۔ ہیکچ ہیکچ پروفیسر گیب ہارڈ نے کار نکالی وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ساتھ ہو لیا تھا کیونکہ کل ہی ہملر نے اسے ریڈ کراس کا چیف مقرر کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس تقرر کی منظوری فیوہرر سے بھی ہو جائے۔ "نوائن میں جب فیچی لین" نہیں پہنچا تب ہملر نے برلن جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کی البتہ پروفیسر "گیب ہارڈ" کو منظوری حاصل کرنے کے لئے برلن کے تہہ خانے جانے کی اجازت دے دی

پروفیسر گیب ہارڈ جب ہٹلر کے تہہ خانے پہنچا تب رات کے گیارہ بجے تھے۔ اسے اسی وقت ہٹلر کے کمرے میں ملاقات کے لئے پیش کر دیا گیا کیونکہ ہٹلر رات کو اب بمشکل تین گھنٹے سوتا تھا۔ پروفیسر گیب ہارڈ نے جاتے ہی فیوہرر کو ہملر کا پیغام دیا جو ہملر نے چلتے وقت زبانی دیا تھا اور کہا "ہملر نے اپنی محافظ بٹالین فیوہرر کی خدمت میں بخوشی پیش کی ہے کہ اس بٹالین سے چانسلری کی حفاظت کی جائے۔" ہٹلر اس پیشکش پر خوش ہوا اور اسی وقت نقشے پر پنسل رکھتے ہوئے کہا :- "بٹالین ٹائر گارٹن پہنچ کر لوہے کی دیوار بن جائے۔" پروفیسر گیب ہارڈ نے یقین دلایا کہ فیوہرر کے حکم کی تعمیل ہوگی تب اس نے اپنی تقرری کا خط پیش کیا جس پر ہٹلر نے فوراً دستخط کر دیئے۔ جب وہ جانے لگا تو ہٹلر سے پوچھا :- "ہملر کے لئے فیوہرر کا کوئی حکم ہے ؟" ہٹلر نے کہا :- "ہملر تک میری خوشنودی پہنچا دینا۔" اور اسی وقت پروفیسر "گیب ہارڈ" تہہ خانے کے باہر آ گیا۔ !

پروفیسر گیب ہارڈ کے جانے کے بعد تہہ خانے دوسرا ملاقاتی پہنچا۔ "برگر" جسے تہہ خانے سے حکم دیا گیا تھا کہ جنوبی محاذ پر جانے سے قبل فیوہرر کو رپورٹ دو اور احکامات لو۔ یہ سنتے ہی "برگر" فوراً بذریعہ کار برلن پہنچا۔ جب وہ تہہ خانے میں داخل ہو رہا تھا تو روسی گولے چانسلری کے قریب گر رہے تھے اور پھٹ رہے تھے۔ "برگر" تہہ خانے پہنچا تو اسے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ "فیوہرر کانفرنس میں ہیں۔" کانفرنس کے بعد "برگر" کو ملاقات کی اجازت ملی۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان خطرناک لمحات میں بھی فیوہرر کے پاس فوجی جرنل موجود ہیں۔ "برگر" کو بتایا گیا کہ جنوبی محاذ پر غدارانہ سرگرمیوں کی اطلاعات ملی ہیں جس کی "برگر" کو جاتے ہی تحقیقات کرنی ہے اور اپنے ہی ہاتھ سے سزا دینی ہے۔ "برگر" نے جب

امریکی و برطانوی جنگی قیدیوں کے متعلق جواب تک مغربی جرمنی میں کیمپوں میں محصور تھے اور اب بویریا منتقل کر دیئے گئے تھے تو ہٹلر نے برجستہ کہا۔ "سب کو گولی مار دو"۔ یہ کہتے کہتے ہٹلر کا مزاج پھر گرم ہو گیا۔ اس کا سارا جسم غصے سے کانپنے لگا اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا:۔ "سب غدار ہیں۔۔۔ سب نے مجھے دھوکا اور فریب دیا ہے۔۔۔ کسی نے مجھے صحیح حقائق سے آگاہ نہیں کیا۔۔۔ مسلح افواج اور ہوائی کمان بھی غداری مکروفریب و دغا کرتا رہا ہے۔۔۔۔"

"برگر" جب تہہ خانے سے نکلا تو رات کا ایک بج چکا تھا اس دوران ہمارے روسی توپوں کی گولہ باری میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر "برگر" نے کار کو ہوائی اڈے کی طرف موڑ دیا جہاں ہٹلر کا چار انجنوں والا طیارہ موجود تھا جس پر بیٹھ کر وہ بویریا کی سمت اڑ گیا۔ "برگر" کو ہوائی اڈے پر اژدحام نظر آیا تھا۔ سب ہی بھاگ رہے تھے۔ ان میں ہٹلر کا ایڈجوڈنٹ جولیس سکاب؛ بحری ایڈجوڈنٹ ایڈمرل "وان پٹکار" ہٹلر کے دو اسٹینو "ہرگیسل"، "ہیگن"، چار سکریٹریوں میں سے دو سکریٹری فراکولین اسکوڈر" اور "فرابیلین" بھی شامل تھے۔ یہاں تک کہ ہٹلر کا ڈاکٹر "پروفیسر موریل" بھی بھاگنے والوں میں شامل تھا۔

البتہ مارٹن بورمین اس کا ماتحت "زینڈر" اور سکریٹری فراکولین "کریگر" نہ بھاگنے والوں میں سے تھے۔ ان کے نہ بھاگنے پر اوروں کو تعجب تھا۔ اس لئے کہ "بورمین" ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے آخر وقت تک ہٹلر کو تہہ خانہ چھوڑ کر جنوب چلے جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اب جبکہ ہٹلر پتھر کی لکیر بن چکا تھا تو وہ نہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ جبکہ ہٹلر نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ :۔ "جو جانا چاہے بلا تکلف چلا جائے" پھر بھی "بورمین" نے فیوہرر کے ساتھ قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ بظاہر یہ وفاداری کی آخری حد تھی۔ لیکن در پردہ "بورمین" کا قیام اپنے مقصد کے تحت تھا۔ اس لئے کہ اس کو یہ امید تھی کہ آگ لگ جانے کے باوجود اس کو سیاست کوئی سنہری موقع ضرور دے گی اور اسی امید پر وہ جان کو خطرے میں ڈال کر برلن میں مقیم تھا۔

۲۳ر اپریل ۱۹۴۵ء کی دوپہر کو جنرل "کولر" بعجلت "گوئرنگ" کے مستقر پہنچا اور فیلڈ مارشل "جوڈل" سے ان تفصیلات سے آگاہ کیا جو

الشجارء

۲۲ر اپریل کو ہٹلر کے تہہ خانے کی کانفرنس سے متعلق تھی۔ گوئرنگ کو تفصیلات سن کر از حد تعجب ہوا۔ اس نے فوراً اپنے مشیر کاروں اور برتلوں کو طلب کیا۔ انھیں فیوہرر کے تہہ خانے کے کوائف سے آگاہ کیا اور مشورہ کیا۔ مشورہ میں طے ہوا کہ نازی وزیر قانون "لیمز" سے فوراً استفسار کیا جائے اور صورت حال کی قانونی وضاحت چاہی جائے۔ ایک زمانے میں "لیمز" کا اتنا ہی عروج تھا جتنا کہ "بورمین" کا اقتدار اس وقت "بورمین" کو حسد پیدا ہوا۔ اسے شبہ ہوا کہ "لیمز" کہیں رقیب نہ بن جائے لہٰذا اس نے چالیں چلنا شروع کیں اور بالآخر اپنے ابھرتے ہوئے مدمقابل سیاسی رقیب کو چاروں خانے چت کر دیا۔ اس کے بعد سے "لیمز" گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔

تہہ خانے کے حالات سنتے ہی گوئرنگ نے اس صندوقچے کو طلب کیا جس میں ۱۹۴۱ء کا وہ اعلان موجود تھا جس میں ہٹلر نے گوئرنگ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ نئی اطلاع کے بموجب ہٹلر نے اپنے جملہ اختیارات ترک کر دیئے تھے۔ جنرل "کولر" کے بقول اب گوئرنگ ہی ہٹلر کے بجائے جملہ اختیارات کا خود مختار مالک تھا لیکن گوئرنگ کو بخوبی علم تھا کہ "بورمین" اس کا سیاسی رقیب ہے اور یہ کہ "بورمین" کی دلی خواہش یہی ہے کہ وہ ہٹلر کے بعد اس کا جانشین ہو لہٰذا مشورہ کے ساتھ ہی گوئرنگ نے دریافت کیا کہ ۱۹۴۱ء کی دستاویز کے بعد کوئی دوسری ایسی سرکاری دستاویز تو نہیں جس میں ہٹلر نے اپنے سابقہ فیصلہ میں ترمیم کر دی ہو اور گوئرنگ کی جگہ "بورمین" کو اپنا جانشین نامزد کر دیا ہو۔ لیکن "لیمز" کا جواب صاف تھا کہ "ایسی کوئی ترمیم یا حکم جاری نہیں ہوا"۔ اس جواب کے ملنے پر گوئرنگ نے بہ احتیاط صورت حال پر غور کیا اور "بورمین" کے پرسنل اسسٹنٹ کو جو اتفاق سے وہاں موجود تھا اس کو طلب کیا لیکن اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں اٹھایا اور جنرل کولر کی رائے سے اتفاق کیا۔

تب گوئرنگ نے خود تار کا مضمون لکھنا شروع کیا۔ جو وہ فیوہرر کو برائے تصدیق برلن کے تہہ خانے بھیج کر وضاحت کا خواہش مند تھا۔ بہرکیف گوئرنگ نے اس مضمون کا تار ہٹلر کو اور ایک کاپی "کیٹل"، اور "ربن ٹراپ" کو بھیجا۔ تار یوں تھا:۔

"میرے فیوہرر! اب جبکہ آپ نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ تا آخر تہہ خانے میں قیام کریں گے کیا آپ اس امر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے کہ میں جملہ اختیارات سنبھال لوں؟ اور ملک و بیرون ملک میں دور رس اقدام کروں؟ جیسا کہ ۱۹۴۱ء کے حکم نامے کی رو سے آپ نے مجھے اپنا جانشین نامزد کیا ہے اگر آج دس بجے تک جواب نہ آیا تب میرے لئے یہ باور کرنا لازمی ہوگا کہ آپ فیصلہ و اقدام کرنے سے مجبور ہیں۔ اس صورت میں ۱۹۴۱ء کے حکمنامے کی روشنی میں مجھے خود فیصلہ کرنا مناسب ہوگا۔ میں اپنے جذبات قلبی کا اظہار کرنے سے معذور ہوں جو میرے دل میں آپ کے لئے ہے اور دعا گو ہوں کہ آپ ان سخت لمحات سے کامیابی کے ساتھ گزریں اور کامیاب رہیں

آپ کا ہنوز وفادار۔ ہرمن گوئرنگ"

جس دن گوئرنگ نے ہٹلر کو اپنا تاریخی تار روانہ کیا اسی شام کو ایک اور سازش خفیہ طور پر بمقام 'لیوبک' ہملر، اسکیلن برگ اور کاؤنٹ برناڈوٹ کے درمیان ہو رہی تھی تاکہ ہملر جملہ اختیارات سنبھالے اور مغربی ملکوں سے گفت و شنید کا آغاز کرے! ۲۲ اپریل کو ہٹلر کے تہہ خانے میں کیا ہوا تھا اس کا علم نہ تو کاؤنٹ کو تھا اور نہ ہی اسکیلن برگ کو بلکہ ہملر کو جملہ تفصیلات کا علم تھا اور اسی بنا پر ہملر اب اقدام سے بے قطعی تیار تھا۔ لیکن اس کو قطعی علم نہ تھا کہ قانونی جانشین گوئرنگ پہل کر چکا ہے ---!

ہملر آیا تو پورے عزم کے ساتھ تھا کہ وہ ہٹلر کو نظر انداز کرتے ہوئے اسکیلن برگ کے پرانے مشورہ پر عمل کرے گا۔ خود ہٹلر کا جانشین ہو کر فیوہرر بن جائے گا اور گفت و شنید کا آغاز کرے گا تاکہ جرمن عوام کو مزید تباہی و ہلاکت سے بچائے لیکن راستے میں ہملر پھر دھیرے دھیرے پستی کی طرف واپس ہونے لگا۔ اسے شبہ ہوا کہ ہٹلر کی زندگی میں اگر ہٹلر کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی بڑا قدم اٹھائے گا تو کیا ثبوت ہے کہ عوام اور خواص اس کے احکامات کی تعمیل بھی کریں۔ اس وقت اس کی کیا پوزیشن ہو گی۔ اسے اس حقیقت کا بخوبی علم تھا کہ کچھ ہو سارے جرمنی میں ہٹلر کے سوا کوئی دوسرا ایسی شخصیت نہیں جو عوام و خواص پر کمانڈ کر سکے اور غلط یا صحیح فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کرا سکے۔ ہملر سوچ رہا تھا کہ اب جبکہ ۲۲ اپریل کے واقعات رونما ہو چکے ہیں اور یہ کہ ہٹلر نے تہہ خانہ نہ چھوڑنے کا عزم راسخ کر لیا ہے اور خود ہملر نے اپنی محافظ بٹالین کے نصف آدمی فیوہرر کی حفاظت کے لئے بھیج دیئے ہیں۔ ہٹلر تہہ خانے سے اب کسی دوسری جگہ منتقل نہیں ہو گا۔ ایسی صورت میں زیادہ سے زیادہ دو دن میں پورے برلن پر روسیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور ہٹلر بغیر کسی اقدام کے اپنے خاتمہ تک پہنچ جائے گا۔ لہٰذا دو دن اور انتظار کر لینا مناسب ہو گا۔ اس کے بعد ہملر کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔

جب 'لیوبک' کے سوئیڈنی کونسلیٹ میں ہملر اور برناڈوٹ کی خفیہ لیکن تاریخی میٹنگ شروع ہوئی اس وقت بجلی فیل ہو گئی۔ فوراً موم بتیوں کا انتظام ہوا۔ ابھی روشنی ہوئی ہی تھی کہ ہوائی حملہ کا الارم بجا اور ہملر و کاؤنٹ تہہ خانے میں جا چھپے۔ نصف رات کو جب باہر آئے اور گفتگو کا آغاز ہونے والا تھا تب ہملر نے پہل کی اور کہا:- "ہمارے عظیم فیوہرر کی زندگی قریب الختم ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے برلن نہ چھوڑنے کا عہد کر لیا ہے۔ برلن زائد سے زائد دو دن کا اور ہے اس طرح دو دن ختم فیوہرر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ مجھے عجلت نہیں کرنی چاہئے اور کوئی ایسا اقدام میرے لئے مناسب نہ ہو گا جو غداری کی اصطلاح میں آتا ہو...." اس تمہید کے بعد ہی ہملر نے کہا کہ کاؤنٹ برناڈوٹ کو ان دو دنوں میں صلح کے لئے زمین ہموار کر لینی چاہئے صلح کے لئے ہملر نے یہ شرط رکھی کہ سوئیڈن کی حکومت اس کے پیغام کو مغربی ملکوں تک پہنچا دے اور وعدہ کیا کہ امریکی و برطانوی محاذ پر وہ جنگ بند کرا دے گا لیکن مشرقی محاذ پر جنگ جاری رہے گی یہاں تک کہ مغربی دوست آکر ہمیں اس سے چھٹکارا دیں۔ ہملر نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ڈینش اور ناروے کے جو نظر بند جرمنی میں ہیں ان کو فوری طور پر حکومت سوئٹزرلینڈ کے حوالے کر دے گا۔ ساتھ ہی کاؤنٹ برناڈوٹ کے کام کو آسان کرنے کے لئے ہملر آمادہ تھا کہ اپنے دستخط سے ایک خط حکومت سوئیڈن کے لئے تحریر کر دے تاکہ حکومت سوئیڈن کو گفت و شنید

کے لئے بنیاد مل جائے۔ میٹنگ اگرچہ پورے طور پر کامیاب نہیں تھی پھر بھی کاؤنٹ برناڈوٹ مطمئن اس لئے تھا کہ اقدام کے لئے بنیاد مل گئی تھی۔ لہٰذا وہ فوراً اسٹاک ہام بذریعہ طیارہ روانہ ہو گیا۔ دوسری طرف ہملر نئی سلطنت کی کارکردگی اور نام و اقدام کے متعلق غور و فکر کرنے لگا۔ وہ اس امر پر بھی اسی وقت سے غور کرنے لگا کہ صدر امریکہ جنرل آئزن ہاور سے ملاقات کے وقت سر جھکائے یا صرف ہاتھ ملائے۔!؟

اس طرح برلن کے تہہ خانے میں ۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو جو کچھ ہوا تھا اور جس کی بنا پر گورنگ ذہنی الجھن میں پھنس گیا تھا لیکن اسی میٹنگ نے ہملر کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ ہملر اور کاؤنٹ برناڈوٹ "لیوبک" کی میٹنگ سے بڑی حد تک مطمئن تھے جبکہ "اسکیلن برگ" پورے طور پر مطمئن نہ تھا اس لئے کہ اس کے آقا نے عین وقت پر پھر ہچکچاہٹ کا اظہار کیا اور دلیری و شجاعت سے کام نہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہملر نئے فیوہرر کے انداز میں کامل اعتماد کے ساتھ بات کرتا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا اسے رنج تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہملر کے ان الفاظ سے کہ "فیوہرر زائد سے زائد دو دن کے اندر اپنے انجام تک پہنچ جائیگا" یہ مطلب لیا کہ ہملر ڈاکٹروں کے ذریعہ ہٹلر کی ہلاکت کا انتظام کر چکا ہے اور یہ کہ اسے برلن کے تہہ خانے سے اپنی کوشش کی کامیابی کی خبر کا ہر لمحہ انتظار ہے۔ یہ سوچ کر "اسکیلن برگ" خوش ضرور ہوا کیونکہ وہ اپنے آقا کو عرصے سے متعدد تجاویز ہٹلر سے چھٹکارا پانے کے لئے پیش کرتا رہا تھا اس میں سے ایک راستہ دواؤں کے ذریعے بھی نکلتا تھا۔ کہ ہٹلر کو ڈاکٹروں کی مدد سے زہر دے کر راستہ صاف کر لیا جائے۔ بہرحال "اسکیلن برگ" ان معنوں میں میٹنگ سے مطمئن تھا کہ ہملر نے بالآخر ہٹلر کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے — "اسکیلن برگ" چونکہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء کی تہہ خانے کی کانفرنس اور حالات سے لاعلم تھا لہٰذا اس کا ذہن زہر خورانی کی طرف گیا۔ کچھ پہر کاؤنٹ برناڈوٹ کی طرح اب "اسکیلن برگ" کو بھی امید قوی پیدا ہو گئی تھی کہ ہٹلر اور اس کا تہہ خانہ جرمنی کی قسمت کا مالک نہیں بلکہ مستقبل کی عنان اب ہملر کے ہاتھ میں ہے اور رہے گی —!!

الشجاع

جس رات گورنگ اپنے اہم و تاریخی تار کا جواب اس نے تہہ خانے میں مقیم ہٹلر کو منظوری کے لئے اس غرض سے بھیجا تھا کہ ہٹلر کا جانشین بن کر وہ جلد اختیار سنبھال لے اور جواب کے لئے گورنگ نے رات دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اور اب اپنے تار کے جواب کا "اوبرسالزبرگ" میں انتظار کر رہا تھا اسی رات کو ہملر "لیوبک" میں سویڈن کے سفیر کاؤنٹ برناڈوٹ سے خفیہ ملاقات میں مصروف تھا اور مغربی ملکوں سے ہتھیار ڈالنے کی شرائط طے کر رہا تھا —— وہ ۲۳ اپریل ۱۹۴۵ء کی تاریخی رات تھی۔ اسی رات ہٹلر کا سابق وزیر صنعت و حرفت "البرٹ اسپیر" برلن کے تہہ خانے میں موجود تھا اور ہٹلر سے اپنی آخری ملاقات کر رہا تھا —!

۲۳ اپریل کی صبح کو "اسپیر" کو ہیمبرگ میں برلن کے تہہ خانے کی ۲۲ اپریل کی کانفرنس اور فیصلوں کی اطلاع ملی اسی وقت "اسپیر" نے ٹھان لی تھی کہ وہ برلن پہنچ کر ہٹلر سے تہہ خانے میں آخری ملاقات کرے گا نیز اس سے رخصت کا خواہاں ہوگا کیونکہ اس کے بعد برلن تک پہنچنا ہی ممکن نہ ہوگا۔ اس کا فیصلہ اخلاقاً تو تھا ہی لیکن اس جذبے پر مبنی تھا کہ وہ اپنے آقا کی غلط پالیسیوں سے متفق نہ ہونے کے باوجود اس کے لئے اپنے دل میں جذبہ وفاداری زندہ پاتا تھا —— مانا کہ اس کے آزادانہ خیالات و اقدامات نے اسے ہٹلر کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی اور ناقابل تردید کہ "اسپیر" نے اپنی خطرناک تقریر ریکارڈ کرا لی تھی اور اسے محفوظ ہاتھوں میں سونپ رکھا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ریکارڈ تقریر کا نشر ہونا طے تھا۔ خواہ ہٹلر کے خاتمہ کے ساتھ خود "اسپیر" بھی نہ رہے لیکن تقریر کا براڈکاسٹ ضروری تھا پھر بھی ہٹلر کا فیصلہ معلوم کرنے کے بعد "اسپیر" نے برلن جا کر اپنے آقا و دوست سے آخری ملاقات کی۔

"اسپیر" اس عزم کے ساتھ تہہ خانے آیا تھا کہ ہٹلر کو اب اندھیرے میں نہیں رکھے گا اور بتا دے گا کہ اس نے اپنے سیاسی عقیدے میں تبدیلی کر لی ہے اور اب وہ شخص وفاداری کے لائق

عوام کی عدالت کا قائل ہو چکا ہے۔ حالانکہ 'اسپیر' کو دوسرا گمان یہ تھا کہ بہت ممکن ہے کہ ہٹلر اس کے اس نظریے کو سن کر بھڑک جائے اور غدار قرار دے کر اسے زیر حراست کرے یا ممکن ہے گولی سے اڑا دے لیکن 'اسپیر' کو اب کسی سزا کا خوف نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا کام ختم ہو گیا لہٰذا اس نے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی۔

چونکہ اب بذریعہ سڑک برلن تک پہنچنا ممکن نہ تھا اس لئے کہ سڑکیں مسدود ہو چکی تھیں لہٰذا وہ "ریچلن" تک موٹر سے گیا اور وہاں سے ایک تربیت دینے والے طیارہ سے گاٹاؤ ہوائی اڈے پہنچا جو برلن کا مغربی ہوائی اڈہ تھا۔ یہاں اچانک اس کی ملاقات جنرل "کرسچین" سے ہوئی جو کچھ دیر قبل ہی برلن کے تہہ خانے میں ہٹلر سے مل کر آ رہا تھا۔ جنرل "کرسچین" سے کچھ دیر بات کرنے کے بعد "اسپیر" اس اڈے تک اٹا جو چانسلری کے قریب تھا اور وہاں سے سیدھا تہہ خانے کی طرف ہو لیا۔

ہٹلر کو اس نے اپنے تہہ خانے میں پایا۔ ہٹلر کے علاوہ چند اور درباری بھی ابھی تک ہٹلر کے ساتھ ہی تہہ خانے میں تھے 'بورمین'، "گوئبلس" "ربن ٹراپ"، 'کربس'، 'وان بلو' کے علاوہ ہٹلر کے ایڈجوٹنٹ بھی موجود تھے ساتھ ہی ہٹلر کی محبوبہ 'ایوا براؤن' بھی ہٹلر ہی کے ساتھ ہی تہہ خانے میں 'اسپیر' کو ملی۔

ہٹلر نے 'اسپیر' کو ملاقات کے لئے طلب کیا تاکہ محاذ کی کوئی نئی خبر سنائے لیکن اس وقت ہٹلر کو تعجب ہوا جب 'اسپیر' نے اپنے کرتوت کا کچا چٹھا سنانا شروع کر دیا ۔۔ ہٹلر دم بخود ہو کر "اسپیر" کے اعمال نامے کو سنتا رہا اور بقول 'اسپیر'، ہٹلر پہلی داستان کا اختتام ہوا۔ اور جب 'اسپیر' خاموش ہو گیا اور فیصلے کا وقت آیا تو 'اسپیر' کو از حد تعجب ساتھ ہی خوشی بھی ہوئی کیونکہ ہٹلر تو نہ ناراض ہوا۔ نہ ہی گرفتاری کا حکم دیا اور نہ ہی ہلاک کیا ۔۔ اس طرح جو طوفان آنے والا تھا اور جس کا خدشہ تھا وہ لمحہ گزر گیا ۔۔!

آخر طوفان کیوں نہیں آیا؟ ۔۔ جبکہ ہٹلر ان دنوں مکمل طور پر خونخوار بن چکا تھا اور بات بات پر خون بہانے کا عادی لیکن ...

اس کے باوجود 'اسپیر' کے باغیانہ کردار کے باوجود وہ نرم دل، اور رحمدل کیوں بن گیا؟ یہ سوال خود 'اسپیر' کے ذہن ہی میں نہیں بلکہ تہہ خانے میں موجود اوروں کے دلوں میں بھی پیدا ہوا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ 'اسپیر' خود ہٹلر کا انتخاب تھا اور اسی نے عروج بھی دیا تھا اس کے علاوہ ہٹلر کے دل میں 'اسپیر' کی ذاتی قابلیت و صلاحیت کا سکہ بہت پہلے بیٹھ چکا تھا جب اس نے انتہائی مشکل کام بڑی محنت و صلاحیت سے انجام دیئے تھے۔ لہٰذا بعد میں سیاسی اختلاف سے اگرچہ ہٹلر نے اسے ذمہ دار پوسٹ سے ہٹا دیا تھا لیکن اسپیر کی قابلیت وفاداری اور صاف دلی کا وہ اب تک قائل تھا یہی نہیں بلکہ ہٹلر اسپیر کی خداداد قابلیت کا اس قدر قائل تھا کہ اکثر مشکل مسائل گوئرنگ، ہملر اور ربن ٹراپ کے بجائے صرف 'اسپیر' کو بتاتا تاکہ وہ ان کا حل نکالے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وجہ ہو کہ ۲۳ر اپریل کا پورا دن اور رات طویل عرصے کے بعد ہٹلر میں ایک ایسی تبدیلی لائی جو خلاف توقع سی نظر آتی تھی ۔۔ وہ تبدیلی یہ تھی کہ ۲۲ر اپریل کے ہیجان و اضطراب کے بعد ہٹلر اچانک خاموش ہو گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاموشی اس کی موت سے پہلے طاری ہونے والی غنودگی کی غمازی کر رہی ہے یہی وجہ تھی کہ 'اسپیر' کے رضاکارانہ اعتراف جرم کے باوجود ہٹلر اس پر برہم نہیں ہوا ۔۔ حالانکہ 'بورمین' کافی دنوں سے ہٹلر کے کان بھر رہا تھا اور آگاہ کر رہا تھا: 'اسپیر سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے وہ یقیناً غداری کرنے والا ہے'؛

غرضیکہ 'اسپیر' خلاف توقع طور پر شیر کے پنجرے میں پہنچ جانے کے باوجود محفوظ ہی رہا ۔۔ وہ تہہ خانے میں آٹھ گھنٹے رہا۔ اس دوران میں اتحادی طیاروں نے کئی بار فضائی حملے کئے اور برلن کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہاں تک کہ پروپیگنڈہ منسٹری کی عمارت میں آگ لگ گئی۔ 'اسپیر' نے دوبارہ اور بھی ہٹلر سے بات کی۔ اس کی محبوبہ 'ایوا براؤن' سے گفتگو کے دوران 'اسپیر' کو معلوم ہوا کہ 'بورمین' کی نیت صاف نہیں اور وہ اس آگ و خون کے طوفان میں بھی چالیں چل رہا ہے۔

'بورمین'، اور 'ربن ٹراپ' نے آج بھی یہ سمجھ کر کوشش

بی او۔ چاہا کہ ہٹلر تہہ خانہ چھوڑ دے لیکن ہے کہ کل مغلوب الغضبی کی وجہ سے ہٹلر فیصلہ نہ کرسکا جو لیکن گوئیبلس اور خود 'ایوا براؤن' دونوں نے ہٹلر کو مشورہ دیا کہ وہ تہہ خانہ خالی نہ کرے اور وہیں رہے۔ آخر ہٹلر نے اس بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ: "میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں ڈل کو کیٹل کو بتا چکا ہوں کہ جسمانی طور پر میرے لئے لڑنا ممکن نہیں لہٰذا میں پستول سے کام لوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ زخموں اور زخمی ہو کر روس کا قیدی بنوں اور روسی مجھے پروپیگنڈے کی تکنیک کے لئے استعمال کریں ۔۔۔۔ دشمنوں کو میری راکھ تک نہ ملے گی اس کا میں پورا انتظام کر چکا ہوں۔"

۲۳ راپریل کی رات کو ہٹلر کے تہہ خانے میں اس تار کا چرچا بھی ہو رہا تھا جو گوئرنگ نے ہٹلر کو بھیجا تھا اور منظوری چاہی تھی کہ وہ ہٹلر کا جانشین بن کر اتحادیوں سے ہتھیار ڈالنے کی گفت و شنید کا آغاز کرے ــــ گوئرنگ کے اس تار پر ہنوز کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

گوئرنگ کا تار بعد سہ پہر تہہ خانے پہنچا تھا۔ اس تار کی اطلاع جوں ہی 'بورمین' کو ہوئی وہ مضطرب ہو گیا۔ اس لئے کہ ۱۹۴۱ء سے جب سے گوئرنگ کو ہٹلر نے اپنا جانشین منتخب کیا اور نامزد کیا تھا اس وقت سے 'بورمین' کی دلی تمنا تھی کہ وہ گوئرنگ کو پچھاڑ دے ورنہ ہٹلر کی موت کے بعد جب تک قانون میں ترمیم نہ ہو گوئرنگ ہی قانونی جانشین متصور ہوگا۔ لیکن ان چار سالوں میں 'بورمین' کو انتظار شدید کے باوجود کوئی موقع حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن آج قسمت نے 'بورمین' کو وہ موقع دے دیا تھا جس سے وہ گوئرنگ کو راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ 'بورمین' دل میں بہت خوش ہوا اس لئے کہ آج کل اس کا اثر واحد طور پر ہٹلر پر گہرا تھا دوسرے یہ کہ ان نازک لمحات میں اس امر کا قطعی کوئی امکان ہی نہ تھا کہ گوئرنگ جوابی وار کر سکے یا غلط فہمی کو دور کر سکے لہٰذا 'بورمین' نے طے کیا کہ وہ بھرپور وار کرے گا اسے اپنی کامیابی کا یقین بھی تھا۔

یہ سوچ کر 'بورمین' نے ہٹلر کو تار کے اس حصے کی طرف متوجہ کیا۔ جس میں دس بجے رات تک کا وقت تعین کیا گیا تھا آخر 'بورمین' نے کہا: "گوئرنگ نے فیوہرر کو کھلی دھمکی دی ہے۔ کیا یہ الٹی میٹم نہیں؟" اس طرح 'بورمین' نے اپنا کھیل شروع کیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے ہی وار میں کامیاب ہوا۔ اس لئے کہ خاتمہ کے قریب بھی ہٹلر اپنے کسی ماتحت سے دھمکی سننے اور برداشت کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ تیجے پر سے اکھڑ گیا تب 'بورمین' نے نہلے پہ دہلا لگاتے ہوئے کہا! "چند ماہ قبل بھی گوئرنگ کے متعلق شبہات تھے کہ وہ فیوہرر کو نظر انداز کرتے ہوئے صلح کا آغاز کرنا چاہتا ہے اور اب تو گوئرنگ کا منشا صاف ظاہر ہو گیا:" اسی وقت ہٹلر نے طیش میں حکم دیا کہ گوئرنگ کو فوری جواب بھیجا جائے۔ 'بورمین' کا کام بن گیا۔ اس نے فوراً تار کا جواب لکھا: "فیوہرر ابھی زندہ اور حاکم اعلیٰ ہیں اور ان ہی کے ہاتھ میں اقتدار رہے گا۔ فیوہرر ہر اقدام و عمل پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ علیحدہ سے کسی قسم کے اقدام کو فیوہرر ناپسند کرتے ہیں لہٰذا فیوہرر کا حکم ہے کہ تعمیل ہو۔"

'بورمین' اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اسے گوئرنگ کی جانشینی کو بہ ذریعہ سازش ناممکن بنا دیا۔ لہٰذا اس کی خوشی جائز تھی۔ لیکن اس غیر متوقع کامیابی کے بعد 'بورمین' بچلا نہیں بیٹھا اور نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان تاریک دنوں میں ہٹلر کا حکم کوئی زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ہٹلر تہہ خانے میں قید ہے اور اس کی جملہ طاقت منتشر ہو چکی ہے۔ لہٰذا 'بورمین' کو شبہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گوئرنگ اس حکم کو نظر انداز کر دے وہ ایسا آسانی سے کر سکتا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہٹلر راہ میں مانع بھی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا 'بورمین' اب چاہتا یہ تھا کہ گوئرنگ کی آزادی سلب کر لی جائے تاکہ اس کا شبہ دور ہو جائے۔

لہٰذا تار جانے کے بعد 'بورمین' نے دوسرا جال بچھایا اور اب تہہ خانے میں رات کو اس امر پر غور شروع ہوا کہ گوئرنگ کا انجام کیا ہو؟ جب یہ مسئلہ زیر غور تھا، اسپیر، اس وقت تہہ خانے میں موجود تھا اور ہٹلر میں اضطرابی و انتشاری کیفیت پھر عود کر آئی

[illegible] ’بورمین‘ اور ہوا دے رہا تھا۔ اس نے ہٹلر کو سمجھایا تھا کہ ’گورنگ کی آزادی اب انتہائی خطرناک نتائج کی حامل بن سکتی ہے ....‘

’بورمین‘ نے ہٹلر کو گورنگ سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود ہٹلر کا خیال اب تک یہی تھا کہ ’گورنگ صلح کی گفت و شنید بہتر طور پر کر سکتا ہے‘۔ اگر غصہ کے عالم میں وہ گورنگ کو برا بھلا بھی کہتا جاتا تھا: ’مجھے کچھ عرصے قبل ہی معلوم ہو گیا تھا کہ گورنگ ناکام ہو چکا ہے .... وہ نااہل اور بدعنوان بھی ہے۔‘ لیکن اس کے باوجود ہٹلر کا خیال تھا کہ گورنگ ہتھیار ڈالنے والی گفتگو بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ یہ بات ’بورمین‘ کو کھلی اس نے کہا: ’یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ ایک نااہل بھی لہٰذا گورنگ کو اپنے کئے کی عبرتناک سزا ملنی ضروری ہے۔‘ اس مسئلہ پر ہٹلر اور ’بورمین‘ میں اتفاق نہ تھا کہ گورنگ کو گولی مار دی جائے۔ کافی بحث کے بعد آخر ہٹلر نے کہا: ’لیکن میرا فیصلہ یہ ہے کہ گورنگ کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا جائے ساتھ ہی برخواست بھی اور اس کی جانشینی کا حکم منسوخ ہو۔‘ ہٹلر نے پھر ’بورمین‘ ہی کو تار لکھنے کا حکم دیا۔ بورمین لکھنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تار لکھوا لایا۔ ظاہر ہے ’بورمین‘ نے تار محنت اور دل سے لکھا ہوگا اس لئے کہ وہ تار گورنگ کی قسمت کا فیصلہ اور ’بورمین‘ کی سوئی ہوئی قسمت کو جگانے جا رہا تھا۔ تار یوں تھا جو فوراً گورنگ کو بھیج دیا گیا۔

’تم نیشنل سوشلزم اور فیوہرر سے غداری کے
مرتکب ہوئے ہو۔ چونکہ غداری کی سزا موت ہے
لیکن پھر بھی فیوہرر تم پر رحم کرتے ہوئے اور تمہاری
گزشتہ شاندار خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے سزائے
موت کے بجائے تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تار ملتے ہی خوشی
مستعفی ہو جاؤ۔ عدم تعمیل کی صورت میں انتہائی
سخت سزا کے موجب سمجھے جاؤ گے۔ فوراً جواب دو‘

اس تار کے ساتھ ہی ’بورمین‘ نے دو تار ’اوبرسالزبرگ‘ ’ایس ایس لیڈر فرینک‘ اور دوسرا جنرل ’بریڈو‘ کو روانہ کیا جس

الشہاع

میں ان دونوں کو مطلع کیا گیا تھا کہ ’چونکہ گورنگ غداری کا مرتکب ہوا ہے لہٰذا بلاخیر اسے زیر حراست کر لو۔‘ اس تار پر فوراً عمل ہوا۔ جنرل ’بریڈو‘ نے نہ صرف گورنگ بلکہ اس کے اسٹاف کو، مشیر کاروں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔ جن میں جنرل ’کولر‘ اور سابق نازی وزیر قانون ’لیمر‘ بھی شامل تھے۔ صبح برلن ریڈیو سے خبر نشر ہوئی کہ ’گورنگ خرابی صحت کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔‘ اس طرح ’بورمین‘ نے پورے چال انتظار کے بعد آخر اپنا کام کر دکھایا۔ اب وہ فتحیاب تھا اس لئے کہ گورنگ کے راہ سے ہٹ جانے کے بعد جانشینی کا مسئلہ پھر سامنے آ چکا تھا!

۲۳ ؍ اپریل ۱۹۴۱ء کی ہیجانی رات بھی ختم ہو گئی اور ۲۴ ؍ اپریل ۱۹۴۱ء کی صبح نمودار ہو گئی —

روسی ٹینکوں، بھاری توپوں اور فوجوں کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا تھا اور اب یہ حقیقت چند گھنٹوں میں سامنے آنے والی تھی کہ روسی گرفت کے بعد کسی متنفس کی آمد و رفت ممکن نہیں ہو سکے گی صرف وہی قصد کرے جس کو اپنی جان عزیز نہ ہو۔

صبح چار بجے سب سے پہلے ’اسپیر‘ گورنگ کے زوال کا خوفناک ڈرامہ دیکھ کر تہہ خانے کو خیرباد کہہ گیا اور اس کے بعد پھر کبھی اس کو تہہ خانے آنے کا موقع نہ مل سکا اور نہ ہی اس نے آنے کا قصد کیا۔ فیلڈ مارشل ’کیٹل‘ اور فیلڈ مارشل ’جوڈل‘ دونوں قبل ہی تہہ خانے سے جا چکے تھے۔ فیلڈ مارشل ’اسکورزنی‘ بھی تہہ خانے کو خالی کر گیا تھا۔ گزشتہ دو دنوں سے ہٹلر بڑے عزم و استقلال سے اس امر کی کوشش کر رہا تھا اور ہر آنے والے سے مقابلہ کر رہا تھا جو یہ مقصد لے کر آتے کہ فیوہرر فوراً تہہ خانہ کو خیرباد کہہ دے اور ’اوبرسالزبرگ‘ منتقل ہو جائے۔ اس کوشش اور مقابلے میں بالآخر ہٹلر ہی کی فتح ہوئی اور وہ آہنی دیوار بن کر اپنے مقام پر جا رہا۔ حالانکہ اس عزم کے باوجود ہٹلر کو تہہ خانے سے منتقل کرنے کی کوشش اب بھی جاری تھی۔

۲۴ ؍ اپریل کی صبح فیلڈ مارشل ’اسکورزنی‘ کے تار سے ہوئی۔ فیلڈ مارشل ’اسکورزنی‘ نے بوہیمیا کی پہاڑیوں سے ہٹلر کو تار بھیجا تھا۔

’فیوہرر سے دست بستہ التجا ہے کہ تہہ خانہ کو خیرباد

کہیں اور فوراً فوج سے آملیں۔ اس لئے
کہ بوہیمیا میں فوجیں اب بھی با اقتدار
ہیں اور شکست سے دور ہیں۔

ہٹلر نے فوراً اس تار کا جواب دیا" میں طے کر چکا ہوں کہ برلن کا دفاع آخری سانس تک کروں گا" اس طرح آخر وقت کی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی اور ہٹلر نازی چانسلری کے صحن میں پچاس فٹ نیچے کنکریٹ تہہ خانہ ہی میں رہا۔ یہی اس کا عزم تھا اور سب جانتے ہیں کہ ہٹلر فیصلہ کے بارے میں انتہائی ضدی تھا۔ ایک بار فیصلہ کر لیا۔ تب اس فیصلہ میں ترمیم ممکن نہ تھی۔

۲۴ر اپریل ۱۹۴۵ء کی شام کو "جنرل ویگز" کی طرف سے تہہ خانہ میں فون آیا۔ "ویگز" امیرالبحر "ڈونٹز" کا نمائندہ تھا۔ اس لئے کہ شمالی محاذ جنگ کے پورے اختیارات ہٹلر نے چند دن پہلے امیرالبحر "ڈونٹز" کے حوالے کر دیئے تھے اور اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ لہٰذا شمالی علاقے کے سول معاملات کو نمٹانے کے لئے امیرالبحر "ڈونٹز" نے جنرل "ویگز" کو نامزد کر دیا تھا۔ ویگز نے فون اور سوال کیا" کیا ایسا ممکن نہ ہوگا کہ فیوہرر دوہری تباہی و ہلاکت کو ختم کرنے کے لئے مغربی اتحادیوں سے صلح کی اجازت دے دیں تاکہ مشرقی محاذ پر روسیوں سے کامیابی سے نمٹا جا سکے۔؟"

جنرل "ویگز" ناممکن سی بات کے لئے کوشاں تھا اس لئے کہ ہٹلر کو منظور ہی کب تھا کہ تباہی و ہلاکت بربادی اور خونریزی نہ ہو۔ وہ تو شیدائی ہی اس کا تھا کہ ہلاکت و بربادی عالمگیر پیمانے پر ہو۔ اس کا ہر عمل اس بات کا ثبوت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل "ویگز" کی تجویز کا بھی مناسب جواب نہ ملا۔!

بہرکیف ۲۴ر اپریل ۱۹۴۵ء تک ہٹلر نے تہہ خانے سے نکلنے کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں ان کو رد کر دیا اور ۲۴ر اپریل وہ آخری دن تھا جس کے بعد مزید التجا و درخواست کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اس لئے بند ہو گیا کیونکہ روسیوں کی گرفت مکمل ہو چکی تھی اب کسی کے لئے بھی قطعی ناممکن تھا کہ سڑک سے برلن آئے یا یہاں سے نکل سکے۔ البتہ ہوا کا راستہ اب تک ضرور کھلا تھا لیکن وہ بھی روسی توپوں اور طیاروں کی وجہ سے پُرخطر ہی تھا۔ اس طرح ۲۴ر اپریل کو وہ آخری پردہ گر گیا جس کے بعد روسیوں نے ہٹلر کے تہہ خانے کا محاصرہ شروع کر دیا۔!!

مطمح نظر

۱۹۱۳ء میں پیارے لال شاکر ایڈیٹر "العصر" لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اسی زمانہ میں حضرت مولانا ارشد تھانوی لکھنؤ گئے تو شاکر صاحب نے مولانا کی پرتکلف دعوت کی۔ اس دعوت میں من جملہ اور اصحاب کے ایک کمسن صاحبزادی بھی تھیں۔ کھانے کے بعد شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ کسی نے ان صاحبزادی کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ بھی شعر کہتی ہیں۔ چنانچہ تقاضہ ہوا کہ وہ بھی اپنا کلام سنائیں۔ صاحبزادی نے شرماتے ہوئے کہا۔

" میں شاعرہ نہیں ہوں میں تو صرف اپنے ذاتی جذبات کو شعر کا جامہ پہناتی ہوں۔" کہا گیا "آپ وہی سنا دیجئے۔" چنانچہ انھوں نے ایک نظم یہ کہہ کر سنانا شروع کی۔ میں اپنی ماں سے بڑی محبت کرتی ہوں اور ان کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا مطمح نظر سمجھتی ہوں۔ نظم سناتے ہوئے صاحبزادی نے بڑے جوش و عقیدت سے جب یہ مصرعہ پڑھا کہ

" قدموں سے جدا تم مجھے للّٰہ نہ کرنا "

تو مولانا ارشد تھانوی (مرحوم) فوراً بولے۔

" میں کہتی ہوں اماں مرا تم بیاہ نہ کرنا "

مولانا کا مصرعہ سنتے ہی کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

صابر شاہ آبادی

وجدان اور جمالیات

ہر چند کہ سائنس کے اس ارتقائی بلکہ محیر العقل دور میں جمالیات جیسے موضوع پر گفتگو تقریباً لایعنی ہی سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر سائنس کے اس ارتقاء کا منجملہ دیگر مقاصد کے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح انسان کو آسودگی نصیب ہو سکے تو میں سمجھتا ہوں کہ نگاہ کعبۂ دل کا طواف بھی کوئی معصیت نہیں۔ اور دیکھیے اس حسرت کدہ کی طرف سے مستقلاً بے رخی نے کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کئے۔ اور بطور خصوصاً جنوں آفرینی و حق شناسی کے اعتبار سے انسانی زندگی میں اس کی خدمات سائنس سے کسی طرح کم درجہ کی نہیں رہیں۔ خواہ اس کی یہ خدمات سائنس زدوں کی نگاہ میں کسی نوع کی ہوں۔ لیکن جماعت انسانی میں ان کی انقلاب آفرینی سے کس کو انکار نہیں اور پھر انقلاب آفرینی معمولی قوت کا کام نہیں اور خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کے بیشتر انقلابات رابطۂ انسانی۔ جذبۂ حق شناسی کی استواری و بقاء کے لحاظ سے نہایت خوشگوار و مفید ہوں۔ چونکہ سائنس کی ترقی انسانی ذہن و دماغ کی جستجو اور بے چینی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے سائنس کی کامرانی سے صرف ذہن و دماغ ہی آسودہ ہو سکتے ہیں۔ آسودگیٔ قلب و روح کو اس سے علاقہ خاص نہیں۔ یعنی انسانی دماغ سائنسی منتر کے ذریعہ زمین سے چاند سورج اٹھا سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی بڑھتی ہوئی ویرانی دیے نور کی کی تلافی کے لئے جس ضیائے حقیقی کی ضرورت ہے۔ فراہم نہیں کر سکتا اس لئے سائنس کی کئی ایجادات ضروریات کی تکمیل کے بجائے اشیاء

ان میں اضافہ کا باعث ہیں۔ چنانچہ ریڈیو اور فلم کی افادیت سے انکار نہیں۔ لیکن ان سے حاصل ہونے والے بنیادی فوائد ان ایجادات سے پہلے بھی رنگا رنگ کتب و رسائل سے کما حقہ حاصل ہو رہے تھے ان کی وجہ سے صرف اتنا فرق ہو گیا کہ لوگ پہلے کم صرف کے باوجود حسب فرصت کتب کے مطالعہ سے معلوماتی استفادہ کر سکتے تھے۔ اور اب ان ایجادات کے پروگرام کے مطابق وہ معلومات حاصل کر لی پڑتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سائنس کی کئی ایجادات کی روشنی میں اس کا نصب العین حاجتوں میں اضافہ ہی کا باعث معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی ترقی سے پیدا شدہ مصروفیت ذہن و دماغ کو تھکا کر رفتہ رفتہ قلب و روح کو تاریک ہی بنا دینے کا ذریعہ۔ اس کے برخلاف جمال و احساس جمال خستگیٔ قلب و روح کا آسان اور یقینی علاج ہے۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا۔ اگر سائنس کو جمالیات کا ردِ عمل کہا جائے۔ کہ اس کا سارا دار و مدار عقل و دماغ پر اور اس کا سارا انحصار قلب و نگاہ پر ہے اس کا نظریہ۔ ارتقائے علم و فن اور اس کا ایمان آسودگی و احتظاظ۔ فلسفۂ جمال کا یہ پہلو کہ کوئی کشش انگیز شے بجائے خود حسین و دلکش ہے یا یہ ہمارا رنگ نظر و احساس مزاج ہے۔ تقریباً منطقیانہ موشگافی ہی کے مترادف ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں کسی روائتی ذوق کے ارتقاء یا اسے عملی صورت دینے کا منکر ہوں۔ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو شئے صرف احتظاظِ قلب

جس طرح غزل گوئی کے لیے غزل گو کا فنِ غزل سے واقفیت کے ساتھ ساتھ دل گزیدہ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح حسن و جمال سے محظوظ ہونے کے لئے ناظر کا گداختہ قلب اور مناسب فطرت کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحیح البصارت و بصیرت ہونا۔ چونکہ اس گداختہ قلبی کا راست تعلق فطرت سے ہے علم و شعور سے نہیں۔

روح کے لئے تخلیق ہوتی ہے اس کے متعلق اس کے متعلقہ احساسات سے قطع نظر کر کے عقلِ محض کی رائے حقیقی و مکمل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس نوع کے لطیف و محسوساتی موضوعات کے متعلق عقلی استدلال اور منطقی تسلسل ایسی بے معنی طوالت اختیار کرتا ہے کہ بات نفسِ موضوع سے کوسوں دور چلی جاتی ہے اور بحث برائے بحث ہو جانے پر نتیجہ معلوم!

" لاریب ذوق " انسان کی وہ تربیت یافتہ حس ہے جس کی مدد سے متعلقہ علوم و فنون کے حسن و قبح پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ہر چند یہ عقل سے براہ راست نہ سہی لیکن قابلِ لحاظ علاقہ ضرور رکھتا ہے اور جذبات و قلب سے بھی اس کا تعلق قابلِ تسلیم ہے۔ لیکن باہم خصوصاً فنونِ لطیفہ کے متعلق اس کے کئی فیصلے قطعی نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ حس، مذکور قلب و دماغ (احساس و علم) کا خوشگوار امتزاج نہیں ہے۔ یا اس کے بعض جذباتی فیصلوں کے ماتحت کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق بعض فیصلوں میں قلب سے نسبتاً زیادہ ہو جاتا ہے اور بعض فیصلوں میں عقل سے، کہ تجزیہ کے بعد ان میں حذف و اضافہ۔ تغیر و تبدل کی بڑی گنجائش نظر آتی ہے جس کی تکمیل و تفہیم اہل ذوق سے نہ ہو سکنے کے باعث مخاطب کا احساس و استفسار مطمئن نہیں ہو پاتا۔ اس کے برخلاف وجدان جو ترکیبی اعتبار سے ایک حد تک ذوق ہی کے مماثل ہے لیکن اس کے بیشتر فیصلوں کے تجزیوں نے اسے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ، مکمل اور دقیقہ سنج احساس ثابت کر دیا ہے۔ جس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ قلب و دماغ کی بجائے روح و شعور (گداختی و آگہی) کا خوشگوار امتزاج ہے۔ یعنی کہ " ذوق " کسی حسینہ کی تصویر کے متعلق اس کے زاویوں کی صحت اور رنگوں کے صحیح امتزاج اور ابھار ہی کے زیرِ اثر فیصلہ کرے گا لیکن " وجدان " کی ان کے علاوہ خطوط کے گداز اور بدن کے لوچ پر بھی رہے گی۔ اتنا ضرور ہے کہ ذوق کے اکثر فیصلے علمی اور مدلل ہوتے ہیں اور وجدان کے محسوساتی و تاثری۔ لیکن واضح رہے کہ یہ احساس و تاثر ذوق ہی کے تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ جو ارتقا کی آخری یعنی وجدانی انتہا ہے

منزلوں پر فرطِ لطافت و نزاکت سے تقریباً ناقابلِ شرح و بیان معلوم ہوتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ وہ قوت جس کی ابتدا ارکی شدت احساس سے ہو وہ ترقی کی انتہائی منزلوں پر استدلال کے عام علمی و فنی قواعد کے ذریعہ مشکل سے ہی پہچانی جا سکتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح " قرارِ بے وجہ "، کی کوئی مطمئن کن علمی و اصولی دلیل نہ دی جا سکے لیکن ہمیں اس کی واقعیت سے انکار نہ ہو۔

چونکہ اکثر فیصلوں کے وقت ذوق کا تعلق اپنے اجزائے ترکیبی کے ساتھ مساویانہ نہیں ہوتا اس کے اکثر فیصلوں میں وسعت اور گہرائی قابلِ لحاظ نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو ان سے شوخی اور جذباتیت ٹپکتی ہے۔ چنانچہ وہ بیک نگاہ " باغ و بہار " کا علیحدہ علیحدہ مقام متعین نہیں کر سکتا بلکہ وہ یا تو موجِ بہار کی لطافت و روانی کو گل و لالہ کی نکہت و جنبش سے تعبیر کرے گا۔ یا گل و لالہ کی تازگی، و شگفتگی کو بہار کی منحصر پروری سے۔ نفسِ اثر اور اصل حسن کا جائزہ ذوق کے بس کی بات نہیں۔ ورنہ کسی علمی و اصولی زینہ کی مدد سے یہ ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق بعض اوقات رومانی و نامکمل حسن سے بھی محظوظ ہو جاتا ہے۔ مگر وجدان روحِ حسن کے بغیر کسی رنگِ حسن سے محظوظ تو کیا متاثر تک نہیں ہو پاتا۔ کیوں کہ وجدانی آسودگی کے لئے ضروری ہے کہ حسن فطری ہو۔ خواہ وہ قدرتی ہو کہ مصنوعی۔ چنانچہ کسی بھی منظر، کسی بھی صورت اور کسی بھی چیز کے متعلق قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ جمالیاتی احساس کی مکمل غذا ہے کہ کوئی منظر بغیر کسی خیالی اضافے کے حس مذکور کو متاثر و محظوظ کر جاتا ہے اور کوئی منظر بغیر کسی خیالی اضافہ کے معیارِ جمالیات پر پورا نہیں اترتا جس کا سبب وہی منظر کا فطری ہونا۔ یعنی وجدانی آسودگی و نا آسودگی کہ وجدانی آسودگی ہی کا دوسرا نام جمالیاتی آسودگی ہے۔

مختصر یہ کہ " ذوق " ایک اہم احساس اور تشنگی ہے، جس کی عدم سیرابی سے دل و دماغ متاثر ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ذوق کی یہ تشنگی اتنی شدید نہیں ہوتی کہ اہل ذوق کو تمنائے سیرابی کے ساتھ ساتھ جستجوئے سیرابی بھی ہو اس لئے اس کی عدم سیرابی وجدانی عدم سیرابی کی طرح روح میں خستگی نہیں پیدا کر سکتی اور نہ قدم قدم

پیاسی کی طرح قلب کو کچھ کے دے کر رفتہ رفتہ زندگی کو گدگدا سکتی ہے۔ چنانچہ اسی شدت و عدم شدت کی بنا پر اہلِ ذوق صرف حسن شناس اور حسن پسند ہوتے ہیں اور اہلِ وجدان حسن آفریں اور حسن پرست۔

ہر چند میں نے حسن و جمال سے محظوظ ہونے کے لئے ناظر و سامع کا صاحب وجدان ہونا ضروری بتایا ہے۔ اور یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ جو لوگ ذی علم و باشعور ہونے کے علاوہ فطرت کی طرف سے پاکیزہ مذاقِ جمال لاتے ہیں۔ وہ حسن و جمال سے نسبتاً اور لوگوں سے بہت زیادہ آسودہ ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے شوقِ بے کراں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ صرف منظرِ حسین کو آنکھوں میں نچوڑ کر دل کو آئینۂ بہار بنا لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی جستجوئے حسن مطمئن نہیں ہو پاتی کہ ان کے معیارِ جمالیات پر پورے اترنے والے مناظر و محاسن انھیں بہت کم میسر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر منظر کو اس وقت مکمل اور محظوظ کن تصور کرتے ہیں جو ہر لحاظ بھرپور ہو اور اس میں کسی قسم کے حذف و اضافہ کی گنجائش نہ ہو کیوں کہ وہ ہر منظر و صورت پر فنکارانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور حسین منظر و صورت کی معمولی سی اجنبیت و تخییلیت منظر سے ان کی نگاہ پھیر دیتی ہے کہ کسی بھی لطیف و حسین شے میں وجدانِ معمولی سے نقص تصنع کا روادار نہیں ہو سکتا۔ ہاں ان کے پاکیزہ و لطیف فطری و دماغی قرائن کے لحاظ سے یہ عین ممکن ہے کہ وہ کلاسیکل فنِ لطیف سے کما حقہٗ محظوظ ہوں کہ وجدان پر کھٹکنے اور اسے ناآسودہ رکھنے کی حد تک کلاسیکل فنونِ لطیفہ میں نقص ذرا نامطلب بات ہی ہے۔ مختصر یہ کہ حسن و جمال سے محظوظ ہونے والی صلاحیت کی تعمیر میں فطرت کی مناسبت کے علاوہ علم و شعور بھی لازمی چیزیں ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ احساسِ جمال بھی منجملہ دیگر احساسات کے عطیاتِ فطرت میں سے ہے اور یہ کہ جمال سے محظوظ ہونے کی صلاحیت کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ بقدرِ علم و احساس ہی سہی۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بعضوں میں یہ صلاحیت شعوری راہوں سے آتی ہے اور بعضوں میں لاشعوری راہوں سے

الشہاع

ہاں جہاں تک نفسِ جمال سے صرف آسودہ ہونے کا تعلق ہے (لیکن صرف بجدا اشیائے حسین و لطیف، فنونِ لطیفہ سے نہیں) مجھے وہ لوگ اس کلیہ سے تقریباً مستثنیٰ نظر آتے ہیں، جن کا احساسِ جمال، شعور و علم کے اعتبار سے وجدان کی حد تک لطیف و مکمل نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ ان کم علم افراد میں جمال سے محظوظ ہونے کی صلاحیت فطرتاً بہت زیادہ ہوتی ہے اور پھر چونکہ ان کے یہاں جمال و احساسِ جمال کے متعلق کوئی خاص علمی نظریہ نہیں ہوتا اس لئے ان میں افکار کم اور احساسات زیادہ، تخیلات کم اور جذبات زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ وہ لہکتے ہوئے سبزہ پر جب بھی لالۂ خوش رنگ دیکھیں گے۔ لاشعوری طور پر ایک بے نام مسرت محسوس کریں گے اور یہ کبھی نہیں ہوگا کہ ان کا خیال تلاشِ حقیقت کی جستجو میں اس نظارۂ حسین کے پس منظر کی طرف جائے اور خرد زدوں کی طرح وہ لالہ کے اختصارِ حیات یا سبزہ و لالہ کے تخلیقی اسباب کی تحقیق میں کھو جائیں۔ ان کے مزاج کی یہ فطری سادگی و معصومیت انھیں نفسِ حسن کے پیہم مطالعہ اور لذت یابی سے ہرگز نہیں ہٹا سکتی۔ لہٰذا وہ پھول کی ایک ایک پتی سے بھرپور لطف حاصل کریں گے اور بس۔ اسی لئے قدرتی طور پر ان میں جذبۂ نقد و ترمیم بہت کم ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ہر معیار کے حسین و دلکش منظر سے اتنا ہی محظوظ ہوتے ہیں جتنا کسی مکمل منظر پر اہلِ وجدان۔ لیکن جب وہ اپنے درجۂ تاثر و آسودگی کے اظہار پر مجبور کئے جاتے ہیں تو کم علمی کی بنا پر اپنی آسودگی بقدرِ آسودگی ظاہر نہیں کر پاتے جس کی بنا پر ان کا احساسِ جمال مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس باب میں وہ لوگ بھی اوروں سے کچھ کم آسودہ نہیں ہوتے۔ ان کے برخلاف بعض ذی علم و شعور حضرات جنھیں خرد زدگان کہنا چاہئے۔ اپنے آپ کو نہایت اونچا اور پاکیزہ مذاقِ جمال رکھنے والے ظاہر کرنے کے لئے جمال و احساسِ جمال کی اپنی باریک بینی و حسابی ذہنیت سے ایسی سخت فنی صورت دے ڈالتے ہیں کہ اچھے اچھے جمال شناسوں کو اس سے محظوظ ہونے کے لئے ملکۂ الہامی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ لوگ جو حسن شناسی کے

متعلق کوئی علمی نظریہ نہیں رکھتے اور پھر کمال یہ کہ ان حضرات کی نگاہ میں حقیقی حسن شناس کچھ وہی لوگ ہوتے ہیں جو سیدھی سادی بات کو الجھا کر پیش کرنے اور سادگی کو پہاڑ ظاہر کرنے میں استادانہ لفاظی کے ماہر ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح غزل گوئی کیلئے غزل گو کا فن غزل سے واقفیت کے ساتھ ساتھ "دل گزیدہ" ہونا بھی ضروری ہے اسی طرح حسن وجمال سے محظوظ ہونے کے لئے ناظر کا گداختہ قلب اور مناسب فطرت کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحیح البصارت وبصیرت ہونا۔ اور چونکہ اس گداختہ قلبی کا راست تعلق فطرت سے ہے علم وشعور سے نہیں اس لئے وہ لوگ جو گداختہ قلب نہ ہوں اور علم جمال سے کیسی ہی وسیع واقفیت رکھتے ہوں یہ ممکن نہیں کہ وہ جمال سے متاثر ہونے کی بجائے محظوظ ہو سکیں ہاں ہو سکتا ہے کہ ان کی پختہ عقلی بلکہ خرد زدگی انہیں مغرب کے بڑے بڑے مفکرین کا نام لے لے کر جمالیات پر دقیق وغیر واضح لکچر دینے اور عوام کو مرعوب کرنے میں کامیاب کر سکے ان کے اس نوع کی باریک بینی سے قدرتی طور پر پیدا ہونے والی دو اور دو چار والی بندھی ٹکی ذہنیت انہیں حسین وجمال سے ہرگز محظوظ نہیں کر سکتی۔

میری ان باتوں کے پیش نظر شاید کوئی اعتراض کرے کہ یا تو میں نے جمال نہ احساس جمال سے محظوظ ہونے کے لئے ناظر وسامع کے احساس پر وجدان کی حد تک لطیف وکمل ہونے کی شرط لگائی اور یہاں تو میں ان لوگوں میں بھی جمال سے آسودہ ہونے کی صلاحیت دکھا رہا ہوں جن کا احساس وجدان کی حد تک تو کجا ذوق ومذاق کی حد تک بھی مشکوک ہے۔ اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ کم علم افراد معمولی درجہ کے احساس کے باوجود جو جمال سے کافی متاثر ومحظوظ ہو سکتے ہیں۔ تو صرف اشیائے جمیل وحسین سے، فنون لطیف وجمیل سے نہیں۔ اور اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ "وجدان" "گداختگی وآگہی" کا خوشگوار امتزاج ہے لیکن اس کے باوجود اگر اس احساس پر عنصر اول "گداختگی" کا غلبہ ہو تو قطعاً مضائقہ نہیں لیکن عنصر دوم "آگہی" رفتہ رفتہ جس کی سرحدیں عقل زدگی سے ملتی ہیں کا زیادہ ہو جانا باعث خسارہ ہوتا ہے اور چونکہ زیر بحث افراد کا احساس اول الذکر صورت کے ذیل میں آتا ہے اس لئے ان کا حسن وجمال سے آسودہ ہونا قرین قیاس امر ہے۔ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ دراصل احساس جمال ہی وہ شدید تشنگی تھی جس کی سیرابی کی جستجو میں فطرت انسانی نے کئی اہتمام تحقیقات کر ڈالیں اور رفتہ رفتہ فنون لطیفہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہم آہنگ الطباع ع

تلاش وجستجو کی مدد میں بوقت رقص رقاصہ کے بدن کے لوچ اور ہاتھوں کی گداز جنبشوں اور لطیف اشاروں پر نگاہ کا رک جانا۔ غزلیہ اشعار کا نگاہ وسماعت سے گذر کر جزو روح ہو جانا۔ صدائے ساز کا ساز کے تاروں سے نکل کر قلب ودماغ میں بس جانا اور نقش وتصویر کے مچلتے اور لرزتے ہوئے خطوط کا روح میں تیرنا جداگانہ احساسات کی غذا ہونے کے باوجود ان سب کا تقریباً یکساں رنگ کی آسودگی پہنچانے کا سبب اور کیا ہے اگر مادی احساس یعنی احساس جمال کی آسودگی نہیں ہے۔ اس طرح اشیائے لطیفہ کے بارے میں صحن باغ میں کھلائے نو شگفتہ یعنی وشادابی، فضاؤں کی عطر بیزی، سبزہ کی لہک، تاروں کی ضیا بار اور ساغر کی کھنک کے زیر اثر شاعر کا بے اختیار کہہ اٹھنا "ایسے میں مرا گیسوؤں والا نہ ہوا" آخر شاعر کے کس جذبہ بنیادی کا ثبوت ہے؟ آیا شوق دیدار واحساس جمال کا اور ضمنیات فن میں اصل حسن کی کمی کا یا کسی اور احساس کی تشنگی کا۔ شاید میری اس بات کو جنسیات کا نام دیا جائے لیکن غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جمالیاتی بحث میں جنس لطیف وصنف جمیل کے ذکر سے گریز کرنا اور بحث کو جوں توں اختتام تک پہنچا دینا نام نہاد اخلاقی اعتبار سے کیسا ہی قابل فخر کارنامہ سہی لیکن نفس حقیقت وموضوع کے اعتبار سے فرار ہی کہلایا جائے گا۔ کیونکہ احساس جمال کو بنیادی طور پر تشنہ وسیراب کرنے میں اسی جنس کو نسبتاً بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی جنس کی اندرونی اور نامعلوم تمنا کی وجہ سے انسانی ترکیب میں احساس جمال کی تخلیق ہوئی اور اس کے سکون کو تہ وبالا کر دینے والے محبوب اشاروں نے کسی کو شاعری، کسی کو مصوری اور کسی کو موسیقاری پر مجبور کر دیا۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ جمالیات یا بالخصوص سرچشمہ جمال کے ذکر سے کانوں پر ہاتھ دھرنا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ متین وسنجیدہ اصطلاح میں اس کجروی اور بیماری کا نام بلند اخلاقی ہی سہی لیکن اس بلند اخلاقی سے جمالیات وجنسیات میں امتیاز کی تمنا قطعاً بے سود ہے یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی شاعری کے بعض پاکیزہ حصے جنسیاتی خانے میں ڈھکیل دیئے گئے اور پھر "آہ بیچارے کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" کی مطلب براری کو سپر بنا کر سیکڑوں دلنواز جمالیاتی اشعار کا خون کر دیا گیا۔ القصہ اب یہ بلند اخلاقی اپنے تدریجی ارتقاء کی اس بلند ترین منزل پر جلوہ افروز ہے جیسا کہ اس فقرے سے ظاہر ہے کہ ــــ

"شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل!"

عزمی لدھیانوی

نغمۂ زندگی

سحر کے گیت گا کر سونے والوں کو جگاؤں گا
جلو میں زندگی لے کر ترے کوچے میں آؤں گا

پرانے گھور اندھیروں کی لکیروں کے فقیروں کو
نئے نغمے سنا کر میں، نئی شمعیں جلاؤں گا

جواں تاروں پہ جب بھی تیرگیِ شبخون مارے گی
میں تیرے شعلۂ رخسار کی لَو کو بڑھاؤں گا
سَروں پر آ کے سورج جس گھڑی آتش فشاں ہوگا
میں زیرِ آسماں اس وقت بادل بن کے چھاؤں گا

میں شاعر ہوں مرے دل میں ہے احساسِ جمال اب تک
فرازِ دار سے سوئے فرازِ دل بھی آؤں گا

شبِ ہجراں کے پتھر کو بہا کر موجِ نغمہ میں
اسی سیمیں بدن کی چاندنی میں پھر نہاؤں گا

شگوفہ، پھول، پتی، برگِ سبزہ کیوں ہراساں ہے
چمن میں نو بہاراں کے اجالے لے کے آؤں گا

حزیں پیاسی زمیں جب پیاس کی شدت سے چیخے گی
لہو بن کر میں دھرتی کی رگوں میں دوڑ جاؤں گا

عنوان چشتی

خودکشی

عہدِ نو کے آذر نے
فکر و فن کے تیشے سے
جو صنم تراشے تھے
ان سے خود ہی گھبرا کر
پاش پاش کر ڈالا
پھر ذرا سا دم لے کر
اُن شکستہ ٹکڑوں سے
آئینہ کی کرچوں سے
اپنے جسم و جاں کو بھی
چاک چاک کر ڈالا

اُف وہ خوابِ محرومی
اُف یہ شوخیٔ تعبیر

طیب سرسار

مرگِ ظلمت

دَرد سے آنکھ جو بھر آئی تو موتی چمکا
درد سے زخم جو بھر آیا تو زنداں مہکا
زخم سے خون جو ٹپکا تو چمن مہکے ہیں
کرب سے آہ جو نکلی تو فضا تھرائی

رات وحشت کدۂ تیرہ لحد کی مانند
دل پہ، احساسِ تنفس بہ گراں لگتی ہے
ظلمتیں تیرہ صلیبوں کی طرح ہر لحظہ
زیست کے ساتھ یونہی رقص کناں ہیں ابتک

دوستو! زخمِ تمنّا کا مداوا ہے یہی
بزم میں رسمِ وفا رسمِ جنوں عام کرو

ہے یقیں یہ کہ اکھڑ جائیں گی سانسیں شب کی
شعلۂ صبح جنم لے گا افق سے جس دم
راکھ ہو جائیں گی ظلمت کی روایتیں ساری

رحمٰن جامی

تم نے کیوں آج سرِ راہ مجھ کو کیا سلام
یونہی انجان گزرتیں تو بہت اچھا تھا
آج پھر تم سے تعلق کا خیال آتا ہے!

جانے کیا سوچا ہے تم نے مجھے معلوم نہیں
میں نے سوچا ہے کہ اب تم سے رہ و رسم نہ ہو
کیونکہ اب غیر ہو تم غیر سے رشتہ کیسا
یوں بھی تنہائی مری اب نہ اجازت دیگی
کوئی در آئے مرے پیار کے ویرانے میں

○

اگر ہو زحمتِ جلوہ نمائی طور پر کیوں ہو؟ — نظر ہوتے ہوئے رسوائی ذوقِ نظر کیوں ہو؟

حجاباتِ نظر ہی ٹھوکریں کھانے کو کیا کم تھے — نظر آنا نہیں منظور تو پیشِ نظر کیوں ہو؟

ہم اپنی بے حسی پر طنز کی پروا نہیں کرتے — قفس میں رہ کے پروائے شکستِ بال و پر کیوں ہو؟

مرے شغلِ جنوں پر مضحکہ بھی اک سیاست ہے — نظر بیباک ہو جائے تو وقفِ بام و در کیوں ہو؟

ہنسی آتی ہے درسِ احتیاط و ضبط پر مجھ کو — پرستارِ چمن کو خدشۂ برق و شرر کیوں ہو؟

تمہارے خالِ عارض کا تصور باندھنے والے — شبِ غم سے نہیں ڈرتے شبِ غم مختصر کیوں ہو؟

بھٹکنے میں شرف بھٹکا دیے جانے میں ذلت ہے — کوئی منزل نہ ہو جس کی وہ میرا راہبر کیوں ہو؟

کسی کو غم نہ ہو تو کیا ضرورت غمگساروں کی — ہمارے درد کا درماں بھی ممکن ہے مگر کیوں ہو؟

مری زنجیرِ پا اور ٹوٹ جائے موت سے پہلے — تمہاری زلف کا افسانہ اتنا مختصر کیوں ہو؟

بہار اس ظلمتِ شب میں بھی سرگرمِ سفر ہیں ہم
جو محرومِ بصارت ہو ہمارا ہم سفر کیوں ہو؟

علی عبّاس امید

○

زندگی رات کے زینے سے اترتی ہی رہی
روشنی دور مناروں پہ بکھرتی ہی رہی

ریگزاروں میں بھٹکتے رہے انساں مگر
زلفِ فرسودہ اصولوں کی سنورتی ہی رہی

آج تک میرا ہر اک خواب رہا ہے بےکیف
یوں تو ہر صبح نئے ڈھب سے نکھرتی ہی رہی

بوئے گل چھوٹ کے مجلس سے یہاں آئی جب
ذکرِ مایوس تمنّاؤں کا کرتی ہی رہی

آرزوؤں کے بیاباں میں بہار آنہ سکی
تو مرے ذہن سے ہر آن گذرتی ہی رہی

خوں میں تر فصلِ جنوں آئی مگر بادِ صبا
رنگ ہر نقشِ گل و برگ میں بھرتی ہی رہی

دل کی راہوں میں ضیا بار رہی شمعِ امیدؔ
فن کی قندیل اندھیروں میں ابھرتی ہی رہی

مَنظر ایّوبی

○

بیباکیٔ نظر کی سزا جانتے ہیں ہم
کس دل کی ہے مگر یہ خطا جانتے ہیں ہم

کیا مصلحت ہے پیشِ نظر ان کے دوستو
کہتے ہیں جو بتوں کو خدا جانتے ہیں ہم

تو لاکھ اپنی وضع پہ قائم رہے مگر
اے دل تری وفا کا صلا جانتے ہیں ہم

ہونٹوں پہ لاکھ ثبت کریں مہرِ خامشی
دبتی نہیں ہے دل کی صدا جانتے ہیں ہم

گزرے ہیں ہم بھی سخت مراحل سے دوستو
کتنی کٹھن ہے راہِ وفا جانتے ہیں ہم

یہ رنگِ میکدہ ہے تو اک روز میکشو
ہوگا ضرور حشر بپا جانتے ہیں ہم

ہم نے بھی زندگی میں اٹھائے ہیں دکھ بہت
اظہارِ مدّعا کی سزا جانتے ہیں ہم

نظمِ چمن سے اپنا تعلق نہیں مگر
کیوں چاک ہے گلوں کی قبا جانتے ہیں ہم

برہم نہیں ہے تیری نظر ہی کچھ ان دنوں
ہیں دل کی بستیاں بھی خفا جانتے ہیں ہم

تیری فسردگی کا بھی سوچیں گے کچھ علاج
اپنے تو ہر مرض کی دوا جانتے ہیں ہم

سحر رومانی

○

سُورج نہیں زمین نہیں آدمی نہیں
میں اُس مقام پہ ہوں جہاں کوئی بھی نہیں

خود تیرگی بھی نور کے سائے کا نام ہے
وہ کونسی جگہ ہے جہاں روشنی نہیں

شہرِ وفا میں بُوئے وفا کا نہیں نشاں
بازار تو کھُلے ہیں مگر جنس ہی نہیں

دیکھے ہوئے ہیں ہم نے دھنک کے تمام رنگ
منظر کوئی ہمارے لئے اجنبی نہیں

صحرا کی سمت جائیے کیوں شہر چھوڑ کر
ویرانیوں کی دل کے نگر میں کمی نہیں

فرصت ملے تو گوشۂ دل کی بھی سیر کر
اِس بحر کی کسی کو ابھی تہہ ملی نہیں

مرنے کا وقت آئے تو پھر بھی نہ مر سکوں
اِس درجہ بھی عزیز مجھے زندگی نہیں

عنبر چغتائی

○

نور و نغمہ ہے، تیری خوشبو ہے
زندگی کیا، نگارِ دل جُو ہے

رات ہے یا سیاہ گیسو ہے
چاندنی ہے کہ تیرا بازو ہے

قہقہوں کا نچوڑ آنسو ہے
یہ بھی اِک زندگی کا پہلو ہے

تیری زلفیں ہیں، تیری خوشبو ہے
تیرا سر اور میرا بازو ہے
یا یہ عالم نگارِ دل جُو! ہے
اپنا سر اور اپنا زانو ہے

جسم اور روح کا تعلق کیا
جیسے اِک میں ہوں، دوسری تو ہے

ذہن ہے یا نگار خانۂ حسن
یاد ہے یا نگارِ دل جو ہے

اب بھی ہوں میں طلسم دل میں اسیر
آج بھی مجھ پہ تیرا جادو ہے

ظہیر قادری

○

دیکھو گے جو مجھ کو تو میں تم سے بھی نہاں ہوں
محسوس کرو گے تو قریبِ رگِ جاں ہوں

جب سے مرے احساس کی لَو تیز ہوئی ہے
اُس وقت سے مصلوبِ غمِ کون و مکاں ہوں

سوچا تھا ترے قُرب سے بجھ جائے گی یہ آگ
یہ کیا کہ ابھی تک میں یونہی شعلہ بجاں ہوں

مجھ کو بھی ترے سایۂ گیسو کی طلب ہے
چاہت کی کڑی دھوپ میں برسوں سے رواں ہوں

جو زیست کا عنوان بنے میں وہ نظر ہوں
جو وقت کی اقدار بدل دے وہ زباں ہوں

ب بھی مرے ہونٹوں پہ انا الحق کی صدا ہے
ب بھی رسَن و دار کی عظمت کا نشاں ہوں

ل تم کہ زمانے سے یونہی مہر بلب ہو
ل میں کہ ہر اک دور کا اندازِ بیاں ہوں

فیروز ناطق خسرو

○

صبح کہیں تو شام کہیں پر گزاریئے
بیتے ہوئے دنوں کی تھکن کو اتاریئے

غیروں سے رسم و راہ کی تدبیر کیجئے
اپنوں کا سامنا ہو تو نظریں بچائیے

کیا کیجئے گا پڑھ کے اَدب کی حکایتیں
الماریوں میں صرف کتابیں سجائیے

ورنہ سکوں سے نہ کبھی جی سکیں گے آپ
شیشے کے گھر میں رہ کے بھی پتھر اچھالیے

خسرو یہی ہے ریت زمانے کی آج کل
چادر ہوئی جو تنگ تو پاؤں پساریئے

آپ نے مزید کچھ کہا، اب لیٹ جائیے ۔

"چلو بابا، تم نے قسم دے دی اور ہماری زبان بند ہو گئی اب جینے کبھی جائے گا، لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شرارت سے مسکائے اور ہماری بھی تو سن لیجئے، ہمارے قریب آیئے اور قریب ۔"

ادھر تکیے سے سر لگایا ادھر ان کی آنکھ لگ گئی، تھکن چہرے سے صاف نمایاں تھی میں نے آہستہ سے ان کی بانہوں سے اپنے آپ کو الگ کیا ۔ اپنی مسہری پر لیٹ کر ان کے محبت بھرے چہرے کو دیکھنے لگی، ماضی کے کئی پردے آنکھوں کے سامنے اٹھنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ممیم ابا کے چچیرے دوست کے لڑکے تھے، وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتے ان سے کوئی پردہ نہیں کرتا تھا ۔ وہ پھوپی جان کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے ۔ انھیں بہت کم بولتے دیکھا گیا، پھوپی جان کچھ پوچھتیں تو ہاں یا نہیں میں جواب دیتے، وہ خاموشی سے پھوپی جان کی باتیں سنے جاتے، وہ پھوپی جان کے لاڈلے بن گئے تھے ۔ جب ایک دن بھی نہ آتے یا اپنے وقت مقررہ سے دیر سے پہونچتے تو پھوپی جان بے چین ہو جاتیں، کہلا بھجواتیں ممیم میاں کیوں نہیں آئے، طبیعت تو اچھی ہے نا؟ ——
اس دن مجھ غریب پر پھوپی جان ناحق غصہ کرتیں مانو میں ان کے نہ آنے کا باعث ہوں صرف میں! ——— مجھے دونوں پر غصہ آتا، پھوپی جان پر اور ان کے لاڈلے پر ۔ ویسے انجانے میں مجھے بھی تشویش ہوتی، ان کی منتظر رہتی، اس دن بھی کچھ اجاڑ اُچاٹ سا لگتا ۔ ان کی سنجیدگی مجھے بے حد پسند تھی، نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو سنگدل انسان ظاہر کرنے کی کوشش کرتے گویا انھیں کسی کے آنسوؤں کی پروا ہے اور نہ کسی کی خوشی سے سروکار ـــ مگر ایک دن بھانڈا پھوٹ ہی گیا، میں مشین پر بیٹھی اپنے بلاؤز پر ایمبرائڈری کر رہی تھی اور کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھ لیتی تھی کہ یکایک سوئی میری انگلی میں دھنس گئی، میری ایک چیخ نکل گئی وہ ایسے تڑپ کر اٹھے مانو سوئی ان کے چبھ گئی ہو ۔ میرے طرف لپکے، دانتوں سے سوئی کو نکالنے کی کوشش

الشجاع

کرنے لگے، ان کے ہونٹ میری انگلی سے لگے ۔ ادھر ان کی نگاہ میرے سینے سے ٹکرائی تو مجھے جھرجھری آ گئی، سوئی کھینچ کر نکالتے وقت میں نے ان کے چہرے پر ان کے دل کی ساری کیفیت کو عیاں دیکھا، جتنی تکلیف مجھے ہو رہی تھی اس سے زیادہ احساس ان کے چہرے سے عیاں تھا ۔ میں اپنی تکلیف بھول بیٹھی، پٹی باندھی اور میری جانب دیکھے بنا "دیکھ سمجھ کر کام کیا جاتا ہے" کا ریمارک کر کے پھر پھوپی جان کی باتوں میں محو ہو گئے ۔ میں نے سوچا یہ انسان سنگدل بالکل نہیں ہے اس کو صرف پہچاننے کی ضرورت ہے، جو پہچان گیا وہ سمجھ جائے گا کہ اس چٹان کے نیچے نرم نرم چشمہ رواں دواں ہے ۔ جب میں ٹائیفائڈ سے بیمار ہو گئی تھی تو ان کی آنکھوں سے دہشت سی ٹپکتی تھی، مجھے ان آنکھوں پر بے تحاشہ پیار آ جاتا تھا، میری جانب اس وقت دیکھ لیتے جب میں سونے کی کوشش کرنے لگتی، وہ یہ سمجھ بیٹھتے کہ میں سو گئی ہوں اور میرے متعلق تمام تفصیلات پھوپی جان سے پوچھ لیتے، آج ٹمپریچر کتنا تھا، کب تک بخار ٹوٹے گا، ڈاکٹر نے کیا کہا ۔ مجھے کچھ شرارت سی سوجھتی میں ایک آنکھ موند کر دوسری کھول دیتی، وہ بوکھلا کر موضوع بدل دیتے،

پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ واقعہ چھا گیا، میری منگنی کی بات چل رہی تھی، ممیم اب پہلے سے بھی زیادہ گم سم رہنے لگے تھے، جس دن منگنی تھی ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ یہ سمجھ کر چلے آئے تھے کہ وہاں کوئی نہ ہوگا، ایک منٹ کے لئے آنکھیں چار ہوئیں آنسوؤں کا سیلاب نکل پڑا، آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ فوراً مڑ گئے، وہ لوٹنے ہی والے تھے کہ میں پوچھ بیٹھی "کیا بات ہے؟!"

"کوئی خاص بات نہیں" وہ میری طرف دیکھے بنا بولے "آنکھوں میں جلن سی ہے صبح سے ایک عجیب سی بے چینی ہے ۔ سوچا کہ شاید آپ بیٹھی کمرے میں ہوں گی کچھ دیر آرام کرنے کے لئے یہاں چلا آیا"

"بیٹھئے نا ۔" میں بمشکل کہہ سکی، نہ جانے کیوں مجھے

یہ خیال آیا کیا انھیں مجھ سے پیار نہیں تھا اور . . . . . . میں آنکھیں بند کئے سوچتی رہی۔ مجھے اس سے پہلے کیوں خیال نہیں آیا۔ کیوں — " نہ جانے کیوں میرا دل ڈوب گیا۔

میری منگنی کیا ہوئی ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ پھوپی جان کہلا بھیجتیں تو چلے آتے جو گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے، منٹوں میں کوئی بہانہ کر کے اٹھ جاتے۔ لاشعوری طور پر میں ان کی راہ تکتی۔ پھوپی جان پر غصہ آتا کہ انھوں نے کیوں جھوٹ بولی، کیوں نہ بلایا؟

مجھے ان سے ہمدردی ہے یا سچ مچ محبت — میں کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی شادی کے دن بھی قریب آ پہنچے، نہ جانے کیوں میرا جی اچاٹ اچاٹ سا تھا، یہ کیسی بے چینی تھی۔

گزشتہ پندرہ بیس دن سے وہ ہمارے گھر نہیں آتے تھے۔ شادی کے لئے صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ نہ جانے کیوں کون سا جذبہ تھا کہ میں ان کی ہر حرکت پر نظر رکھتی تھی مجھے یہ خبر ملی وہ سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ کیا وہ میری شادی میں شریک نہیں ہوں گے میں کیوں اور کیسے ان کے گھر پہنچ گئی مجھے اس بے خبری پر خود تعجب تھا۔ ہولڈال تیار پڑا تھا سوٹ کیس میں کپڑے رکھے جا رہے تھے انھیں میری آمد کی خبر نہیں تھی۔ فوٹو فریم میں کوئی تصویر جڑی تھی، وہ بڑی احتیاط سے رکھ رہے تھے۔

"آداب عرض"

وہ ایسے چونک پڑے گویا میں نے ان کی چوری پکڑ لی ہو،

"کسی کی تصویر بغیر کسی کی مرضی کے رکھ لینا بری بات ہے نا"

"کس کی تصویر؟"

وہ فریم سے تصویر الگ کرتے ہوئے بولے "اگر تم ایسا نہ چاہو تو میں اسے لوٹا دوں گا" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میں پتھر کی مورتی بنی کھڑی رہ گئی۔ میں یہ کیا دیکھ رہی تھی ان کی آنکھوں میں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا بھلا کوئی یوں کسی سے چھپ چھپ کے محبت کرتا ہے۔"

مجھے ان پر شدید غصہ بھی آیا کہ آخر انہوں نے پھوپی جان سے دبی زبان ہی میں مدعا کیوں نہ کہا۔

میں ان سے کچھ کہے بغیر لوٹ آئی۔ اس رات جی بھر کر روئی، میں نے اس رات اپنے عجیب و غریب احساسات سے گھبرا کر پھوپی جان سے کہہ دیا میں شادی نہیں کروں گی، وہ سکتے کے عالم میں آ گئیں لیکن پھوپی جان کیا کر سکتی تھیں۔ منگنی ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ شادی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں اور کوئی معقول وجہ انکار کی بھی نہ تھی۔ انکار کیسے کرتیں وہ ڈاکٹر تھے گھرانہ اچھا تھا۔ پھر شادی کیوں روک دی جائے۔ امی کے لئے یہ ابا کی عزت کا سوال تھی، میں نے عزت و ناموس کے لئے زہر پینا گوارا کر لیا۔

وقت بیتتے کیا دیر لگتی ہے، دو سال ہواؤں کی طرح اڑ گئے، خالد پیدا ہوا، پھر میری زندگی میں خزاں آ گئی شفیع سے میرا نباہ نہ ہو سکا، نظریات اور مزاج کے گہرے اختلافات کے سمندر میں زندگی کی کشتی کیسے آگے بڑھ سکتی ہے۔ فسخ نکاح ہی ایک واحد علاج تھا جب غم کے بادل چھا گئے تو عمیم کے خیال کا سورج بن کر چمکی۔ مگر میرے پاس اب رکھا ہی کیا ہے۔ جو انھیں دیتی صرف ایک کٹر و بے مایہ زندگی تھی، بے کار زندگی، ناخوشگوار اور بے مقصد۔

اس دوران وہ اپنے شہر نہیں لوٹے تھے۔

عمیم کو پھوپی جان کے پاس بیٹھے دیکھ کر خوشی سے آنسو بھر آئے، میں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ سب کچھ کیسے ہو گیا پھوپی جان، کل ہی مجھے خبر ہوئی میں آ دوڑا چلا آیا۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا۔ کیا ایک ڈاکٹر اتنا بے رحم ہو سکتا ہے۔" ان کی آواز میں درد تھا، ہمدردی تھی۔

"پھوٹی تقدیر! دو سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا، اس کی عمر کی لڑکیاں تو ابھی کنواری بیٹھی ہیں۔ اس کی شادی بھی ہوئی اور ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔"

"ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اس میں بھی اللہ کا کوئی راز پنہاں ہے۔"

"کسی کی تقدیر میں غم ہی لکھ دینے میں بھلا کونسی مصلحت ہوتی ہے" میں جھپٹ کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"تمہیں برا نہیں لگے گا عشی" وہ میری طرف محبت

بھری نظروں سے دیکھ کر بولے میرے اللہ کتنا خلوص ٹپکتا ہے ان کی آنکھوں سے ـــ!

"آپ کو اپنا شہر یاد نہیں آیا، دو سال میں ایک مرتبہ بھی اپنے گھر نہیں آئے!"

"کس کے لئے آتا، کسے میرا انتظار تھا!"

کیا ان کا اشارہ میری طرف تھا ـــ میں اس خیال ہی سے جھوم جھوم گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے یہ خیال ستانے لگا، شائد پہلے وہ مجھے اپنانا چاہتے ہوں مگر اب بھی ـــ بھلا وہ ایسا کیوں کرنے لگے، میرا سب کچھ تو کھو گیا تھا، میں تو تہی دست تھی۔

مجھے پتہ نہیں چلا تھا کہ ۱۶ رمئی کو میری سالگرہ تھی، صبح ابھی نماز سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ وہ چلے آئے انھیں آتے وقت دیکھ کر میرا دل دھڑکا۔

"میں تمہیں سالگرہ کی مبارکباد دینے آیا ہوں اور ساتھ ہی کچھ مانگنے اور کچھ کہنے ـــ"

"کیا مانگیں گے، میرے پاس دینے کے لئے رکھا ہی کیا ہے" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "آپ تو بلند و بالا تر ہیں، آپ جیسے مخلص دیوتا کی محبت مجھے نصیب ہے، یہی میرے لئے بڑی بات ہے"

"اپنے مستقبل کے لئے کیا سوچا ہے؟"

"جس نے بنایا ہے وہی سوچے گا" میرے لہجے میں طنز تھا درد تھا۔

وہ میری بات ان سنی کرتے ہوئے بولے "خالد کو ایک شفیق باپ کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں اچھے ساتھی کی، تمہارے خاندان میں کوئی ایک معقول نوجوان نہیں؟ ان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے کیوں پڑ گئے ہیں جو ایک ہیرے کو پہچان نہیں سکے، کیا کوئی ایسا اچھا آدمی نہیں جو تم دونوں کو خوشی دے سکے"

میں ان لڑکیوں میں نہیں ہوں جن کے لئے دولت ہی سب کچھ ہے مجھے محبت آشنا دل چاہئے۔

"اگر میں پھر بھی جان سے کہہ کر تم دونوں کو مانگ لوں تو؟

پھولوں کی سیج پر سونے والی کو کانٹوں پہ سونے کے لئے کچھ وقت کی ضرورت تو ہوگی شائد میری محبت اس کو محسوس نہ کرنے دے، میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ سدا آرام و آسائش مہیا کر دوں گا مگر مجھے امید ہے کہ تمہیں میرے پاس تکلیف نہ ہوگی خالد پڑھا لکھا خوب پڑھے گا، اور بڑا آدمی بنتے دیکھ کر میں خوشی سے پھولے نہ سماؤں گا" ایک سانس میں وہ سب کچھ کہہ گئے۔

میرے آنسو ابل پڑے "خدارا کچھ نہ بولئے میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا ہوں عاشی۔ نہ یہ سمجھو کہ میں وقت سے فائدہ اٹھا رہا ہوں، تمہاری مرضی پر ہمارا مستقبل منحصر ہے ـــ نفی، اثبات دونوں میں میری محبت کو ثابت قدم پاؤ گی تم"

"آپ غلط کیوں سمجھ رہے ہیں" الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے میں کچھ بھی بول نہ سکی!

وہ قریب آئے، وہ میری آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ شرم و حیا سے میری پلکیں جھک گئیں۔

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا" وہ کچھ سننے پر مصر تھے۔

میں انھیں کیا جواب دیتی، خوشی سے دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں بمشکل کہہ سکی "خالد کو آپ کا بیٹا بتاتے ہوئے بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے"

پھر وہ دن بھی آ گیا، ہماری ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہو گئی، ـــ وہ خالد اور میں ـــ دن بادلوں کی طرح گذر گئے، ہماری محبت پاسے اور جوہی کی صورت میں نمودار ہوئی مجھے اس بات سے اطمینان تھا کہ خالد ان کا لاڈلا تھا۔ اور وہ بھی اپنے ابو کو انتہا سے زیادہ چاہتا تھا، اب جب کہ وہ ڈاکٹر بن کر جرمنی سے لوٹ رہا تھا ان کی آرزو کی تکمیل ہوئی تھی۔

سوچتے سوچتے نہ جانے میری کب آنکھ لگ گئی تھی یکایک شور سے میں جاگ اٹھی، دن چڑھ آیا تھا، خالد وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا تھا، وہ میری طرف لپکا اور میرے قدم

الشہاع

اشرف فاروقی

فٹ پاتھ بکنگ

● ـــــــ ایک پھکڑ قسم کے آدمی نے سرگوشی کی ـــــــ پھٹ منگتا؟ ـــــــ کون سا چلے گا؟
اس نے اس سرگوشی کا کوئی جواب نہیں دیا ـــــــ وہ آدمی بڑبڑاتا آگے بڑھ گیا ـــ صاحب نہیں سمجھا ـــــ فٹ پاتھ بکنگ ـــــــ فٹ پاتھ بکنگ۔

دفتر سے نکلتے وقت اس نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ باہر کھڑا ہوا چپراسی چونک کر سہم گیا۔ اور وہ دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ یا پھر اس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہوں اسے خوب معلوم تھا کہ جب بھی صاحب غصے میں ہوتا ہے تو دروازہ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ سہمے ہوئے چپراسی کو یکسر نظر انداز کر کے وہ منزل کے زینے سے نیچے آ گیا ـــ آج صبح سے اس کی یہی حالت تھی، دفتر کا سارا وقت اس نے بے کار گزارا تھا۔ کسی بھی فائل میں اس کا جی نہیں لگا۔ حالانکہ کام کی کوشش میں اس نے متعدد اہم کاغذات میز پر پھیلا رکھے تھے۔ جیسے اس نے طے کر رکھا ہو کہ نہ صرف سابقہ بلکہ آئندہ دس بیس برسوں کا کام بھی آج ہی مکمل کر دے گا۔ مگر پھر کاغذات کی الٹ پھیر کے وہ دن بھر کچھ نہ کر سکا۔ اس کی ذہنی حالت بالکل ان منتشر موجوں کی سی تھی جو بار بار ہلک ہو جاتی ہیں۔ اسے موجوں میں انتشار کی یہ کیفیت بڑی عمل آور معلوم ہوتی تھی۔ جب بھی منتشر لہریں طوفان کا روپ اختیار کر لیتی ہیں تو سمندر کا سینہ چیر کر رکھ دیتی ہیں اور پھر کناروں سے ٹکرا کر پاش پاش الشہاع

ہو جاتی ہیں۔ شکست و فتح کی یہ متضاد حالت اسے ہمیشہ پسند رہی تھی مگر آج اس کے دل و دماغ میں انتشار کا جو طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کی تہہ میں نہ کوئی فتح کا جذبہ تھا کہ اس کے سینے سے کوئی ڈھکی چھپی بات کو باہر پھینک کر اسے مطمئن کر دیتا اور نہ شکست کا کوئی احساس کہ اس کی انتشاری سی حالت سر پٹک جاتی اور وہ نڈھال سے ہو جاتا۔

آمنہ کے چلے جانے کے بعد کل رات سے اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ آمنہ پہلی بار اپنے گھر گئی ہو۔ مگر جن حالات میں وہ اپنے میکے گئی تھی وہ اس کے لئے ناقابل برداشت بن گئے تھے۔ بات بالکل معمولی سی تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی آمنہ کے ساتھ انتہائی پیار و محبت کا سلوک کیا تھا۔

آمنہ کی بعض باتیں اسے بری طرح کھلتی تھیں۔ مگر وہ انہیں پی جاتا۔ اور ایک مسکراہٹ میں اس کے اعتراضات کو خوش اسلوبی سے ٹال جاتا۔ مگر کل رات جب وہ دوستوں کی محفل سے کرکٹ میچ کے بعد اپنی کامیابی کے نشے میں جھومتا ہوا گھر آیا تھا تو وہ بہت خفا تھی کہ

اس کی دانست میں اس نے غذا کے نازک ترین موقف کے بارے میں افسر
کو صورت اپنے دلائل سے مطمئن کر دیا تھا لیکن پھر اپنی اعلیٰ سوجھ بوجھ اور سیاسی
و قومی رجحانات کے بھرپور احساس کی دھاک بھی بٹھا دی تھی اور منٹوں میں
ملکی غذائی بحران کا حل ڈھونڈ نکالا تھا۔ جس پر اس کے سارے ساتھی چپ
چاپ، خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے انھیں حالات کی نئی
روشنی میں لا کھڑا کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھیوں میں سے خان نے بحث کو کرٹ
مجتی کا رنگ دے کر اس سے اپنے اثر و رسوخ کا بیڑا ظاہر کر کے پر زور الفاظ
میں کہا تھا۔

" حکومت نے سستے غلے کی سینکڑوں دوکانیں کھول رکھی ہیں
مگران دوکانداروں کا کہنا ہے کہ کئی لوگ اناج لینے نہیں آتے۔ اب
بتاؤ اس میں نظم و نسق کی کیا کمزوری؟ اناج ہے۔ دوکانیں ہیں۔
لوگ خریدتے ہی نہیں تو بیچاری حکومت کا کیا قصور؟ "

اس نے بڑے ہی جارحانہ انداز میں جواب دیا۔

" اناج تو ہے مگر پیسہ کہاں ہے؟ سرمایہ دار پیسہ فراہم کرنے
کے مواقع کہاں دیتے ہیں؟ روپیہ نہ ہو تو سستا اناج بھی ہزاروں کے لئے
لاکھوں کا ہو جاتا ہے۔ انہی لوگوں کے حصوں کا اناج دوکانداروں
کے لئے کالے بازار کا نفع بنا ہوا ہے۔ تم کہو گے وہ بینکوں سے رقم کیوں
نہیں نکالتے۔ آخر ملک میں لاکھوں بینکیں کس لئے کھولے گئے ہیں؟"

اس کے ساتھیوں نے ایک زبردست قہقہہ لگایا تھا۔ خان
پر اس کا آخری وار بھی بڑا کاری تھا "میرے بھائی تم ہمیشہ کھاپی کر مست
رہتے ہو۔ اس لئے پیٹ سے سوچتے ہو" قہقہوں میں مزید اضافہ ہو
گیا تھا۔ اور اس نے خان کی طرف اس طرح دیکھا تھا۔ جیسے اسے چاروں
شانے چت کر دیا ہو۔ حالانکہ اسے بھرپور احساس تھا کہ وہ ایک اعلیٰ
سرکاری عہدیدار ہے اور صرف دوستوں کی محفل ہی میں وہ اس طرح
کھل کر بات چیت میں حصہ لے سکتا ہے۔ ایک وقت جب اس کے افسر
اعلیٰ نے اس سے غذائی پالیسی سے متعلق چند امور پر بحث کی تھی تو وہ
صرف EXACTLY اور YES SIR, YES SIR کہہ کر خاموش
ہو گیا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس کی سیمابی طبیعت مچل جایا کرتی تھی۔ اور پھر وہ
بالکل آزادانہ انداز میں سوچا کرتا۔ اور اس بات کو فراموش کر دیتا کہ وہ ایک
اعلیٰ عہدیدار ہے۔

اس کی یہ سیمابی کیفیت ہی تھی کہ جس نے اسے اس بات
پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ آمنہ کا ہاتھ تھام لے۔ جو حالات کے تھپیڑوں کی زد
میں تھی۔ اس وقت سینکڑوں کی تعداد میں اس کے عزیز و اقارب بھی
چاندی کے تھال لئے؟ اس طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے کہ جونہی موقع
ملے اسے ہڑپ کر جائیں مگر وہ ان کو بری طرح نظر انداز کر کے مسکراتا ہوا
آمنہ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ آمنہ کے عشق و محبت کے
چکر میں پڑا ہو۔ اس کے احباب میں کوئی بھی اس طرح کی بات کرتا افلاطونی
عشق کی کیفیات کا اظہار کرنے لگتا تو اسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ
ہوتا۔ اس کی سوچ اور سمجھ کی ڈگر واقعات و حالات کی صداقت پر مبنی
ہوتی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک غریب رشتہ دار کو وہ
اعزاز بخشا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ اور بڑی سادگی سے
اس نے آمنہ کو اپنا ہمسفر بنا لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے آمنہ کو اپنی پسند
کے مطابق ڈھال لیا تھا مگر پھر بھی آمنہ کی باتیں اکثر اس کے لئے بڑے دکھ
کا سبب بن جاتیں۔

کبھی کبھی آمنہ کے شکوک اس کے لئے ناقابل برداشت بن
جاتے۔ خاص طور پر اس کی سیکرٹری مس نسیم تو اس کی کمزوری بن کر رہ گئی
تھی۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بڑھ گئے تھے جب اس نے سادگی میں
دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ اور ایک دو بار اسے محض اس خیال
سے اپنے گھر بلا لیا تھا کہ وہ دونوں آپس میں گھل مل جائیں گی۔ تب سے
بات بات میں مس نسیم کا حوالہ دے کر اسے لعن طعن کرنا آمنہ کی عادت
سی ہو گئی تھی۔ وہ اس کی نادانی کو ہنس کر ٹال جاتا۔ اس نے کبھی بھی
مس نسیم کے چہرے کو بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اس کا خیال
تھا کہ وہ شاندار لڑکیوں میں شمار نہ کی جا سکے جو متمول طبقہ یا بڑے لوگوں
کی دلبستگی کا سامان ہوتی ہیں۔ کم از کم اس کے کام اور سلیقے اور رکھ
رکھاؤ سے اسے یہی احساس ہوا تھا۔ یوں بھی اس کی اپنی سوچ اور فکر
کے مطابق اس طرح کی باتیں اس کے ذہن کے دروازے کے باہر ہی رہ
جاتیں ۔۔۔۔

کل رات جب وہ بحث کی کامیابی کے نشے میں مست ہو کر

گھر واپس ہوا تو آمنہ نے دروازے ہی میں بڑے چبھتے انداز میں پوچھا "کیا پروگرام تھا؟ آج مس نسیم کے یہاں بڑی دیر کر دی آپ نے؟"
اس نے بغیر کوئی جواب دیئے ایک زناٹے کا ہاتھ رسید کر دیا۔ اور نفرت کے انتہائی شدید جذبات کے ساتھ اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ ہاتھ کی گرمی کے ساتھ ہی اس کی زبان بھی گرم ہو گئی اور ایک گندی گالی اس کے ہونٹوں پر آ کر رک گئی۔ اور گندگی کے اس تصور کے ساتھ ہی اس کا خیال غلاظتوں کے پاتال میں چلا گیا۔ غصہ کی اس کیفیت میں وہ میونسپل کارپوریشن کے اس انتظام کو نہ بھلا سکا جس کے ذریعہ کارپوریشن نے نہ صرف بھنگیوں کی روزی کا بلکہ ان کی رہائش کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ ایک دن وہ بحیثیت افسر اعلیٰ ان مقامات کا معائنہ کرنے نکلا تھا تو بستی میں بھنگیوں کو کھانا کھاتے دیکھ کر گندگی و غلاظت کا تصور اس کے لئے انتہائی شدید ہو کر رہ گیا تھا۔ کارپوریشن نے ان بھنگیوں کے ذریعہ غذا اور غلاظت کے فرق کو بڑی آسانی سے مٹا کر رکھ دیا تھا۔ اسے اس وقت بڑے زور کی ابکائی آئی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ جہنم میں بھی شاید اس انداز میں پیٹ کی آگ نہ بجھتی ہوگی۔ اس کے بعد سے اس معائنہ کا خیال بھی اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ اور اب جب گالی سے گندگی کا شدید تصور ٹکرایا تو اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور روتی بسورتی آمنہ کو روکنے کی کوشش نہ کی جو سسک سسک کر نوکر سے سامان سٹیشن لے چلنے کی بات کہہ رہی تھی۔ نوکر نے بڑی ویران نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس نے زور سے چلا کر کہا "جاؤ میم صاحب کو چھوڑ دو"

آمنہ کے چلے جانے کے بعد اس کی طبیعت بکھرنا شروع ہوئی تھی۔ اور سارا دن اسے طرح طرح کے خیالات تنگ کرتے رہے تھے۔ اس انتشار کی کیفیت میں وہ مسلسل اپنی زندگی کا جائزہ لیتا رہا۔ اور دفتر کا وقت ختم ہوتے ہی تیزی سے کار چلاتا ہوا سیدھا شہر کے ایک خوبصورت سینما میں پہنچ گیا۔ تاکہ موڈ بدل جائے۔ وہاں پہونچا تو ... رکاؤنٹر پر اسے "ہاؤس فل" کی تختی نظر آئی۔ وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بے حد چھکڑ قسم کے آدمی نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی "ٹکٹ منگتا؟ کرن سا چاہئے گا؟" اس سرگوشی کا اس نے الشہار کوئی جواب نہیں دیا۔ اور حقارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آدمی بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا "صاحب نہیں سمجھا غٹ پاتھ بکنگ، فٹ پاتھ بکنگ"

یکایک کوئی خیال بجلی کی مانند اس کے ذہن میں کوندا اور وہ الٹے پاؤں واپس اپنے کار کے پاس آیا۔ اور اتنی ہی سرعت کے ساتھ کار اسٹارٹ کر دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مس نسیم کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ مکان کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اور پھر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ابھی دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے مس نسیم کی سرگوشی ابھری جس کے جواب میں ایک کرخت مردانہ آواز سنائی دی۔

"تم بالکل بازاری عورتوں کی طرح بھاؤ تاؤ کرنے لگی ہو آج کل" آواز ایک لمحے کے لئے رک گئی جیسے کوئی اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو "مگر یاد رکھو یہ ٹھاٹ باٹ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتے" آواز میں زیادہ سختی اور تنفر پیدا ہو گیا تھا۔

"ذرا ... میرا باس سیکریٹری بن جائے تو پھر دیکھنا!"
مس نسیم کے اس انکشاف پر اس کا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ جیسے اسے برقی رو چھو گئی ہو۔ اور دوسرے لمحے اسے یوں محسوس ہوا جیسے شہر کی ساری بازاری عورتیں فٹ پاتھ پر برہنہ اور فحش رقص کے ذریعہ گاہکوں سے سودے میں مصروف ہوں اور ساری گلیاں ان سے بھر گئی ہوں اور پھر آہستہ سے سینما کا وہ چھکڑ آدمی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "صاحب نہیں سمجھا فٹ پاتھ بکنگ"

وہ کس طرح کب گھر پہونچا اس کا احساس تک اسے نہ ہوسکا وہ ڈرائنگ روم میں گیا ایک کاغذ نکالا اور کچھ لکھنے لگا پھر اس نے اطمینان کے ساتھ اسے دوبارہ پڑھا اور بڑی پیاری نرم آواز میں نوکر کو بلایا "جلدی یہ ٹیلی گرام ابھی دے آؤ" کاغذ نوکر کے ہاتھ میں تھمانے سے پہلے ایک بار اور اس نے تار کی عبارت پڑھی "پیاری آمنہ، چلی آؤ" اور پھر اسی پلنگ پر اس طرح ڈھیر ہو گیا۔ جیسے برسوں کی تھکن دور کر رہا ہو۔

جمیلہ زبیری

درد نہ جانے کوئی

> اسے آج معلوم ہوا کہ
> وہ نعیم سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی شکل بہت
> بھدی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔
> لیکن اتنے عرصہ وہ اس نفرت سے کیوں
> آگاہ نہیں ہوئی ــ کیوں وہ اس درجہ نعیم
> کے لئے بے قرار رہتی تھی، اور اس کی موجودگی میں
> وہ کیوں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتی تھی ــ؟

وہ مہمانوں کو چھوڑ کر اندر چلی گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ اس کے شوہر کو اس موقعہ پر اس کا رونا بہت ناگوار گزرا۔ اور وہ ناک بھوں چڑھا کر گھر سے باہر چلا گیا۔ اس کے لڑکے کا عقیقہ تھا اور وہ بھی پہلوٹی کا لڑکا۔ یہ تو بڑی خوشی کا موقع تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد اس نے لڑکے کا نام پرویز تجویز کیا تھا۔ لیکن جونہی اس نے اپنی بیوی کو مجوزہ نام بتایا۔ پہلے تو وہ ایک دم سے چونکی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن وہ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا پہلے بھی مختلف نام تجویز کئے گئے تھے۔ مگر نعیم نے آج سے پہلے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

شمسہ رو رہی تھی۔ اسے اچانک شاہد یاد آگیا جس نے آج سے دو سال پہلے اس سے ایک بار ہنسی ہنسی میں کہا تھا۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی۔ اور تمہارے لڑکا پیدا ہو تو تم اس کا نام عبد الاول رکھنا۔ کیا بھونڈا سا نام تھا۔ اور یہ نام بتا کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا تھا اور اس وقت اس کے خوبصورت دانت شمسہ کو کتنے اچھے معلوم ہوئے تھے سفید چمکدار موتی کی لڑی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ شاہد کا خیال اپنے دل سے نکال دے مگر وہ جسقدر کوشش کرتی رہی اسے پچھلے دنوں کی ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ حالانکہ جس دن سے اس کی شادی ہوئی تھی اس دن سے آج تک اس نے شاہد کے متعلق کبھی بھی نہ سوچا تھا۔ اور اس خیال سے اسے اور بھی دکھ ہونے لگا کہ شاہد جواب سے کچھ دنوں پہلے اسے جان سے زیادہ عزیز تھا اس سے اتنا نزدیک تھا وہ جس کے تصور میں گھنٹوں کھوئی رہتی تھی جو مدتوں اس کے خیالات کا مرکز بنا رہتا تھا اس کے ذہن سے کیوں یکسر محو ہوگیا تھا۔ شادی کے دن وہ آنسوؤں کا ایک طوفان لے کر اس سے آخری دفعہ ملا تھا اور اس نے صرف اتنا کہا تھا "تم جا رہی ہو مجھے اکیلا چھوڑ کر"۔ لیکن اس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اور خاموش سوچ کر گھر دن جھکا لی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ شاہد سے علیحدہ ہو کر چند دن بھی مشکل سے زندہ رہ سکے گی۔ مگر شوہر کے گھر آنے کے بعد اس کے سارے خیالات بدل گئے۔ وہ شمسہ شمسہ ہی نہ رہی اس کا خیال تھا کہ جب وہ اپنے کو ایک ایسے انسان کے سپرد کرے گی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تو اس کا ذہن ماؤف ہو جائے گا وہ پاگل ہو جائے گی یا اس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ مگر سب کچھ اس کے برعکس ہوا نعیم نے جیسے اس پر جادو کر دیا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ وہ شرمائی شرمائی نعیم کی آغوش میں چلی گئی اور پھر اسے احساس ہوا کہ زندگی آنسوؤں سے عبارت نہیں ہے۔ زندگی تو بے انتہا حسین ہے اور ازدواجی زندگی، زندگی کی تکمیل کا نام ہے۔

اس کے شوہر نے اس کی زندگی میں داخل ہو کر اس کے

سو نے جتے تے احساسات اور جذبات کو برانگیختہ کر دیا۔ اسے اور کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ وہ یہ سوچ سکے کہ یہ وہی شمسہ ہے جس کے لئے شاہد نے اپنی دنیا تج دی تھی جس نے اس سے ملنے کے بعد سوائے شمسہ کے اور کچھ سوچا ہی نہیں تھا اور اسے اپنی نئی زندگی میں یہ کبھی یاد نہیں آیا کہ اس نے شاہد سے کتنے وعدے کئے تھے اور پھر وہ ان سب وعدوں کو بھلا کر اسے اکیلا بہت دور چھوڑ آئی۔ اس کے ذہن سے تو دوری کا احساس بھی مٹ گیا تھا۔ اور اس کی محبت کی چتا خود اس کے جسم کی آگ پر جل گئی۔ کہاں اسے شاہد کے تصور میں رات رات بھر نیند نہیں آتی تھی شاہد کے چمکیلے دانتوں کی چمک ہر لحظہ اس کے ذہن میں موجود رہتی تھی اور کہاں دو سال سے ایک لمحہ کے لئے بھی شاہد کا خیال اس کے ذہن میں نہیں آیا یہ چیز ارادی تھی یا غیر ارادی اس نے کبھی یہ تک جاننے کی کوشش نہ کی۔ اور آج یکایک نہ جانے کہاں سے آنسوؤں کا طوفان امنڈ آیا تھا۔ مگر اب سے پہلے کبھی ایسا کیوں نہیں ہوا۔ آج ہی اسے بھولی بسری ہوئی باتیں کیوں یاد آنے لگیں۔؟

شاہد اس کے چلے آنے کے بعد سے کس طرح زندگی بسر کر رہا تھا اس نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہ کی۔ جب وہ شاہد کو اکیلا چھوڑ کر چلی آئی تو اس پر کیا بیتی اس نے کبھی سوچنے کی کوشش نہ کی وہ اتنے دن صرف نعیم میں کھوئی رہی۔ جب نعیم اور وہ تنہا ہوتے تو اسے خود بخود اپنی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک محسوس ہونے لگتی۔

وہ ہمہ وقت نعیم کے ساتھ تنہا رہنا چاہتی تھی۔ اور اگر کبھی اس کی تنہائی میں نعیم کی بہن مخل ہو جاتی تو اسے بہت برا لگتا اور اس کی طبیعت میں ایک عجیب اکتاہٹ پیدا ہو جاتی۔

وقت گزرتا گیا اور آہستہ آہستہ شمسہ کو اپنے ان جذبات میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ اور ایک معصوم خوبصورت بچے کا تصور اس کے ذہن پر چھا گیا۔

وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ نعیم کے لئے کیوں اس حد تک بےقرار رہتی تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ کیوں دنیا و مافیہا سے بےنیاز ہو جاتی تھی۔ مگر اسے آج معلوم ہوا کہ وہ نعیم سے نفرت کرتی

لگی ہے

ہے۔ نعیم کی شکل بہت بھدی ہے اس کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ لیکن اتنے عرصے تک یہ بات اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ لیکن دل و دماغ دونوں اس بات کا جواب دینے سے قاصر تھے۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنے عرصے اپنی اس نفرت سے آگاہ کیوں نہیں تھی وہ نعیم میں اسقدر کیوں محو رہتی تھی شاید اس لئے کہ اس کے دل میں ماں بننے کی زبردست خواہش تھی جس سے وہ اتنے عرصے بے خبر رہی تھی اور نعیم اس خواہش کی تکمیل کا ذریعہ تھا۔ اسے اب بھی شاہد سے اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی۔ مگر اس کا احساس اسے آج ہو رہا تھا جب وہ ماں بن چکی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ شمسہ ہونے کے علاوہ ایک عورت بھی تھی اور اس کے دل میں جتنی خواہشیں پوشیدہ تھیں اس میں سب سے زبردست ماں بننے کی خواہش تھی اور شادی کی پہلی ہی رات کو یہ خیال اس کی سطح ذہن پر آ چکا تھا مگر اس سے وہ اس وقت تک واقف نہ ہوئی تھی جب تک اس کا سڈول اور خوبصورت جسم جس کی تعریف اکثر لوگوں نے کی تھی رفتہ رفتہ بدڈول نہ ہو گیا۔ اور اس کے پاؤں بھاری نہ ہو گئے۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے" زہرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ تمہارے رونے سے نعیم کو کسقدر دکھ ہوگا۔ تم نے اس کا خیال بھی نہیں کیا۔ آخر میں پوچھتی ہوں اس خوشی کے موقع پر تمہیں اسقدر رونا کیوں چلا آ رہا ہے"

"کچھ نہیں آپ جایئے میں ابھی آتی ہوں" اس نے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ عورتوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی مگر کوئی اس کے رونے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

عقیقہ کی رسم ختم ہو گئی مہمان رخصت ہو گئے مگر شمسہ کی زندگی میں انقلاب آ چکا تھا۔ کچھ اس قسم کا جیسا شادی کے روز شادی سے پہلے ہوا تھا۔ وہ دن بدن اپنے شوہر سے دور ہوتی گئی اور بچے سے نزدیک تر وہ ایک لمحہ بھی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ کسی دوسرے کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔

جیسے اسے ڈر لگتا ہو کہ کوئی اسے لے کر بھاگ نہ جائے۔ اسے نعیم سے نفرت ہو چلی تھی اس کا بات کرنا بھی اسے برا لگتا تھا۔ نعیم اس چیز کو شدت سے محسوس کر رہا تھا مگر وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا وہ تو بیچارہ سیدھا سادہ آدمی تھا اسے کیا معلوم تھا کہ عورت اس وقت تک سب کچھ ہو سکتی ہے جب تک وہ ماں نہ بنے۔ بہن ہو سکتی ہے۔ محبوب ہو سکتی ہے۔ دوست ہو سکتی ہے۔ بیوی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب وہ ماں بن جاتی ہے تو وہ صرف ماں ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔

اور شمسہ اب صرف ماں تھی۔ نعیم سے اسے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر اختلاف ہوتا رہا۔ رائی کے پہاڑ بنتے چلے گئے۔ شمسہ کے دل میں جیسے نفرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ وہ نعیم کی صورت سے بیزار تھی۔ بات کرنا تو درکنار وہ نعیم کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نعیم نے سمجھایا۔ منایا خوشامدیں کیں مگر شمسہ نے تو جیسے کان بند کر لئے تھے۔ نعیم کو اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے لپکتے نظر آتے تھے۔ عزیز و اقارب دوست احباب سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ نعیم کے لئے زندگی ایک دہکتا ہوا آتشکدہ بن گئی تھی۔ اسے شمسہ اس مادہ بچھو کی طرح نظر آنے لگی تھی جو بچے ہونے کے بعد نر بچھو کو مار کر کھا جاتی ہے اور اپنے بچوں کو پیٹھ پر سوار کر کے کہیں دور چلی جاتی ہے۔ اور پھر ایک اداس دوپہر کو خاندان کے رشتہ داروں کی موجودگی میں نعیم نے شمسہ کو ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔ شمسہ کے لئے یہ فیصلہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے دنیا دکھاوے کے لئے بھی ایک اظہار افسوس نہیں کیا۔ اور اس طرح اپنے گھر چلی گئی جیسے اس کے لئے کوئی خاص بات نہ ہو۔ ماں کے آنسو اور باپ بھائیوں کے افسردہ چہرے اسے ذرا بھی متاثر نہ کر سکے۔ اس رات وہ خواب میں شاہد کو دیکھتی رہی اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد یہ خوشخبری شاہد کو سنا دے۔ دو چار دن تو وہ خاموش رہی۔ مگر اس حادثہ کے پانچویں دن جب اس نے ماں سے شاہد کی بہن کے ہاں جانے کی اجازت طلب کی تو ماں نے تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

"کس کے پاس جاؤ گی۔ وہ لوگ تو لاہور گئے ہوئے ہیں۔ شاہد کی دلہن کے ہاں بچہ ہونے والا ہے"

شمسہ کے کانوں میں جیسے کسی نے سیسہ پگھلا دیا۔

اور اسی وقت ماں نے نعیم کا کارڈ لا کر اسے دے دیا جو ڈاک سے آیا تھا۔ کارڈ پر نعیم کی تحریر دیکھ کر اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لئے اور اپنے دل پر جبر کر کے خط پڑھا۔ جب وہ اس فقرہ پر پہنچی "قانون کے مطابق ابھی پرویز کو تم چند سال رکھ سکتی ہو۔ اس کے بعد تو وہ میرے پاس آجائے گا اس دوران پرویز کی پرورش کے لئے ایک مناسب رقم تم کو ہر ماہ پابندی سے ملتی رہے گی۔"

شمسہ اس کے بعد ایک لفظ نہ پڑھ سکی۔ وہ سوچنے لگی۔ کیا اس کی گود سونی ہو جائے گی کیا نعیم اس سے پرویز کو چھین لے گا؟ وہ زور سے چیخی۔

نہیں نہیں پرویز میرا ہے۔ اسے کوئی نہیں چھین سکتا کوئی نہیں ––

ماں جلدی سے اس کے قریب آئی۔ مگر اس کی چیخیں بند ہو چکی تھی اور وہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

الشعاع

سفارش

جن دنوں جگر صاحب کو شراب سے بڑی محبت تھی۔ دہلی میں ایک صاحب نے ان کی بار بار دعوتیں کیں، ہفتوں کھلاتے پلاتے رہے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی بزنس کے سلسلہ میں ان سے کوئی سفارش کرانا چاہتے تھے۔ جگر صاحب فوراً سفارش کرنے پر تیار ہو گئے اس روز انھوں نے صبح ہی سے ڈٹ کر پینی شروع کی۔ بارہ بجے کے قریب تانگہ میں سوار ہو کر وہ افسر اعلیٰ کے یہاں جاتے ہوئے جب چاندنی چوک سے گزر رہے تھے تو انھوں نے تانگہ والے سے تانگہ روکنے کو کہا۔ تانگہ رکا تو وہ تانگے کی سیٹ پر کھڑے ہو گئے اور اشتہاری حکیموں کی طرح پکار پکار کر کہنے لگے "اے لوگو! یہ شخص مجھے ہفتہ بھر تک اسلئے شراب پلاتا رہا کہ میں فلاں افسر سے اسکی سفارش کر دوں۔ وغیرہ ....!"۔ تقریر ختم کر کے .. جگر صاحب اپنے میزبان کی طرف پلٹے تو اس نے انکے پاؤں پکڑ رکھے تھے اور کہتا جا رہا تھا نہیں نہیں مجھے سفارش کی ضرورت نہیں مجھے معاف کر دیجیے جگر صاحب

تلخیص و ترجمہ:- احمد صغیر صدیقی

پراسرار کہانی

بوتھ نمبر

ایک سات چار گیارہ

یہ رات بھی جاڑوں کی دوسری راتوں ہی کی مانند سرد اور تاریک تھی۔ ٹیلیفون ہاؤس کی طویل عمارت کے اندر واقع ایکسچینج روم میں البتہ برقی راڈ گرمی پیدا کئے ہوئے تھے۔ سوئچ بورڈ پر اس وقت کلرک چارلی کی ڈیوٹی تھی۔ اس طویل اور اکتا دینے والی ڈیوٹی کو ختم ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ وہ مسلسل دو گھنٹے سے بور ہو رہا تھا۔ اس طویل اور سرد رات میں شاذ ہی رات کو کوئی کال ملتی تھی۔ لہٰذا مشغولیت کا سوال ہی نہ تھا۔ چارلی نے وقت گزاری کے لئے جیسے تیسے سگریٹ سلگایا ہوگا کہ سوئچ بورڈ پر روشنی کی لکیر ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سگریٹ ایک جانب ڈالتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹکٹ پیڈ اٹھایا۔ روشنی کے نیچے والے نمبر کو نوٹ کیا۔ ٹائم ڈالا۔ گیارہ پینتالیس۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ سے سامنے کے سوراخ میں جیک کو ڈالتے ہوئے اسپیکنگ کی گھنڈی سے لگا لیا۔ "فرمایئے۔"

جواب میں اسے کسی کی ہلکی سی سسکی سنائی دی۔ کسی نے آہستہ سے کہا

"خدا کے لئے"

التجا ئیہ

— عورت کی تھرتھراتی آواز سنائی دی۔

آپریٹر — آپریٹر! وہ بلا بوتھ کے اوپر چڑھ رہی ہے — وہ ہوا دان کے ذریعہ اندر آنے کی کوشش کر رہی ہے — پھر عورت نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ میرے خدا! وہ اندر گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اپنا بیگ اس پر دے مارا تھا۔ بلب ٹوٹ چکا ہے۔ اب بوتھ کے اندر اور باہر گہرا اندھیرا ہے۔

"کیا — ؟" کچھ نہ سمجھتے ہوئے جھلا کر چارلی نے سوال کیا۔ "کیا" کونسا نمبر چاہئے آپ کو"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔"

"پھر — ؟" اس نے جھلا کر پوچھا۔ "کیا پولیس کو بلاؤں؟"

"ہاں" غیر متوقع طور پر دوسری جانب سے کسی نے کہا۔ اس بار آواز صاف تھی۔

"ہاں کسی کو بھی بلا دیجئے۔" وہ یقیناً کسی عورت کی آواز تھی

اور — اور"

ادھر پھر ایک ہلکی سی سسکی سی گونجی۔ "سلسلہ نہ کاٹئے۔ خدا کے لئے"

"کیا بات ہے؟" چارلی نے عورت کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں — میں بوتھ میں بند ہوں۔ باہر نہیں جا سکتی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں"

"لیکن کیوں" چارلی وحشت زدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"باہر کوئی موجود ہے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے ادھر آیا ہے۔

میں بھاگ کر بوتھ میں آگھسی ہوں۔ پھر، سوچ کر میں نے ٹیلیفون ایکسچینج کو رنگ کر دیا تھا۔"

وہ رک کر سوچنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اسے چپ محسوس کر کے ادھر سے عورت نے اسے پھر پکارا "ہیلو" آواز سے خوف صاف طور پر عیاں تھا۔

"فکر نہ کریں۔ میں موجود ہوں" اس نے اسے دلاسا دیا۔

اس نے اپنے ساتھی آپریٹر کی سمت میں دیکھا پھر کچھ سوچ کر سپروائزر کو بلانے والی گھنٹی بجا دی۔ دوسرے لمحے سپروائزر اپنے کمرے سے برآمد ہو گیا اس کے ہاتھ میں چائے کا پیالا تھا۔

"کیا بات ہے؟" جھلاہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"جناب کوئی عورت ہے۔ وہ کسی بوتھ میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے"

سپروائزر نے ٹائم چیک کرتے ہوئے کہا "گیارہ بج پاس "کون سے بوتھ میں ہے وہ؟"

"غالباً ڈاک یارڈ کی سمت والے بوتھ سے وہ بول رہی ہے"

"کمال ہے" سپروائزر نے کہا۔ "اتنی رات گئے وہ اُدھر کیا کر رہی ہے۔ ٹھیرو میں اس سے بات کرتا ہوں" اس نے ہاتھ بڑھا کر رسیور لے لیا۔

"ہیلو۔ کیا آپ کو پولیس کا نمبر دیا جائے"؟

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ مجھے مدد چاہئے۔ فوری مدد۔ وہ باہر میرا منتظر ہے"

"کون ہے وہ"

"پتا نہیں۔ وہ ایک کالی سی شے ہے۔ پانی میں بھیگی ہوئی سیاہ شے۔ وہ بوتھ کے دروازہ پر بیٹھی ہوئی ہے"

"ممکن ہے کہ وہ کوئی کتا ہو؟"

"پتا نہیں۔ باہر بے حد اندھیرا ہے۔ میں اسے نہیں دیکھ سکتی"

"کمال ہے" الجھتے ہوئے سپروائزر نے پوچھا "جب آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو آپ وثوق کے ساتھ کیوں کہہ رہی ہیں کہ کوئی باہر موجود ہے؟"

"نہیں باہر وہ موجود ہے۔ میں نے ابھی دروازہ کو دھکا دے کر دیکھا تھا۔ وہ ذرا نہیں ہلا۔ وہ ضرور اس سے لگا ہوا لیٹا ہوا ہے"

اس بار سپروائزر کو یقین سا ہو گیا کہ وہ ضرور کتا ہی ہوگا۔ بولتے ہوئے اسے تنبیہ کی "دیکھئے میں پولیس کو رنگ کرنے جا رہا ہوں۔ آپ اندر ہی ٹھیریں۔ جلد ہی مدد پہنچ جائے گی"

دوسرے فون پر اس نے پولیس سے رابطہ قائم کرتے ہوئے کہا "میں ایکسچینج سپروائزر بول رہا ہوں۔ ایک عورت کولڈ واٹر لین کے ٹیلیفون بوتھ میں موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی شے دروازے کے باہر اس کی منتظر ہے۔ وہ خوفزدہ ہے۔ برائے کرم اس کی مدد کی جائے"

رک کر اس نے چارلی سے پوچھا جو "اسپیکنگ کا" پر جھکا ہوا تھا "کیا وہ اب بھی وہاں موجود ہے۔؟"

"جی ہاں" ماؤتھ پیس کو ڈھانپتے ہوئے چارلی نے بتایا۔ "وہ رو رہی ہے"

"شاید اس نے پی رکھی ہے" سپروائزر نے تبصرہ کیا "ورنہ عورت کا رات میں اُدھر کیا کام۔ کوئی آوارہ عورت ہوگی"

"یقیناً" چارلی الرٹ ہوتے ہوئے بولا۔ "کہتے کہتے میں سن رہا ہوں" تو اسے آواز سنائی دے رہی تھی "میں نے ابھی ماچس جلا کر ابھی شیشے میں سے جھانکا تھا۔ وہ اب بھی موجود ہے۔ میرے خدا لیٹے ہونے پر بھی اس کا جسم شیشے کے سرے سے ٹکراتا ہوا ہے"

"اس کی شکل کیسی ہے"

"کچھ پتا نہیں چلتا۔ بس سیاہ اور چمکدار سی شے ہے کچھ"

"آپ گھبرائیں نہیں۔ پولیس پہنچا ہی چاہتی ہوگی" ۔ اس نے صاف سنا۔ دوسری جانب وہ زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی۔

اسی لمحہ سپروائزر نے پھر رسیور چارلی کے ہاتھوں سے لیا۔ اب وہ عورت کی سسکیاں اور رونے کی آواز صاف سن رہا تھا۔ یکایک عورت نے چیخ کے سے لہجے میں کہا "

"او میرے خدا۔ وہ دروازے کو دھکا دے رہا ہے"

"کچھ حرج نہیں" سپروائزر نے دلاسا دیا۔ "دروازہ باہر کی جانب کھلتا ہے"

"تم نہیں سمجھے" عورت نے وضاحت کی۔ اس کے وزن سے
پورا بوتھ ہل رہا ہے۔ آخر پولیس ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔"
"انہیں اطلاع دی جا چکی ہے" سپروائزر نے پھر بتلایا۔
اس نے مزید احتیاط کے طور پر چارلی سے کہا کہ وہ پولیس پھر
رنگ کر کے پوچھے۔ چند ہی لمحوں میں جواب مل گیا۔ پولیس اس بوتھ
کی جانب روانہ ہو چکی تھی۔ یکایک سوئچ بورڈ پر ایک اور روشنی ابھری
"ہیلو کون ہے؟" چارلی نے "اسپیکنگ کی" سنبھالتے ہوئے
پوچھا۔
"پولیس انسپکٹر"
"کہئے کیا خبر ہے"
"بوتھ تو بالکل خالی پڑا ہے"
"ایک منٹ ٹھہریئے"
چارلی نے سپروائزر کو ساری بات بتلا دی۔ "کمال ہے —
خیر" سپروائزر نے کہا۔ "تم بوتھ کا نمبر چیک کرو۔"
"ون - سیون فور الیون" چارلی نے نمبر چیک کرتے ہوئے کہا۔
"پتا تلاش کرو"
چارلی نے ڈائریکٹری کھولتے ہوئے بتایا۔ "مقابل کولڈ
واٹر لین"
"ٹھیک ہے —" اس نے ایک فالتو جیک نمبر ہول میں ڈال کر
"سننے والی کی" کا بٹن دبا دیا۔ عورت اپنے بارے میں کچھ بتا رہی تھی۔
سپروائزر نے پھر دونوں کینز کو کھول کر فوراً ہی بند کر دیا۔
"سن رہے ہیں آپ" اس نے پولیس انسپکٹر سے کہا — "وہ
اب تک وہاں موجود ہے۔ جیسا کہ اس کی آواز سے ظاہر ہے"
"ٹھیک ہے" اُدھر سے انسپکٹر نے جواباً کہا۔ "مگر ہم بھی تو
یہیں سے بول رہے ہیں —!!"
معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نوعیت ہی کچھ ایسی
تھی کہ دوسرے روم کے کلرک بھی ایک ایک کر کے چارلی کے کمرے میں
آنے لگے۔ اب وہاں اچھا خاصہ مجمع ہو چکا تھا۔ سپروائزر سیلیری
نے چارلی کو وہیں رکے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھا اور اپنے
اشتعال

کمرے میں جاکر اس نے ڈیوٹی انچارج کو بلانے کے لئے آدمی بھیج دیا۔
انجینئر کے آنے پر اس نے بتایا۔ "دیکھئے معلوم ہوتا ہے
لائنوں میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ یہیں بوتھ نمبر چودہ سات سو گیارہ
سے کال آ رہی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل بولنے والی
کہیں اور سے بول رہی ہے۔ کیونکہ پولیس کا بیان ہے کہ بوتھ خالی
پڑا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا چکر ہے"
پھر اس نے چارلی کو حکم بھیجتے ہوئے کہا "اس سے کہو کہ وہ
عورت سے رابطہ قائم رکھے۔ انجینئر روٹین چیک کر رہا ہے"
چارلی ہی کیا ہر آپریٹر اپنی اپنی "بسنگ کی" استعمال میں
لاتے ہوئے اس وقت اس عجیب و غریب کال کو سننے میں مشغول تھا۔
وہ آواز پھر ابھری — "دیکھئے۔ دیکھئے وہ بلا اندر آنے کی
کوشش کر رہی ہے"
"گھبرائیے مت — دروازہ بند رکھئے" چارلی نے مشورہ
دیا — "وہ اندر نہیں آسکتی"
مگر وہ دروازے کی درز کے ذریعہ گھسنے کی کوشش کر رہی
ہے — میں نے ابھی ایک تیلی جلا کر دیکھا تھا۔ تبھی وہ پھر پیچھے ہٹ
گئی ہے — وہ بالکل بھورے رنگ کی کیچڑ کی مانند کوئی شے ہے۔
بھیگی بھیگی سی لجلجی سی۔ میرے خدا" عورت بولتے بولتے
گھگھیانے سی لگی۔
"غالباً وہ روشنی سے ڈرتی ہے" چارلی نے اپنی عقل
استعمال کرتے ہوئے کہا — اپنی تیلیاں زیادہ نہ صرف کریں۔ ممکن
ہے بعد میں کام آئیں"
"اچھی بات ہے۔ مگر آپ لوگ میرے لئے کیا کر رہے ہیں"
عورت نے دوبارہ پوچھا۔
"ہم ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اس نمبر پر پولیس
روانہ کر دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے لائن میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔
بہرحال ہمارا انجینئر چیک کر رہا ہے۔ ویسے آپ بتائیے آپ کس جگہ سے
بول رہی ہیں۔ مکمل بتا دیں۔"
آواز نے جواباً کہا۔ "میں کولڈ واٹر لین میں واقع بوتھ

سے بول رہی ہوں۔

اسی لمحہ انجینئر اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔

"ہم نے "سلیکٹر" وغیرہ سبھی کچھ چیک کر لیا ہے۔ ہر چیز ٹھیک ہے" اس نے رپورٹ دی۔

"ٹھیک ہے" سپروائزر سیلوی نے ایک بار پھر فون کو تھاما اور پولیس سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ "انسپکٹر" بولتے ہوئے اس نے ہدایت کی۔ ہو سکے تو آپ یہاں خود ہی آجائیں"

پانچ منٹ بعد انسپکٹر کی کار ایکسچینج بلڈنگ کے سامنے آ کر رکی۔ کمرے میں داخل ہو کر انسپکٹر نے سپروائزر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"بھئی کمال ہے۔ میں نے اس بوتھ کو اچھی طرح چیک کر لیا ہے۔ وہاں چڑیا کا بچہ تک موجود نہیں ہے۔ کیا وہ عورت اب بھی بول رہی ہے؟"

"جی ہاں"

"اس نے بتایا نہیں کہ وہ اتنی رات میں اُدھر کیا کر رہی تھی"؟

"وہ۔ وہ کہتی ہے کہ اپنے ایک دوست سے مل کر واپس ہو رہی تھی۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے گلی کا پتا بھی بتایا ہے۔ یہ وہی گلی ہے جس میں ہمارا بوتھ نمبر ون۔ فور۔ سیون۔ الیون واقع ہے۔

ٹھیک ہے اس سے پوچھو اسے کب پتا چلا کہ کوئی شئے اس کے پیچھے ہے؟

چارلی نے تعمیل کی۔ جواباً عورت کی آواز گونجی "میں واپس لوٹ رہی تھی۔ اس جگہ بے حد تاریکی تھی۔ میں نے سنا جیسے کوئی شئے میرے پیچھے "شپ شپ" کی سی آواز نکالتی دوڑ رہی ہو۔ میں نے رفتار تیز کر دی تو اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ پھر میں دوڑنے لگی۔ کونے پر مجھے بوتھ نظر آیا اور میں اس میں گھس آئی۔ میں نے "آپریٹر کے لئے "او" کا حرف ڈائل کیا۔ اور تب سے میرا تم سے رابطہ قائم ہے"

تبھی جیسے کوئی کھٹکا سا ہوا۔ چارلی نے صاف سنا۔ پھر اسے عورت کی تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "آپریٹر۔ آپریٹر

اشتہار ع

وہ بوتھ کے اوپر چڑھ رہی ہے۔ وہ ہوا دان کے ذریعے اندر آنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پھر یکایک سناٹا چھا گیا۔ کوئی شئے کسی جانب زور سے ٹکرائی۔ اور پھر خاموشی۔

"ہیلو۔ ہیلو" چارلی نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایک سکنڈ۔ دو سکنڈ!

"ہیلو" یکایک چارلی نے اس کی آواز پھر سنی "آپریٹر میں نے بوتھ میں لگے ہوئے بلب کو توڑ دیا ہے۔ میرے خدا۔ وہ اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ اس پر دے مارا تھا بلب ٹوٹ چکا ہے۔ اور اب بوتھ کے اندر گہرا اندھیرا ہے"

"فکر نہ کرو۔ ہم میں سے جلد ہی کوئی تم تک پہنچ جائے گا"

"مگر اب تو مجھے یہاں پورے تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ کچھ کرو آپریٹر"

چارلی نے مڑ کر انسپکٹر کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر سخت قسم کی حیرت جھلک رہی تھی۔

مڑ کر انسپکٹر نے اپنے قریب کھڑے سرجنٹ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم اسی بوتھ کو دیکھ کر آتے تھے جس سے یہ عورت بول رہی ہے"

"یقیناً جناب۔ میرے دوسرے ساتھیوں سے پوچھ لیجئے" سرجنٹ نے الرٹ ہوتے ہوئے کہا۔

"مسٹر انجینئر آپ ایک بار لائن پھر چیک کریں"

"میں نے دوبارہ چیک کر لی ہے جناب"۔ انجینئر روبن نے بھنا کر کہا

"خیر"۔ انسپکٹر بھی کچھ کم جھلایا ہوا نہ تھا۔ اس نے سرجنٹ کی جانب مڑتے ہوئے کہا "تم پھر جاؤ۔ اپنے ساتھ زیادہ آدمی لے لو اور اس بوتھ کے ارد گرد ہی ٹھہرو۔ میں تم سے ریڈیو فون پر رابطہ قائم کرتا ہوں"

"بہتر ہے" سرجنٹ نے سلیوٹ کیا اور واپس ہو گیا۔

"اب کی اسے ضرور تلاش کر لیا جائے گا" انسپکٹر نے ماتھے پر

آیا مجھا پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔ "کیا وہ اب بھی بول رہی ہے"۔
چارلی نے رسیور اس کی جانب بڑھا دیا۔ انسپکٹر نے سنا
عورت کہہ رہی تھی۔
" آپ برڑ وہ بلا بوتھ کے اردگرد چکر لگا رہی ہے۔ بالکل کسی
بھیگے ہوئے اخبار کی مانند اس نے بوتھ کو لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔"
اسی وقت سامنے بورڈ پر ریڈیو فون کا نمبر روشن ہو گیا۔
انسپکٹر نے عورت کو چارلی کے سپرد کر کے ریڈیو کال ریسیو کرنی شروع کر دی
سرجنٹ اپنی رپورٹ دے رہا تھا۔ جناب ہم نے اس بوتھ کو چاروں
طرف سے گھیر رکھا ہے۔ وہ اندر سے بالکل خالی ہے۔"
اس لمحہ چارلی کو یوں محسوس ہوا جیسے اندر بے حد سردی
ہو گئی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے برقی راڈ گرمی خارج کرنے کے بجائے سرد
ہوا پھینکنے لگی ہوں۔ اس کے دماغ میں لمحہ بہ لمحہ ایک خیال جڑ پکڑتا
جا رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ میرے خدا۔ تو کیا یہ عورت کسی اور دنیا
سے بول رہی ہے۔ پھر آواز سے بولتے ہوئے اس نے انسپکٹر کو
مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
میں آسیب وغیرہ کا قائل تو نہیں لیکن مجھے اس بار تو
کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے یہ کوئی آسیبی چکر ہے۔
" ہوں۔" انسپکٹر نے پرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
سمجھ میں نہیں آتا کیا چکر ہے؟ "
اسی وقت چند لمحوں کے تعطل سے چارلی کے کانوں سے اس
عورت کی آواز پھر ٹکرائی۔
" تم جھوٹ بول رہے ہو۔ آخر پولیس ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔
وہ اب بھی باہر موجود ہے۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ مجھے بچاؤ۔" ایک بار
پھر سسکیوں میں اس کی آواز جیسے ڈوبتی چلی گئی۔
" وہ وہاں پہنچ چکے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔"
پھر اگر وہ پہنچ چکے ہیں تو اسے ہٹاتے کیوں نہیں۔ مجھے تو
یہاں ایک بھی آدمی نظر نہیں آ رہا ہے۔"
مجبوراً سچائی سے کام لیتے ہوئے چارلی نے کہا۔ "وہ کہہ رہے
ہیں بوتھ خالی پڑا ہے۔"

الشجاع

" آہ۔ تم سمجھ رہے ہو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ تم نہیں
جانتے میں سخت مصیبت میں ہوں۔ میری مدد کرو۔"
" میرا خیال ہے چارلی ہی کا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔" سپر
وائزر سیلونی نے انسپکٹر کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔ یہ عورت یقیناً
کسی اور دنیا سے بول رہی ہے۔ ممکن ہے یہ کسی ایسی عورت کی روح
ہو جو خوف کی موت مری ہو۔"
چارلی نے ان سب کی گفتگو سے یہی اندازہ لگایا کہ وہ سب شاید
اب بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ اس عورت کو مدد پہنچانا اب کسی کے لئے ممکن
نظر نہیں آ رہا تھا۔
اس نے اپنے طور سے عورت کی ہر ممکن مدد کرنے کی ٹھانی۔ ایک
بار پھر اس نے عورت کو مخاطب کیا۔ "ہیلو۔"
" ہیلو۔ میں سن رہی ہوں۔" عورت نے فوراً ہی جواب دیا۔
" اب کیا پوزیشن ہے۔" اس نے پوچھا۔
وہ باہر موجود ہے۔ کسی لمحہ بھی وہ مجھے آ لے گی۔
" نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ سنئے آپ نے پہلے کہا تھا کہ وہ روشنی سے
خوفزدہ ہے آپ تیلی جلاتی رہیں۔ وہ قریب نہیں آ سکے گی۔"
" مگر۔" عورت کی آواز سرگوشی کی مانند گونجی۔ "تیلیاں ختم
ہو رہی ہیں۔ میں کیا کروں۔"
" ٹھیک ہے۔" سوچتے ہوئے چارلی نے مشورہ دیا۔ "بوتھ میں
ڈائریکٹری موجود ہو گی۔ اسے پھاڑ کر آگ دکھا دیں۔"
" لیکن بعد میں کیا ہو گا۔" اس نے پوچھا۔
" پوری بات سن لیں۔" چارلی نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "آگ
جلا کر دروازہ کھول دیں۔ اور پوری قوت سے بھاگ لیجئے۔ مجھے امید ہے
اس طرح آپ بچ جائیں گی۔ اب یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔"
جواب میں دوسری جانب سناٹا سا چھا گیا۔ چارلی نے
وقت دیکھا۔ بارہ بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔
ریسیور کان سے لگائے وہ ایک ایک آواز سننے میں لگ گیا۔
اس عورت سے نہ جانے کیوں وہ بے حد ہمدردی سی محسوس
کرنے لگا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کافی لمحے جا رہے ہوں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

وقار احمد رضوی

اقبال

بہ حیثیت غزل گو

> علامہ اقبال کی غزلیہ شاعری محض حدیثِ شوق ہی نہیں بلکہ اس میں نئی دنیا کی تعمیر کا حوصلہ ہے۔ اُن کے پاس دل پُرسوز اور نگاہ گرم ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں جذبے کو فکر کا درجہ اور فکر کو جذبے کا آب و رنگ بخشا ہے۔

اقبال ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ ناظم کے علاوہ غزل گو کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مگر ان کی غزل گوئی عام سطح سے بلند ہے۔ ان کی غزل ذہنی و جذباتی آسودگی کا سامان فراہم نہیں کرتی۔ اور نہ وہ معاملاتِ حُسن و عشق کا اظہار ہے۔ اقبال کی محفلِ ادب میں غزل ایک فلسفی اور مفکر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اقبال کی غزل محفلوں کو گرماتی ہے اور زندگی میں سوز و ساز پیدا کرتی ہے۔ ان کے اشعار دلوں میں ولولوں کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ اور ان سے امنگوں کی شمعیں فروزاں ہوتی ہیں ان کے افکار کی رعنائی زندگی کے جمود کو توڑتی ہے۔ سکون اور ٹھہراؤ میں جولانی کی بجلیاں دوڑاتی ہے۔

اقبال نے نفسیات انسانی کے اسرار و رموز کو بے نقاب کیا۔ ان کے پاس انسانی زندگی کی شادمانیوں اور اداسیوں کا گہرا شعور ہے۔ وہ زندگی کا مفکرانہ تجزیہ کرتے ہیں اور زندگی کی فلسفیانہ تحلیل پیش کرتے ہیں۔ ان کے مفکرانہ اظہار میں اس دور کے ذہن اور فکر کی تصویر ابھرتی ہے۔ اقبال کی غزل میں قوم کا کردار اس کا مزاج اور اس کا تفکر ہے۔ اقبال نے اپنے نغمات کے میٹھے سُرود سے انسانی قلب کے طلسماتی پیکروں کو نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اور جذباتی زندگی کے حقائق کو تخیلی رمز و ابہام کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔

کچھ نظم کہنے والے بہترین غزل گو ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی نظم کو بہ یک وقت داخلی و خارجی خوبیوں سے سنوارتے ہیں۔ اقبال ایسے ہی شعراء میں سے تھے۔ اقبال سے پہلے غزل نگاروں نے تخیلی اور جذباتی حقیقت پر زور دیا۔ غزل محض معاملات حسن و عشق کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اقبال نے ادراک اور علم کے حقائق کو غزل کے مضامین میں سمویا اور خارجی عالم کی بصیرتوں کو زندگی سے ہم آہنگ کیا۔ آرٹ تخلیق ہے اور سائنس تفہیم۔ اعلیٰ درجہ کا احساس دتا ثر وہ ہے جس میں جماعت شرکت کر سکے۔ ایسی خوشی جو شخصی ہو بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ مگر وہ خوشی جو غیر شخصی اور اجتماعی نوعیت کی ہو زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ اقبال نے اپنی غزلوں سے آرٹ کے اسی نظریہ کی تبلیغ کی۔ وہ فرد اور جماعت دونوں کے تقاضوں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ دوئی اور تضاد کو مٹاتے ہیں۔ فرد اور جماعت کے اسی ارتقاء کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں ؎

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو۔ گل ہے تو گلستاں ہو

اقبال خوش فکر غزل گو اور فلسفی شاعر ہیں۔ ان کا کلام فلسفیانہ حقائق سے معمور ہے۔ ان کا فلسفہ۔ معرفت نفس، احساس خودی اور عمل سے عبارت ہے۔ دوسرے شعراء کی طرح اقبال کی شاعری کا آغاز بھی تغزل سے ہوا۔ اس کا ثبوت اس غزل سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے

پہلی بار لاہور کے ایک مشاعرے میں سُنائی تھی اور جس کے اس شعر کو سن کر مجمع جھوم جھوم گیا تھا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اقبال حزن و یاس کے شاعر نہیں۔ وہ امید و خوشی کے پیامبر ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا زاویہ نگاہ رجائی ہے۔ یہ چیز ان کو معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ طوفان اور آندھیوں سے کھیلتے ہیں تاریکیوں سے گھبراتے نہیں۔ اور مصائب سے مردانہ وار مقابلہ کرنا سکھاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ناکامیاں انسان کی سیرت کو پختہ اور مضبوط بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عملی شاعر ہیں۔ وہ اشیاء کے عملی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی دنیا عمل کی دنیا ہے۔ جس میں خوشی و غم، راحت و یاس سب ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔

اقبال بادہ تصوف کے میخوار ہیں اور فطرت کے گہرے رمز شناس وہ گفتار کے بجائے کردار کے غازی کی تلاش میں ہیں۔ اُن کی غزلیہ شاعری محض حدیثِ شوق ہی نہیں بلکہ اس میں نئی دنیا کی تعمیر کا حوصلہ ہے۔ ان کی مفکرانہ پُرجوش غزل سرائی میں پہاڑوں کا شکوہ، سمندروں کا زیر و بم جلال خسروی، اور خارا شگافی کی شان پائی جاتی ہے۔ اقبال کے پاس دلِ پرسوز اور نگاہِ کرم ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں جذبہ کو فکر کا درجہ اور فکر کو جذبے کا آب و رنگ بخشا ہے۔

اقبال کی غزلوں سے اردو شاعری میں فلسفیانہ بلند آہنگی آئی۔ ان کی غزلیں عالمگیر انسانیت کا خواب پیش کرتی ہیں۔ اقبال کا تخیل بلند ہے۔ ان کی شاعری کا ایک مقصد ہے۔ وہ ہستی کے ثبوت میں حرکت عمل اور پیکار کا فلسفہ سناتے ہیں۔ ان کی غزل کا چراغ کسی پہاڑ کی چوٹی سے خورشید کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ اور ایک عالم کو مطلع انوار بنا دیتا ہے۔

اقبال، داغ کے شاگرد تھے۔ لیکن ان پر داغ کے تغزل کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ ان کی آزاد پسند طبیعت محدود دائروں میں مقید نہیں رہ سکتی تھی۔ ان کی فکر کو بلندی پرواز کی ضرورت تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنی فکر اور عمل کی راہیں، داغ اور غالب سے الگ ہٹ کر استوار کیں۔ اقبال نے غزل کو نیا آہنگ و مزاج دیا۔ جو علامتی اور ایمائی ہے۔ اور

اشباع

اس میں تاثر کا سحر بھی پیدا کیا۔

غالب و اقبال کی عظمت و رفعت میں فرق یہ ہے کہ غالب نے تصوف کو فلسفہ بنا کر پیش کیا۔ اور اقبال کی قوت و جستجو اس چیز پر مرکوز ہے کہ جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے۔ وہ فلسفہ سے انسان کا ساتھی وجود ثابت کرتے ہیں۔

"بانگ درا" کی غزلیں ابتدائی دور کی ہیں۔ مگر متانت کلام، بلندی مضامین اور فلسفہ میں غالب کی غزلوں سے ٹکر لیتی نظر آتی ہیں۔ ان غزلوں کے ہر شعر سے اقبال کی طباعی اور ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے ان غزلوں میں روایتی موضوعات کی ترجمانی نہیں کی گئی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کا دائرہ وسیع ہے۔ ان میں جذبے کی شدت ہے اور اصلاح کا رنگ غالب ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تہہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی، نوائے زیرِ لبی رہی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال کی "بانگ درا" والی غزلوں نے جدت کا ایک نیا راستہ پیدا کیا۔ ان غزلوں کو پڑھ کر ذہن پر چھائے ہوئے تاریکیوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں، اخلاقی قدریں نیا روپ دھارتی ہیں۔ صحت مند جذبات و احساسات ابھرتے ہیں۔

"بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کی غزلوں میں اقبال کا رنگ بہت پختہ ہے۔ ان غزلوں میں فکر کی گہرائی اور تخیل کی کارفرمائی ہے۔ ان میں خارا شگافی کی ادا اور بڑھ گئی ہے۔ ان غزلوں میں ایک نیا انداز اور نیا آہنگ ہے۔ اجتماعی زندگی کے مسائل عمل کا پیام۔ خودی کا فلسفہ۔ یہ سب "بالِ جبریل" کے موضوعات ہیں۔ اقبال نے غزل کے روایتی پیمانوں کو توڑ کر نئے گلزار و باغبان اور نئے خم و مینا ایجاد کئے۔ ان کے ہاں

(باقی صفحہ ۶۶ پر)

جھوٹ کے پاؤں

{ہوٹل کا ہلکا ہلکا شور۔ باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں پیالیوں کی کھنک}

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) آپ حضرات تو بلا وجہ اپنا خون خشک کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں ہر آنے والا ایسی ہی لمبی چوڑی تقریریں کرتا ہے

مسعود:۔ (جلدی سے) اظہر صاحب۔ یہ مینیجر دوسروں سے مختلف ہے اس سے بچ کر رہیئے گا۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) ارے بھئی اتنی جلدی بھول گئے تم لوگ کلیم صاحب کو۔ جب وہ آئے تھے تو آپ حضرات نے ان کا نام پتھر رکھا تھا، مگر دیکھا نہیں آپ نے کتنی جلدی یہ پتھر موم ہو گیا۔

مسعود:۔ (زور دے کر) محترم۔ یہ مینیجر دوسرے سابق مینیجروں سے بالکل ہی مختلف ہے۔

نیاز:۔ (جلدی سے) اظہر صاحب! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ صاحب بہادر چھٹی کے معاملہ میں انتہائی بخیل ہیں۔

مسعود:۔ (جلدی سے) اور دیر سے دفتر آنے والوں سے تو ایسے چڑتے ہیں۔

نیاز:۔ (ہنستے ہوئے) اس سادگی کے قربان۔ ایک ہفتہ میں تین بار آنجناب کی پیشی ہو چکی ہے مگر پھر بھی آپ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) ہاں تین چھوڑ ہزار پیشیاں ہوں مگر یہ حضرت میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

مسعود:۔ شاید آپ کو یہ نہیں معلوم محترم۔ کہ صاحب موصوف نے سب کے پرسنل فائل منگا کر اپنی الماری میں رکھ لئے ہیں۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) ارے بھائی اگر وہ ڈال ڈال چلیں گے تو ہم پات پات چلیں گے۔

نیاز:۔ (سنجیدہ لہجہ میں) اظہر صاحب۔ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ کم از کم پندرہ بیس دن تو وقت کی پابندی کیجئے۔ اور چھٹیاں نہ لیجئے گا۔

مسعود:۔ (سمجھاتے ہوئے) ہاں بھئی آدمی اصولی ہے کہیں ایسا نہ ہو تمہیں نقصان پہنچ جائے۔

نیاز:۔ (جلدی سے) وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ اسے جھوٹ سے نفرت ہے وہ جھوٹے آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

مسعود:۔ (جلدی سے) وہ کہتا ہے کہ میں جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا عادی ہوں۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) جی ہاں کل مجھ سے بھی فرمایا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

نیاز:۔ (سنجیدہ لہجہ میں) یہ بات تو صحیح ہے۔ ایک جھوٹ کی خاطر انسان کو سینکڑوں جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) اچھا اب اٹھئے۔ لنچ کا وقت ختم ہو گیا۔ صاحب موصوف آگئے ہوں گے۔

{قدموں کی چاپ۔ بیرے کی آواز۔ تین بھائی ایک روپیہ}

―――――― ★ ――――――

منظر بدلتا ہے

{مرغے کے بولنے کی آوازیں۔ پھر شاہدہ کی آواز سنائی دے}

شاہدہ:۔ (ذرا زور سے) اب اٹھ بھی جائیے چھ بج گئے ہیں۔

اظہر:۔ (خوابناک لہجہ میں) اوں۔ اوہ۔ کیا ہے۔

شاہدہ:۔ (زور دے کر) سنا نہیں آپ نے چھ بج چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو آج بھی دفتر کو دیر ہو جائے۔

الشجاع

اظہر:۔ (جھلاکر) اُفوہ! اتنی جلدی چھ کیسے بج سکتے ہیں۔ خاصا اندھیرا ہو رہا ہے (مرغ کی ککڑوں کوں)

شاہدہ: (سنجیدگی سے) سن نہیں رہے ہیں آپ۔ مرغ بول رہا ہے۔ صبح ہوگی

اظہر:۔ (جھلاکر) مرغ تو آدھی رات کو بھی بولتا ہے۔ اس کے بولنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ صبح ہوگئی۔

شاہدہ:۔ (شکایتی لہجہ میں) رات کو خود ہی کہا تھا کہ جلدی اٹھا دینا ورنہ دفتر کو دیر ہو جائے گی۔

اظہر:۔ (غصہ سے) رات بھر مچھروں نے نہیں سونے دیا۔ ابھی ابھی آنکھ لگی تھی تو آپ نے آکر اٹھا دیا۔ (گھڑی کا الارم بجتا ہے)

شاہدہ:۔ اب تو یقین آیا کہ سوا چھ ہو چکے ہیں۔ رات کو آپ ہی نے سوا چھ کا الارم لگایا تھا۔

اظہر:۔ (غصہ سے) میں عرض کر رہا ہوں کہ دفتر مجھے جانا ہے آپ کو نہیں۔ آپ فکر مند کیوں ہیں؟

شاہدہ:۔ (غصہ سے) میری بلا سے آپ دن بھر سوتے رہئے مگر اب مجھ سے نہ کہئے گا کہ آج پھر دفتر کو دیر ہوگئی اور منیجر نے جواب طلب کیا۔

اظہر:۔ (تیز لہجہ میں) بہت اچھا۔ دفتر کے بارے میں آپ سے ایک لفظ نہیں کہوں گا۔ اب آپ تشریف لے جائیے اور مجھے آٹھ بجے اٹھا دیجئے گا۔ لوکل سے چلا جاؤں گا۔

شاہدہ:۔ (طنزیہ لہجہ میں) اگر لوکل سے جائیں گے تو دس بجے دفتر پہنچیں گے۔

اظہر:۔ (جھلاکر) خدا کے لئے اب میرا پیچھا چھوڑئیے۔ ملازم میں ہوں آپ نہیں ہیں۔

شاہدہ:۔ (جھلاکر) غلطی ہوگئی۔ معاف کر دیجئے۔ کان پکڑتی ہوں جو آئندہ سے آپ کو سویرے اٹھاؤں (تیز تیز قدموں کی چاپ)

منظر بدلتا ہے

{ٹائپ کی کھٹ کھٹ۔ کرسی سرکنے کی آواز۔ پھر نیاز کی آواز ابھرتی ہے۔ پس منظر میں ٹائپ کی کھٹ کھٹ برابر جاری ہے۔}

نیاز:۔ (سرگوشی میں) عجیب آدمی ہو آج پھر دیر سے آئے۔ کئی بار تمہیں بلایا جا چکا ہے۔ منیجر نے مس صوفیہ کو پابند کیا ہے کہ جیسے ہی تم آؤ وہ ان کو مطلع کرے۔ چنانچہ جیسے ہی تم آئے۔ وہ فوراً اٹھ کر منیجر کے کمرے میں گئی ہے۔

اظہر:۔ (آہستہ سے) یہ محترمہ جب سے پی اے ہوئی ہیں ان کے دماغ آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔

نیاز:۔ (آہستہ سے) شی! وہ تشریف لا رہی ہیں۔ (قدموں کی چاپ)

صوفیہ:۔ (خوشگوار لہجہ میں) مسٹر اظہر۔ آپ کو منیجر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔

اظہر:۔ (آہستہ سے) مس صوفیہ مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔

صوفیہ:۔ (سوالیہ لہجہ میں) مجھ سے شکایت ہے۔

اظہر:۔ (زور دے کر) جی ہاں آپ سے۔ آج تک اس دفتر میں اتحاد رہا ہے اور عملے کے کسی فرد نے کبھی کسی کی شکایت منیجر سے نہیں کی تھی۔

صوفیہ:۔ (جلدی سے) مسٹر اظہر یقین کیجئے۔ میں نے آپ کی شکایت نہیں کی۔ مجھے تو منیجر نے حکم دیا تھا کہ آپ جب آئیں تو میں انھیں مطلع کر دوں

اظہر:۔ (تلخ لہجہ میں) مس صوفیہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔

صوفیہ:۔ (بگڑ کر) کیا مطلب ہے آپ کا۔ آپ مجھے دھونس دے رہے ہیں۔ میں ابھی منیجر سے ــــ

اظہر:۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ ایک دوسرے کے کام آنا چاہیئے۔ منیجر تو آتے جاتے رہتے ہیں مگر ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے۔

صوفیہ:۔ (بات کاٹ کر) خیر اس وقت تو آپ منیجر کے پاس جائیے۔ میں آپ سے پھر بات کروں گی۔

{قدموں کی چاپ بتدریج بلند ہو ٹائپ کا شور معدوم ہو}

اظہر:۔ (معذرانہ لہجہ میں) حاضر ہو سکتا ہوں۔

منیجر:۔ (تعجب سے) تشریف لائیے۔ ارے آپ لنگڑا کیوں رہے ہیں۔ کیا ہوا۔؟

اظہر:۔ کیا عرض کروں۔ بس سے گر پڑا۔ فٹ بورڈ پر کھڑا تھا۔

منیجر:۔ (سنجیدہ لہجے میں) فٹ بورڈ پر کھڑے ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ آپ نے خود حادثہ کو دعوت دی۔

اظہر:۔ (معذرانہ لہجہ میں) صبح بسوں میں بہت بھیڑ ہوتی ہے جناب! جگہ نہیں ملتی۔ وقت پر دفتر پہنچنے کی خاطر خطرہ مول لے کر بس میں سفر کرنا پڑتا ہے۔

منیجر:۔ چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا۔؟

اظہر:۔ (آہستہ سے) صرف موچ آئی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانے کی وجہ سے ہی تو دفتر دیر سے پہنچا۔

منیجر:۔ خیر آج تو میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ (چند لمحات کے توقف کے بعد) لیکن یہ بات آپ ہمیشہ یاد رکھئے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

اظہر:۔ (معذرانہ لہجہ میں) جناب والا مجھے بھی جھوٹ سے نفرت ہے۔ میری تربیت اس ماحول میں ہوئی ہے جہاں جھوٹ کی گنجائش نہیں تھی۔

منیجر:۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے (زور دے کر) میں بڑی سے بڑی غلطی معاف کر سکتا ہوں مگر جھوٹے آدمی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔

اظہر:۔ (آہستہ سے) جناب کو اس سلسلہ میں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

منیجر:۔ مسٹر اظہر جانے سے پہلے یہ بات غور سے سن لیجے کہ آئندہ آپ دیر سے نہیں آئیں گے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں آپ پر جرمانہ کیا جائے گا۔

اظہر:۔ (گھبرا کر) کیا فرمایا جناب نے۔ جرمانہ۔

منیجر:۔ (زور دے کر) جی ہاں جرمانہ! دوسری بات یہ ہے کہ آپ کم از کم دو مہینے تک کوئی چھٹی نہیں لیں گے۔

اظہر:۔ (گھبرا کر) مگر جناب بیماری آزاری۔ میرا مطلب ہے —
خدانخواستہ —

منیجر:۔ (سنجیدہ لہجہ میں) اگر آپ بیمار ہوں تو فوراً مجھے اطلاع دیں۔ دفتر فوری طور پر ڈاکٹر سے آپ کا معائنہ کرائے گا۔

اظہر:۔ (گڑبڑا کر) جی۔ میں۔ میرا مطلب ہے کہ بیوی یا۔ آفت حادثہ یا آفت ارضی و سماوی وغیرہ تو —

منیجر:۔ (بات کاٹ کر) ہر صورت میں آپ دفتر کو اطلاع دیں گے اور دفتر آپ کو آسانیاں بہم پہنچائے گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ سمجھ گئے آپ —

اظہر:۔ (آہستہ سے) جی۔ بہت اچھا۔ آئندہ میں چھٹی نہیں لوں گا۔ وقت پر دفتر آؤں گا۔

{قدموں کی چاپ بتدریج دور ہو۔ پھر پس منظر میں ٹائپ کی کھٹ کھٹ سنائی دے۔ قدموں کی چاپ کرسی سرکانے کی آواز}

نیاز:۔ (آہستہ سے) ارے! لنگڑا کیوں رہے ہو اظہر؟

مسعود:۔ (تعجب سے) کیا منیجر نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔

نیاز:۔ (شرارت سے) ہاتھ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے رول اٹھایا ہے اور پیروں پر مارا ہے۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) ارے بھئی میں بس سے گر پڑا ہوں۔ پیر میں موچ آگئی ہے۔

مسعود:۔ (تعجب سے) مگر جب تم دفتر آتے تھے تو اچھے خاصے تھے۔

نیاز:۔ (بات کاٹ کر) کیا منیجر صاحب کے کمرے میں بس چلنے لگی ہے۔ جس سے گر پڑے۔

اظہر:۔ (ہنستے ہوئے) موصوف فرما رہے تھے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

مسعود:۔ بھئی ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تم جو جھوٹ بولتے ہو اس کے نہ صرف پاؤں ہوتے ہیں بلکہ وہ خوب چلتا پھرتا ہے۔

نیاز:۔ (دبی دبی ہنسی کے درمیان) ابھی چلنا کیا معنی۔ اظہر کا بولا جھوٹ تو دوڑتا ہے۔ تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرتا ہے

{دبی دبی مشترکہ ہنسی}

منظر بدلتا ہے

{گھڑی سات بجاتی ہے۔ پھر اظہر کی آواز سنائی دیتی ہے}

اظہر:۔ میرا منہ کیا دیکھ رہی ہیں۔ جلدی سے میرا کوٹ لائیے دیر ہو رہی ہے {دروازہ پر دستک}

شاہدہ:۔ جاکر دیکھیے کون ہے ؟

اظہر:۔ اُفوہ۔ اسی وقت کسی کو آنا تھا۔

{تیز تیز قدموں کی چاپ۔ وقفہ۔ پھر قدموں کی چاپ}

شاہدہ:۔ کون تھا۔ یہ کیا! آپ کے ہاتھ میں تو تار ہے۔ کس کا تار ہے ـــ ؟

اظہر:۔ (جھلا کر) پڑھ تو لوں (چند لمحات توقف کے بعد) آپ کے ابا جان آ رہے ہیں۔

شاہدہ:۔ (خوشی کے لہجہ میں) سچ۔ کب آ رہے ہیں۔ بتائیے نا۔

اظہر:۔ (پریشان کن لہجہ میں) آج آ رہے ہیں رحمانی ایکسپریس سے۔

شاہدہ:۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر ابا جان نے میری بات مان لی۔

اظہر:۔ اچھا بھئی میں تو اب دفتر جا رہا ہوں۔ آپ اسٹیشن۔

شاہدہ:۔ (بات کاٹ کر) کیا مطلب آپ کا۔ کیا آپ اسٹیشن نہیں چلیں گے ابا جان کو لینے۔

اظہر:۔ (پریشان کن لہجہ میں) میں کیسے جا سکتا ہوں۔

شاہدہ:۔ (بات کاٹ کر) آج کی چھٹی لے لیجیے۔

اظہر:۔ (تیز لہجہ میں) چھٹی نہیں مل سکتی۔ کل مجھے مینیجر نے پابند کیا ہے کہ میں کم از کم دو مہینے چھٹی نہیں لوں گا۔ اور میں نے وعدہ کر لیا ہے۔

شاہدہ:۔ ارے تو کوئی اور بہانہ کر دیجیے۔

اظہر:۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ مینیجر نے سب راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

شاہدہ:۔ (تلخ لہجہ میں) جی ہاں۔ میرے ابا جان آ رہے ہیں تو آپ بہانہ نہیں کریں گے۔

اظہر:۔ (تیز لہجہ میں) نیا مینیجر بہت سخت آدمی ہے جھوٹ سے اسے نفرت ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔

شاہدہ:۔ (طنزیہ لہجہ میں) ہاں جی آپ کیوں جھوٹ بولیں گے آج ہی آپ کو معلوم ہوا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور جب اپنا کام ہوتا ہے تو جھوٹ کے پاؤں کیا ہاتھ بھی ہوتے ہیں۔ ناک بھی ہوتی ہے۔ کان بھی ہوتے ہیں۔

اظہر:۔ (جلدی سے) میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں محترمہ! آپ کو میری مجبوریوں کا اندازہ نہیں ہے۔

شاہدہ:۔ (روہانسے لہجہ میں) میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ نہیں چلیں گے تو میں بھی ابا جان کو لینے نہیں جاؤں گی (سسکیاں)

اظہر:۔ (پریشان کن لہجہ میں) اُفوہ ـــ رونے کیوں لگیں۔ اچھا سنئے ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ آپ میرے جانے کے ایک گھنٹہ بعد مجھے ٹیلی فون کریں۔

شاہدہ:۔ (سوالیہ لہجہ میں خوش ہو کر) تب تو آپ کو چھٹی مل جائے گی۔ آپ آ جائیں گے۔؟

اظہر:۔ یہ نمبر جو میں نے لکھا ہے اس پر مینیجر بولے گا بس آپ اس سے انتہائی گھبراتے ہوئے لہجے میں کہیے گا کہ جلدی سے اظہر صاحب کو بلا دیجیے۔ پھر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں ـــ

شاہدہ:۔ (جلدی سے) اس سے کیا ہوگا۔؟

اظہر:۔ (زور دے کر) آپ مینیجر سے کوئی اور بات نہیں کریں گی۔ اور سنئے جب میں آ کر آپ کو اپنا نام بتاؤں تو آپ فوراً ریسیور رکھ دیجیے گا۔

شاہدہ:۔ (جلدی سے) آپ کا مطلب ہے کہ میں آپ سے کوئی بات نہ کروں۔

اظہر:۔ (جھلا کر) آپ جرح نہ کیجیے جتنا میں نے کہا ہے اس پر عمل کریں اچھا خدا حافظ۔

شاہدہ:۔ (زور سے) جلدی آنے کی کوشش کیجیے گا ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے

{قدموں کی چاپ دور ہوتی}

ـــــــــ ★ ـــــــــ

منظر بدلتا ہے

{قدموں کی چاپ پھر اظہر کی آواز ابھرے}

اظہر:۔ (مودبانہ لہجہ میں) جناب! آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔

منیجر:۔ آپ کا فون ہے۔

اظہر:۔ (سوالیہ لہجے میں) میرا فون ؟۔

منیجر:۔ جی ہاں کوئی خاتون بول رہی ہیں۔ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

اظہر:۔ (جلدی سے) ہلو۔ ہاں۔ میں اظہر بول رہا ہوں اظہر۔ ہاں ہاں اظہر سعدی۔

{چند لمحات کے توقف کے بعد انتہائی گھبرائے ہوئے لہجے میں۔}

کیا کہا۔ نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔ خدا نہ کرے۔

{بھرائی ہوئی آواز میں} ڈاکٹر کہہ رہا ہے۔ افسوس۔

رو۔ نہیں شاہدہ صبر کرو۔ یہ بتاؤ تمہارے پاس کون ہے؟

سب کو اطلاع کرا دی ہے۔ اچھا جمال بھائی آگئے ہیں۔

محلہ والے بھی۔ اچھا ڈاکٹر نے معائنہ کر لیا۔ افسوس۔

(سسکی لے کر) صبر کرو شاہدہ صبر کرو۔ میں آرہا ہوں {ریسیور رکھنے کی آواز}

منیجر:۔ کیا ہوا مسٹر اظہر آپ پریشان کیوں ہیں۔

اظہر:۔ (رقت بھرے لہجے میں) میری اہلیہ کے والد کا انتقال ہو گیا (ٹھنڈی سانس)

منیجر:۔ (سوالیہ لہجہ میں) کیا بیمار تھے ؟ کل تو آپ نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ ؟

اظہر:۔ (گہری ٹھنڈی سانس لے کر) صبح تک اچھے خاصے تھے میرے ساتھ ناشتہ کیا تھا۔

منیجر:۔ (سوالیہ لہجے میں) تو کیا ہارٹ فیل ہو گیا۔ ؟

اظہر:۔ (گلوگیر لہجہ میں) جی بیگم نے بتایا کہ ڈاکٹر کی یہی رائے ہے۔ (آہستہ سے) جناب اگر آپ اجازت دیں۔

منیجر:۔ (اچانک چونک کر) اوہ مجھے افسوس ہے {قدموں کی چاپ قریب آتے}

صوفیہ:۔ سر۔ گزشتہ تین سال میں محلے کے ہر شخص نے جتنی چھٹی کی درخواستیں دی تھیں وہ ہر ایک کے علیحدہ فائل میں رکھ دی ہیں۔ سب فائل تیار ہیں۔

منیجر:۔ (جلدی سے) ذرا مسٹر اظہر کی چھٹیوں کا فائل دیجئے۔

اظہر:۔ (جلدی سے) جناب مجھے اجازت ہے۔ ؟

صوفیہ:۔ سر۔ یہ لیجئے مسٹر اظہر کا فائل {کاغذات کی سرسراہٹ}

اظہر:۔ (جلدی سے) جناب! مجھے اجازت دیجئے میری بیوی بھی دل کی مریض ہیں۔ اس صدمے سے۔

منیجر:۔ (چونک کر) یہ کیا مسٹر اظہر ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو بھی آپ نے اپنے سسر کے انتقال کے سلسلے میں چھٹی لی تھی۔

اظہر:۔ (گڑبڑا کر) جناب والا۔ وہ۔ وہ۔ میرے اصل سسر نہیں بلکہ۔ سوتیلے سسر۔ میرا مطلب ہے جی۔ وہ میری بیوی کے چچا۔ یعنی میرے چچیا سسر تھے۔ جی ہاں رشتے کے سسر۔

صوفیہ:۔ (آہستہ سے) سر۔ مارچ ۶۷ء میں بھی مسٹر اظہر کے سسر کا انتقال ہوا تھا اور انھوں نے چھٹی لی تھی۔

اظہر:۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) مس صوفیہ۔ وہ۔ وہ یعنی وہ میرے حقیقی سسر نہیں۔ بلکہ۔ یعنی میری بیوی کے حقیقی ماموں۔

منیجر:۔ (آہستہ سے) اظہر صاحب آج آپ کے جن سسر کا انتقال ہوا وہ کس قسم کے سسر تھے۔؟

اظہر:۔ (گھبرا کر) جناب آج جن سسر صاحب کا انتقال ہوا ہے وہ یعنی وہ۔ جناب وہ میرے خالص۔ سو فیصدی خالص میرا مطلب ہے جناب کہ وہ میری بیوی کے حقیقی والد تھے۔ جناب اب مجھے اجازت دیجئے۔ میری بیوی نے رو رو کر برا حال کر لیا ہوگا۔ وہ۔ وہ دل کی مریض ہے۔ باپ کی موت سے اور نڈھال ہو گی۔

منیجر:۔ (سنجیدہ لہجہ میں) خیر اس وقت تو آپ جائیے لیکن میں آپ کو پھر ایک بار یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

اظہر:۔ (گھبرائے ہوئے) مجھے معلوم ہے جناب۔ شکریہ۔ اچھا جناب اب میں جا رہا ہوں {تیز تیز قدموں کی چاپ}

منظر بدلتا ہے

{ ریسیور رکھنے کی آواز پھر شاہدہ کی آواز سنائی دے }

شاہدہ :۔ (محبت بھرے لہجے میں) کسے ٹیلی فون کر رہے تھے ابا جان ؟

واحد :۔ بیٹی میرے ایک دوست ہیں امجد بیگ ان کا بڑا لڑکا یہاں ہے انھوں نے اس کو کچھ سامان بھیجا ہے اور اس کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔ اسی سے بات کر رہا تھا۔

شاہدہ :۔ (جلدی سے) سامان ان کو دے دیجئے۔ وہ لے آئیں گے۔ آپ کو جانے کی کیا ضرورت۔

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) میں نہیں جاؤں گا۔ ۵ بجے وہ خود آئے گا۔ بڑا نیک اور سعادت مند لڑکا ہے۔ اپنے باپ کی طرح میرا احترام کرتا ہے۔

شاہدہ :۔ اچھا تو وہ خود آئیں گے۔

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) ہاں کہتے تھے کہ آپ تکلیف نہ کریں میں خود قدم بوسی کو حاضر ہوں گا۔

شاہدہ :۔ (خوشی کے لہجے میں) ابا جان اگر آپ امی کو بھی لے آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) میں تو تمہیں لینے آیا ہوں شاہدہ غضب خدا کا دو سال ہو گئے مگر تم نے آنے کا نام نہیں لیا۔ اور یہ اظہر میاں کہاں غائب ہو گئے۔

شاہدہ :۔ (جلدی سے) وہ بازار گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ کل سے نوکر نے چھٹی لے لی ہے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ آ رہے ہیں تو اس کو چھٹی نہ دیتی۔

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) کوئی بات نہیں نوکر کی بھی ضروریات ہوتی ہیں وہ بھی ہم جیسا انسان ہوتا ہے۔

شاہدہ :۔ (خوشی کے لہجے میں) ابا جان اب آپ چل کر ہاتھ منہ دھو لیجئے جب تک میں کھانا لگاتی ہوں۔ اتنی دیر میں وہ بھی آ جائیں گے

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) نہیں بھئی ہاتھ منہ دھونے سے کام نہیں چلے گا میں نہالوں۔ بالوں میں ریت اور خاک بھری ہوتی ہے۔

شاہدہ :۔ ضرور ضرور چلئے۔ میں آپ کے کپڑے نکالے دیتی ہوں۔

الشجاع

{ مشترکہ قدموں کی آواز دور ہو }

---★---

منظر بدلتا ہے

{ باتیں کرنے کی ملی جلی آواز میں قہقہے پھر واحد کی آواز ابھرے }

واحد :۔ آصف میاں! تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تعجب ہے کہ کراچی میں رہ کر بھی تمہاری صحت بہت اچھی ہے۔

منیجر :۔ اس کی وجہ یہ ہے قبلہ! کہ میں کھانے پینے میں بہت احتیاط برتتا ہوں۔

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) یہی وجہ ہے۔ ورنہ میاں اظہر تو برسوں کے بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ اور شاہدہ کی صحت بھی ٹھیک نہیں

منیجر :۔ (چونک کر) اظہر۔ اظہر کون۔؟

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) اسے اظہر کو نہیں جانتے شاہدہ بیٹی کے دولھا کا نام ہے اظہر سعیدی۔ یہاں کسی کمپنی میں نوکر ہے۔

منیجر :۔ (سوالیہ لہجہ میں) شاہدہ آپ کی بھانجی۔؟

واحد :۔ (بات کاٹ کر) کیسی باتیں کر رہے ہو۔ شاہدہ میری منجھلی لڑکی کا نام ہے۔ اسے بھی جسے ہم لوگ شدو کہتے ہیں۔ بڑی نیک سلیقہ شعار ہے بچپن میں تم نے اسے دیکھا ضرور ہوگا۔

منیجر :۔ (ہنستے ہوئے) صورت تو یاد نہیں رہی ہاں یہ نام مجھے یاد ہے۔

واحد :۔ پندرہ بیس سال کے بعد بھی تمہیں نام یاد رہا۔ یہی بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ آج کل کے نوجوانوں کی یادداشت بہت خراب ہوتی ہے۔

منیجر :۔ (خوشگوار لہجے میں) اچھا تو اظہر سعیدی صاحب آپ کے داماد ہیں۔ کہاں ہیں وہ۔

واحد :۔ (ہنستے ہوئے) جانے لگے کہ ابھی آتے ہیں۔ بازار گئے ہوئے تھے (ہنستے ہوئے) بات یہ ہے کہ ان کا نوکر کل سے چھٹی پہ ہے

{قدموں کی چاپ دور سے بلند ہو}

منیجر:۔ (ہنستے ہوئے) ان کا نوکر شاید چھٹی لینے کا عادی ہے۔

{قدموں کی چاپ قریب آئے}

واحد:۔ (جلدی سے) آؤ آؤ اظہر میاں رک کیوں گئے۔ یہ ہیں فرید میرے دوست بھائی امجد بیگ کے بڑے صاحبزادے اور آصف میاں یہ ہیں میرے داماد اظہر سعیدی۔ آتے کیوں نہیں اظہر میاں! ارے تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے۔ کیا ہوا۔؟

اظہر:۔ (ہکلاتے ہوئے) آپ ۔ آپ جی ۔ جی ۔ آپ ۔

منیجر:۔ (طنزیہ لہجے میں) تشریف لائیے اظہر صاحب آج کی ملاقات تو ہمیشہ یاد رہے گی۔

واحد:۔ (پریشان کن لہجے میں) کیا ہو گیا اظہر میاں تم کو آؤ نا تم تو پتے کی طرح کانپ رہے ہو۔

منیجر:۔ بات یہ ہے قبلہ آج ان بیچارے کے سسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ بہت غمگین ہیں۔

واحد:۔ (تعجب سے) کیا فرمایا آصف میاں! میرا انتقال ہو گیا۔ میں فوت ہو گیا۔ یعنی میں مرحوم ہو گیا۔ اور کمال یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔

اظہر:۔ (انتہائی گھبرائے ہوئے لہجے میں) جی۔ آپ کا۔ آپ کا نہیں آپ تو زندہ ہے

{دور سے چائے کے برتن گرنے کی آواز۔ اس کے بعد منیجر کے قہقہے موسیقی میں ڈوب جائیں۔ (فیڈ آؤٹ)}

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

صفحہ ۱۳۵ کا بقیہ ۔ بوتھ نمبر ایک سات چار گیارہ

پھر اسے ماچس کے جلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر اسے عورت کی الوداعی آواز سنائی دی "خدا حافظ" یکایک دوسری جانب سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اب اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اس نے آہستگی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور رپورٹ کے لئے سپروائزر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اس کی ڈیوٹی جب ختم ہو گئی۔ گھر لوٹتے ہوئے اس نے سوچا کیوں نہ ایک نظر اس بوتھ پر بھی ڈالتا چلے جس نے چکر میں آج کی پوری رات برباد ہو گئی تھی۔

کوڈ وا اسٹریٹ کے کنارے وہ بوتھ جوں کا توں موجود تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا ہر چیز اپنی جگہ صحیح سالم تھی۔ پولیس وہاں سے گھنٹہ بھر قبل ہی ہٹ چکی تھی۔ اس نے بلب کی جانب دیکھا بوتھ کا بلب بدستور موجود تھا۔ فون کے قریب ہی ڈائریکٹری بھی پڑی ہوئی تھی اس کے تمام ورق جوں کے توں موجود تھے۔

(پلاٹ مابرٹ برسلی سے ماخوذ)

صفحہ ۱۷ کا بقیہ ۔ نیشا پور

کتاب کو ذکھ دیا۔ نماز ادا کی اور اپنے اعزا اور دوستوں کو نصیحت اور وصیت کی۔ اس کے بعد اس نے شام تک کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ اور شام کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے سجدہ کیا اور بلند آواز میں یہ الفاظ ادا کئے "اے معبود حقیقی میں نے اپنے علم اور اہلیت کے مطابق تجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ اب میں تیری مغفرت کا طالب ہوں" یہ کہتے ہوئے اس کی روح اس کے جسم خاکی سے پرواز کر گئی۔ اور اس کی خواہش کے مطابق اسے نیشا پور کے ایک سرسبز و شاداب کنج میں دفن کیا گیا۔

حاصل مطالعہ

اس عنوان کے تحت اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

سیتاپور میں تحصیل سدھولی اپنی جھیلوں اور شکاریوں کے لئے مشہور تھی۔ اب جھیلوں میں دھان بویا جاتا ہے۔ بندوقیں بیچ کر چکیاں لگوائی گئی ہیں اور لائسنس پر ملے ہوئے کارتوس بلیک کر کے شیروانیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قصبوں کا ذخیرہ پھیلا ہوا تھا۔ جن میں شیخ آباد تھے جو اپنے ہندو ماضی کی یاد میں ناموں کے آگے خان لگاتے تھے۔ اور ہر قسم کے شکار کے لئے غنڈے کتے اور شکرے پالتے تھے۔ ان میں سارنگ پور کے بڑے بھیا رکھو چچا اور چھوٹے بھیا پاچو چچا بہت ممتاز تھے۔ میں نے رکھو چچا کا بڑھاپا دیکھا ہے ان کے سفید ابروؤں کے نیچے تڑپتی آنکھوں سے چنگاریاں اور کڑکتی آواز سے لپٹیں نکلتی تھیں۔ رضو باجی انھیں رکھو چچا کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ میں نے لڑکپن میں رضو باجی کے حسن اور اس جہیز کے افسانے سنے تھے۔ جسے ان کی دو توتلی صاحب جانیں برسوں میں جوڑ جوڑ کر مر گئی تھیں۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں میراثنیں اتنے طنطنے سے ان کا ذکر کرتیں کہ بڑے بڑے لوگ بھی ان کی ڈیوڑھی پر منڈلانے لگتے۔ جب رضو باجی کی ماں مر گئیں اور رکھو چچا پر فالج گرا تو انھوں نے مجبور ہو کر ایک رشتہ قبول کر لیا۔ مگر رضو باجی پر عین منگنی کے دن جنات آ گئے رضو باجی کی ڈیوڑھی سے رشتوں کے دھاگے ہمیشہ کے لئے اڑ گئے جب رکھو چچا مر گئے تو پاچو چچا ان کے ساتھ تمام ہندوستان کی درگاہوں کا چکر کرتے رہے لیکن جناتوں کو نہ جانا تھا نہ گئے۔ پھر رضو باجی کی عمر ایسا پیمانہ بن گئی۔ جس کے قریب پہنچنے کے خوف سے سوکھی ہوئی کنواریاں لرز اٹھیں جب بھی رضو باجی کا ذکر ہوتا تو میرے وجود میں ایک ٹوٹا ہوا کانٹا کھٹکنے لگتا اور میں اپنی یاد دل کے کارواں کو کسی ذہنی مصروفیت کے صحرا میں ڈھکیل دیتا۔ انھیں رضو باجی کا جب رجسٹری لفافہ ملا تو حالانکہ ایسا محسوس ہوا کہ خط پھاڑ دیا۔ لکھا تھا کہ وہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ اور میں فوراً سارنگ پور پہنچ جاؤں لیکن اس طرح سے گویا میں ان سے نہیں پاچو چچا سے ملنے آیا ہوں۔ اور یہ بھی کہ میں خط پڑھنے کے بعد فوراً جلا دوں میں نے رضو باجی کے ایک حکم کی فوراً تعمیل کر دی۔ خط کے شعلوں کے اس پار ایک دن چمک رہا تھا۔ پندرہ سال پہلے کا ایک دن جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اور محرم کرنے گھر آیا ہوا تھا۔

محرم کی کوئی تاریخ تھی۔ اور سارنگ پور کا سپاہی خبر لایا تھا کہ دوسرے دن مسرکھ اسٹیشن پر شام کی گاڑی سے سواریاں اتریں گی۔ ہماری بستی کے محرم سارے ضلع میں مشہور تھے اور یہ مشہور محرم ہمارے گھر سے وابستہ تھے اور دور دور سے عزیز و اقارب محرم دیکھنے آیا کرتے تھے۔ اور ہمارا گھر شادی کے گھروں کی طرح گھمگھمانے لگتا تھا۔ اس خبر نے میرے وجود میں قمقمے جلا دیئے۔ میں رضو باجی کو جن کی کہانیوں سے میرا تخیل آباد تھا پہلی بار دیکھنے والا تھا۔ عید کی چاند رات کے مانند وہ رات بڑی مشکل سے گزری اور صبح ہوتے ہی تعزیوں میں مصروف ہو گیا چھوٹے چھوٹے اڈے جن کو چپرک اور ہڑدو بھی کہتے ہیں۔ سنوارے گئے۔

رضو باجی نے برقعہ کا اوپری حصہ اتار دیا تھا اور وہ سرخ بال جن پر ان کے حسن کی شہرت کا دارو مدار تھا، چہرے کے گرد پڑے دہک رہے تھے۔

اور اچانک رضو باجی کے ہاتھ میری کمر کے گرد آ گئے اور میرا بایاں شانہ ان کے چہرے کے لمس سے سلگ رہا تھا اور اعصاب میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں

بیل سامان سے تہلات گئے۔ ان کو نئی اندھریاں، سنگوٹیاں اور جھلیں پہنائی گئیں۔ دھراؤ جھولیں اور پردے نکالے گئے۔ گھوڑے کے ایال تراشے گئے زین پر پالش کی گئی اور سیاہ اطلس کا پھینٹا باندھا گیا۔ جو اس کے سفید جسم پر پھوٹ نکلا۔ ہنہاتھ جانے والے آدمیوں میں اپنی نئی قمیصیں بانٹ دیں اور جیب خرچ سے دھوتیاں خریدیں اور دوپہری سے کلف لگی برجس پر لانگ بوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ اور دو بجتے بجتے سوار ہو گیا۔ جبکہ چھ میل کا راستہ میرے گھوڑے کے لئے چالیس منٹ سے کسی طرح زیادہ نہ تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کو جو ہمارے تحائف سے زیر بار رہتا تھا اطلاع دی کہ ہمارے خاص مہمان آنے والے ہیں اور مسافر خانے کے پورے کمرے پر قبضہ جما لیا گاڑی وقت پر آئی لیکن ایسی خوشی ہوئی جیسے کئی دن کے انتظار کے بعد آئی ہو۔ فرسٹ کلاس کے دروازے میں سارنگ پور کا مولو گرام لگائے ایک بوڑھا سپاہی کھڑا تھا۔ ڈبے سے مسافر خانے تک قناتیں لگا دی گئیں۔ آگے آگے پھوپھی جان تھیں ایک رشتے سے رگھو چچا ہمارے چچا تھے اور دوسرے رشتے سے ان کی بیوی ہماری پھوپھی تھیں۔ ان کے پیچھے رضو باجی پھر عورتیں تھرماس اور پاندان اور صندوقچے اٹھائے ہوئے آرہی تھیں چائے کا انتظام تھا۔ لیکن پھوپھی جان نے میری بلائیں لے کر انکار کر دیا اور فوراً اس اڈے پر سوار ہو گئیں جو تابوت کی طرح پردوں سے ڈھکا ہوا تھا۔۔۔ رضو باجی بھی اسی میں غروب ہو گئیں۔ ہوئے ہاتھ سیاہ برقعے پر شعلوں کی طرح تڑپ رہے تھے۔ دوسرے اڈھوں پر عورتوں کو سامان کے ساتھ ٹھونسا دیا گیا۔ کٹھنا ریس کے پھڑکتے ہوئے سیاہ بیلوں پر میرا چھوٹا سا ادھا خالی اڑا جاتا تھا۔ اور میں پھوپھی جان کے اڈھے کے پہلو میں چھل بل دکھلاتے ہوئے گھوڑے پر بھاگ رہا تھا۔ میں جو کبھی بولائی بندوق ہاتھ میں لے کر نہ چلا تھا آج بارہ بور کی پنچ میزی اس امید پر لادے ہوئے تھا کہ اگر اڑتا ہوا طاؤس گرا لیا تو رضو باجی ضرور متاثر ہو جائیں گی۔ کچی سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے دھندھاری کے جنگل پر میری نگاہیں منڈلا رہی تھیں۔ اور میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ دو کسی جھاڑی سے کوئی طاؤس اٹھے اور اتنے قریب سے گزرے کہ میں شکار کر لوں، کہ پھوپھی جان کا ادھا رک گیا۔ میں گھوڑا اچکا کر قریب پہنچا آج سے زیادہ بھی اس جانور کے نخرے بھلے نہ لگے تھے۔

"میرا تو اس تابوت میں دم گھٹا جا رہا ہے۔"

الشجاع

رضو باجی کی آواز تھی جاڑوں کی دھوپ کی طرح صاف اور اجلا

" تو آپ میرے اڈھے پر آجائیے۔"

" مگر اس پر پردہ کہاں ہے "

" میں ابھی بندھوا لیتا ہوں "

پردہ بندھ رہا تھا کہ پھوپھی جان نے حکم دیا۔

" کسی بوڑھے آدمی سے کہو ان کا اڈھا ہانکے اور کسی عورت کو بٹھال دو "

" اچھا تو میں ہانکوں گا۔"

" ارے تو۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا ہانکے گا "

انہوں نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا اور میں گھوڑے سے پھاند پڑا ساتھ ہی کسی سپاہی نے میری تائید کی۔

" ایسا ویسا انکستہ نہیں بھیا۔۔۔۔۔۔ بیلن کی جان نکال لیتے ہیں "

چادروں اور صافوں کا پردہ باندھ دیا گیا۔ رضو باجی سوار ہوئیں اور بولیں۔

" اس پر اتنی جگہ کہاں ہے کہ ہوا بھی دھانس ملی جائیں "

قبل اس کے کہ لوگ اپنے اڈھے سے اتریں میں نے بیل چھڑوا دیئے اور پینٹھ لے کر جوڑ پر بیٹھ گیا۔ اور بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ پھوپھی جان نے کچھ کہا لیکن پانچ جوڑ بیلوں کے گھنگھروؤں کی تند جھنکار میں ان کی بات ڈوب گئی۔

جب حواس درست ہوئے اور دماغ کچھ سوچنے پر رضامند ہوا تو جیسے رضو باجی نے اپنے آپ سے کہا۔

" امی کے اڈھے کی ساری دھول ہمیں کو پھانکنا ہے "

میں نے فوراً لیکھ بیلی۔ آدمی نے راسیں کھینچ کر مجھے نکل جانے دیا۔ ظالم بیلوں کو دوبارہ لیکھ پر لانے کے لئے میں نے ایک کی پینٹھ اور دوسرے کے ٹھوکر مار دی اور میری مہمیز اس کی ران میں چبھ گئی وہ تڑپا اور قابو سے نکل گیا اور اچانک رضو باجی کے ہاتھ میری کمر کے گرد آگئے اور میرا بایاں شانہ ان کے چہرے کے لمس سے سلگ رہا تھا۔ اور اعصاب میں پھلجھڑیاں چھٹ رہی تھیں۔

" دودکو "

انھوں نے بیلی باہنے مجھے حکم دیا میں نے بہتے تک دائیں کھینچ

لیں بیل دل کی چلنے لگا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ سانپ کی طرح رینگتی ہوئی سڑک پر دور تک درختوں کے سنتری کھڑے تھے۔ اور ایک سپاہی میرے گھوڑے پر سوار ساتھ کے مانند پیچھے لگا تھا۔ رضو باجی نے برقعے کا اوپری حصہ اتار دیا تھا۔ اور وہ سرخ بال جن پر ان کے حسن کی شہرت کا دار و مدار تھا۔ چہرے کے گرد پڑے دمک رہے تھے۔ اور وہ ایک طرف کا پردہ جھکا کر جنگل کی بہار دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی قاتل گرفت نے ایکبار پھر چٹکی لی۔ اور میں نے بیلوں کو چھیڑ دیا۔ اور ایک بار پھر ان کے سفید نرم ریشمی ہاتھ میری کمر کو نصیب ہو گئے۔ لیکن اب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں اور میں بیلوں کو پھٹکار رہا تھا اور ان کا سر میری پشت پر رکھا تھا۔ اور میں اڑتی ہوئی ریشمی لپیٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ باغ نظر آنے لگے جن کے سامنے سے آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ جس کو سے میرے گھر کا راستہ کبھی اتنے جلدی نہیں ختم ہوا اتنا دلکش نہیں معلوم ہوا۔ میں نے اوصار دکا پردہ برابر کیا۔ سپاہی کو جو پر بٹھا کر خود گھوڑے پر سوار بستی میں بیل ہانکتے ہوئے داخل ہونا شایان شان نہ تھا۔ رضو باجی مجھے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ جب وہ اتر کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں تو میں نے پہلی بار ان کا سراپا دیکھا اور ان کے حسن کے سامنے میراثنوں کی تمام کہانیاں ہیچ معلوم ہوئیں۔ وہ مجھ سے تھوڑے دنوں بڑی تھیں لیکن جب انھوں نے میری پیٹھ پر سر رکھا اور ٹھنک کر کہا کہ گھر پہونچ کر وہ اپنی بھابی جان اور میری اماں سے شکایت کرائیں گی تو وہ مجھے بہت چھوٹی سی معلوم ہوئیں۔ جیسے میں نے ان کی گڑیا نوچ کر پھینک دی ہو اور وہ مجھے دھمکیاں دے رہی ہوں۔

میں جو محرم میں سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات باہر گزارا کرتا تھا۔ اس سال باہر جانے کا نام نہ لیتا تھا اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اندر منڈلایا کرتا تھا۔ نویں کی رات سال بھر میں واحد رات ہوتی تھی۔ جب ہمارے گھر کی بیویاں بستی میں زیارت کو نکلتی تھیں۔ پورا اہتمام کیا جاتا تھا کہ وہ پہچانی نہ جائیں۔ برقعوں کے بجائے وہ موٹی موٹی چادریں اوڑھ کر نکلتی تھیں لیکن دور چلتے سپاہیوں کو دیکھ کر لوگ جان جاتے تھے۔ اور عورتیں تک راستہ چھوڑ دیتی تھیں۔ جب رات ڈھلنے لگی اور سب لوگ موٹی چادریں اوڑھ کر عجلت میں جانے کو تیار ہوئے تو پتہ چلا کہ رضو باجی سو گئی ہیں کسی نے جگایا تو پتہ چلا کہ سر میں درد ہے اور میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔ جب بیبیوں کے الشجاع

پیچھے چلتے ہوئے سپاہیوں کی لاٹھیاں اور لالٹین پھاٹک سے نکلنے والی سڑک پر کھو گئیں تب میں اندر آیا۔ وہ دالان میں سیاہ کامدانی کے دوپٹے کا پلو سر پر ڈالے سو رہی تھیں ایک عورت پنکھا جھل رہی تھی دوسرے ان کے پائنتی پڑے کھٹولے پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے ان کی سفید گداز کلائی پر میٹھی سی چٹکی لی انھوں نے منہ کھول دیا۔

"چلئے آپ کو تعزیئے دکھلا لائیں"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے انھوں نے عورتوں کو دیکھ کر جلدی سے چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئیں۔

"میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے"

"زیارت کی برکت سے دور ہو جائے گا"

میں نے بڑے جذبے سے کہا انھوں نے کپڑوں پر نگاہ کی۔

"اگر ان سے خراب کپڑے آپ کے پاس ہوں تو پہن لیجئے"

اور میں نے ان کے پلنگ سے چکن کی چادر اٹھا کر ان کے شانوں پر ڈال دی۔

اپنے تعزیئے کے پاس بیٹھی ہوئی بھیڑ سے چند پاسی منتخب کئے ان کو بندوق اور ٹارچ لینے کی ہدایت کی اور رضو باجی کو لئے ہوئے سڑک پر آ گیا۔ مجھے بیبیوں کے راستے معلوم تھے۔ جو محترم کے جلوس کی طرح مقرر تھے۔ اور میں مخالف سمت میں چل رہا تھا۔ کٹا ہوا چاند تہائی آسمان پر روشن تھا۔ اور ہم بستی کے باہر نکل آئے تھے۔ اور میں خود اپنے منصوبے سے لرزاں تھا۔ پھر وہ تالاب آ گیا جس کے پاس ٹیلے پر مندر کھڑا تھا۔ اور سامنے املیوں کے دائروں میں لکھوری اینٹوں کا کنواں تھا۔ میں نے اپنے رومال سے پختہ جگت صاف کی پاسیوں کو حکم دیا کہ وہ مندر کے پاس جا کر بیٹھ جائیں اب حد نگاہ تک دمکتے پانی اور آبادی کے دھندلے خطوط کے علاوہ کچھ نہ تھا ہمارے چاروں طرف املی کے درختوں کا گھنا سایہ پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا۔ ان کے پاس بیٹھ کر پہلی بار ان کو مخاطب کیا۔

"یہ کنواں دیکھ رہی ہیں آپ؟"

مجھے خود اپنی آواز بھیانک معلوم ہوئی۔

"یہ جناتوں کا کنواں ہے۔"

انھوں نے پوری شربتی آنکھوں کو کانوں تک کھول دیا۔ اور میری طرف ذرا سا سرک آئیں۔

"اس میں جنات رہتے ہیں؟"

وہ میرے اور قریب آگئیں۔ ان کا زانو میرے جسم سے مس کرنے لگا۔ لیکن میں بھائیوں کی طرح کچھ رہا تھا۔

"یہ جنات میرے ایک دادا کے شاگرد تھے جب دادا میاں اس کنویں میں ڈوب کر مر گئے تو جناتوں نے یہاں بسیرا کر لیا۔"

انھوں نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا چادر ان کے شانوں سے ڈھلک گئی۔ گھٹی گھٹی آواز میں بڑے کرب سے بولیں "چلو یہاں سے بھاگ چلو۔"

اور ان کا سر میرے شانے پر ڈھلک آیا اور میں نے سرخ بالوں کی ریشمی لپٹوں میں اپنے ہاتھ جلا لئے جن کے داغ آج تک میری جلد کے نیچے محفوظ ہیں۔

"محرم کی اس رات کے آخری حصے میں جو شخص اس کنویں سے اپنی ایک مراد مانگتا ہے وہ پوری ہوتی ہے۔"

وہ مجھکو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں اور میں اس دنیا میں تھا جو پہلی بار میرے حواس نے دریافت کی تھی۔

"آپ ذرا دیر کے لئے مجھے چھوڑ دیجئے میں اس کنویں سے دعا مانگ لوں۔ آج کے بعد پھر کبھی کوئی دعا نہ مانگوں گا۔"

وہ تڑپ کر اٹھیں اور مجھکو تقریباً گھسیٹتی ہوئیں چلیں جب پاس کھڑے ہو گئے ــ وہ مجھ سے الگ ہوئیں سڑک پر آ کر مچل گئیں کہ گھر جاؤں گی۔ مگر میں ان کو بہلاتا ہوا امام باڑے کی طرف چلا۔ یہ امام باڑہ نواب نقی کی اس بہن نے بنوایا تھا۔ جو واجد علی شاہ کی محل تھی آج بھی اس کی اولاد موجود ہے اور امام باڑے والیوں کے نام سے مشہور ہے۔ اور یہ عمارت انھیں کے عمل میں ہے۔ یہاں کربلائے معلیٰ سے لائی ہوئی ضریح رکھی ہے۔ عورتیں اپنے بالوں کی ایک لٹ باندھ کر مراد مانگتی ہیں۔ جب پوری ہو جاتی ہے تو کھول دے جاتی ہیں ایک پاسی نے روز کو امام باڑہ مردوں سے خالی کرا دیا۔ پھاٹک میں عورتوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ بستی کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ میرے گھر کا کوئی فرد الشجاع

کسی عورت کے ساتھ زیارت کرنے نکلا تھا۔ دالان کے پاس ایک بڑی سی لڑکی میرے جوتے کھولنے آئی میں نے رضو باجی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ان کے سینڈل کھولنے لگی۔ جب میں اس ہال میں داخل ہونے لگا۔ جس میں سونے کے پانی کی ضریح مبارک رکھی ہے تو وہی لڑکی جھپٹتی آئی اور بولی بٹیا صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ باہر ہی رہیں میں باہر ہی کھڑا رہا جب میں ان کے ساتھ امام باڑے سے نکل رہا تھا۔ تو ان گنت مرد مجھے کنکھیوں سے گھور رہے تھے اور عورتیں گھونگھٹ سے جھانک رہی تھیں اور میرے اعصاب کی کمان کھنچی ہوئی تھی کہ ایک عورت نے دوسری عورت سے پوچھا۔

"ای کون ہیں؟"

"بڑے بھیا کی دولہن"

اور میں لڑکھڑا گیا۔ رضو باجی کے سر سے چادر کا جھونپا ڈھلک گیا جب سڑک ویران ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ رضو باجی کا چہرہ ملی جلی مسکراہٹ سے روشن تھا میں ان کے قریب ہو گیا۔

"آپ بہت خوش ہیں؟"

"اوں ...... ہاں ...... نہ مانگتے دیر نہ ملتے دیر"

اور میں اس جملے کے معنی سوچتا رہا۔

پھر ہمارے مقدر میں کوئی ایسی رات نہ لکھی گئی جو ان کے قریب سے دہک سکتی۔

ایک آدھ بار ان کی صورت دیکھنے کو ملی بھی تو اس طرح جیسے کوئی چاند دیکھ لے اور جب میں سارنگ پور کی ڈیوڑھی پر یکے سے اترا تو دیر تک کسی آدمی کی تلاش میں کھڑا رہا۔ دہاڑے ایسا سناٹا تھا جیسے اس شاندار بوسیدہ عمارت میں آدمیوں کے بجائے روحیں آباد ہوں میں دوہری ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا اور آواز دی۔

"میں اندر آ جاؤں"

ایک بوڑھی پھٹی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں چھتر پور کا اجی ہوں۔

تم کو معلوم ہے مجھ پر جنات کب آئے ؟ آج سے دس سال پہلے ۔ اور
تم کو معلوم ہے ۔ تمہاری شادی کو کتنے دن ہوئے ؟ دس سال ! تم کو
ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا ۔ تم نے چترہٹہ کے
سفر میں کیا کیا ۔؟ تم محرم کی نویں تاریخ مجھے کہاں کہاں گھسیٹتے پھرے
تم اس بھیانک کنویں سے میرے سامنے کیا مانگنا چاہتے تھے ؟ تم نے
عباسی علم کو بوسہ دے کر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کیسے پانے کی
آرزو کی تھی ؟ جاؤ اپنے امام باڑے کی ضریح کو غور سے دیکھو ۔ میرے
بالوں کی سرخ لٹ آج بھی جنری ہوئی نظر آئے گی ۔ اگر کھبڑی نہ ہو
گئی ہو ۔ سارنگ پور کے تالابوں اور میرا ثنوں سے پوچھو کہ وہ رشتے
مجھے دلاتے تھک گئیں لیکن میں انکار کرتی رہی تھی ۔ کیا مجھ سے تم یہ
چاہتے تھے کہ میں سارنگ پور سے ستر باندھ کر چلوں اور چترہٹہ کی ڈیوڑھی
پر دسویں بار کر بیٹھ جاؤں اور جب تم برآمد ہو تو اپنا آنچل پھیلا کر کہوں
کر مسند مجھ کو اپنے نکاح میں قبول کر لیں کہ زندگی سوارت ہو جائے
تم نے دلّو میاں کی بیٹی سے وہ بات چاہی جو دلّو میاں کی طوائفوں
سے بھی ممکن نہ تھی ۔"

"لیکن رضو باجی ۔"

"مجھ پر جنات نہیں آتے ہیں اچھن میاں ! میں جناتوں کو بلاتی
ہوں ۔ اگر جنات نہ آتے تو کوئی دولہا آچکا ہوتا ۔ اور تب اگر جناتوں
کا کنگن، عباسی علم اور ضریح مبارک تینوں میرے دامن کو ایک مراد
سے بھر دینے کی خواہش کرتے تو میں کیا کرتی ؟ کس منہ سے کہا تھا اس
لئے میں نے یہ کھیل کھیلا تھا ۔ اسی طرح جس طرح چترہٹہ میں تم مجھ سے
کھیل رہے تھے ۔ نہ اس میں تمہارے لئے کچھ حقیقت تھی ۔ اور نہ
اس میں رضو کے لئے کوئی سچائی ہے ۔ یہ سچ ہے میں اپنے باپ کے لئے کچھ
جاہ گاہوں ، جو سب سے پہلے گھل گھل کر مر گئے ۔ جنھوں نے مرتے وقت
بھی اپنی عاقبت کے لئے نہیں میری دنیا کے لئے دعا کی ۔ اس لئے میں
نے تم کو معاف کیا ۔ تم اگر زہرہ کو مجھ پر سوت بنا کر لے آتے تو بھی معاف
کر دیتی ۔ ۔"

وہ نرکل کے درخت کی طرح لرز رہی تھی ۔ ان کا چہرہ دونوں
ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا ۔ دو رنگی شال شانوں سے ڈھلک گئی تھی ۔ سرخ
الشعاع ۔

بالوں میں برابر سے بڑھے ہوئے چاندی کے تار جگمگا رہے تھے ۔ اور
مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی رائیگاں چلی گئی ۔ جیسے میری بیوی
نے مجھے اطلاع دی ہو کہ میرے بچے میرے بچے نہیں ہیں ۔ ۔ ۔

(کتاب نکفش)

صفحہ ۲۳۵ کا بقیہ ــــ اقبال بحیثیت غزل گو

بلبل اور قفس و آشیانہ کا فرسودہ تصور نہیں ملتا ۔" بال جبریل " کی غزلیں
اس تجربہ کی آئینہ دار ہیں ۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

شاعر کا آرٹ جذبے کا رمز ہوتا ہے ۔ ایمائی علامتوں میں وجدان
کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ اقبال نے الفاظ کو علامت اور
رمز کے طور پر برتا ہے ۔ ان کے ذریعہ جذبہ اور تخیل کی قوت میں جوہری
توانائی پیدا کی ہے ۔ جن رموز و علائم کو اقبال نے اپنی غزلیہ شاعری میں استعمال
کیا ہے وہ یہ ہیں ۔ " خودی " ، عشق " ، عقل ، فقر ، ذوقِ یقین ،
شاہیں ۔"

اختصار و اجمال ایمائیت و رمزیت اور اشارات و تلمیحات
اقبال کی غزلیہ شاعری کے اہم عناصر ہیں ۔ ان کی شاعری میں زندگی کی تازگی اور
لطافت ہے ۔ ان کی غزلیہ شاعری تعقل و تاثر کا حسین امتزاج ہے ۔
غزل گو کی حیثیت سے بھی اقبال اردو کے غزل گو شعراء میں ایک
ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ ان کی غزلیہ شاعری تہذیبی میراث ۔۔ اور انسانی
اقدار و کلچر کی امین ہے ۔

خلوتِ خیال کو ہوش میں کوئی لائے کیوں
شعلۂ طور ہی سہی ہم سے نظر ملائے کیوں

ہم سے کچھ اور ہی کہا، ان سے کچھ اور کہہ دیا
بادِ صبا یہ کیا کیا، تو نے یہ گل کھلائے کیوں

قیس کا حاصلِ جنوں، ناقہ و محمل و حجاب
لیلیٰ نجد آشنا، خلوتِ دل میں آئے کیوں

عقل حریصِ خار و خس صورتِ شعلۂ ہوس
دولتِ سوزِ جاوداں عقل کے ہاتھ آئے کیوں

گردشِ مہر و ماہ بھی گردشِ جام بن گئی
صبح نہ لڑکھڑائے کیوں، شام نہ جھوم جائے کیوں

طالبِ جلوۂ بہار دشتِ طلب ہے خار زار
وقت کسی کی راہ میں مسندِ گل بچھائے کیوں

حشر میں حسن سے روش! شکوۂ روبرو غلط
روزِ ازل کی بات ہے آج ہی یاد آئے کیوں

(جامعہ دہلی)

جاں نثار اختر

دل کو ہر لمحہ بچاتے رہے جذبات سے ہم
اتنے مجبور رہے ہیں کبھی حالات سے ہم

نشۂ مے سے کہیں پیاس بجھی ہے دل کی
تشنگی اور بڑھا لائے خرابات سے ہم

آج بھی عشق میں ہے نیم نگاہی کا چلن
پیار کرتے ہیں اسی حسن روایات سے ہم

لاکھ آوارہ سہی اے غمِ گیتی لیکن
اپنا دامن نہ چھڑائیں گے ترے ہاتھ سے ہم

آج تو مل کے بھی تجھ سے نہ ملے ہوں جیسے
چونک اٹھتے تھے کبھی تیری ملاقات سے ہم

مرکزِ دیدۂ خوبانِ جہاں ہیں بھی تو کیا
اک نسبت بھی تو رکھتے ہیں تری ذات سے ہم

(جمالستان دہلی)

پیارے ساتھیو

اس بار تمہارے صفحات میں جناب اخلاق حسین عارف کا ایک معلوماتی مضمون پیش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کہانی ایک مضمون اور ایک نظم ان صفحات کی زینت ہے امید ہے تم کو یہ مضامین پسند آئیں گے۔

(نگراں ہونہار شہری)

اخلاق حسین عارف

اکبر الہ آبادی

کے کلام میں جذبہ وطنیت

اکبر الہ آبادی عام طور سے اپنی ظریفانہ شاعری کی وجہ سے
مشہور ہیں۔ لیکن
ظریفانہ اشعار
کے علاوہ ان کے
یہاں ایک طرف
فلسفہ و عرفان
اور فطرت نگاری
کی مثالیں کثرت
سے ملتی ہیں۔
دوسری طرف
وہ اشعار جن
میں جذبۂ وطنیت
کوٹ کوٹ کر
بھرا ہوا ہے۔
اکبر سرکاری ملازم

چولستان کا ایک منظر

عکاس .... مظفر بہاولپوری بہاولپور

تھے اس لئے انگریز یا حکومت وقت کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہتے تو تعجب
کی بات نہ تھی مگر انھوں نے ملازمت کی پابندیوں کے باوجود دل میں جو
بات آئی کہہ دی۔ انھوں نے اپنی صاف گوئی کا اس طرح اظہار بھی کیا ہے۔
اشعار

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر
دل میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

اپنی اور ملک کی محکومی کا انھیں اس شدت سے احساس تھا کہ وہ
مختلف عنوانات سے اس پر اظہار تاسف کرتے رہتے تھے۔ فرماتے ہیں
"انقلاب دہر دیکھو
بن گیا آقا غلام۔
قصر کا مالک جو تھا
اب اس کا دربان ہو گیا"
اور ایک
جگہ تو اپنی ملازمت
سے علی الاعلان
نفرت ہی کا اظہار
نہیں کرتے
بلکہ خدا سے
دعا کرتے ہیں
کہ اس پھندے
سے انھیں نجات
مل جائے۔

پراگندہ بہت ہے دل مرا دنیا کے دھندوں سے
چھڑا دے مجھ کو یارب نوکری کے سخت پھندوں سے

اکبر کو ہر اس چیز سے جس کا تعلق اپنے ملک سے ہو محبت تھی۔

ہونہار شہری کے نئے ممبر

عالم عظیم آبادی کراچی

چنانچہ وہ ملکی اشیاء کے استعمال پر برابر زور دیتے رہتے تھے۔ اکبر کے متعدد اشعار اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ وہ اپنے وطن کی ہر چیز اور ہر ادا پر کتنے نثار تھے۔ کہتے ہیں۔ ؎
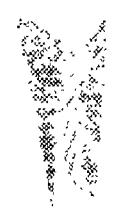
ہو وضع اپنے دیس کی مال اپنے دیس کا
بہتر ہے۔ راہ منزل بہبود لیجئے

اسی ضمن میں انھیں شاید اس امر کا بھی احساس تھا کہ دیہات کا رہنے والا شہر میں رہنے والوں سے زیادہ سادہ دل اور وطن پرور ہے۔ اس جذبہ کے تحت ذیل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

وطن دیس کی تھی جس میں سمجھا تھا اک دیہاتی
بنگلے سے ہے سلام، پوری ہو یا چپاتی

بہت سے ہندوستانی۔ انگریزی راج کے زمانہ میں انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے اور ان سے قربت حاصل کرنے کے لئے ہر طرح جتن کیا کرتے تھے۔

اکبر ایسے لوگوں کا ہمیشہ تمسخر اڑاتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز سے دوستی کا چاہے جتنا دم بھریئے وہ آپ کو اپنا غلام ہی سمجھتا رہے گا۔ کہتے ہیں ؎

آپ اکبر لاکھ مشق خوش سلامی کیجئے
کتنا ہی اظہار اعزاز دوامی کیجئے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اس شوخ کو
یا کھسکئے سامنے سے۔ یا غلامی کیجئے

اور اگر انگریز آقا کسی ہندوستانی کے ساتھ کوئی رعایت بھی کرتا تھا۔ تو اکبر اسے بھیک سمجھتے تھے ؎

ان کی ہر باتوں کو اکبر سیکھ لے
خود وہ فرمائیں گے پھر آ بھیک لے

اکبر کے متعلق تعلیم یافتہ طبقہ میں عام خیال یہ ہے کہ وہ انگریزی تعلیم کے معاملہ میں سخت رجعت پرست تھے۔ انھوں نے مغربی تحصیل علوم و زبان کے سلسلہ میں بڑی مخالفت کی یہاں تک کہ ہمیں پچاسوں سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس قسم کی رائے رکھنے والے حضرات کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کا مطالعہ انھوں نے سلیقہ سے نہیں کیا ورنہ وہ ان کے لئے اتنی غلط رائے نہ قائم کرتے۔ اکبر یہ نہیں کہتے تھے کہ تعلیم نہ حاصل کرو یا تہذیب مغرب کے پاس نہ پھٹکو۔ ان کا خیال تھا کہ سب کچھ کرو مگر اپنی وضع داری۔ اپنی مشرقیت۔ اپنی قومیت اور اپنی وطنیت نہ بھول جاؤ۔ ؎

کون کہتا ہے کہ انگلش سا نہ ہو دل سے مطیع
کون کہتا ہے کہ نہ کر الفت و حسن پیدا
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے کہ نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

حاصل کرو علم، طبع تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

وہ اپنے ملک کے ہر انسان کو ہنرمند اور صنعتی اعتبار سے وطن کو خود کفیل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ تقلید مغرب کرنا ہے تو مغرب کے ہنر سیکھو۔ موٹر پہ بیٹھنا ہے تو

مولے بانا بھی سیکھو ؎

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا ہے لد لیے، موٹر پہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ، تکلیفیں اٹھا
روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

اکبر کا خیال تھا کہ موجودہ انگریزی تعلیم وطن دوستی اور قوم پروری نہیں سکھاتی۔ بلکہ محض سرکار کی سرپرستی سکھاتی ہے۔ اسی تعلیم سے دل برداشتہ ہو کر اکبر نے یوں طنز کیا ہے ؎

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے نری بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے، فقط سرکاری ہے

اور اس تعلیم کا مطمح نظر کیا تھا ؟ ؎

بی۔ اے کی کمال کامیابی ہے یہی
سروس کے لگاؤ سے معزز بننا

اور ملازمت بھی کوئی بڑی ملازمت نہیں۔ معمولی کلرکی! چنانچہ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ ایک معمولی ملازمت کے لئے کوئی ہندوستانی اپنی عزت اور وقار ختم کر دے ؎

مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید، اور اتنی مصیبت، توبہ توبہ

ایک اور جگہ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ تعلیم ضرور حاصل کرو۔ مگر اس کا مقصد سرکاری نوکری نہ ہونا چاہیئے۔

علم و حکمت میں ہو اگر خواہش فہیم
سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ایم

قوم کی فلاح و بہبود کو پس پشت ڈال کر اپنی منفعت کے لئے انگریزوں سے تعاون کرنے والوں پر اکبر نے یوں طنز کیا ہے ؎

جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب ان اگروں پہ رونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے، معلوم نہیں کیا ہونا ہے

الشہاع

ہونہار شہری کے نئے ممبر

سلیم لطیف سلیم کراچی

"ٹھیکہ داروں نے کیا نیلام قومی روح کو۔ چھپا لی میں اب فقط روٹی کمایا کیجئے" "کوئی صاحب نہ ہوں للہ، ناخوش، سن کے یہ مصرع۔ خیالِ حب قومی پیچھے اور فکر شکم پہلے"

عروجِ قومی، زوالِ قومی، خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ ردّ و بدل کے اندر یہ امر پولیٹیکل رہا ہے

عالم عظیم آبادی

منگلا بند

للہ الحمد آج وہ شے بھی مہیا ہو گئی
خوابِ گمنامی میں جس پہ پاکستان کی
ہاں وہ منگلا بند جس کی وسعتیں ہیں بیکراں
چومتا ہے جس کی پیشانی کو جھک کر آسماں
آئینہ ہے یہ ہماری شوکتوں کا شان کا
"بند" ہے یا طرۂ دستار پاکستان کا
تجھ پہ صدقے تجھ پہ قربان واپڈا کے شاہکار
تجھ پہ تھا ذرعی مسائل کا ہمارے انحصار
تیرے احسان کی نظروں میں ہے عزت تری
میرے احسان سے دوچند ہے عظمت تری
آبپاشی کا ہے تو مضبوط و مستحکم نظام
تیرے معماروں کی خدمت میں عقیدت کے سلام

اختر غازی پوری

تعویذ

غلطی کس سے نہیں ہوتی ؟ مجھ سے بھی ایک غلطی ہوئی اور میں اچھی طرح بے وقوف بنا۔ کس طرح بنا، یہ بھی سنو۔ لیکن وعدہ کرو کہ تم کبھی ہماری طرح بے وقوف نہیں بنو گے۔

گزشتہ سال ۱۴ اگست کو پاکستان کے جشن آزادی کا میلہ دیکھنے کے لئے میں جیب میں دو روپے ڈال کر گھر سے نکلا۔ ہر طرف رونق تھی اور بھیڑ بھاڑ تھی۔ گھومتا پھرتا میں نواب پور پہنچا، وہاں ایک مجمع لگا دیکھا۔

ایک آدمی جو صورت سے خاصا شریف معلوم ہوتا تھا۔ درمیان میں کھڑا تقریر کر رہا تھا۔

" بھائیو! نہ میں کوئی جادوگر ہوں نہ پیر۔ میں صرف غریب بچوں کی مدد کرنے کے لئے نکلا ہوں "۔

اس کے بعد اس آدمی نے تھیلے سے کچھ پڑیاں نکالیں اور کہنے لگا۔ 'یہ ہے تعویذ'۔ صرف ان بچوں کے لئے جو امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں، یا جنھیں پاس ہونے میں دشواری ہوتی ہے۔ ایک تعویذ کا ہدیہ شریف صرف ایک روپیہ "۔

میں دو سال سے فیل ہو رہا تھا۔ ایسے کراماتی تعویذ کا نام سن کر بھڑک گیا۔ اور بولا" بھئی ایک تعویذ ادھر لاؤ "۔

اس آدمی نے اپنے معمول سے پوچھا۔ " اے معمول میں اسے تعویذ دے دوں ؟ "

معمول نے جواب دیا" ہرگز نہیں۔ یہ لڑکا تعویذ کی بے ادبی کرے گا "۔

اب اس نے کہا" تمہیں تعویذ ہرگز نہیں مل سکتا۔ چاہے تم ایک کے بجائے دو روپے دو "۔

لیکن میں کہاں ٹلنے والا تھا۔ بہت سے لڑکے ایک ایک کر کے تعویذ لیتے گئے اور اپنی راہ پکڑتے گئے۔

جب ہر طرف سناٹا ہو گیا۔ تو میں نے چپکے سے کہا۔

" بھائی دو روپے لیجئے۔ میں تعویذ کی بے ادبی نہیں کروں گا "۔ آخر بڑی منت سماجت کے بعد اس آدمی نے دو روپے لے کر مجھے تعویذ دے دیا۔

ایسی قیمتی چیز پاکر میں پڑھائی کی طرف سے بالکل بے فکر ہو گیا۔ اور جب نتیجہ نکلا تو فیل ہونے والوں میں پہلا نام میرا تھا۔ تعویذ کھول کر دیکھا تو اس میں لکھا تھا۔

" دل لگا کر پڑھو۔ یقیناً کامیاب ہو گے "۔

اقبال احمد خان

مرزا رفیع سودا

سودا اردو کے پہلے طنز نگار شاعر مانے جاتے ہیں لیکن ان کے یہاں تمسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری کا تمام تر سرمایہ ان کا ہجویہ کلام ہے۔ اس میں استہزاء، تمسخر، مضحکہ، پھکڑ پن، گالی گلوچ سبھی کچھ ہے سودا کی ہجویات زیادہ تر واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ شیخ چاندان کی ہجو گوئی سے متعلق لکھتے ہیں" سودا کی ہجو گوئی کے دو پہلو ہیں۔ اس نے کہیں کہیں لطیف مزاح سے کام لیا ہے۔ کمزوری، کوتاہی، برائی اور بدی کو ظریفانہ انداز میں عریاں کیا ہے لیکن مطمح نظر ہمدردی اور اصلاح ہے طیش میں آکر عام ذمائم پر غم و غصہ اور ناراضگی و بیزاری کا اظہار نہیں کیا بلکہ با اسلوب لطیف ان خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن کئی ہجویہ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں لعن طعن طنز و تشنیع اور سب و شتم سے کام لیا ہے۔" سودا بہت ہی حساس واقع ہوئے تھے اپنے مخالف کو کبھی معاف نہیں کرتے تھے جب بھی کسی کا کوئی فعل بار خاطر گزرا انھوں نے کچھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لی۔ لیکن اس سے ہٹ کر ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن کا شمار طنزیات میں ہوتا ہے ان میں فکر کی روشنی اور بصیرت کی آمیزش ہے۔ سودا کی مزاح نگاری بڑی حد تک زہرخند سے مشابہ ہے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں" سودا کا کلام مرتبت سے قطعاً مبرا ہے۔ ان کے کلام کا بہ حیثیت مجموعی مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ان کے ذہن اور فکر کو کسی ایسے مرحلہ سے شاذ و نادر ہی گزرنا پڑتا ہے جس کی فضا تاریک یا حزن آمیز رہی ہو"۔

گذشتہ شمارے میں جو سوال شائع ہوتے تھے ان میں جناب شفیق احمد پشاور کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان کے مطابق شفیق صاحب کے نام ایک سال کے لئے اس ماہ سے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

ریاض اشرف پٹنہ

س :۔ مختلف کتابوں میں میں نے پڑھا ہے کہ بابر نے ہمایوں کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔ بظاہر یہ واقعہ ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو بتلایئے اس کا راوی کون ہے اور کس بنیاد پر اس کی روایت کو صحیح سمجھا جا سکتا ہے۔

ج :۔ ریاض صاحب! یہ واقعہ صحیح ہے کیونکہ شہنشاہ بابر کی بیٹی اور شہنشاہ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے یہ واقعہ لکھا ہے۔ گلبدن بیگم خود ایک بلند پایہ شاعرہ اور مورخ تھی اور علماء اور فضلا کے حلقوں میں اسے وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ گلبدن بیگم نے اپنے مخصوص انداز میں اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ــ "بادشاہ بیمار بیٹے کے بستر کے گرد چکر لگاتا اور دعا کرتا جاتا ـ اے خدا اگر زندگی کا زندگی سے تبادلہ ممکن ہے تو میں اپنی زندگی ہمایوں کو دیتا ہوں" گلبدن بیگم نے لکھا ہے کہ "پھر اسی دن بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اور ہمایوں چند دن میں صحت یاب ہو گیا۔ بیماری کے عالم میں بابر نے ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ دو تین مہینے بیمار رہنے کے بعد بابر کا انتقال ہو گیا اور ہمایوں تخت پر بیٹھا"

انیس الحسن کراچی

س :۔ نئی نسل کے ادیب جن کو جدید ادیب کہتے ہیں دراصل اس دور کے ترقی پسند ادیب ہیں مگر ان کی تحریروں میں جدیدیت کے باوجود مسائل کا کوئی حل نہیں ہوتا اس لئے یہ جدید ادیب ترقی پسند ادیبوں سے بہت پیچھے ہیں اور ان کی تحریریں مبہم اور بے معنی ہیں۔ آپ میری اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں۔ اگر متفق نہیں تو پھر بازگشت کے عنوان کے تحت اس کا جواب دیں۔

ج :۔ انیس صاحب۔ آپ کا سوال بہت دلچسپ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ سے متفق نہیں ہیں۔ آپ نے ترقی پسندی کا مطلب نہ جانے کیا لیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "ترقی پسندی ایک نقطہ نظر ایک ہمہ گیر تصورِ حیات کا نام ہے۔ وہ ایک نقطہ۔ فارمولا یا مذہب نہیں سائنٹفک انداز نظر ہے اور اس انداز نظر سے زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا تجربہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور سیاسی حکمت عملی کا کوئی زاویہ بھی۔ مثلاً اس آگہی اور ارتعاش کو پیش کرنے کا ہے۔ ترقی پسندی کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہر نظم یا افسانہ حل ضرور پیش کرے یا خواہ مخواہ رجائیت کا روپ دھارے۔ ترقی پسندی کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ پڑھنے والوں میں سماجی تبدیلی کی صحت مند خواہش پیدا کر دے اور اشارے کنائے سے ہی ان میں صحت مند تجسس اور منزل کی تلاش کی خواہش جگائے۔" آپ اس نقطہ نظر کی روشنی میں نئی نسل کی تخلیقات کا جائزہ لیں اور پھر کوئی رائے قائم کریں۔

انیسہ نجمہ سمیع ملتان

س :۔ فن برائے ضرورت یا فن برائے زندگی کے نظریہ سے میری رائے میں فن کو نقصان پہنچا ہے۔ جب تک فن برائے فن رہا۔ فن نے ترقی کی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج :۔ محترمہ! بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری "فن برائے فن کے تصور سے حیات انسانی کی تاریخ بالکل ناآشنا ہے ہر زمانہ کا فن اس کی زندگی کیلئے وجود میں آیا اور اس کی بدولت زندہ رہا۔ انسان جو تخلیقی کوششیں کرتا ہے ان میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک اجتماعی میلان یا غایت نمایاں یا پوشیدہ ضرور ہوتی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی ہر کوشش ساقط الاعتبار ہے انسان کی فنی کوششیں اس کی ذاتی مسرت اور راحت کا بھی ذریعہ ہوتی ہیں اور پوری جماعت بلکہ اکثر تمام مخلوقات انسان کے لئے خیر و برکت کا سبب ثابت ہوتی ہیں۔"

مسرت مرزا (سرورق کے صفحہ ۲ سے مسلسل)

بہاؤ میں بہنے کے بجائے اسے اس کفایت شعاری سے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لینا مسرت مرزا کی ذہانت اور فکر کی دلیل ہے۔

کہیں کہیں ان کے یہاں علامتی اظہار ہے لیکن یہ علامتیں جو انہوں نے استعمال کی ہیں وہی ہیں جو ہماری روز مرہ کی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہیں اور جانی پہچانی ہیں۔ جیسے اپنی ایک تصویر ,,خوشی،، میں انہوں نے بلبلوں کو خوشی کے عارضی اور لمحاتی ہونے کی علامت بنایا ہے ,,خوشی کتنی دیرپا ہو سکتی ہے؟ میرے ذہن سے جواب ملتا ہے کہ اتنی ہی جتنا ایک بلبلہ کا وجود ،،۔

مسرت مرزا کی تصاویر میں ہیئت (form) کے ذریعہ کم، اور رنگوں کے امتزاج سے اظہار زیادہ ہے۔ ان کے لئے رنگ زیادہ معنی خیز ہیں کہیں یہ رنگ غم وافسردگی میں ڈوبے ہوئے سامنے آتے ہیں اور کہیں کہیں بلکہ بہت کم خوشی کے لبادے میں، لیکن اس خوشی میں بھی ذرا سی افسردگی کا تاثر باقی رہتا ہے۔

اس ماہ کے سرورق پر مسرت مرزا کی تصویر ''معصوم،، پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں اپنے موضوع کو انہوں نے سیدھے سادے طریقہ پر رنگوں اور تقریباً روائتی ہیئت میں بالکل نیچرل انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی یہ تصویر اور دوسری تصویریں ظاہر کرتی ہیں کہ ان کے موضوعات میں مشرقیت نمایاں ہے اور مغرب کی تکنیک کو انہوں نے صرف اپنے تقاضوں کے مطابق برتا ہے۔

مسرت مرزا پاکستان کے ہونہار اور نو عمر مصوروں میں سے ہیں۔ ان کا فن ابھی تجرباتی مراحل سے گزر رہا ہے لیکن ان کی ذہانت، تخیل، فکر اور لگن کی مظہر تصاویر ان کے روشن مستقبل کی نشاندھی کرتی ہیں۔

طالبہ زاہدہ رضا ایک تصویر مکمل کر رہی ہیں -

فنون لطیفہ کی درسگاہ

(سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس ۔کراچی)

برنس گارڈن سے ملحق آرٹس کونسل کراچی کی خوبصورت عمارت کی دوسری منزل پر چار فن کار، جن میں ایک جواں سال خاتون مصور بھی شامل ہیں روزانہ صبح سے شام تک تبلیغی جوش و خروش کے ساتھ فنون لطیفہ کے طلباء کو مصوری، نقاشی اور کمرشل آرٹ کی تعلیم دیتے ہیں - پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں فنون لطیفہ کی تعلیم کا جو کچھ بھی بندوبست ہے آرٹس کونسل کی یہ درسگاہ اس کا بہترین مظہر ہے - اور یہ صرف انہیں چار اساتذہ پر مشتمل ہے جن کے سربراہ علی امام ہیں، علی امام پاکستان کے ان چند مصوروں میں سے ایک ہیں، جو مصوری کے بین الاقوامی مراکز لندن اور پیرس میں مصوری کے نقادوں اور قدردانوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں - انہیں کی شخصیت اس درسگاہ کی روح رواں اور اس کے معیار کی ضامن ہے -

علی امام اور ان کے ساتھ پاکستان کی ایک اور نوجوان خاتون مصور لبنیٰ لطیف اس درسگاہ میں تصویر کشی کی تعلیم دیتے ہیں -

(باقی مضمون دیکھئے سرورق کا صفحہ ۳

کمرشل آرٹ کے شعبہ کے استاد نصیر رضا زیدی ایک طالبہ کو فن کی باریکیاں سمجھا رہے ہیں -

ہمارے نام

نجمہ عباسی

تازہ شمارے میں تصویری فیچر "ملایا کے جنگلوں میں" خاصا دلچسپ ہے۔ اس دور میں جب کہ انسان تسخیر چاند کے خواب دیکھ رہا ہے یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ابھی دنیا میں ایسے خطے بھی ہیں جہاں علم کی روشنی نہیں پہنچتی۔ کیا اس دور کا متمدن انسان جہالت کے اس اندھیرے میں علم کے چراغ روشن نہیں کر سکتا؟ (خانیوال)

احمد صغیر صدیقی

پر اسرار کہانیوں کے بعد اب میں سائنسی کہانیوں کو اردو میں منتقل کر رہا ہوں۔ کیونکہ اردو زبان اس سے تقریباً تہی دامن ہے۔ مغرب میں ان کہانیوں کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سائنس کی وہ کہانیاں اردو میں منتقل کی جائیں جنہیں عام پڑھنے والوں کا نہ صرف ذہن قبول کرے بلکہ یہ ذہنی شگفتگی کا باعث بھی ہوں تبھی تعلیمی نقطہ نظر سے بھی اس قسم کی کہانیاں افادی نوعیت کی حامل ہوں گی (ٹلہار)

سرفراز احمد

طویل عرصے کے بعد آپ نے اس بار سرورق پر مسرت مرزا کی پینٹنگ شائع کر کے جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ تجریدی آرٹ ایک طرف روز بروز مقبول ہو رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے جریدے اس آرٹ سے قطعی بیگانہ ہیں جیسے ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ آپ قابل ستائش ہیں کہ آپ نے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ایک ذہین فنکارہ کی پینٹنگ کو سرورق کی زینت بنا کر عام پڑھنے والوں کو جدید مصوری کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اس قسم کے سرورق پیش کریں گے۔ (نواب شاہ)

عطیہ پرویز ہاشمی۔ ایم اے۔

اشتیاق طالب کے مقالہ "نئی نسل اور پرانے نقاد" کے ذیل میں آپ نے الناس کے تحت جو کچھ لکھا ہے وہ جیسے میرے دل کی آواز ہے۔ نہ جانے کیوں ہمارے بزرگ فنکار اس قسم کے مضامین پڑھ کر چراغ پا ہو جاتے ہیں اور ان کے عنوان جہاں تک کے خلاف محاذ قائم کر لیتے ہیں جو غیر جانبدارانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اعتراض کرنے والے کیونکہ صداقت کو نہیں اشتہاء جھٹلا سکتے۔ اس لئے سنجیدہ بحث سے کتراتے ہیں۔ البتہ ایک کارڈ یا لفافہ لکھ کر مدیر کو جلی کٹی سنا کر اپنی ادبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ میں ان تمام حضرات کو جو اس مضمون سے متفق نہیں ہیں مباحثہ کی دعوت دیتی ہوں اور یہ یقین دلاتی ہوں کہ اگر وہ سنجیدگی سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کریں گے تو بالآخر وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ نئی آوازیں زیادہ جاندار اور صحت مند ہیں۔ اور ان کا حلقہ اثر روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ (سلطانپور)

پروفیسر سہیل انور

تازہ شمارے میں نظموں کا معیار اشجاع کی روایات کی نفی کرتا ہے۔ خدارا ایسی مہمل اور بے تکی نظمیں شائع نہ کیجئے جو ماسوا شاعر کے کسی اور کی سمجھ میں نہ آ سکیں۔ غزلیں اچھی ہیں۔ بالخصوص بہار کوٹی، عباس امید، فیروز ناطق نے متاثر کیا۔ تمثیلچہ "جھوٹ کے پاؤں" پڑھ کر لطف آگیا۔ مصنف نے معاشرہ کی ایک عام تصویر کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ مزاح کی چاشنی نے اس کے رنگوں کو اور نکھار دیا ہے۔ (ممبئی)

خالد ندیم

طویل انتظار کے بعد اشجاع نظر نواز ہوا۔ اس زمانہ میں جب کہ اچھی چیزیں کم لکھی جا رہی ہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آپ بلند پایہ اور معیاری تخلیقات کیسے حاصل کر لیتے ہیں۔ شعری حصہ میں عنوان چشتی اور قطب سرشار کی نظمیں کافی خوبصورت ہیں لیکن غزلیں آج کی غزل کی نمائندہ نہیں ہیں۔ تمثیلچہ بے حد پسند آیا۔ ہمارے اردگرد ایسے کردار بکھرے ہوئے ہیں۔ بھرپور طنز و مزاح، مکالموں کی چستی اور ڈرامائی کیفیت نے اس تمثیلچہ کے فنی معیار کو بہت اونچا کر دیا ہے۔ نعیم اقبال اور جمیل زبیری کی کہانیاں چونکا دینے والی ہیں۔ اثر فاروقی کا قلم پاتھ ہموار ہے لیکن آخر میں جا کر اچانک اس میں گڑھے پڑ گئے ہیں۔ اختتام اتنی عجلت سے کیا گیا ہے کہ اس کا تاثر باقی نہیں رہا۔

(راولپنڈی)

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی ای / جی / ڈی ۸۹۴/۶۶۶۹
مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

مرتب

ایس ایم غیاث الدین ـــ سلمان الارشد

طابع و ناشر

ایس ایم شجاع الدین

زیر اہتمام
سلطان کلیم

زرِ سالانہ: پانچ روپے ـــ فی شمارہ: پچاس پیسے
فون نمبر ۵۲۳۳۳ (پریس) ـــ ۵۵۲۱۲ (شعبۂ ادارت)

شعبۂ نشر و اشاعت
ٹائمز پریس
مینسفیلڈ اسٹریٹ صدر کراچی

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر و پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا۔

اس شمارے کے چند فنکار

- ڈاکٹر عابد حسین
- ڈاکٹر فرمان فتح پوری
- ڈاکٹر احراز نقوی
- خلیل الرحمٰن اعظمی
- پروفیسر شاہد عشقی
- جاں نثار اختر
- ابن فرید
- محمد احمد سبزواری
- غلام ربانی تاباں
- شہریار
- نشور واحدی
- جان مینسفیلڈ
- جمال میر صادقی
- مانک ٹالہ
- شبی فاروقی
- یٰسین معصوم
- شمیم نوید

ان کے علاوہ:-
اور دوسرے

مشرقی پاکستان میں:-
الشجاع ہوائی ڈاک سے
فی شمارہ: ۶۵ پیسے

جلد-۱۶ ۱۹۶۸ء شمارہ-۴۵

مستقل مزاج
کیوینڈرز کو
پسند کرتے ہیں

کیوینڈرز سگریٹ، تمباکو کی بہتر
عمدہ معیار کے حامل ہونے کی وجہ سے
ہیں - یہ عام سگریٹوں سے مقابلتاً بڑے اور
تسکین حاصل ہوتی ہے - انہی خوبیوں کے سبب ان

آمیزش، اعلیٰ قوام اور اپنے روایتی
سگریٹ نوشی کا صحیح لطف بخشتے
مختلف ہیں - انہیں پینے سے دیرپا
کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے

CAVANDER'S
MEDIUM
NAVY CUT
MAGNUM

۳۸ پیسے میں ۱۰

مالکان:- پریمیئر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
بہ اشتراک:- گوڈفرے فلپس لمیٹڈ - لندن

UNITED

CAV/8/7/66

التماس

امریکہ کے عظیم نیگرو رہنما ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کا بہیمانہ قتل اس سال کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ ڈاکٹر کنگ کو اپنے نظریات کی بنا پر امن و آشتی کے پیامبر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ دنیا میں امن کے داعی تھے۔ ایک طویل عرصہ سے لوتھر کنگ امریکہ کے نیگروؤں کے بنیادی انسانی حقوق کی بحالی کے لئے جرأت مندانہ جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ عدم تشدد کے اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے اپنی پر امن تحریک بڑی کامیابی سے ساتھ چلا رہے تھے۔ ڈاکٹر لوتھر کنگ کے صحت مندانہ اور مثبت نظریات کی بنا پر عالمی رائے عامہ ان کے ساتھ تھی۔ لیکن ان کا قتل ان لوگوں کی بزدلی اور مایوسی کا مظہر ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کی دشمن ہیں۔ جن کی لغت میں حق و انصاف کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس وحشیانہ قتل کی دنیا بھر میں مذمت کی گئی۔ تمام امن پسندوں نے اسے ایک اندوہناک سانحہ قرار دیا ہے۔ امریکہ کے نائب صدر ہمفرے نے تو واشگاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ:۔

"ڈاکٹر لوتھر کنگ کے قتل سے امریکیوں کا سر ندامت سے جھک گیا ہے"

اگر ندامت سے جھکے ہوئے یہ سفید فام سر اب بھی فراخ دلی کے ساتھ نیگروؤں کو آبرومندانہ طریقہ پر زندگی گزارنے کے مواقع بہم نہیں پہنچائیں گے تو پھر یہ سر کبھی بلند نہیں ہوسکیں گے۔ اور امن و انصاف کے لفظ بے معنی ہو جائیں گے۔

اس شمارے میں ڈاکٹر لوتھر کنگ کے عنوان سے ایک اہم مضمون پیش ہے جس میں اس عظیم رہنما کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس مضمون کے علاوہ شخصیت و فن کے تحت اردو کے صاحب طرز انشاپرداز اور شاعر مولانا ارشد تھانوی مرحوم سے متعلق افادی نوعیت کے حامل مضامین اس شمارے کی زینت ہیں جن کے مطالعہ سے نئی نسل کو مولانا کی علمی و ادبی خدمات کا اندازہ ہوگا۔

ڈاکٹر اعزاز نقوی کا مضمون "ایرانی تہذیب" اختصار کے باوجود فکر انگیز ہے۔ گزشتہ دو سال سے الشجاع میں جو پر اسرار کہانیاں شائع ہو رہی تھیں ان کو قارئین نے بے انتہا پسند کیا تھا لیکن اچھی کہانیاں نہ ملنے کی وجہ سے اب اس سلسلہ کو ختم کر کے اس کے بجائے سائنسی کہانیوں کا نیا سلسلہ اس شمارے سے شروع کیا جا رہا ہے۔ الشجاع کے دیرینہ قلمی معاون جناب احمد صغیر صدیقی نے اس ذیل میں جو کہانیاں اردو میں منتقل کرنے کے لئے منتخب کی ہیں۔ موضوع اور فن کے اعتبار سے ان کا شمار مغرب کی بہترین سائنسی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ "روبوٹ ۱۳" اس سلسلہ کی پہلی کہانی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

افسانوی حصہ میں مالک تالد کے علاوہ باقی دونوں نام نئے ہیں لیکن ان کے افسانے ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

شعری ادب میں ابن فرید۔ جاں نثار اختر۔ شاہد عشقی۔ صفی فاروقی۔ ظہیر۔ یار اللہ بہار کوٹی کے نام شعری تخلیقات کے معیار کی ضمانت ہیں۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی رائے سے نوازیں تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ اس شمارے کی ترتیب میں ہم کس حد تک کامیاب رہے۔

آپ کا مخلص

شجاع الدین

ناشر

تصویری فیچر

نوشتہ: ڈبلیو رابرٹ
تلخیص و ترجمہ: یٰسین معصوم

ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ

امن و آشتی کا نقیب

رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے لیکن سڑکوں کی روشنی میں لورین ہوٹل کی دوسری منزل کی بالکونی صاف نظر آ رہی تھی۔ اسی وقت اس نے کمرہ کا دروازہ کھولا اور باہر بالکونی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کا ذہن اس جلوس کے نتائج پر غور کرنے لگا جس کی پُرامن قیادت اس نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۸ء کو کی تھی۔ اور پھر وہ اس پُرامن مظاہرے کے متعلق سوچنے لگا جس کی قیادت اسے دو روز بعد کرنی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ یکبارگی رک گیا۔ اس نے اپنے سامنے پھیلی ہوئی وسیع کائنات کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور چہرے پر طمانیت کی روشنی پھیل گئی۔ اور عین اسی وقت ٹھائیں۔ ٹھائیں۔

رات کے سناٹے میں ایک خوفناک آواز گونجی اور شب کی چادر تار تار ہو گئی۔ وہ یکبارگی اپنی جگہ سے اچھلا اور گر پڑا۔ اسے اپنے چہرے اور گردن پر گرم گرم خون کی بارش ہوتی محسوس ہوئی۔ اور پھر پوری کائنات غم کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اور تھوڑی دیر میں یہ خبر پوری دنیا میں پھیل گئی کہ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ قتل ہو گئے۔ رات گزر گئی مگر ہر دل پر غم کا اندھیرا تھا۔ دکھ کا بوجھ تھا اور ہر آنکھ میں آنسوؤں کے موتی تھرتھرا رہے تھے۔ اس کا بے جان جسم ساکت و صامت تھا۔ وہ جو کل رات کو بالکونی میں ٹہل ٹہل کر شہری حقوق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج تمام چیزوں سے بے پرواہ بے نیاز نہایت آرام اور سکون سے خاموش تابوت میں لیٹا تھا۔ ہر قدم اس کے پاس آتا۔ لمحہ بھر کے لئے رکتا۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اسے تکتیں اور پھر وہ قدم آگے بڑھ جاتا۔ ایک بوڑھی عورت آگے بڑھی اور تابوت میں لیٹے ہوئے مارٹن کی پیشانی کو چوما۔ ایسے جیسے وہ اپنے بیٹے کو چوم رہی ہو۔ اور چلا چلا کر بین کرنے لگی۔ پھر ایک جوان جسم آگے آیا۔ دو زانو ہو کر جھکا۔ پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ جیسے وہ مارٹن نہیں اس کا اپنا بھائی تھا۔ اپنا

لورین ہوٹل میمفس (ٹینسی) جس کی دوسری منزل کی بالکونی پر کھڑے ہوئے مارٹن لوتھر کنگ کو گولی ماری گئی۔

المطب

محبوب تھا۔

ہاں وہ سب کا بیٹا تھا۔ سب کا بھائی تھا۔ سب کا محبوب تھا کیونکہ وہ امن مساوات اور عدل و انصاف کا پیامبر تھا۔ اخوت اور انسانیت کا مبلغ تھا۔ رنگ، نسل اور معاشرتی برتری کے جھوٹے بتوں کا پرستار نہ تھا۔ گورے امریکہ میں بسنے والے لاکھوں نیگروؤں کے حقوق کا محافظ تھا۔ شہری حقوق کا علمبردار تھا اور عدم تشدد پر ایمان رکھنے والا تھا۔

مگر جب امریکہ کی ریاست جارجیا میں اس کا آخری سفر شروع ہوا تو ریاست کے گورنر نے اس کے جنازے میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ وہ نیگرو تھا کالا تھا۔ انسانی مساوات اور عدل کا خواہاں تھا۔ وہ شہری حقوق کا علمبردار تھا۔ مارٹن لوتھر کنگ مر گیا مگر حق و صداقت کی آواز دور دور پھیل گئی۔

وقت کے قدم رک گئے۔ اور گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹنے لگی۔

"چٹاخ" اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ پڑا۔

"بیوقوف کالے دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ میرا پیر کچل دیا۔"

چھ سالہ نیگرو بچے نے بڑی بے بسی سے اس سفید فام عورت کو دیکھا۔ اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک جگہ کھڑے کھڑے اسے جا...

کیسے کسی دوسرے کا پیر کچلا جا سکتا ہے۔ وہ تو کب سے وہیں کھڑا اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ خریداری سے فارغ ہو جائے تو اس کے ساتھ گھر جائے۔ یہ ۱۹۳۵ء میں پہلا نسلی طمانچہ کھانے والا چھ سالہ بچہ مارٹن لوتھر تھا۔

اور یہ بھی ۱۹۳۵ء ہی کا واقعہ ہے۔ پادری مارٹن لوتھر کنگ سینئر اپنے چھ سالہ بچے کا ہاتھ پکڑے جوتوں کی ایک دوکان میں داخل ہوا۔ وہ سامنے والی نشستوں پر بیٹھ گئے اور جوتوں کا آرڈر دیا۔ دوکاندار نے ایک نظر ان پر ڈالی اور پادری سے کہا کہ وہ اپنے بچے کو دوکان کی پچھلی نشستوں پر لے جائے۔

"کیوں؟ یہاں کیا برائی ہے؟" پادری نے پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ نشستیں صرف گوروں کے لئے مخصوص ہیں۔ کالوں کے لئے دوکان کا پچھلا حصہ ہے۔"

"نہیں۔ اگر ہمیں جوتے دینے ہیں تو ہم انہیں نشستوں پر بیٹھ کر خریدیں گے ورنہ نہیں۔" پادری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اگرچہ اس زمانے میں جوتوں کی اتنی مانگ نہ تھی اور دوکاندار کے لئے ایک گاہک بھی بڑا قیمتی تھا۔ مگر دوکاندار نہ مانا۔ اور اپنی بات پر اصرار کرتا رہا۔ پادری مارٹن لوتھر کنگ سینئر نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور دوکان سے باہر آ گیا۔ اور ننھا مارٹن سوچتا رہ گیا کہ ہم اگلی نشستوں پر کیوں

ڈاکٹر کنگ کی بچی اور دو لڑکے اٹلانٹا میں باپ کا دیدار کر رہے ہیں۔ ان کی پشت پر ڈاکٹر کنگ کی بیوہ کھڑی ہیں

نہیں بیٹھ سکتے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک چودہ سالہ نیگرو لڑکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ریاست اٹلانٹا کے مقام میکان سے اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اور جلد سے جلد گھر پہنچ کر یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا کہ وہ ریاست کے مقامی تقریری مقابلے میں دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ جب وہ سب چار جارڈ مین بس اسٹاپ پر پہنچے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بس خالی کھڑی تھی وہ سب لپک کر اس میں بیٹھ گئے بس چلنے ہی والی تھی کہ ایک سفید رنگ کا فربہ اندام شخص بس میں داخل ہوا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ پھر اس نے باہر دیکھا جہاں اس کے بہت سے سفید رنگ والے ساتھی کھڑے تھے۔ بس میں نیگرو طالب علم خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ غصہ سے اس موٹے آدمی کی کنپٹیاں جلنے لگیں اس نے ڈرائیور کے کان میں کچھ کہا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر کھڑا ہوا۔ طرہ بھر جائزہ لیا اور پھر چیخا۔

"نیگرو۔ تم سب سیٹیں چھوڑ کر بس کے پچھلے حصہ میں چلے جاؤ جلدی کرو"۔ ڈرائیور کی اس آواز پر یکدم خاموشی چھا گئی۔

"سنا نہیں تم نے۔ کیا تمہاری شامت آئی ہے"۔ وہ دوبارہ اشتعال

ڈاکٹر کنگ کے سوگ میں ہزاروں افراد کا جلوس۔ جس کی قیادت مقتول کی بیوہ نے کی سنگین کے پیچھے بیوہ کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔

دھاڑا۔ اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ مارٹن کنگ کے برابر سے ایک بوڑھا نیگرو اٹھا اور پیچھے چلا گیا۔ پھر ایک سالی خاتون اپنے بچے کو گود میں سنبھالتی ہوئی اٹھی اور پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ مارٹن خاموشی سے بیٹھا یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ اب یہ نظارہ اس کے لئے نیا نہ تھا۔ ہر کالا آدمی سفید آدمی کے تعصب کا نشانہ تھا۔

ڈرائیور پھر چیخا۔

"جلدی کرو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے"۔ اس نے مارٹن اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اٹھ جانا چاہئے"۔ مارٹن کا ایک دوست اس کے کان میں بولا۔

"نہیں۔ ہم نہیں اٹھیں گے اس لئے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط ہے"۔ مارٹن کنگ نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ مارٹن کے خیال سے سیاہ طلباء کی اکثریت متفق تھی اس لئے کہ وہ پہلے آئے تھے۔ اور یہ کہ انھوں نے بھی اتنا ہی کرایہ ادا کیا تھا جتنا کہ کسی سفید فام نے۔ پھر وہ کیوں کھڑے ہو جائیں۔

"اچھا تو یوں کام نہیں چلے گا"۔ ڈرائیور دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میں تم سالوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ فسادیو تم سب جیل کی ہوا کھا رہے ہو گے"۔ لیکن اس سے پہلے کہ ڈرائیور اپنی

سپیٹ سے اتر کر ان تک آتا۔ بس میں سے ایک باریک خوفزدہ آواز اُبھری۔ "ٹھہرو"۔ یہ بچوں کی استانی تھی جو ان کے ساتھ ساتھ تھی "ہم اُٹھے جاتے ہیں"۔ پھر اس نے تمام طلبار کو حکم دیا کہ وہ نشستیں چھوڑ کر پیچھے جا کر کھڑے ہو جائیں۔

مارٹن کنگ نے حیرت سے اپنی استانی کو دیکھا۔ اور سوچا کہ کیا وہ نہیں جانتیں کہ یہ ناانصافی ہے۔ یہ ظلم ہے۔ یہ تعصب ہے یہ نسلی امتیاز ہے۔ اس نے احتجاج کیا۔ مگر استانی نے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ ہم ڈرائیور کے حکم کی تعمیل کریں۔ آہستہ آہستہ تمام کالوں کی سیٹیں خالی ہو گئیں۔ مارٹن کنگ کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ اسے مقابلے میں جیتا ہوا انعام انتہائی حقیر نظر آنے لگا۔

جنوب کی تمام ریاستوں میں کالے اور سفید کا فرق ہر جگہ عدم مساوات کا ثبوت تھا۔ اور کالے اور گوروں کو مہیا کی جانے والی شہری سہولتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور قدم قدم پر یہ ٹکراؤ کالے ذہنوں پر تازیانہ کا کام دیتا تھا۔ اور مارٹن لوتھر کنگ بھی ایک کالا تھا وہ اس امتیازی برتاؤ سے کیسے بچ سکتا تھا۔ اسکول، بازار، کلب، چرچ، تفریح گاہ، ہوٹل، غرض ہر جگہ یہ ٹکراؤ تھا۔ اور ہر ٹکراؤ پر اس کا ذہن جھنجھنا اٹھتا۔ ایسا کیوں ہے؟۔ ایسا کیوں ہے؟ کیوں؟ کیوں؟۔ اور وہ اس کیوں کا جواب سوچنے لگتا۔ جو سوالیہ نشان بن کر ہمہ وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتا۔

پادری مارٹن لوتھر کنگ سینیئر ایک مذہب پرست تھا۔ اس کی بیشتر زندگی مذہب کے پرچار میں گذری تھی چنانچہ وہ ایک گرجا سے متعلق تھا۔ گرجا گھر کے قریب ہی ایک دو منزلہ مکان میں کنگ خاندان آرام و آسائش سے اپنی پرسکون زندگی بسر کرتا تھا۔ مارٹن کنگ جونیئر کا بچپن انتہائی ناز و نعم میں گذرا۔ اسے غربت افلاس اور پریشانی سے کبھی واسطہ نہ پڑا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا لباس زیب تن کرتا اور اچھی غذا کھاتا۔ اس کا شمار ذہین طلبار میں ہوتا۔ بچپن میں اس نے ایک سال میں کئی کئی امتحانات پاس کئے۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے اٹلانٹا کے مور ہاؤس کالج میں داخلہ لے لیا۔ الشجاع

پھر یہاں سے اسے ڈاکٹریٹ کے لئے وظیفہ مل گیا اور وہ بوسٹن یونیورسٹی چلا گیا۔ بوسٹن یونیورسٹی میں اس کی ملاقات کوریٹا اسکاٹ سے ہوئی جو ریاست الاباما کی رہنے والی تھی۔ اور موسیقی کی طالب علم تھی۔ کنگ نے اسے دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ کوریٹا اسکاٹ خود موسیقی میں تحلیل ہو کر اس کی روح میں سما گئی ہے۔ کوریٹا جو اسی کی طرح نیگرو تھی۔ کالی تھی۔ مگر جس کی روح اور دل بڑا ہی گورا تھا۔ نسلی امتیاز اور عدم تشدد میں وہ بھی اس کی ہمنوا تھی۔ چنانچہ کنگ نے اسے اپنا جیون ساتھی بنا لیا۔ یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اپنی بیوی کے وطن منٹگمری چلا آیا۔ اور یہاں ڈیکسٹر بیپٹسٹ چرچ میں نوکری کر لی۔

۱۹۵۴ء میں مارٹن کنگ کا منٹگمری چلے آنا ایک بہت بڑی تحریک کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اور جنوبی ریاستوں میں مساوات اور شہری حقوق کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے امریکہ کے نیگروؤں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور انھیں سفید فام آقاؤں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ انھیں عزت اور وقار سے ہم کنار کیا۔

۱۹۵۵ء میں اچانک ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک نیگرو خاتون نے بس کی اگلی نشست چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ فوراً ہی اسے نافرمانی کی سزا ملی اور وہ منٹگمری جیل میں ڈال دی گئی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر ساری ریاست میں پھیل گئی۔ فوراً نیگرو لیڈروں کا اجتماع ہوا جس میں مارٹن کنگ کے علاوہ پادری رالف ابرنا تھی بھی شامل تھا۔ اور فوراً منٹگمری امپرومنٹ ایسوسی ایشن (ایم۔ آئی۔ اے) کا قیام عمل میں آیا۔ نیز فیصلہ کیا گیا کہ تمام نیگرو علامتی طور پہ ایک دن کے لئے بسوں کا بائیکاٹ کریں۔ ایم۔ آئی۔ اے کا صدر نوجوان مارٹن لوتھر کنگ کو منتخب کیا گیا۔

۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کی صبح مارٹن لوتھر کنگ اور اس کی بیوی کوریٹا جیکسن اسٹریٹ کے نکڑ پر کھڑے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کے سامنے سے ایک بس گذری۔ جس میں صرف ایک آدمی تھا اور وہ تھا ڈرائیور۔ کنگ اور کوریٹا نے حیرت اور خوشی کے ملے

جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کو قطعاً یہ امید نہ تھی کہ ان کی بائیکاٹ کی اپیل سو فی صد کامیاب رہے گی۔ وہ اپنی پہلی کامیابی پر خوش خوش گھر آئے۔ تھوڑی دیر بعد ایم۔ آئی۔ اے کے نائب صدر رالف ابرناتھی کا فون آیا۔ اس نے مارٹن کو مبارکباد دی۔ معاً مارٹن لوتھر کنگ کو بارہ سال پہلے کا وہ دن یاد آگیا جب اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسی طرح بس کی نشستیں چھوڑ کر کھڑا ہو جانا پڑا تھا۔ ذلت کے اس احساس کی تلخی وہ ابھی تک نہ بھولا تھا۔

بسوں کے بائیکاٹ کے اس واقعہ سے منٹگمری کے نیگرو اور سفید فام باشندوں کے درمیان دشمنی کے پھندے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ شروع شروع میں سرکاری حکام اور بسوں کے مالکان کا خیال تھا کہ یہ بائیکاٹ بہت جلد خود دم توڑ دے گا کیونکہ پچاس ہزار نیگرو وؤں کے لئے بسوں کا استعمال ناگزیر تھا۔ مگر جب دن پر دن گزرتے رہے اور بائیکاٹ ختم ہونے کی صورت نظر نہ آئی تو سرکاری حکام اور مالکان بس مارٹن لوتھر کنگ سے ملے۔ کنگ ظاہری مساوات اور حقوق حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور سفید فام آقا انھیں اسی پرانے ڈھب پر رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ بات چیت ناکام ہو گئی۔ مارٹن لوتھر کنگ بڑی ہوشیاری اور عقلمندی سے اپنی تنظیم کی پرامن قیادت کرتے رہے۔ جن نیگرو وؤں کے پاس اپنی ذاتی کاریں تھیں وہ انہوں نے عام کالوں کے لئے وقف کر دیں۔ حکام نے یہ دیکھ کر ٹریفک کے قوانین انتہائی سخت کر دیئے۔ مگر وہ اس تعاون کو ناکام نہ بنا سکے۔ اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے مارٹن لوتھر کنگ کو صف اول کا ہیرو بنا دیا۔ اور ان کی تنظیم کو کچھ اور مستحکم کر دیا۔

۳۰ جنوری ۱۹۵۶ء کی رات کو گیارہ بجے کے قریب ایک کالی کار تیزی کے ساتھ مارٹن کے گھر کے سامنے رکی۔ دروازہ کھلا اور ایک پراسرار شخص نے انتہائی تیزی کے ساتھ ایک بنڈل گھر کے دروازہ پر پھینکا۔ دوسرے لمحہ وہ کار میں داخل ہوا اور کار اسی تیزی کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس وقت مارٹن لوتھر کنگ جلسے میں شریک ہونے
السنجاع

گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی کوریٹا اپنی ایک سہیلی میری لوسی کے ساتھ ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی۔ قدموں کی چاپ اور دروازہ پر کچھ گرنے کی آواز سن کر میری لوسی اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کی جانب بڑھی۔ مگر کوریٹا نے اسے روک دیا کیونکہ اس کے ذہن میں وہ تمام دھمکیاں گونج اٹھیں جو وقتاً فوقتاً مارٹن اور اسے ٹیلیفون پر آتی رہتی تھیں۔ کوریٹا نے اپنی بچی کو بستر سے اٹھایا۔ میری کا ہاتھ پکڑا اور تیزی کے ساتھ گھر کے پیچھے باغ میں چلی گئی۔ اسی لمحہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بم پھٹ گیا۔

"ذلیل کتے کو اب پتہ چلے گا کہ ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں" دوڑتی کار میں بیٹھے ہوئے ایک سرپھرے نے دوسرے سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "بہت لیڈری کے چکر میں رہتا تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان بدمعاش کالوں کا دماغ روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ان کو انگلی پکڑنے کی اجازت دو تو یہ پہنچا ہاتھ پکڑتے ہیں"۔ دوسرے نے پہلے کی رائے پر صاد کیا۔

کار تو تاریکی میں غائب ہو گئی۔ مگر ذرا ہی دیر میں آس پاس کے لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ اور انھوں نے گورے آقاؤں کے خلاف باغیانہ نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آگئی اور مارٹن بھی۔ لوگوں میں اشتعال پھیلتا جا رہا تھا۔ نعرے بلند سے بلند ہونے لگے۔ پولیس نے لوگوں کو منتشر کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ تب پولیس نے مارٹن سے درخواست کی کہ وہ ان کی مدد کرے۔ مارٹن نہایت وقار سے مجمع کے سامنے آیا۔ اور انہیں پرسکون لہجہ میں گھروں کو واپس لوٹ جانے کو کہا۔ اس نے کہا "جو تلوار کے سہارے زندہ رہتا ہے وہ تلوار ہی سے تباہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں نظم و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی مہم پرامن طور پر جاری رکھنی چاہیئے۔ ہم حق پر ہیں اور خدا ہمارے ساتھ ہے"۔ دوسرے لمحہ لوگ گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے اور پولیس مارٹن کا منہ تک رہی تھی۔

اس کے دو دن بعد ہی منٹگمری کی کاؤنٹی کونسل جیوری نے سو سے زیادہ نیگرو لیڈروں پر شہری ٹرانسپورٹ کو تباہ و برباد

کرنے کے الزامات لگا کر انھیں گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ کیونکہ انھوں نے بسوں سے گوروں اور کالوں کی تفریق ختم کرنے کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا۔ اخبارات کے صفحے کے صفحے نیگروؤں کے مسکراتے چہروں سے مزین ہو گئے۔ جو جیل اس طرح جا رہے تھے جیسے چرچ میں شادی کی رسومات ادا کرنے جا رہے ہوں۔ آخر کار امریکی سپریم کورٹ نے ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو بسوں میں سے کالے اور گورے کی تفریق ختم کر دی۔ اس طرح ایک دن کے لئے کی جانے والی بائیکاٹ کی تحریک ایک سال سے زائد جاری رہنے کے بعد فتح کی صورت میں ختم ہو گئی۔ اب ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ عالمی شہرت کا مالک بن چکا تھا۔

منٹگمری کی ان فتوحات سے کالوں کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور ان میں ایک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ جنوبی ریاستوں کے تمام نیگرو لیڈروں نے مارٹن کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیا۔ اور جنوبی کرسچین لیڈر شپ کی تنظیم وجود میں آئی جس کا صدر مارٹن کنگ کو منتخب کیا گیا۔

ریاست الاباما میں بہت سے انتہا پسند ایسے تھے جو کسی بھی صورت میں نیگروؤں کی زندگی میں کوئی اچھی تبدیلی کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ کالوں کی مخالفت اب فرداً فرداً نہیں بلکہ گروہ بندی کی صورت میں ہونے لگی۔ اس طرح کا ایک دہشت پسند گروہ منٹگمری بھی آیا۔

۱۰ر جنوری ۱۹۵۷ء کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ستارے اپنے سفر کی آخری منزل پر تھے۔ اور صبح کی ملگجی روشنی بھی پورے طور پر نہ پھیل پائی تھی کہ ایک کار تیزی سے آئی اور۔ ایم۔ آئی۔ اے۔ کے نائب صدر رالف ابرناتھی کے مکان پر رکی۔ کار میں سے ایک لمبا تڑنگا شخص نکلا اور انتہائی احتیاط سے ایک بنڈل دروازہ پر ڈال دیا۔ کار آگے روانہ ہوئی اور ہوچنس بیپٹ چرچ کے دروازہ پر بھی ایک بنڈل رکھ دیا گیا۔ کار پھر تیزی سے آگے بڑھی اور ماؤنٹ الیو رچرچ اور فرسٹ بیپٹسٹ چرچ پر بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ کار کی اگلی منزل ایک ایسے پادری کے گھر کی تھی الشجاع

ہوتا تو سفید فام مگر کالوں کے حقوق کا حامی۔ اور جب چند لمحوں کے وقفے سے ان تمام جگہوں پر بم پھٹے تو شہر بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رات کو شہر پر یا تو کوئی ہوائی حملہ ہوا ہے یا پھر کسی زبردست زلزلے نے ان عمارتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ نیگرو غضبناک ہو گئے لیکن یہاں ایک بار پھر مارٹن کنگ کی عقلمندی آڑے آئی اور فسادات کا خطرہ ٹل گیا۔

گورے اور کالے کے تنازعات روز بروز ترقی پذیر تھے۔ گورے کالوں کو دہشت زدہ کر کے اپنی برتری کو تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ ہنگامے روز مرہ کی بات تھے۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب جنوبی ریاستوں میں کسی گورے اور کالے کا کسی نہ کسی بات پر ٹکراؤ نہ ہوتا۔ کالوں میں جتنا اپنے حقوق کے منوانے کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی اتنا ہی گورے ان کے حقوق کو پامال کرنے پر تلے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے سیاست، چالاکی اور ہوشیاری سے خود کو پس پردہ رکھ کر کچھ کالے کے کالوں کو بطور مہرہ آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ مارٹن لوتھر کنگ کے مخالفوں میں گوروں کے ساتھ ساتھ کچھ کالے مہرے بھی تھے۔ ڈاکٹر مارٹن اب ہر جگہ مقبول عام و خاص تھے۔ وہ جس طرف بھی نکل جاتے ان کے ہم نسل ان کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کرتے۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو ڈاکٹر مارٹن ہارلم کے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں تھے کہ لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔ وہ لوگوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور شوقین نوجوانوں کو آٹوگراف بھی دیتے جا رہے تھے کہ دوکان میں ایک کالی خاتون داخل ہوئی۔ اس نے مجمع کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا اور پاس کھڑی ایک اور خاتون سے پوچھا "یہ مجمع کیسا ہے۔ وہ کون ہے؟" "وہ۔ وہ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ اور کون؟" دوسری نے حیرت سے پہلی کو دیکھا۔ "اچھا" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ اور پھر ٹر کی طرف بڑھی۔ مجمع کو چیرتے پھاڑتے وہ سب سے اگلی قطار تک پہنچ گئی۔ اس کی اس حرکت پر بہت سے لوگ چڑ بڑ بھی ہوئے۔ کسی نے دبے لفظوں میں اس کی

اسے بدتمیزی پر ٹوکا بھی۔ لیکن وہ سب کچھ سنی ان سنی کر کے ڈاکٹر مارٹن کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لٹکے پرس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس کے ہاتھ نے ایک چھوٹا سا پستول چھوا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پرس سے ہاتھ نکال لیا وہ ایک قدم اور آگے بڑھی اور ڈاکٹر مارٹن پر اس طرح جھکی جیسے وہ اس کے کان میں کچھ کہنا چاہتی ہو۔ ڈاکٹر مارٹن اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "اچھا تو تم ہو اس فساد کی جڑ" وہ ڈاکٹر مارٹن کے کان میں بولی۔ جواباً مارٹن نہایت اخلاق سے مسکرائے اور اس کی طرف دیکھا۔ اس دوران اس کا ہاتھ دوبارہ پرس میں تھا۔ اس مرتبہ اس کی انگلیاں ایک چھوٹے لیکن تیز دھار کھلے چاقو کو چھو رہی تھیں۔ دوسرے لمحے وہ چاقو ڈاکٹر مارٹن کے سینے میں پیوست تھا۔ لیکن خیریت گذری کہ نشانہ غلط گیا چاقو دل سے دو انگل کے فاصلے پر لگا۔ لوگوں نے فوراً عورت کو پکڑ لیا۔ کوشش کے باوجود قتل کی وجہ معلوم نہ ہوسکی چنانچہ اس کو دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

۳ ستمبر ۱۹۵۸ء کو پادری رالف ابرناتھی پر ایک کلہاڑی سے حملہ کرنے کی بنا پر ایک نوجوان نیگرو پر عدالت میں مقدمہ کی کارروائی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر مارٹن اپنی بیوی اور رالف ابرناتھی کے ساتھ عدالت پہنچے لیکن دروازے پر تینوں کو روک دیا گیا۔ گارڈ کو جب بتایا گیا کہ ابرناتھی مقدمہ کی ایک پارٹی ہیں تو انھیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن مارٹن اور اس کی بیوی کو پھر بھی روک دیا گیا۔

"آپ اندر نہیں جا سکتے۔ اگر ذرا بھی چوں و چرا کی تو گرفتار کر لئے جاؤ گے" متعین گارڈ نے بڑی رعونت سے کہا۔

"لیکن میں ابرناتھی کے وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں" مارٹن بولے۔

"ہرگز نہیں" گارڈ دھاڑا۔ قبل اس کے کہ مارٹن کچھ اور کہتے، پیچھے سے دو سپاہیوں نے ان کے بازوؤں کو جکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ بیچاری کوریٹا چیختی رہ گئی۔ مارٹن اور اس کی بیوی پر عدالت میں آوارہ گردی کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا اور چودہ اشخاص

ڈالر کا جرمانہ یا چودہ دن کی قید ہوئی۔ مارٹن نے احتجاجاً جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ حالات خراب ہوں کسی نامعلوم محسن نے جرمانہ ادا کر دیا۔

۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر کنگ کو ایک اسٹور کا لنچ کاؤنٹر، جو گوروں کے لئے مخصوص تھا، نہ چھوڑنے پر گرفتار کیا گیا۔ اخبارات نے ہنگامہ مچایا تو مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ لیکن پھر فرضی ٹریفک چالان کر کے پھر مقدمہ چلایا اور جج نے چار مہینے کی قید کی سزا دی۔ دنیا بھر کے اخبارات نے پھر واویلا مچایا تو ڈاکٹر کنگ کو پھر رہا کر دیا گیا۔ اب سفید آقاؤں کو اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر کنگ کو قید کرنا اور جیل بھیجنا آسان نہیں ہے۔ اس دوران بعض وجوہات کی بنا پر ڈاکٹر کنگ اپنی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر اٹلانٹا لے گئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔ جارجیا کے گورنر نے ان کی آمد پر صاف الفاظ میں ناراضگی کا اظہار کیا۔

۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر کنگ کی سرکردگی میں "آزادی کا سفر" شروع ہوا۔ اور بسوں میں مساوات کے حق میں شہر در شہر جلوس نکالے گئے۔ جلوس نے جلتی پر تیل کا کام کیا جہاں جہاں سے بسیں گزریں فسادات کی آگ جنگل کی آگ کی طرح بڑھتی اور پھیلتی رہی۔ کیرولین سے نیو آرلینز تک شعلے ہی شعلے تھے۔ اور قانون خاموش تماشائی تھا۔

۲۱ مئی کو منٹگمری میں ڈاکٹر مارٹن ایک گرجا میں عدم تشدد اور پرامن رہنے کی اپیل کر رہے تھے۔ اور گرجے سے باہر سینکڑوں سفید فام ان کا خون بہانے کا نعرہ لگا رہے تھے۔ پولیس نے بڑی مشکل سے ان کو منتشر کیا۔

۱۹۶۱ء ہی میں جارجیا میں آزادی کا سفر شروع کیا گیا تو پولیس انسپکٹر نے اس پرامن جلوس کو آگے بڑھنے سے روک دیا کہ یہ خلاف قانون ہے۔ اور ڈاکٹر مارٹن کو گرفتار کر لیا۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں ایک دعائیہ اجتماع کو زبردستی منتشر کر دیا گیا۔ غرض جنوبی کرسچین لیڈرشپ کی اور امریکی پولیس کی برابر آنکھ مچولی ہوتی رہتی۔ لیکن ڈاکٹر مارٹن کنگ ہمیشہ اپنی تنظیم کی کشتی کو بچا کر لے جاتے کیونکہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار عدم تشدد اور پرامن انداز تھا۔ اس

سلسلے میں ڈاکٹر مارٹن وقتاً فوقتاً امریکی صدر سے بھی ملاقات کرتے تھے مقتول صدر کینیڈی سے اور پھر صدر جانسن سے انھوں نے کئی مرتبہ تبادلۂ خیالات کیا۔ لیکن جنوبی سفید فام بھڑکے ہوئے مشتعل ہوتے رہے۔ ڈاکٹر مارٹن امن کے لئے اپنی جدوجہد اور کوششوں سے ساری دنیا میں عزت و عقیدت کی نظروں سے دیکھے جانے لگے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۴ء میں انھیں امن کا نوبل انعام دیا گیا اس انعام نے ان کے حوصلے اور بڑھا دیئے اور انھیں احساس ہو گیا کہ امن اور نسلی امتیاز کی اس کوشش میں وہ اکیلے نہیں بلکہ دنیا کا باشعور طبقہ ان کے ساتھ ہے۔ اس طرح سے انھوں نے اپنی تحریک اور مشن کو زیادہ جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا اور اپنی زندگی گوروں اور کالوں کی اس تفریق کو ختم کرنے کے لئے وقف کر دی۔

لیکن اب جب کہ ڈاکٹر کنگ اپنے تابوت میں لیٹے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ تو امریکہ بھر میں نسلی فسادات کی ہولناک آگ بھڑک اٹھی ہے۔ جس نے پورے امریکہ اور امریکی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ لوٹ مار۔ آتشزنی۔ قتل و خون ریزی۔ غارت گری۔ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی ہے نیو یارک اور واشنگٹن، بوسٹن، میامی، ٹلاہاسی، فلوریڈا، مارشول، ٹینسی، جیکسن، میس پی، ہر جگہ آگ و خون کی ہولی کھیلی گئی۔ مفروضہ قاتل کو گرفتار کرنے کے لئے آئی۔ سی۔ بی کا عملہ حرکت میں آگیا ہے۔ بلکہ ایک لمبے تڑنگے چھ فٹ کے کالے سوٹ میں ملبوس جوان کو گرفتار بھی کر لیا گیا ہے جو پولس کے بقول قاتل ہے۔ تفتیش جاری ہے اور نگاہ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے۔ شاید ان کے چہروں سے بھی نقاب اٹھے جو اس پردۂ زنگاری میں ہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔

۱۹۳۵ء میں ایک چھ سالہ نیگرو بچے نے نسلی امتیاز کا پہلا طمانچہ کھایا اور اب اپنی جان دے کر سفید مجنونوں کے منہ پر وہ زوردار طمانچہ لگایا ہے جس کی آواز وقت کے ایوان میں گونجتی رہے گی۔

عرصہ تک گونجتی رہے گی۔

میمفس کے پریس آفیسر نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر کنگ کو اس نوکیلی اور زہر میں بجھی ہوئی گولی سے ہلاک کیا گیا ہے جس کے استعمال پر جنیوا کنونشن نے پابندی عائد کر رکھی ہے

ڈاکٹر لوتھر کنگ آج دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن انھوں نے جو چراغ روشن کیا ہے اسے کوئی طاقت نہیں بجھا سکتی۔ ڈاکٹر کنگ کی بیوہ کوریٹا کنگ نے اپیل کی ہے کہ :۔

" میرے شوہر نے جو کام نامکمل چھوڑا ہے اسے مکمل کیا جائے۔ میرے شوہر کی روح کو اسی وقت سکون نصیب ہوگا جب نیگرو باشندے گوروں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے"

مسز کوریٹا نے زور دے کر کہا ہے :۔

—— " میرے شوہر نے انسانی اقدار کی ترویج اور امریکی معاشرہ کو صحت مند بنانے کے لئے اپنی جان قربان کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور دنیا سے جنگ و تشدد کا خاتمہ ہو جائے گا" ——

لوتھر کنگ کے قتل پر دنیا بھر کے امن پسندوں نے ان کی موت کو دنیا کے لئے ایک المناک سانحہ قرار دیا ہے۔ اس حادثہ پر مسز جیکولین کینیڈی نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ :۔

" آج میری آنکھیں مسز لوتھر کنگ اور ان کے بچوں کے لئے اشکبار ہیں۔ میں اس وحشیانہ حرکت پر بے انتہا غمگین ہوں جس کی وجہ سے ہم ایک ایسے انسان سے محروم ہو گئے جو محبت اور عدم تشدد کا مبلغ تھا۔ انھوں نے اہل امریکہ سے سوال کیا ہے کہ :۔

آخر ہمارا ملک یہ بات کب سمجھے گا کہ تشدد تباہی کا راستہ ہے؟

جیکولین کینیڈی نے جو سوال اپنے اہل ملک سے کیا ہے وہ اہل امریکہ کے لئے ایک لمحۂ فکر یہ ہے — کیا ان کے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔؟

زمانہ قدیم سے ایران دنیا میں تہذیب و تمدن کا ایک اہم گہوارہ رہا ہے۔ طلوع اسلام سے قبل یہاں کی ساسانی تہذیب اپنے بام عروج پر تھی۔ مصر اور بابل کی تہذیبوں کے بعد ساسانی اور یونانی تہذیبوں نے مغربی ایشیا کی تاریکیوں کو منور کیا۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے زمانے میں عربوں نے جب ایران فتح کیا تو ایرانی تہذیب عربوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ خلافت راشدہ اور خلافت بنی امیہ کے زمانے میں عربوں نے اسلامی اقدار اور عربی کردار کو بڑی حد تک زندہ رکھا اور ان میں سادگی بے باکی اور دلیری کی خصوصیات بدرجہ اتم نمایاں رہیں۔ لیکن خلافت عباسیہ کے عہد حکومت میں ایرانی تہذیب کے براہ راست اتصال سے عربی کردار میں نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ سادگی کی جگہ تکلفات، بیباکی کی جگہ مصلحت اندیشی اور دلیری کی جگہ آرام طلبی اور عیش کوشی نے لے لی۔

خلفائے عباسیہ ہارون رشید اور مامون رشید کے عہد خلافت میں برمکی اور حسن بن سہیل کے خاندانوں سے اتصال نے خلافت عباسیہ کو بہت متاثر کیا اور ایرانی تہذیب رفتہ رفتہ عربی تہذیب پر غالب آنے لگی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے
الشجاع

اسلام میں علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔ ایران اور ترکستان نے دنیائے اسلام کے وہ نامور فرزند پیدا کئے جنھوں نے علوم و فنون کی شمعیں روشن کیں اور زمانہ وسطیٰ میں علوم و فنون کے امام تسلیم کئے گئے۔ جن کے علوم کی روشنی نے مغرب کی تاریکی کو دور کیا اور مغربی نشاۃ ثانیہ کو جنم دیا۔

ایران کے مردم خیز خطے میں شیراز کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جسے علماء، صلحاء، مفکرین اور اولیاء کرام کی سرزمین ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کے زندہ جاوید شعرا حافظ اور سعدی کا وطن اور مدفن ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ حافظ کے لافانی اشعار نے شیراز کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

فارس کے صوبے کا صدر مقام شیراز اصفہان کے جنوب میں ایک وسیع نخلستان میں واقع ہے جسے نہر رکنا باد سیراب کرتی ہے۔ گل و بلبل کے اس رومانی شہر نے فارسی کے عظیم ترین شعرا حافظ، سعدی، عرفی اور قاآنی کو جنم دیا ہے۔

اس تاریخی شہر کو خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کے زمانہ خلافت میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری نے فتح کیا۔ دنیائے اسلام کے نامور فاتح محمد بن قاسم نے جو حجاج بن یوسف کے چچازاد بھائی تھے اموی خلیفہ ولید کے عہد خلافت میں قدیم شہر

حافظ

ابتدا میں ایک معمولی شاعر تھے اور شعرا کی محفلوں میں ان کا بڑا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

ایک رات

اپنی ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر وہ باباکوہی کی درگاہ میں پہنچے اور رات بھر رو رو کر اپنی کامیابی کی دعائیں مانگتے رہے۔ اسی رات انھوں نے

حضرت علی

کو خواب میں دیکھا جنھوں نے حافظ کو خوش خبری سنائی کہ شاعری کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے ہیں۔

صبح حافظ نے جب اپنی غزل اپنے ہم عصر شعرا کو سنائی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔

کے کھنڈرات پر اسے از سر نو تعمیر کیا۔ قدیم شہر کو اردشیر نے تعمیر کیا تھا اور اس کی جگہ پر اب فیروز آباد کا شہر آباد ہے۔

شیراز کی فصیلوں کو خاندان بویا کے سلطان الدولہ نے ۱۰۴۴-۱۰۴۸ء میں تعمیر کیا تھا اور اس نے اس میں بارہ دروازے تعمیر کئے تھے۔ ۱۳۹۳ء میں دنیائے اسلام کے مشہور فاتح صاحبقراں تیمور یہاں وارد ہوا۔ وہ خاندان مظفر کے شاہ منصور کی سرکوبی کے لئے یہاں آیا تھا جس نے تیمور کے ساتھ کئی بار بدعہدی کی تھی۔ ۱۷۲۴ء میں افغانوں نے اس کو فتح کر لیا اور کریم داد خاں زند نے اسے اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کے چہار جانب خندقیں اور فصیلیں تعمیر کیں۔ اس شہر کو خوبصورت عمارتوں سے مزین کیا۔ اس کی سڑکوں کو پختہ بنوایا۔ اور اس کے وسط میں ایک بڑا بازار تعمیر کیا۔ لیکن ۱۸۱۳ء اور ۱۸۲۴ء کے زلزلوں سے اس شہر کو بہت نقصان پہونچا۔

شیراز اپنے انگور، گلاب کے پھولوں، شہد اور خوبصورت پتھروں کے لئے ساری دنیا میں مشہور رہا ہے۔ رکنا باد کی نہر جسے بلبل شیراز حافظ شیرازی کے اشعار نے زندہ جاوید بنا دیا ہے خاندان بویا کے سلطان رکن الدولہ کی تعمیر کردہ ہے۔ گلستان اور بوستان کے مصنف شیخ سعدی کا مزار اسی نہر کے کنارے واقع ہے

شیراز میں تین مشہور مسجدیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جامع عتیق ہے جسے عمر نے نویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا دوسری مسجد کو سلطان اتابک سعد زنگی نے بارھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ اور تیسری مسجد سونکور ہے جسے پہلے اتابک سلطان نے تعمیر کیا تھا۔

اس شہر میں متعدد اولیاء کرام کے مقابر پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس کو برج الاولیاء کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں احمد بن محمد بن موسیٰ کاظم کا مقبرہ اور فارسی کے شہرہ آفاق صوفی شعرا حافظ اور سعدی کے مقبرے قابل ذکر ہیں جو شہر کے شمال میں واقع ہیں۔

شیراز اپنے باغوں کے لئے سارے ایران میں مشہور رہا ہے اور ان میں دلکشا اور ہفتاں بہت مشہور ہیں۔ یہ باغات اپنا نظیر نہ رکھنے والے

اور شاداب کے لئے بے نظیر ہیں

شیراز اپنی خاتم کاری اور ملبوسات کے لئے بھی مشہور رہا ہے اس شہر نے فارسی کے مشہور شعرا کو جنم دیا ہے۔ جن میں حافظ، سعدی عرفی، قاآنی، اثیر، شافیہ، ابو اسحق صلاح اور صانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شہرہ آفاق مذہبی مصلح باب بھی شیراز کے رہنے والے تھے۔

اس مردم خیز شہر نے دنیائے اسلام کے متعدد علماء اور مفکرین کو بھی پیدا کیا ہے۔ ان میں سے ایک ابو اسحق ابراہیم شیرازی تھے۔ جو فقہ شافعی کے قاضی اور عالم تھے۔ اور جو بغداد کے مشہور اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ دنیائے اسلام کے شہرہ آفاق مدبر نظام الملک طوسی نے جو ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم تھے۔ ۱۰۶۷ء میں ابو اسحق شیرازی کو نظامیہ یونیورسٹی بغداد کا مدرس اعلیٰ مقرر کیا۔ دنیائے اسلام کے دور دراز مقامات سے طلباء ان سے درس حاصل کرنے کے لئے بغداد آتے تھے۔ ان کے بے شمار طلباء قضاء کے عہدوں پر متمکن ہوئے۔ ابو اسحق شیرازی اپنی وفات کے وقت تک نظامیہ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ خلیفہ بغداد نے جب انہیں ۱۰۸۳ء میں نیشاپور بھیجا تو ان کے ساتھ ان کے طلباء کا ایک بڑا جلوس تھا۔ نیشاپور کے مشہور عالم اور استاد امام الحرمین جو امام غزالی کے استاد رہ چکے ہیں ابو اسحق شیرازی کو خوش آمدید کہنے کے لئے شہر کے باہر تشریف لائے اور ان کا لبادہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر لائے۔ امام الحرمین نے ابو اسحق شیرازی کی افضلیت کو تسلیم کیا ہے۔

نیشاپور سے واپسی پر ابو اسحق شیرازی کا ۵ نومبر ۱۰۸۳ء میں بغداد میں انتقال ہو گیا اور عباسی خلیفہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی

شیراز کے دوسرے شہرہ آفاق مفکر ابو الحسین عبد الملک الشیرازی ہیں جو بارھویں صدی عیسوی کے مشہور ریاضی داں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ موصوف نے یونانی ریاضی اور ہیئت کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اور بطلیموس کی شہرہ آفاق تصنیف المجسطی کا ایک مختصر لیکن جامع ایڈیشن تیار کیا۔

اس شہر کے تیسرے مشہور مفکر قطب الدین شیرازی تھے۔ جو

فیلسوف اسلام کے آخری عظیم ہیئت داں مفکر نصیر الدین طوسی کے شاگرد رشید تھے۔ قطب الدین شیرازی (۱۲۳۶ء تا ۱۳۱۱ء) ایک مشہور ریاضی داں تھے جنھوں نے بطلیموس کی المجسطی کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا وہ ایک مشہور موسیقی داں تھے جنھوں نے درۃ التاج نامی کتاب لکھی جو موسیقی سے متعلق ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔

اس شہر کے مایہ ناز مفکر صدر الدین شیرازی جن کا انتقال ۱۶۴۰ء میں ہوا اپنے عہد کے مشہور مذہبی فلسفی اور صوفی تھے جنھوں نے اشراق کے ایرانی صوفیانہ فلسفہ کو جنم دیا۔ شیراز کے مشہور منجم اور ہیئت داں ابوطاہر شیرازی گزرے ہیں۔

شیراز کی حقیقی شہرت اس کے زندہ جاوید شعرا حافظ، سعدی اور عرفی کی بدولت ہے۔ جنھوں نے اس شہر کو قیامت تک کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ اور جن کے مزار مرجع خاص و عام ہیں۔

حافظ شیرازی جن کا شمار فارسی شاعری کے چار ستونوں میں ہوتا ہے لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے دیوان سے فال نکالنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر نے اپنی مشہور تصنیف "تو زک جہانگیری" میں دیوان حافظ سے فال نکالنے کے کئی واقعات درج کئے ہیں جو حیرت انگیز طور پر صحیح ثابت ہوئے۔

کہا جاتا ہے حافظ ابتدا میں ایک بہت معمولی شاعر تھے اور شعرا کی محفلوں میں ان کا بڑا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ایک رات اپنی ناکامیوں سے انتہائی دل برداشتہ ہو کر وہ باباکوہی کی درگاہ پر پہنچے اور رات بھر رو رو کر اپنی کامیابی کی دعائیں مانگتے رہے۔ اسی رات کو انھوں نے حضرت علی کو خواب میں دیکھا جنھوں نے حافظ کو خوشخبری سنائی کہ شاعری اور علوم کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے ہیں۔ صبح کو حافظ نے جب اپنی غزل اپنے ہم عصر شعرا کو سنائی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس کے بعد حافظ کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی اور عراق، ہندوستان اور عرب کے شاہی حکمرانوں سے انھیں دعوت نامے پہنچنا شروع ہوئے لیکن وہ چمنستان شیراز کو چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس کے

الشجاع

اطہانے بہتے نخلستانوں، سرسبز باغات، خوشگوار آب و ہوا اور رکناباد کی شفاف نہر جن کی جھلک ان کی شاعری میں نظر آتی ہے بھلا دوسری جگہ کہاں دستیاب ہو سکتی تھی۔

بغداد کے الخانی سلطان احمد ابن اویس نے حافظ کو بغداد آنے کی دعوت دی لیکن حافظ نے ایک شعر لکھ کر انھیں بھیج دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ مصلیٰ کی نسیم سحری اور رکناباد کی نہر انھیں کہیں اور جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ بہمنی ہندوستان میں بہمنی خاندان کے نامور سلطان محمود شاہ بہمنی نے حافظ کو اپنے دربار میں مدعو کیا اور بلبل شیراز کو لانے کے لئے اپنے خصوصی درباری میر فضل اللہ کو کثیر رقم اور ایک جہاز کے ساتھ بھیجا۔ میر فضل اللہ حافظ شیرازی سے ملے اور بڑی خوشامد سے انھیں ہندوستان جانے پر راضی کیا۔ حافظ نے کچھ رقم تو خود خرچ کر ڈالی اور باقی ماندہ ایک نادار دوست کے حوالے کر دی۔ جہاز جب روانہ ہوا تو بدقسمتی سے طوفان نے آگھیرا حافظ جہاز سے خشکی پر آگئے اور انھوں نے محمود شاہ کی خدمت میں چند اشعار لکھ کر بھیج دیئے۔ بنگال کے سلطان غیاث الدین نے بھی حافظ شیرازی سے ہندوستان آنے کی درخواست کی جس کے جواب میں بلبل شیراز نے چند اشعار لکھ کر بھیج دیئے۔

حافظ کی شاعری میں زندگی کا رجائی پہلو غالب ہے۔ انھوں نے زندگی کو ہنس کھیل کر گزارنے کی تلقین کی ہے اور اس معاملے میں عمر خیام کے مقابلہ میں حافظ کا رنگ زیادہ گہرا ہے اور ان کے اشعار میں زیادہ تاثر پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں گل و بلبل، شراب و شباب، حسن و عشق کی جو عکاسی کی ہے اس نے انھیں دنیائے تغزل کا بلند ترین شاعر بنا دیا ہے۔ اور ان کے اشعار اور دیوان دنیا کی متعدد ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ کئے گئے ہیں اور گوئٹے جیسے شہرہ آفاق شاعر نے اس سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

شیراز کے دوسرے نامور اور لافانی شاعر، ادیب اور صوفی منش انسان سعدی شیرازی تھے۔ جنھوں نے طویل زندگی پائی اور ۱۲۰ سال زندہ رہے۔ اس میں سے چالیس سال انھوں نے

حصول علم۔ چالیس سال سیاحت اور چالیس سال ریاضت میں گزارے

ایک بار وہ ایسے وقت میں تبریز پہونچے جب بادشاہ کی سواری نکل رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب تماشائیوں کا ہجوم تھا سعدی بھی سڑک کے کنارے انھیں کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ کی سواری کے ہمرکاب اس کے وزیر اعظم شیخ شمس الدین اور ان کے نامور بھائی علاء الدین بھی تھے۔ شمس الدین شیخ سعدی کے روحانی شاگرد تھے۔ ان کی نظر ہی ایک شیخ پر پڑی جو تماشائیوں میں کھڑے تھے۔ شمس الدین فوراً گھوڑے سے اتر کر شیخ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے۔ ان کے بھائی علاء الدین بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ بادشاہ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان کا وزیر اعظم ایک خستہ حال فقیر کی قدم بوسی کر رہا ہے اور اس کی ایسی تعظیم کر رہا ہے جیسی تعظیم اس نے کبھی بادشاہ کی بھی نہیں کی۔

محل واپس آنے پر بادشاہ نے اپنے وزیر اعظم شیخ شمس الدین سے ماجرا پوچھا اور شکایتاً کہا "تم تو اس فقیر کی ایسی تعظیم کر رہے تھے جیسی تم نے کبھی میری بھی نہیں کی"۔ وزیر اعظم نے جواب دیا۔ "وہ فقیر نامور صوفی شاعر شیخ سعدی تھے۔ جو ہمارے روحانی باپ ہیں"۔

بادشاہ کو بھی شیخ سے ملنے کی بڑی خواہش ہوئی۔ دوسرے دن وزیر اعظم نے شیخ سعدی کو اپنے گھر پر مدعو کیا اور بادشاہ کو بھی بلایا۔ بادشاہ شیخ سعدی کی حکیمانہ گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور شیخ سے درخواست کی کہ وہ اسے نصیحت فرمائیں۔ شیخ سعدی نے کہا کہ مرنے کے بعد صرف نیک عمل تمہارے کام آئے گا۔ اب یہ تم پر مبنی ہے کہ تم نیک یا بد اعمال اکٹھا کرو۔

بادشاہ نے درخواست کی کہ شیخ ان خیالات کو اشعار کا جامہ پہنا دیں۔ شیخ سعدی نے فوراً ان خیالات کو اشعار میں ادا کر دیا جس کو سن کر بادشاہ کے آنسو جاری ہو گئے۔

شیخ سعدی نے نظامیہ یونیورسٹی بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ بغداد میں وہ شہرہ آفاق صوفی حضرت شہاب الدین سہروردی سے بہت متاثر ہوئے۔ حضرت سہروردی کی صحبت نے شیخ

الشجاع

سعدی کو ایک عظیم اخلاقی شاعر اور ادیب بنا دیا۔

شیخ سعدی نے دور دراز ممالک کی سیاحت کی اور وہاں کے لوگوں سے استفادہ حاصل کیا۔ شیخ متعدد بار حجاز گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عراق۔ شام۔ عرب۔ ہندوستان کا سفر کیا اور بلخ۔ غزنی۔ پنجاب۔ سومناتھ۔ گجرات۔ یمن۔ بعلبک۔ دمشق۔ مصر، شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک کی بھی سیاحت کی۔

شیخ سعدی کی بلند پایہ اور لافانی تصانیف گلستاں اور بوستاں نے دنیا کو جو اخلاقی تعلیم دی ہے اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ ان کتابوں کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے اور دنیا کی کسی دوسری زبان میں ایسی بلند پایہ اخلاقی کتابیں موجود نہیں ہیں۔

شیخ سعدی نے اپنی زندگی کے آخری ایام شیراز میں گزارے ۶۹۱ھ ہجری میں ان کا انتقال ہوا اور دلکشا کے نواح میں دفن کئے گئے جو اب سعدیہ کے نام سے مشہور ہے۔

لفظ جدیدیت

پر غور کریں تو ہر نئی چیز جدید ہی ہوتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی سے اردو شاعری میں جدید شاعری کا باب کھلتا ہے مگر وہاں مقصدیت کا احساس ہوتا ہے اور آج کل کی جدیدیت میں عمداً ایسے رجحان کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے جو اخلاقی پستی اور گراوٹ کی طرف لے جاتا ہے۔ میں خود جدیدیت کا مخالف نہیں ہوں مگر ایسی منظم کوشش کا فرد مخالف ہوں جس کے ذریعہ جان بوجھ کر جدیدیت کے پس پردہ دماغ اور خیالات کو مسموم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جدیدیت کا وہ مطلب جو آج کل ایک گروہ یا طبقہ بیان کرتا ہے وہ بالکل ہی الگ ہے۔ نام نہاد جدیدیت کے ان علمبرداروں کا مقصد صرف ایک ہے۔ دماغ اور خیالات کی تنالعو اور بیکار بنا دو کہ وہ اپنے ملک اپنے سماج اور اپنے آپ کے مسئلے سے بالکل بے نیاز ہو جائے اور دماغ غرسودہ قسم کے جدید ادب کے مسائل میں کھو جائے۔

(مخدوم محی الدین)

ڈاکٹر اعزاز نقوی

ہماری تہذیب پہ ایرانی تہذیب کے پیچ و خم

شجرۂ اقوام اور ثقافت عالم میں دبستان ایران اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ آریہ نسل دنیا کی قدیم نسل میں شمار کی جاتی ہے۔ جو اپنی شکل، شباہت، ساخت رنگ، خصلت، مسلک وضع اور عقیدے کے اعتبار سے سب سے مختلف ہے۔ جو دنیا کے مختلف گوشوں میں آباد ہوئی اور جہاں گئی اپنا الگ رنگ گانٹھ لیا۔ پھر ایسی گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی۔

برعظیم پاک و ہند میں اسلامی تہذیب مختلف راستوں اور واسطوں سے آئی۔ اسلام کے مقدرین سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اپنے مزاج، اطوار اور رنگ اور نفسیات کے اعتبار سے آریائی نسل سے بالکل اچھوتے اور انوکھے ہیں۔

قدیم ہندوستان نے اپنی تہذیبی نشوونما میں ان دونوں قوم سے استفادہ کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سب سے پہلے آریائی قافلوں نے ہند کی زمین پر پہلا قدم ڈالا اور اپنا مسکن بنایا۔ اور اپنی قومی تہذیب کو ہندوستان میں پھیلایا۔

پاک و ہند کی ثقافتی تشکیل میں سامی اور آریائی نسلوں کو بڑا دخل ہے۔ تاریخ کی روشنی میں ان عناصر کا تجزیہ کرنے کے لئے ہمارے پاس تحقیقی مصادر اگرچہ بہت کم سہی مگر پھر بھی جو کچھ ہیں ان کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ثقافت عرب اور ایران کی مرہون منت ہے۔ گویا سامی عربوں اور آریہ نسل ایرانیوں نے ہماری تہذیب کی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوارا ہے۔ اس ثقافتی اتصال اور اتحاد کی مورخانہ تقسیم آپ چاہیں تو اس طرح کر سکتے ہیں۔

اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد

اسلام سے پہلے سامی عرب تہذیب کے قابل ذکر نقوش نہیں ملتے۔ لیکن تاریخ میں اسلام سے قبل ایران سے روابط کے بڑے بدیہی ثبوت ملتے ہیں۔ ایرانی بادشاہوں کے خروج کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ اور ایرانی اثرات کی بھی واضح تائید ہوتی ہے۔ مگر باقاعدہ طور پر تہذیبی تعلقات اسلام کے بعد استوار ہوئے۔ اس منزل پر پہنچ کر ہمیں اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہند کی اسلامی تہذیب سامی عرب اور آریائی ایران کے ثقافتی امتزاج کا نچوڑ ہے۔ عرب سامیوں کی اسلامی تہذیب کا آغاز پہلے فقراء، صوفیاء اور سوداگروں کی آمد سے ہوا۔ ہند آریائی

> **ایرانی تہذیب**
>
> ایرانی تہذیب کی سالمیت کو ہندوستان نے قبول تو کیا مگر جوں کا توں نہیں بلکہ مقامی اثرات اقدار اور اپنی روایات کو بھی اس میں شامل کر دیا اور اس طرح سے
>
> **نئی اقدار**
>
> اور نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ تصادم افکار سے ایک نئی فکر اور نیا اسلوب زندگی پیدا ہو گیا۔ اور ہمارے مختلف تہذیبی عناصر داخلی اور خارجی عوامل سے مرتب ہوتے اور ایک نئی تہذیب کی بنیاد رہی۔

تہذیب اس سے مکمل طور پر متاثر ہوتی رہی یا نہ ہوتی ہو مگر سندھ۔ اور مالابار کی مقامی تہذیب پر اسلامی تمدن کے واضح طور پر نقوش ملتے ہیں۔ فقراء، صوفیا اور سوداگروں کے بعد عرب کی جانب سے مسلمانوں کے حملے اور مسلم حکمرانوں کے ساتھ اسلام اور سامی النسل کلچر ہندوستان پر غالب آیا۔

ہند اسلامی تہذیب کے دوسرے دور کا آغاز باقاعدہ اور براہ راست دبستان ایران سے ہوتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک انقلابی روش کے ساتھ ایرانی تہذیب ہند اسلامی ثقافت پر غالب ہوتی چلی جاتی ہے۔

مگر اس نکتہ کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کہ خود ایرانی کلچر اسلامی طرز فکر کا مرہون منت ہے۔ یہ درست ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات مسلم حکمرانوں کے ذریعہ ایران پہنچا تو سامی نسل کا طرز فکر اور احساسِ جمال ہی منتقل نہیں ہوا بلکہ توحید، تقویٰ، سنت اور شریعت کے ٹھوس استدلال بھی لائق توجہ اور قابلِ تقلید ثابت ہوئے۔ اس طرح سامی اور آریائی تہذیب کے سنجوگ اور اتصال سے ایک نیا طرز فکر پیدا ہوا جس نے زندگی کی داخلی اور خارجی تہہ داریوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ علوم عقلیہ سے قطع نظر فنون لطیفہ اسلام کے آنے سے پہلے ہی اپنی اعلیٰ اقدار اور روایات کی منازل طے کر چکا تھا۔ اسلامی طرز احساس نے فنون لطیفہ کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی۔ مثلاً شاعری اور اس کے مختلف اصناف شاعری میں عروض، صرف نحو، الفاظ اور رمزیات کے اکتساب اور اشتراک سے شعری فکر اور اسلوب دونوں میں ایک خاص نہج کا اضافہ ہوا۔ اور عربی ادب کا قابلِ تقلید اثر ایران پر ہوا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت نے بعض فنون لطیفہ کے شعبوں سے اغماض بھی کیا۔ مگر مجموعی حیثیت سے دونوں تہذیبوں کے اشتراک تجدید اور تجدّد سے ایک نیا تہذیبی دبستان وجود میں آیا جو اپنی وحدتِ فکر کے اعتبار سے تمام تہذیبوں میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔

عرب اور ایران کا تہذیبی اشتراک اپنے تکمیلی منازل سے گزرنے کے بعد دنیا کی مختلف تہذیبوں پر اثر انداز ہوا۔ اور ہندوستان میں بھی مختلف وسیلوں سے گزر کر آیا۔ ایرانی تاجر، سیاح، فنکار، قلمکار، عالم، عساکر اور حاکم کے علاوہ مختلف علوم اور فنون کا ادب منتقل ہوا۔ اور ثقافتوں کے اتحاد اور اشتراک کے لئے زبانِ المشترک فارسی کے بڑے اعلیٰ پیمانے پر ترویج ہوئے۔ فارسی بادشاہوں کی زبان بنی، دربار میں رچی بسی، فنکار کا ابلاغ بنی۔ تمدنی زندگی اور کاروبار حیات کا رشتہ بنی۔ دفتری زبان ثابت ہوئی۔ فارسی دانی فخر اور افتخار کا وطیرہ بن گئی۔ اور یہاں تک ہندو راجاؤں کے دربار میں بھی اپنی افادیت کا لوہا منوالیا۔ ہندوؤں نے اس زبان کو انتہا عزیز کیا۔ اور شاعری اور انشا میں بھی اپنا نام کمایا۔

ایرانی تہذیب پہلے شمالی ہندوستان میں پھلی پھولی۔ عہد مغلیہ میں ایرانی تہذیب کو خصوصیت کے ساتھ بڑا عروج اور فروغ ہوا۔ مگر عہد چغتائیہ کا ستارہ جب گردش میں آیا اور حکومت کی کمر ٹوٹنے لگی تو اودھ دکن اور بنگال میں خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں اور ان سب حکومتوں نے ایرانی تہذیب کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اور ایران کی زبان، فکر، عقیدہ، شاعری، غرض فنون لطیفہ کے جملہ عناصر اپنے مقام سے انتہا تک پہنچ گئے اور اس کی لپیٹ میں پورا ہندوستان آ گیا۔

ایرانی تہذیب کی سالمیت کو ہندوستان نے قبول تو لیا مگر جوں کا توں نہیں تسلیم کیا بلکہ مقامی اثرات، اقدار اور اپنی روایات کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ اخذ و جذب کیا۔ ترک و اختیار کیا اور اس طرح سے نئی اقدار اور نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ تصادم افکار سے ایک نئی فکر اور نیا اسلوب زندگی پیدا ہو گیا۔ ہندوستان کے باشندے اور ایران کے افراد بنیادی طور پر آریا تھے۔ اور ان کا خون و خمیر یکساں تھا۔ شاید اس لئے تاریخ نے جو ایک موقع فراہم کیا تو پھر دو بچھڑی ہوئی قوموں کا سنجوگ ہو گیا اور اس سنجوگ سے نئی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ اور ہمارے مختلف تہذیبی عناصر داخلی اور خارجی عوامل سے مرتب ہوئے۔ مثال کے طور پر شاعری کو لے لیجئے۔ فارسی زبان کے ساتھ فارسی شاعری کا آغاز ہوا۔ پھر اردو میں طبع آزمائی کا سلسلہ چل نکلا۔ شروع میں طرز ابلاغ اور تصورِ شاعری اور زبان کا آہنگ چڑھاؤ سب فارسی شاعری کی روایات سے وابستہ رہا۔ مگر ساتھ ہی مقامی اثرات بھی شاعری پر غالب ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اپنا انفرادی لہجہ ایجاد کیا۔ اور شاعری کی روایات کو ایسا شیر و شکر کیا کہ اس کو اپنی روایات اور اقدار کا ورثہ بنا لیا اور ہمیشہ کے لئے

(باقی صفحہ ۲۰۰)

انجم خورشید

بازیگر

چلو ہم چلیں اُس مکاں تک،
ذرا چل کے دیکھیں مداری کے کرتب
وہ دیکھو!
وہ لفظوں کے طوطے اُڑانے لگا ہے۔
(سنو لڑکو بیٹھو، بھگا دوں گا ورنہ!)
وہ کاغذ کے ٹکڑوں کے کچھ استعارے بنا کر
دہن سے برابر برآمد کئے جا رہا ہے۔
(ذرا بھائی صاحب،
کھڑے ہو نا پیچھے کو ہٹ کر۔)
وہ دیکھو!
وہ تشبیہ کا اک پرندہ
ابھی اپنی ٹوپی کے اندر سے پیدا کرے گا۔
(" کہیں ابا آتے نہ ہوں، یار دو آؤ
چلو اب، چلیں ہم یہاں سے"
" کہاں؟
کوئی آتا نہیں ہے
ابھی اور کچھ دیکھنے دو تماشہ")
وہ دیکھو!
قواعد کے گولے شکم کو دبا کر
اگلتا ہے اب وہ
(تو بچو، بجاؤ ذرا زور سے تالیاں تم)
ارے، اُف!؟
وہ ننھی سی معصوم بچی کو
تمثال کے طور پہ
اپنے زورِ سحر سے
زمیں سے اُٹھانے لگا ہے۔
لو، اب وہ
علائم کے رستے پہ چڑھ کر
فضا میں ہی غائب ہوا ہے
— یہ ڈمرو، یہ جھولی، یہ منتر!
معانی و الفاظ و فقرے و جملے کا ملبہ!
یہ سب کچھ ہے پھیلا پڑا
کھڑے ہیں تماشائی مبہوت سے سب!
— چلو ہم چلیں اب یہاں سے
کہ بھیڑ اب تو چھٹنے لگی ہے۔

اشتہار

شاہد عشقی

سوچتا ہوں

میں سوچتا ہوں مرا ساتھ دے سکو گی تم

کہ دوپہر کی کڑی دھوپ ہے وجود مرا
تو اک مہکتا ہو پھول ہے تمہارا شباب

سدا لہکتا ہوا شاخِ گل کی طرح یہ جسم
سدا مہکتے ہوئے سے یہ عارضوں کے گلاب

پنپ سکیں گے مری زندگی کے صحرا میں
کہ جس میں سایۂ اشجار ہے، نہ رقصِ سحاب

کھلا سکی نہ کبھی کوئی پھول، بادِ سموم
نہ لا سکا ہے کوئی پھول میرے لمس کی تاب

میں سوچتا ہوں مرا ساتھ دے سکو گی تم

شبنم فاروقی

تلاش

کھوج میں اڑتے بادل کی کب تک پھرو گی
بدن کی اگن میں جھلستی ہوئی دھیان کی
کچی کلیوں کی مالائیں کمھلا گئیں تو۔ کہو
پھر کہاں جاؤ گی؟
پیاس من کی بجھانے
تڑپتی ہوئی اپنی آشاؤں کی
سارے سنسار میں
اس پریوار میں
دکھ سنانے
کون ہے؟
جو ترے دکھ کو اپنائے گا
تھام کر پھول سی نرم باہوں کو سپنوں کی
مہکی فضاؤں میں لے جائے گا
اور پھر گرم سانسوں میں سانسیں بسا کر
تری آتما میں سما جائے گا

جاں نثار اختر

○

ایک ہے زمین تو سمت کیا حدود کیا
روشنی کہیں بھی ہو، روشنی کا ساتھ دو

خود جنونِ عشق بھی اب جنوں نہیں رہا
ہر جنوں کے سامنے، آگہی کا ساتھ دو

کیا بتوں کا واسطہ کیا خدا کا واسطہ
آدمی کے واسطے آدمی کا ساتھ دو

ہر خیال و خواب ہے کل کی جنتیں لئے
ہر خیال و خواب کی تازگی کا ساتھ دو

اب رہا ہے کیا فقط دو قدم کا فاصلہ
اور دو قدم مری زندگی کا ساتھ دو

شہریار

○

دل جو پتھر کے بنے ہیں آج کچھ
غم ہی ایسے آ پڑے ہیں آج کچھ

دشت میں پھرتی ہے آوازِ جرس
قافلے رہ میں لٹے ہیں آج کچھ

روشنی ہی روشنی ہے ہر طرف
داغ سینے کے جلے ہیں آج کچھ

زندگی ہنستی ہوئی گزرے ذرا
ہجر کے لمحے ٹلے ہیں آج کچھ

ایک نامعلوم غم کے منتظر
اشک پلکوں پہ کھڑے ہیں آج کچھ

سرخوشیٔ آبلہ پایانِ شوق
فاصلے پھر بڑھ چلے ہیں آج کچھ

بہار کوٹی

○

جنوں پہ رازِ جنوں آشکار بھی تو نہیں
یہ بد نصیب سزاوارِ دار بھی تو نہیں

ہم ایک عمر سے سرگرمِ جستجو ہیں جہاں
غضب خدا کا تری رہگذار بھی تو نہیں

یہ دستِ شوق میں دیکھو تو کس کا دامن ہے
مری نظر کا کوئی اعتبار بھی تو نہیں

عجب نہیں کہ بتدریج جزوِ جاں ہو جائے
یہ سرسری سی نظر جس میں پیار بھی تو نہیں

نہ پوچھ کشمکشِ انتظار کا عالم
عجب خلش ہے کہ دل بیقرار بھی تو نہیں

جنہوں نے اپنی حقیقت کو پا لیا شاید
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

ہمارا اپنا نشیمن ہے اس چمن میں جہاں
بہار ہی نہیں ذکرِ بہار بھی تو نہیں

شمیم نوید

○

خود سے بھی اب تو رہتی ہے بیگانگی ہمیں
یہ موجِ درد جانے کہاں لے چلی ہمیں

ہم اپنے شہر ہی میں تماشا تو بن گئے
اب اور کیا بنائے گی یہ زندگی ہمیں

پھر آج ساتھ ساتھ تھا سورج تمام دن
پھر آج سائے سائے نے آواز دی ہمیں

پہچان کر بھی لوگ بہت اجنبی رہے
اب راس آ گئی ہے تری دوستی ہمیں

اچھا ہوا کہ آتشِ مے تیز ہو گئی
ویسے تو اپنی آگ بھی کچھ کم نہ تھی ہمیں

کیا کیا حسین شہر تھے جو خواب ہو گئے
لیکن وہ اک گلی کہ نہیں بھولتی ہمیں

بہکے ہوئے قدم یہ سمٹتا ہوا بدن
اچھی لگی کچھ آج تری بے رخی ہمیں

سہیل اختر

○

ترے ستم کی تجھے اس طرح سزا دوں گا
کہ لوحِ دل سے ترا نام تک مٹا دوں گا

یہ تیرا نازِ امارت یہ تیری خود بینی
ہر ایک سنگِ گراں راہ سے ہٹا دوں گا

رہا یہ جذب سلامت تو تیری پلکوں پہ
سرشکِ غم کی میں اک کہکشاں سجا دوں گا

تری حیات کے قصرِ طرب بھی چیخ اٹھیں
میں وحشتِ دل میں تجھے اس طرح صدا دوں گا

رہا جو یونہی غزلخواں تو ایک دن اے دل
میں پتھروں کو ترا ہمنوا بنا دوں گا

رہِ حیات کی قسمت میں تیرگی ہے تو کیا
سہیل بن کے میں اس رہ کو جگمگا دوں گا

زیب النساء نزہت بھوپالی

○

تری آمد آمد کے میں گیت گاؤں
تصور سے بزمِ تمنا سجاؤں

ترے غم سے آباد ہے دل کی دنیا
ترے غم کو میں کس طرح بھول جاؤں

بجا مشورہ ترکِ الفت کا ناصح!
مگر اپنے دل سے میں کیسے بھلاؤں

بھلا ہو ترا روٹھ کر جانے والے
تصور میں کب تک میں تجھ کو مناؤں

مری زیست کے نامکمل فسانے
تجھے اب سناؤں تو کیا میں سناؤں

محبت کی تکمیل کیونکر بھلا ہو
وہ دامن بچائیں میں نظریں چراؤں

تمنا ہے نزہت کہ اس رہگذر پر
کہیں دل جھکاؤں کہیں سر جھکاؤں

باسط عظیم

○

ہے بندگی کا تسلط ازل سے انساں پر
نہ مانتا یہ خدا کو تو پوجتا پتھر

کوئی بھی واقفِ اسرارِ مرگ و زیست نہیں
مگر وہ پھول جو کمھلا گیا ابھی کھل کر

یہ کس خرابے میں لائی ہے زندگی مجھ کو
جہاں نہ صاحبِ دل ہے کوئی نہ اہلِ نظر

نہ ولولے نہ عزائم نہ زیست کے آثار
برس رہی ہے عجب مردنی سی چہرے پر

میں اپنی ذات میں تنہا سہی مگر پھر بھی
ہوں اپنے خالقِ کل کی صفات کا مظہر

فریب خوردۂ تقدیر نہ رہا تھا کبھی
بدل رہا ہے اب انساں حیات کے تیور

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ملاحظات

مولانا ارشد تھانوی (مرحوم)

مولانا اپنی طبیعت اور علم و فضل کے لحاظ سے مجمع عام کے نہیں حلقہ خاص کے آدمی تھے۔

ارشد تھانوی (مرحوم) بھی وہاں چلے گئے جہاں ایک دن ہم آپ سب کو جانا ہے۔ مولانا ارشد تھانوی اردو کے ان ممتاز ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور اکبر الہ آبادی جیسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اور مولوی عبدالحق مرحوم، علامہ نیاز فتح پوری، مہدی افادی، مولانا حامد حسن قادری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اور بعض دوسری مایہ ناز شخصیتوں کے شانہ بشانہ میدان شعر و ادب میں قدم رکھا تھا۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بھوپال، لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے علمی و ادبی مراکز میں بسر ہوا تھا۔ آخر عمر میں کراچی آگئے تھے اور یہیں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔

مولانا ارشد تھانوی شاعر بھی تھے نثر نگار بھی۔ انہوں نے دونوں حیثیت سے مختلف موضوعات و اصناف پر بہت کچھ لکھا ہے اور ایک دو نہیں پورے ساٹھ پینسٹھ سال لکھا ہے، دو چار دس صفحے نہیں ہزاروں صفحے لکھے ہیں۔ کسی خاص پرچے میں نہیں اردو کے سارے ممتاز پرچوں میں لکھا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کے کمالات و اوصاف، پڑھے لکھے آدمی کی نظروں سے پوشیدہ ہوں عوام نہ سہی خواص ان سے ضرور واقف ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ اپنی طبیعت اور علم و فضل کے لحاظ سے مجمع عام کے نہیں حلقہ خاص کے آدمی تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اردو کے جتنے ممتاز ادبی پرچے نکلتے تھے ان سب میں مولانا کے مضامین نثر و نظم آتے ہیں۔ العصر، ادیب، تمدن، زمانہ، الناظر، نقاد، سب میں ان کے مقالات اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کے ادبی رسائل پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقفہ میں مولانا نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ ہر رسالے میں ان کی تخلیقات مدیر کی تعارفی سطروں کے ساتھ فخریہ انداز میں شائع کی گئی ہیں اور ذوق و شوق سے پڑھی گئی ہیں۔

شاعری میں مولانا کی توجہ اس زمانے کے مقبول ترین رجحان کے تحت غزل کے بجائے زیادہ تر نظموں کی طرف رہی ہے۔ انہوں نے عشقیہ موضوعات اور مناظر فطرت پر خصوصیت سے طبع آزمائی کی ہے۔ اگر اُن کی نظمیں تلاش کر کے یکجا کی جائیں تو ان میں سے بعض نظمیں آج بھی بیانیہ شاعری کے ایوان میں گلدستے کا کام دیں گی۔ شاعری کے ساتھ مولانا کو مقالہ نگاری سے بھی خاص شغف تھا۔ علم بیان و بدیع اور عروض پر تو خیر انکی نظر گہری تھی ہی لیکن شعر و ادب کے فنی مسائل سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ اب سے پورے چھپن سال پہلے ان کا ایک مقالہ "شاعری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ بطور نمونہ چند سطریں دیکھیے۔

"بلند پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں، سرسبز میدانوں کی طراوت بخش سبزیاں اپنی جلوہ فروشی سے لاکھ رشک و رقابت کا برتاؤ کریں لیکن وہ کبھی فضائے تخیل کی جنت الفردوس کا جواب نہیں پیش کر سکتیں۔ مادی عناصر کیسے ہی لطیف ہو جائیں، مگر خیالات کی سبک پذیری کہاں سے لائیں گے .... شاعر کی ایک اہم کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کی عکس ریزی کے لئے آئینہ ہائے حیات کو صیقل کرتا ہے۔ جذبات روحانیت

کو جوش دلائے، احساسات باطنی میں تحریک پیدا
کرے اور بالآخر وحدتِ خیال کی آنکھوں کو معیارِ
لطافت پر سجا دے ....

..... لیکن شہرت ابدی اور حیاتِ غیرفانی کا سہرا
صرف انہیں نفوسِ قدسی کے سروں کی زینت ہو
سکتا ہے جو حقیقتاً شاعر ہیں۔ اور شاعری کو اس
کے صحیح مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ موزونیِ
کلام کے لحاظ سے تو شاعری بہ زبانِ حال کہہ رہی
ہے ع

"ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا"

(نقاد آگرہ۔ جون ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۷ تا ۳۹)

یہ مضمون اس زمانے میں جب کہ اس قسم کے موضوعات پر لکھنے کا رواج عام نہ ہوا تھا، خاصا اہم خیال کیا گیا ہوگا۔ لیکن آج بھی یہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس سے مولانا کی شگفتہ اور سنجیدہ اسلوب نثر کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی خیالات کا بھی بہت کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

زبان و بیان کے نکات اور الفاظ و تراکیب کے استعمال کی نزاکتوں پر اُن کی کیسی اچھی نظر تھی۔ اس کا اندازہ اس جواب سے کیا جا سکتا ہے جو مولانا نے اپنے ایک معترض کو دیا تھا۔ ہوا یہ کہ ان کی ایک نظم کے اس شعر پر۔

لطفِ تخیّل بخشا ہے تم نے
محوِ تصور رکھا ہے تم نے

ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ یہاں تخیّل کی بجائے تخیل ہونا چاہیئے۔ مولانا نے اگلے مہینے جواباً لکھا کہ:

"اگر یہاں بجائے تخیّل کے تخیل کر دیا جائے تو نہ صرف مفہوم ہی کا خون ہو جائے گا، بلکہ لطفِ ترکیب کا لطف بھی جاتا رہے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قابل و نیک نیت معترض تخیّل و تخیل کے معنی میں دھوکا کھا گئے۔

تخیّل بر وزن تکلف = در خیال آوردن۔

تخیل = خیال کردن و گمان داشتن و خیال انداختن

تصوّر = در دل خود صورت چیزے بستن

ہو سکتا ہے کہ تخیل کے مفہوم کی وسعت بلحاظ ان تعریفات کے جس کی تشریح شعر العجم وغیرہ میں کی گئی ہے۔ صاحب "تنقید" کے پیش نظر ہو، مگر وہ "تخیّل شاعرانہ" ہے جو "تخیل عاشقانہ" سے جداگانہ ہے ع

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی

(نقاد۔ مارچ ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۸)

۱۹۶۲ء کی بات ہے کہ کراچی کی ایک صحبت میں شاہد عشقی، سلمان الارشد، اکرام احمد اور دوسرے احباب شریک تھے۔ مولانا مرحوم لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں مجھے حوصلہ افزا کلمات سے نوازنے لگے۔ میں نے جواب میں مندرجہ بالا تحریروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، "مولانا۔ دو چار لفظ جو کچھ سیکھے ہیں آپ ہی لوگوں کی تحریروں سے تو سیکھے ہیں"۔ مولانا پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے: "ارے بھائی تمہیں یہ چیزیں کہاں سے ملیں۔ اب تو مجھے بھی یاد نہیں کہ یہ چیزیں کب لکھی تھیں اور کہاں شائع ہوئی تھیں"۔

ضرورت اس کی ہے کہ ان کے مضامین اور نظموں کا ایک انتخاب شائع کیا جائے تاکہ مولانا کی علمی و ادبی خدمات سامنے آ جائیں اور اُن کا نام زندہ رہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کام کو کرے کون؟ مولانا کے پاس اثاثہ ہوتا تو وہ اپنی اولادِ معنوی کو سامنے لانے کی کیا کچھ جتن نہ کرتے۔ اب تو خیر مجموعہ کلام سے زیادہ ان کے پس ماندگان کے لئے لباس و طعام کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے جب تک حکومت و ملک کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے اور علمی و ادبی انجمنیں جنہوں نے پچھلے چند برسوں سے ادیبوں اور شاعروں کے ضرورت مند خاندانوں کو مالی امداد دینے کی طرح ڈالی ہے۔ اس طرف خاص توجہ نہ کریں۔ مولانا کے خاندان کی کفالت اور ان کی تخلیقات کی طباعت دونوں سوالیہ نشان بنے رہیں گے۔

★

اداریہ روزنامہ جنگ کراچی
۱۳ فروری ۱۹۶۸ء

مولانا ارشد تھانوی (مرحوم)

مولانا ارشد تھانوی برصغیر پاک و ہند کے پرانے اور صاحب طرز انشا پردازوں میں سے تھے۔ اُن کا انتقال طویل علالت کے بعد کراچی میں ہوا۔ اُن کی عمر تقریباً ۸۰ سال تھی۔ ان کے انتقال سے ملک کہنہ مشق شاعر اعلیٰ پایہ کے نثر نگار اور بچوں کے مشہور کہانی نویس سے محروم ہو گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ لکھا۔ بے شمار نظمیں غزلیں اور مضامین تحریر کئے۔ جن کی دھوم ان کی زندگی ہی میں ہوئی۔ خاص طور پر بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کے معاملے میں تو انہوں نے ہنس کرسچین اینڈرسن کو پیچھے چھوڑ دیا۔ انہوں نے کم سے کم ایک ہزار کہانیاں بچوں کے لئے لکھیں۔ جو باقاعدگی کے ساتھ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی وہ قدر افزائی نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ مرنجاں مرنج قسم کے انسان۔ شریف النفس اور لئے دئیے رہنے والے زندہ دل اور با وضع آدمی تھے۔ شدید بیماری کے عالم میں بھی وہ لکھتے ہی رہے۔ لکھنا ان کی عادت تھی اور کسی حالت میں بھی انہوں نے اپنی یہ عادت ترک نہیں کی۔ انہوں نے اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر جو مضامین لکھے وہ بڑے وقیع اور قابل قدر ہیں جس سے ان کی تحقیق پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظم پر بھی وہ نثر کی طرح قدرت رکھتے تھے۔ عروض پر پورا عبور تھا بہت سی نظمیں فی البدیہہ لکھیں اور ہر ایک سے داد پائی۔ مولانا ارشد تھانوی مرحوم شوکت تھانوی مرحوم کے بڑے عم زاد بھائی تھے۔ ان کا تعلق تھانہ بھون سے تھا۔ زیادہ عرصہ انہوں نے بھوپال میں گزارا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی چلے آئے اور ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے ملازمت کے دوران انہوں نے بچوں کے لئے بے شمار نظمیں اور کہانیاں لکھیں اور متعدد ڈرامے اور فیچر تحریر کئے۔ کہن سالی اور علالت کے باعث وہ آخر میں ملازمت کو خیرباد کہہ کر گھر ہی پر لکھنے لکھانے میں مصروف رہے اور مرتے دم تک قلم ہی کو اپنا ذریعہ معاش بنائے رکھا۔ اور اپنی بیوی اور چھوٹے بچوں کو بڑے بیٹوں پر بار نہیں بننے دیا۔ اُن کی پرورش اور تعلیم کے لئے خود ہی تگ و دو کی۔ ان کے پسماندگان میں ایک ضعیف بیوہ۔ دو کمسن بچے اور ایک زیر تعلیم لڑکی شامل ہے جن کی کفالت وہ خود کرتے تھے۔ مولانا ارشد تھانوی کی رحلت کے بعد اُن کے بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔ اس پر غور کرنا حکومت کا اور ہر صاحب علم و ثروت کا فرض ہے۔ صدر محمد ایوب کی حکومت اہل علم کی بڑی قدر کرتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ مولانا ارشد تھانوی کی علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر ان کے بیوی بچوں کی کفالت میں ضرور کچھ مدد کرے گی۔ بڑا اچھا ہو کہ خود صدر ان کے لئے صدارتی فنڈ سے خاص رقم بطور مشاہرہ مقرر کر دیں۔ ساتھ ہی پاکستان رائٹرز گلڈ کو بھی ہمارا مشورہ ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے اہل و عیال کی طرف توجہ کرے۔ اور ان کی مدد کے لئے ہر ممکن قدم اٹھائے۔

> مولانا ارشد تھانوی نے بچوں کے لئے کہانیاں لکھنے کے معاملے میں تو
> ہنس کرسچین اینڈرسن کو پیچھے چھوڑ دیا۔
> انہوں نے کم سے کم ایک ہزار کہانیاں بچوں کے لئے لکھیں جو باقاعدگی کے ساتھ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہیں۔

٭

محمد احمد سبزواری ایم۔اے

مولانا ارشد تھانوی (مرحوم)

ہر معاشرہ میں ایسے افراد تو اکثر ہوں گے جو بڑھاپے میں اپنے مال و متاع یا آل اولاد سے محروم ہو جاتے ہوں مگر ایسے افراد کی تعداد خال ہی خال ہوتی ہے جو اپنی ساری زندگی کے علمی سرمائے سے محروم ہو گئے ہوں۔ مولانا ارشد تھانوی کا شمار اسی آخر الذکر زمرہ میں تھا۔ علمی و ادبی اکتسابات کو معنوی اولاد کی حیثیت دی جاتی ہے اور ان کا رونا بھی رویا جاتا ہے ارشد صاحب کو ان کی پائمالی کا احساس ضرور تھا مگر وہ کسی خاص قلق یا افسوس کا اظہار نہیں کرتے تھے انھوں نے اس عظیم حادثے کو بھی روزمرہ کے عام واقعات سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ یہ بھی ان کے اعلیٰ کردار اور ضبط و تحمل کی ایک بیّن مثال تھی۔ اس کو زمانے کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شخص جس نے ۶۰۔۶۵ سال لکھنے پڑھنے میں گزارے ہوں جو متعدد کتابوں کا مصنف رہا ہو۔ جس کی نظموں اور غزلوں کی تعداد ہزار بارہ سو سے متجاوز ہو گئی ہو، جس کے ڈرامے ریڈیو سے نشر کئے گئے ہوں، جس کی کہانیاں بچے ذوق و شوق سے سنتے ہوں جو بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشروں میں اس وقت کے اہم رسالوں مثلاً العصر، ادیب، الناظر، تمدن، زمانہ، نقاد، مخزن وغیرہ کا مایہ ناز ادیب رہا ہو۔ اس کے پاس آخر وقت میں نہ اپنی کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی مجموعہ نہ کوئی ڈرامہ تھا اور نہ کوئی کہانی۔ جو کچھ بھی علمی متاع تھی وہ صرف اس کا حافظہ تھا اور حافظہ بھی اس قدر التجا ع.

زبردست کہ آخر عمر تک دوسروں کے سیکڑوں اشعار برزبان۔ ۵۰۔۶۰ سال پہلے کے واقعات کی جزیاتی تفصیل اس طرح یاد کہ سننے والوں کو محسوس ہو کہ وہ خود اس محفل کے کردار ہیں۔

> **مولانا ارشد تھانوی**
>
> کو زمانہ کے بڑے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا' مگر انہوں نے کسی دور میں اپنے آپ کو ذہنی لحاظ سے درماندہ تصور نہیں کیا' دوسرے اپنی خودداری پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔
>
> **معاشی مشکلات**
>
> کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اُن کے بعض قریبی دوستوں کا بیان ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ گھر میں صرف اللہ کا نام ہے اور یہ باہر احباب میں بیٹھے پوری شدت سے اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

رشید احمد ارشد تھانوی ۱۸۹۸ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یو۔پی میں پیدا ہوئے۔ منشی سلطان احمد ان کے والد تھے جو یو۔پی پولیس میں تھانہ دار میرٹھ میں قائم مقام کوتوال اور ریاست بھوپال میں وکیل رہے ارشد صاحب ان ہی کے صاحبزادے تھے۔ خاندان میں علم و فضل کا چرچا تھا۔ ان کی والدہ بھی لکھی پڑھی خاتون تھیں وہ ان کو بچپن میں مثنوی گلزار ابراہیم سنایا کرتی تھیں اس لئے ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا اور ۹، ۱۰ سال کی عمر میں تک بندی کرنے لگے۔ ان کو اپنے یہ ابتدائی اشعار آخر عمر تک یاد تھے۔ ان کا ابتدائی بچپن تھانہ بھون اور میرٹھ میں گذرا۔ میرٹھ میں ان کے والد بھی کچھ عرصہ رہے۔ وہیں ان کے بڑے چچا کا قیام تھا۔ ان کے دوسرے اعزا مثلاً مولوی سید فدا علی (جو میرٹھ کے بڑے ممتاز وکیل گذرے ہیں) اور مولوی سید ظفر احمد (پھوپھا) وغیرہ بھی کمبو دروازے کے پاس محلہ کوٹلہ میں رہا کرتے تھے۔ کمبو دروازے کے پاس ہی ٹاؤن ہال تھا جہاں ایک لائبریری بھی تھی۔ یہ روزانہ وہاں جاکر اخبارات پڑھا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے دہلی میں پہلا دربار کیا۔ یہ بھی
اپنے سب سے چھوٹے چچا کے ہمراہ دہلی گئے۔ ایک دن چچا ان کو ساتھ
لے کر حکیم واصل خاں صاحب (حکیم اجمل خاں صاحب کے برادر معظم)
سے ملنے گئے۔ حکیم صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت کچھ نہیں کرتے
تو انھوں نے ان کو مدرسہ طبیہ دہلی میں داخل کرانے کی رائے دی۔
چنانچہ فوراً ہی ان کو مدرسہ میں داخل کر دیا گیا اور یہ طب پڑھنے لگے
اور اپنے ذوق شعری کو تسکین دینے کے لئے اپنے اسباق کو نظم کرنا شروع
کر دیا۔ بعد میں دوسری کتابوں کی مدد سے "طب ارشد" مرتب کرنا شروع
کی۔ اس میں سر سے لے کر سینہ تک کے جملہ امراض نظم ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب
کی نگرانی میں مدرسہ سے ایک رسالہ "مجلہ طبیہ" نکلا کرتا تھا اس میں
طب ارشد کے بعض اجزا شائع ہوئے۔ تعطیلات میں تھانہ بھون
آئے مگر وہاں آکر بیمار ہو گئے اور پھر دہلی واپس نہیں گئے۔

قیام دہلی میں چند روز ڈپٹی نذیر احمد کے پاس بھی پڑھنے گئے
پہلے تو ڈپٹی صاحب نے ان کو پڑھانے سے قطعاً انکار کر دیا مگر جب
انھوں نے خوشامد کی اور دریافت پر اپنا حسب نسب بتایا تو پڑھانے
پر آمادگی کا اظہار کیا۔ ارشد صاحب حسب عادت وہاں بھی ٹاؤن
ہال کی لائبریری میں جایا کرتے تھے اور تازہ رسالے پڑھا کرتے تھے۔
ڈپٹی صاحب بھی شام کو وہاں آتے تھے۔ ان کو بھی تازہ رسالوں کی
تلاش رہتی تھی۔ اگر وہ کوئی تازہ رسالہ ان کے ہاتھ میں دیکھتے تو ان
سے چھین کر خود پڑھنے لگتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور یہ بات
ارشد صاحب کو بڑی ناگوار گزری مگر دم نہ مار سکتے تھے۔ ایک دن
ایک پایہ ٹوٹی کرسی ان کو دیوار سے لگی نظر آئی۔ آپ نے اس کا پایہ
لگا کر اس کو اپنے برابر رکھ لیا اور خود ایک تازہ رسالہ لے کر بیٹھ گئے
اتفاق سے تھوڑی دیر بعد ڈپٹی صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے
ادھر ادھر دیکھ کر ان کے ہاتھ سے وہ رسالہ لیا اور ان کے برابر
اسی ٹوٹی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی دھم سے نیچے گرے۔ معززین اور
منتظمین نے لپک کر ڈپٹی صاحب کو اٹھایا۔ اور ان پر ہنسی کا دورہ سا
پڑ گیا۔ اور انھوں نے وہاں سے کھسک جانے ہی میں عافیت
سمجھی۔ ڈپٹی صاحب کو یہ تو علم نہ ہو سکا کہ یہ ان کی شرارت تھی۔
اشجاع

مگر ان کی بے موقع ہنسی بھی پسند نہ آئی چنانچہ جب دوسرے روز
پہنچے تو سختی سے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں یہ اپنے والد کے ساتھ بھوپال آ گئے وہاں
وکالت کا امتحان دے کر سنہ ۱۹۱۲ء میں کورٹ سب انسپکٹر ہو گئے
چودہ سال کورٹ میں رہے پھر تھانہ دار ہو گئے۔ پھر تحصیلدار
ہو گئے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں وزیر مال سے جھگڑا ہو گیا اور ملازمت
سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ ایک سال بعد حیدرآباد چلے گئے وہاں
نواب اکبر یار جنگ کے یہاں مہمان رہے اور نواب صاحب اور
مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش سے ایک پائیگاہ میں سب
جج ہو گئے مگر یہ ملازمت کچھ پسند نہ آئی اور پھر بھوپال آکر وکالت
شروع کر دی۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔ پانچ سال تک ریڈیو
پاکستان سے منسلک رہے۔ بعد میں کوئی خاص مشغلہ نہیں رہا۔
ڈھائی تین سال امراض قلب کی شکایتوں میں مبتلا رہے۔ آخر
۲ فروری سنہ ۱۹۶۰ء کو ساڑھے تین بجے اس دنیا سے رخصت
ہو گئے۔

ان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ بیاض ارشد سنہ ۱۳۱۸ھ
میں شائع ہوا۔ "بیاض ارشد" اس کا تاریخی نام ہے جس میں حسب
روایات قدیم حروف تہجی کے لحاظ سے غزلیں ہیں۔

دوسرا مجموعہ "حسن تخیل" کے نام سے سنہ ۱۹۱۱ء میں انڈین پریس
الہ آباد سے شائع ہوا اس میں شاعر کی ایک تصویر بھی ہے جہاں
شاعر جنگل کے ایک گوشے میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس تصویر کو
دیکھ کر محوی صدیقی نے ایک نظم کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

نظر آتا ہے تو مدت سے پامال جفا ارشد
تبسم سے بھی تیرے لب نہیں ہیں آشنا ارشد
مبارک ہو فراغ خاطر عزلت گزیں تجھ کو
بساط عزت و تمکین ہو صحرا کی زمیں تجھ کو
احبا میں بنیں اشعار تیرے ارمغاں ہو کر
دل دشمن میں کھٹکے معرفہ موزوں سناں ہو کر

تیسرا مجموعہ "تصویر افکار" تھا۔ یہ نظموں کا مجموعہ ہے [illegible]

متعدد تصاویر بھی ہیں۔ مثلاً ایک تصویر میں مالن رانی کو پھول پیش کر رہی ہے۔ نظم کا عنوان "فصل بہار" ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ابتدا میں حوریں اس دنیا میں عورتوں کی شکل میں بھیجی گئیں۔ آسمانی حوریں اپنی پرانی سہیلیوں کو یاد کرتی ہیں، مگر ان سے کوئی ربط قائم نہیں کر سکتیں لہٰذا انھوں نے ہر سال فصل بہار پر اپنا پیغام پھولوں کی شکل میں بھیجنا شروع کیا۔ چنانچہ تصویر کے نیچے جو شعر درج ہے وہ یہ ہے۔

پھول رانی کو جو مالن پیش کرنے آئی ہے
رنگ و بو کی شکل میں حوروں کے بوسے لائی ہے

"آثار سانچی" ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں بدھ مت کے مشہور استوپا سانچی کا تاریخی حال درج ہے۔ اردو زبان میں سانچی پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔

"اختر بیگم"۔ ایک مختصر ناول ہے جسے صدیقی بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ "اجتماع ضدین": ایک دوسرا ناول ہے جو صدیقی بک ڈپو سے شائع ہوا۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں والدین اپنی اولاد کی شادی ان کے منشا اور رضا مندی معلوم کئے بغیر اپنی خالی مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے کر دیتے ہیں۔ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں اور طرفین عمر بھر تلخ زندگی گزارتے ہیں۔

"طواف زمین" یہ فرانسیسی ناول نگار جانس ورن کی مشہور کتاب "اسی دن میں دنیا کا سفر" کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ فارسی سے کیا گیا ہے مگر ترجمہ اس قدر بہتر ہے کہ اس پر طبع زاد ناول کا گمان ہوتا ہے۔

"نوائے تلخ" یہ سیاسی نظموں کا مجموعہ تھا اور اس میں زیادہ تر نظمیں انگریزی دور کے ریاستی نظام اور وہاں کے باشندوں کے حقوق کی پامالی اور استبداد وغیرہ سے متعلق تھیں۔ ابو سعید بزمی مرحوم نے اس کا مقدمہ لکھا تھا مگر یہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ اس مجموعے کی سب نظمیں ۳۵ء سے ۴۶ء تک کے مشہور اخبارات میں شائع ہوئیں۔

"توقیات" یہ ایک طویل سیاسی کتاب تھی جس میں ایک وطنی صاحب
الشجاع

کی زندگی کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یہ وطنی صاحب ایک حقیقی سیاسی کردار تھے جو ارشد صاحب کے عزیز ترین دوستوں میں شامل تھے۔ مگر اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایک صحیح رہنما یا لیڈر میں کون کون سی خصوصیات ہونا چاہئیں اور اس کو اپنا مقصد کس طرح حاصل کرنا چاہئے اور مقصد کے حصول میں کیا کیا دشواریاں پیش آنا ممکن ہیں۔ اس میں اکثر مشاہیر ہند کا تذکرہ بھی ہے جن میں زیادہ تر کانگریسی اصحاب تھے مگر جب قیام پاکستان کے سلسلے میں کانگریسی حضرات سے اختلاف ہوا تو اس کی شکل بدل دی گئی۔

۱۹۳۶ء میں بھوپال سے ایک معتبر ہفتہ وار اخبار "ندیم" سر راس مسعود کے ایما پر محمود الحسن صدیقی بی۔ اے (علیگ) کی ادارت میں جاری ہوا۔ ارشد صاحب نے اس اخبار میں "بھوپال کی فضائے شعری" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جو ۲۵ - ۲۶ اقساط میں شائع ہوا جس میں بیسویں صدی کے اوائل سے بھوپال کی ادبی اور شعری زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس زمانے کے اکثر مشاعروں کا تذکرہ ہے اور بعض جگہ دوسرے شعرا کی غزلیں کی غزلیں اپنے حافظہ کی مدد سے نقل کی ہیں۔ یہ سلسلہ نہ صرف اس وقت کافی مقبول ہوا اور اس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا بلکہ حال ہی میں جب سلیم حامد رضوی نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "بھوپال کی علمی و ادبی خدمات" لکھا تو اس سے کافی استفادہ کیا۔

کراچی آنے کے کچھ عرصہ بعد ارشد صاحب کو ریڈیو پاکستان سے منسلک ہونا پڑا۔ بچوں کے پروگرام کے لئے ہر ہفتہ کم از کم تین کہانیاں لکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ ارشد صاحب نے جب ابتدا میں مجھ سے اس پیش کش کا تذکرہ کیا تو میں نے کہا مبارک ہو مگر کہیں انشا اللہ خاں کا سا حال نہ ہو جائے۔ اس وقت تو ارشد صاحب کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔ مگر برابر پانچ سال تک بچوں کے لئے کہانیاں لکھتے رہے اور اس میں بعض مغربی مصنفین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ان کی کہانیوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے حال میں مجھے بچوں کے ادب پر بعض ایم اے کے مقالوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اس میں ارشد صاحب

کا ذکر تک نہیں ہے۔

ریڈیو کے لئے اکثر ڈرامے بھی لکھے جن میں لالۂ صحرا، خوبیٔ تقدیر پلاسٹک سرجری، نیلی پگڑی، قارون وغیرہ بڑے مقبول اور کامیاب ڈرامے ہیں جن میں سے بعض متعدد بار ریڈیو پاکستان سے پیش کئے گئے۔

اس کہنہ مشق شاعر و ادیب کے دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع رہا ہے۔ ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ اقبال، سر سید، لیاقت علی، سر راس مسعود، شیخ محمد اکرام ایڈیٹر مخزن، مولانا ظفر علی خاں احمد علی شوقی، خواجہ حسن نظامی، علامہ راشد الخیری، علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ سیماب اکبرآبادی، علامہ نیاز فتحپوری، سید جالب دہلوی، قاری عباس حسین، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، پیارے لال شاکر، منشی پریم چند، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا ظفر الملک علوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی صبغت اللہ فرنگی محلی، منشی دیا نرائن نگم، دیوان سنگھ مفتون، عبدالرؤف عشرت، اکبر یار جنگ، عزیز لکھنوی (حضرت جوش کے استاد) احسن مارہروی، ریاض خیرآبادی، لسان العصر اکبرالہ آبادی، مانی جائسی، نوبت رائے نظر، شاہ دلگیر اکبرآبادی، جگر مرادآبادی مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ، پیارے صاحب رشید، نواب انجم نیشا پوری، حضرت جاوید اور خان بہادر محمد مظہر تھانوی (برادر خورد مولانا اشرف علی تھانوی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ارشد صاحب بڑے ذہین، زندہ دل اور دلچسپ بزرگ ہے۔ ان کی زندہ دلی اور ذہانت کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہو سکتا ہے۔

شوکت تھانوی کا نام اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں لیکن غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کو شوکت تھانوی بنانے والے یہی ارشد تھانوی ہیں۔ عم زاد بڑے بھائی اور پھر بڑے بہنوئی کی حیثیت سے شوکت صاحب ان سے کافی مرعوب تھے۔ پھر ان کے بچپن کے زمانے میں جب ارشد صاحب لکھنؤ آتے اور وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کا خیر مقدم ہوتا تھا اس سے بھی کافی متاثر ہوتے تھے۔ یہ اسی مرعوبیت اور تاثر کا نتیجہ تھا کہ وہ

الشجاع

صاحب جو نہ تھانہ بھون میں پیدا ہوئے اور نہ اس وقت تک تھانہ بھون کی صورت دیکھی تھانوی بن گئے (شوکت صاحب صاحب اولاد ہونے کے بعد پہلی مرتبہ ایک دن کے لئے تھانہ بھون گئے تھے) اور شوکت تخلص رکھا ورنہ ان کا اصلی نام محمد عمر تھا۔

ایک دن اتفاق سے ارشد صاحب کو اپنے برادر خورد کے شاعر ہو جانے کا علم ہوا تو فرمائش کی کہ اچھا اپنی کوئی چیز سناؤ۔ شوکت صاحب نے اپنی دو تین کامیاب غزلیں سنائیں مگر برادر معظم کو شک ہوا کہ یہ ان کا کلام نہیں بلکہ ادبی سرقہ ہے۔ چنانچہ امتحان کی غرض سے یہ مصرعہ دیا ؎

جب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

شوکت نے چند لمحے توقف کیا اور مصرعہ لگایا۔

غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

ارشد صاحب پھڑک اٹھے اور شوکت کو شاعر تسلیم کر لیا۔

"حسن تخیل" کی اشاعت کے چند روز بعد علامہ محوی صدیقی کے ہاں لڑکا ہوا انھوں نے ایک دن برسبیل تذکرہ ارشد صاحب سے اس موقع پر کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ اسی زمانے میں سرور جہاں آبادی کی ایک نظم "بیربہوٹی" کے عنوان سے کسی رسالے میں شائع ہوئی تھی جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

آہ، او ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو
صفحۂ ہستی کا اک نقشِ تحیر زا ہے تو

ارشد صاحب نے فوراً شعر پڑھا ؎

آہ او محوی کے بیٹے نازشِ دنیا ہے تو
اس کا بھی بیٹا ہے تو اور میرا بھی بیٹا ہے تو

۱۹۳۱ء میں پیارے لال شاکر ایڈیٹر العصر لکھنؤ میں مقیم تھے جب ارشد صاحب وہاں گئے تو انھوں نے پر تکلف دعوت کی۔ اس میں منجملہ اور اصحاب کے ایک نوعمر صاحبزادی بھی تھیں۔ کھانے کے بعد شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ کسی نے ان صاحبزادی کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ بھی شعر کہتی ہیں۔ چنانچہ تقاضا ہوا کہ یہ بھی اپنا کلام سنائیں۔ انھوں نے کہا میں شاعر نہیں ہوں میں تو صرف

اپنے ذاتی جذبات کو شعر کا جامہ پہناتی ہوں۔ کہا گیا کہ آپ وہی سنا دیجئے۔ چنانچہ انھوں نے ایک نظم سنائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں اپنی ماں سے بڑی محبت کرتی ہوں۔ اور ان کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا مطمح نظر سمجھتی ہوں۔ اس نظم کا ایک مصرعہ تھا ؎

قدموں سے جدا تم مجھے للہ نہ کرنا

ارشد صاحب فوراً بولے۔

میں کہتی ہوں اماں مرا تم بیاہ نہ کرنا

نیاز فتحپوری کافی عرصہ بھوپال میں رہے تھے۔ ارشد صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے۔ بلکہ وہاں ارشد صاحب اور نیاز صاحب نے مل کر ایک انجمن سبعہ سیارہ کی بنیاد ڈالی اس میں ان دو حضرات کے علاوہ فہمی ترمذی۔ مولانا یوسف قیصر۔ مولانا عبدالحلیم۔ محوی صدیقی اور عصمت اللہ شامل تھے۔ نیاز صاحب افسر اعلیٰ نظام پولس کے دفتر میں ریڈر تھے۔ ایک دن ارشد صاحب ان کے دفتر میں گئے۔ نیاز صاحب موجود نہ تھے البتہ میز پر ایک کاغذ رکھا تھا جس پر مندرجہ ذیل مصرعہ لکھا ہوا تھا ؎

تو اگر آنکھوں سے اپنی بادہ پیمائی کرے

ارشد صاحب نے اس کے آگے لکھ دیا۔ ؎

پھر نہ اس دفتر میں ہرگز خامہ فرسائی کرے

خان بہادر محمد مظہر جس زمانے میں الہ آباد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے انھوں نے ارشد صاحب کو وہاں مہمان بلایا۔ دوران قیام لسان العصر اکبر الہ آبادی سے بھی کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ارشد صاحب کا کلام سنا۔ ایک دن کلام سن کر ایک پرچہ پر یہ شعر لکھا ؎

طرزِ اسلوبِ ادا میں کہنگی ہو یا نوی
خوب فرماتے ہیں ہر مضمون کو ارشد تھانوی

ارشد صاحب نے ازراہ احترام اس کاغذ کو سر پر رکھ لیا۔

ارشد صاحب کو زمانے کے بڑے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ مگر انھوں نے کسی دور میں اپنے آپ کو ذہنی لحاظ سے الشجاع

درماندہ تصور نہیں کیا۔ دوسرے اپنی خودداری پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔ معاشی مشکلات کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ ان کے بعض قریبی دوستوں کا بیان ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ گھر میں صرف اللہ کا نام ہے اور یہ باہر احباب میں بیٹھے پوری شدت سے اپنی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاتون ارشد نے بھی ان کا بڑا ساتھ دیا۔ ناز ونعم کی پلی بیٹی۔ لکھنوی طرز معاشرت کی عادی۔ جب ان کے گھر آئی تب بھی اس نے روپے کی ریل پیل دیکھی مگر جب وقت آیا تو ایسا ساتھ دیا کہ اپنا سب کچھ ان پر لٹا دیا۔ طویل علالت میں جو خدمت کی۔ دیکھنے والے بھی اس کے معترف ہیں۔

زمانہ بدل رہا ہے آج تحقیق و تفتیش کا دور ہے۔ جب مولوی عبدالحق اور ان کے ساتھیوں نے دلی دکنی اور اسکے معاصرین کے زمانے کی چیزوں کا کھوج لگا لیا تو کیا اس زمانے میں ارشد صاحب اور کسی قسم کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے گم گشتہ خزانوں کا پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ اگر اردو کے طالب علم کوشش کریں اور جامعات ان کی سرپرستی کریں تو ڈاکٹریٹ کے لئے اسی قسم کے موضوع منتخب کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ عمرانی علوم کی تحقیق کا تھوڑا بہت تجربہ رکھنے کی بنا پر راقم الحروف یہ بات عرض کرنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ چند ممتاز شعرا اور ادیبوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے گھسے پٹے موضوعات کو منتخب کرنے کے بجائے ان گم گشتہ اوراق کی تلاش زیادہ کارآمد مفید اور دلچسپ ہو سکتی ہے جو ہمارے ادبی ورثہ کا ایک اہم جزو ہیں۔ بیشتر مطبوعہ چیزیں پاکستان کی قدیم لائبریریوں اور نجی کتب خانوں میں مل سکتی ہیں۔ کام ہو سکتا ہے بشرطیکہ کام کرنے کی لگن ہو۔ کیا یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ہماری جامعات کے اردو شعبے اس جانب توجہ کریں گے؟ ایک اور اہم مسئلہ جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے وہ پرانے صاحب طرز ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے پسماندگان کی کفالت کا ہے۔ ابھی ہمارا معاشرہ اس درجہ پر نہیں پہنچا جہاں ادیب اور شاعر اپنے قلم سے مالی منفعت حاصل کر سکیں۔ جو لوگ قلم کو اپنا ذریعہ معاش بناتے ہیں ان کی زندگی تو بری بھلی گزر جاتی ہے مگر اس کے بعد ان کے پسماندگان کی حالت بڑی ابتر ہو جاتی ہے۔ ارشد صاحب نے بھی آخر وقت تک اپنے قلم ہی کو ذریعہ معاش بنائے رکھا اب ان کے پسماندگان میں ان کی بیوی۔ دو معذور نوجوان لڑکے اور ایک غیر شادی شدہ زیر تعلیم بچی کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ سنا ہے کہ کچھ عرصے سے ہمارے یہاں پاکستان رائٹرز گلڈ قائم ہو چکا ہے اگر وہ اس جانب توجہ کرے تو ان چار جانوں کی کفالت کا معقول انتظام ہو سکتا ہے اور یہ معاشرے کی بڑی خدمت ہوگی

جنگِ عظیم دوم کا ایک ناقابلِ فراموش باب

نوشتہ
جان مینسفیلڈ

ترجمہ
اختر ملیح آبادی

ڈنکرک سے برطانوی فرانسیسی افواج کا انخلاء

● جرمنی ہوائی حملوں اور لمبی مار توپوں نے ہمارے ہزاروں سپاہیوں کو موت کے نیند سلا دیا تھا۔ ان کی لاشوں کا انبار بڑھ رہا تھا۔ ہزاروں زخمی فوجی تڑپ رہے تھے لیکن ہم ان کو طبی امداد دینے سے مجبور تھے۔ دشمن برابر بمباری میں مصروف تھا اور اس قدر دھواں تھا کہ خود دشمن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دھوئیں کی اس چادر کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی نازی طوفانی افواج سارے یورپ کو اس طرح پامال کر رہی تھیں کہ ان کو روکنے والا تو درکنار للکارنے کی ہمت بھی کسی میں نہ تھی۔ لے دے کے فرانسیسی محاذ پر اتحادیوں نے ساری قوت جمع کر رکھی تھی۔ وہیں برطانوی فوجوں نے بھی مضبوط مورچے سنبھال رکھے تھے۔ فرانسیسی جرمن سرحد پر فرانس کی بین الاقوامی دفاعی شہرت والی میگنٹ لائن ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی اور امید قوی تھی کہ اسی محاذ پر ہٹلر کی افواج کو روکنا ممکن ہو سکے گا

لیکن نازی جنرل اسٹاف نے دنیا کو ششدر کر دیا اور آن واحد میں میگنٹ لائن کو ناکارہ کر دیا فرانس نے پہلی ہی ٹکر میں ہتھیار ڈال دیئے۔ ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کی صرف فرانس ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں اس لئے یادگار رہے گی کہ اس تاریخ کو نازی جنرلوں نے فرانس کو دھچکہ دیا کہ فرانسیسی جنرلوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اور اتحادیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ نازی فوجیں میگنٹ لائن پر حملہ بولنے کے بجائے بغل کی طرف ٹوٹ پڑیں اور اس جنگی چال کے ساتھ کہ اتحادیوں کو باور کرا دیا کہ ان کا رخ اور مقصد میگنٹ لائن پر حملہ ہے جبکہ جھکائی دے کر نازی طوفانی فوجیں بلجیم میں جا گھسیں اور بلجیم اور ہالینڈ کو روندتی ہوئی میگنٹ لائن کو بیکار بناتی ہوئی بائیں جانب سے میگنٹ لائن کے عقب میں در آئیں کہ فرانسیسی سپاہی میگنٹ لائن میں اطمینان و سکون سے اپنی محبوباؤں کو عشقیہ خطوط لکھ رہے تھے کہ نازی طوفانی دستوں کو عقب میں دیکھ کر گھبرا اٹھے۔

میگنٹ لائن کو نازی جرنلوں نے جس شاطرانہ چال سے ناکارہ بنا دیا تھا وہ چال عسکری تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی! یہ سب کچھ ناممکن اقدام جرمنوں نے کل پانچ دن میں کر دکھائے تھے۔ دنیا جہاں ششدر تھی وہاں نازی جرنلوں کے ذہنوں کی معترف بھی! اس طرح ۱۵ مئی ۱۹۴۰ء کو نازی طوفانی فوجوں نے مضبوط فرانسیسی مورچے کو اس طرح توڑ پھوڑ دیا کہ جیسے ریت کا قلعہ آن واحد میں زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۰ء کو نازیوں نے نہ صرف فرانسیسی دفاعی مورچوں کو برابر کر دیا بلکہ ان کے قوی ہیکل ٹینک فرانس کے مغربی ساحل کی طرف مارچ کرنے لگے

فرانسیسی و برطانوی جرنلوں کو یہ شدید زک اس لئے اٹھانا پڑی کہ انہیں یقین تھا کہ بلجیم جس نے جنگ عظیم اول میں جرمن فوجوں کا چالیس دن تک ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا وہ بلجیم اب کہیں زیادہ مستعد ہے لہٰذا نازی فوجوں کو ناکوں چنے چبوا دے گا لیکن اڑتالیس گھنٹے کے اندر بلجیم چیخ اٹھا اور ہتھیار ڈال دیئے اس طرح ہالینڈ کی بساط بھی کاغذی ثابت ہوئی۔ اتحادیوں کی خوش فہمی اور غیر جنگی بصارت نے نہ صرف بلجیم و ہالینڈ پر نازی قبضہ کرا دیا بلکہ فرانس جیسے طاقتور اتحادی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

اب جنگی صورت حال یہ تھی کہ فرانس نے شکست تسلیم کر لی تھی برطانوی فوج سرزمین فرانس پر بالکل تنہا اور بے یار و مددگار تھیں سامنے سے نازی فوجیں سیلاب کی طرح امنڈتی چلی آ رہی تھیں۔ نازی ٹینک دستوں کو روکنے کے لئے ہمارے پاس ٹینک کا نام نہیں تھا۔ اس سے خطرناک بات یہ آن پڑی تھی "لفٹ ویولا" جرمن طوفانی فوج کے ان کے اسکوارڈن اڑتے اور بمباری کرتے تو ہم بنکروں میں منہ چھپانے کے بھی نااہل رہ گئے تھے! ۔ دشمن کی یلغار تھی اور

پیش قدمی تھام ہو سکی تھی۔ جرمن فوجیں ہمیں دائیں بائیں سے گھیر کر جلد از جلد مشہور فرانسیسی بندرگاہ "ڈنکرک" تک پہنچ کر ہمارا راستہ مسدود کر دینا چاہتی تھیں۔ نازی جرنلوں کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اگر کہیں "کیلاس" "بولون" اور "ڈنکرک" پر نازی فوجیں قابض ہو جائیں تب پیچھے بکھری ہوئی برطانوی فوجوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دینا قدرے مشکل کام نہ تھا۔ اس بھیانک خطرے کو ہم سب تاڑ گئے تھے اور ہراساں تھے۔ یوں بھی ہماری طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ہم آمنے سامنے آکر فاتح جرمن نازی فوجوں سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ جبکہ ہماری فضائی طاقت معمولی تھی اور دشمن کے بمبار ہم کو کھانے کے لئے اڑ رہے تھے اور قوی ہیکل نازی ٹینک جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا ہمیں پیس دینے کے لئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ اس بھیانک خطرے میں جن کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے ہماری اخلاقی جرات کا کیا حال ہوگا اور ہماری سکت کس منزل میں ہوگی۔ اس کا تعلق صرف محسوسات ہی سے ہو سکتا ہے اور بس!۔

نازی فوجیں جوں ہی جھکائی دے کر شمالی فرانس میں در آئیں ہم نے اپنے اگلے مورچے چھوڑ دیئے اور پیچھے ہٹ آئے تاکہ سنبھلنے کا موقع ملے۔ لیکن تازی طوفانی فوجوں نے ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان کا رخ ڈنکرک کی طرف تھا۔ اس وقت ہمیں لندن کے دفتر جنگ سے احکامات ملے۔ "آگے بڑھ کر نازی فوجوں پر وار کرو!" اس حکم نے ہمیں انگشت بدنداں کر دیا! — ہمارے سروں پر موت منڈلا رہی ہے۔ ہم حملہ کیسے کر سکتے ہیں!؟ — لیکن تعمیل حکم ضروری تھی۔ اسی وقت ہمارے کمانڈر نے سگنل دیا اور ہم نے ڈرتے ڈرتے بہ احتیاط آگے بڑھنا شروع کیا تاکہ اتحادی گروپ کے اہم ممبر ہونے کی حیثیت میں ہم اپنا فرض انجام دیں اور جو کام فرانسیسی فوج نہیں کر سکی وہ ہم پورا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری پیش قدمی ۲۰ مئی ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ ابھی ہم آگے بڑھ کر اس پوزیشن میں نہیں آپائے تھے کہ حملہ کریں کہ ہمارے بائیں جانب پوزیشن لینے والی بلجیم کی فوج کے حالات ابتر ہونے لگے جو بلجیم کے ہتھیار ڈال دینے کے باوجود ہمارے ساتھ تھی اس طرح ہمارا بایاں بازو کمزور ہونے لگا اس لئے کہ نازی دباؤ سخت تھا۔ ٹھیک اسی وقت داہنے سمت پہلی فرانسیسی فوج کے مورچے کو پارہ پارہ کئے دے رہی تھیں ظاہر ہے ایسی پوزیشن میں ہمارا بڑھ کر حملہ کرنا آگ میں کود نے کے مترادف ہوتا ہمارے لئے بس ایک ہی چارۂ کار تھا کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں یہاں تک کہ جنگی لحاظ سے دفاعی لائن میں آجائیں کہ ہم جس پوزیشن میں تھے وہ جنگی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے انتہائی غیر مناسب اور غیر محفوظ تھی۔ لہذا دفتر جنگ کے احکامات پر عمل نہ کرتے ہوئے ہم نے پسپائی قبول کی۔

لیکن جلد ہی یہ جان کر ہمیں پریشانی ہوئی کہ پسپائی بھی ہمارے لئے انتہائی مشکل ہے اس لئے کہ سڑکوں اور راستوں پر جو مہاجرین سے پٹے پڑے تھے بلجیم و ہالینڈ پر نازی قبضہ نے یہ صورت حال پیدا کی تھی بعد میں فرانس کی شکست نے لوگوں کو ہراساں کر دیا تھا ہماری پسپائی کے راستے اس طرح بند تھے۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ لاکھوں کی تعداد میں رفیوجیوں کی نقل و حرکت دراصل نازی جنگی جرنلوں کی ایک جنگی چال تھی۔ اول تو یہ کہ یہ بھیڑ ہماری رفتار دھیمی بنا دے گی۔ دوسری یہ کہ ان میں نازی جاسوس بھی بھیس بدلے چھوٹے چھوٹے ٹرانسمیٹر لئے موجود تھے اور خفیہ طور پر ہماری نقل و حرکت سے دشمن کو مطلع کر رہے تھے جس کا ہمیں علم نہ تھا۔ غرضیکہ رفیوجیوں کی بھیڑ بھاڑ نے ہمیں پریشان کر دیا۔ ادھر شمال سے نازی فوجیں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ آگے آگے جرمن ٹینک دستے تھے جن کا ہمارے پاس توڑ نہ تھا۔ بائیں محاذ پر بلجیم فوج کا کچومر نکلا جا رہا تھا۔ دائیں محاذ پر فرانسیسی فوج شکست کے قریب تھی اور آسمان سے ہمیں نازی بمبار چنوں کی طرح بھون رہے تھے اور ڈنکرک تک کا فاصلہ بہت تھا کسی مقام پر سر چھپانا ممکن نہ تھا۔!

برطانوی فوج کی ابتر اور خطرناک پوزیشن سے لندن کو باخبر رکھا جا رہا تھا۔ بالآخر ۱۹ مئی ۱۹۴۰ء کو وزارت جنگ لندن میں فوراً جنگی کمانڈ کی کانفرنس ہوئی اس امر پر غور کرنے کے لئے کہ مغربی فرانس کے ساحلی بندرگاہوں پر قبضہ برقرار رکھ کر دشمن پر وار کیا جا سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ کیا جنگی صورت حال کا تقاضہ ہے کہ سرزمین فرانس سے برطانوی افواج کو واپس بلایا جائے۔؟

۱۹ مئی کی کانفرنس میں واضح فیصلہ ممکن نہ ہو سکا تب ۲۱ مئی ۱۹۴۰ء کو دوسری کانفرنس ہوئی۔ اس لئے کہ پچھلے چار دن کی رپورٹیں جو دفتر جنگ لندن میں پہنچی تھیں اس نے برطانوی جنرل اسٹاف کو منتشر کر دیا تھا۔ لہذا کانفرنس یہ طے کرنے کے لئے ہوئی کہ برطانوی افواج سرزمین فرانس سے تخلیہ کیسے ہو؟ کیا فضائی حفاظت ضروری ہے۔ نیز یہ کہ ڈنکرک سے افواج کے تخلیہ کے لئے کتنی کشتیوں کی ضرورت ہوگی؟

ادھر دشمن بھی خالی نہیں بیٹھا تھا۔ ہماری حالت اور پوزیشن کا اسے پوری طرح احساس تھا۔ ساتھ ہی ہم پر دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر ۲۳ مئی کو ڈنکرک کا معاون بندرگاہ "کیلاس" کی پوزیشن مخدوش ہوگئی۔ جتنے اتحادی مورچے تھے ان پر نازی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ جرمن فوجوں نے آگے پیش قدمی شروع کر دی۔ ہم نے گھبرا کر ڈنکرک کی طرف اپنی پیش قدمی تیز کر دی اس لئے کہ اب ہمارا محافظ لے دے کے ڈنکرک تھا۔ اگر ہم نے تاخیر کی تب دشمن جو ہم سے پہلے وہاں پہنچنے کے لئے مقابلہ

کی وہ ذکر رہا ہے اگر کامیاب ہوگیا تب ہماری واحد شہ رگ کٹ جائے گی اور اگر نازی اپنے قوی ہیکل ٹینکوں اور خطرناک بمباروں سے نہ بھی بھونیں تب بھی ہم اپنی موت خود اس لئے مرجائیں گے کیونکہ ڈنکرک ہی لے دے کے ہماری واحد سپلائی لائن تھا۔ لہٰذا ہم نے آنکھ بند کر کے ڈنکرک کا رخ کیا۔ اگرچہ لاکھوں رفیوجیوں نے ہمارے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔

۲۴۔ مئی ۱۹۴۰ء کو "بولینگ" کے بعد ہی بندرگاہ کیلاس پر بھی نازی طوفانی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہ حالت ہمارے لئے اور خطرناک تھی۔ اس لئے کہ نازی فوجوں نے کیلاس پر قبضہ کرتے ہی عقب سے اس راستے کو بند کرنے کے لئے فوجی دستے بھیجے تھے اور نازی ٹینک کالم ایری کینال AIRECNAL تک پہنچ چکے تھے

۲۵۔ مئی ۱۹۴۰ء کو پسپا ہونے والی برطانوی فوج کو اس وقت ایک کاری ضرب لگی جب جرمن بمباروں نے واٹر ورکس کو تباہ کردیا اور اب ہم پانی سے بھی محروم ہوچکے تھے اور اسی دن شام کو جرمن جنگی ہائی کمانڈ نے غیر ملکی نامہ نگاروں کو بتایا اور اعلان کیا کہ "برطانوی فرانسیسی و بلجیم کی افواج کے گرد ہمارا آہنی حصار مکمل ہوچکا ہے۔ اور ہمارے آہنی پنجے سے ایک سپاہی کا بھی بچ نکلنا ممکن نہیں"۔ ادھر اعلان ہو رہا تھا اور ادھر ڈنکرک میں جرمن بمبار بمباری کر رہے تھے اور ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سارے آئل ٹینک بمبارڈمنٹ سے شعلوں کی گود میں آ چکے تھے۔

دوسرے دن بلجیم فوج جو بہتر ہتھیاروں سے مسلح تھی نازی فوج کی معمولی ٹکر نہ سہہ پائی اور بھاری نقصان کے بعد بلجیم کی فوج نے ہمت ہار دی اور ہتھیار ڈال دیئے اس طرح ہمارا بایاں بازو ڈائرکٹ خطرے کی زد میں آگیا۔ بلجیم کی فوج کی شکست کا فرانسیسی فوج پر بہت گہرا ردعمل ہوا

جب ہم ڈنکرک پہنچے تو وہاں ساتویں فرانسیسی فوج مورچے سنبھالے تھی اور ہماری آمد کی منتظر تھی۔ اسی دن ڈنکرک سے ہمارے تخلیہ کے ابتدائی انتظامات شروع ہوگئے۔ ان حالات میں کہ ہم اپنا دفاع بھی کرنے کے قابل نہ تھے مسلسل پسپائی نے ہماری ہمت صفر کے برابر کردی تھی نہ ہمارے پاس پانی تھا نہ خوراک ہم انتہائی تاریکی میں گھر چکے تھے جب کہ دشمن ہم سے کہیں تازہ دم اور بالا پوزیشن میں تھا اس کی ہمت بلند تھی۔ دشمن کا دباؤ زمین اور آسمان سے ہم پر برابر بڑھ رہا تھا۔ ان حالات میں ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لئے پھر بھی کوشاں تھے۔ ہمیں تخلیہ کرنا تھا۔ اور کامیاب تخلیہ جنگ کے ابتدائی دور کا یہ اقدام ناممکن اصل اور جنگی سوجھ بوجھ کے منافی تھا۔ ہم وہی کام کرنے جا رہے تھے۔ جنگ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے ۔۔۔! ہماری مسلسل پسپائی نے اگرچہ ہمیں نڈھال کر دیا تھا۔ لیکن ہم جرمن قید سے اب تک کسی نہ کسی طرح بچ رہے تھے۔ ۲۱۔ مئی ۱۹۴۰ء کی لندن کانفرنس کے فیصلہ کے بعد ہمیں جلد از جلد تخلیہ کر دینا تھا۔ لیکن ایک ہفتہ کی تاخیر ہمیں موت کے شکنجہ سے بچنے کے لئے ناگزیر تھی۔ لیکن ڈنکرک پہنچتے ہی ہماری خستہ حالت کے باوجود فوری کاروائی کا آغاز ہوگیا۔ متعدد بحری فوج کے افسروں اور بحری فوج کے افراد کو بیچ ماسٹر کی ڈیوٹی سونپ دی گئی۔ "موونگ کنٹرول" اور محکمہ جہاز رانی کے افسران مصروف ہوگئے۔ فوج بردار جہازوں اسپتالی جہازوں سپلائی کے جہازوں اور دوسرے جہازوں کی فہرست بننے لگی

جرمن بمبار مستعدی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ ان کی بمباری سے بندرگاہ کا راستہ مسدود ہوگیا تھا کئی جہاز ڈوب چکے تھے کچھ جل رہے تھے لہٰذا تخلیہ کے لئے بندرگاہ غیر محفوظ خطرناک بن گیا تھا لہٰذا بندرگاہ کے ڈاک (DOCK) کو استعمال کرنا ممکن نہ تھا۔ ڈنکرک کے آس پاس کوئی ایسا جزیرہ نہ تھا جو ہماری مدد کرتا لہٰذا تخلیہ کا کام کشتیوں سے شروع کیا گیا۔ ان ہی کشتیوں سے جو فوجیوں کو لے کر جہازوں تک جاتی تھیں واپسی میں اشیائے خوردنی پانی اور گولہ بارود لاتی تھیں۔ جب تخلیہ کا آغاز ہو تب ہوا کا رخ انتہائی مخالف تھا۔ پڑھنے والے اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم پر کیا بیت رہی تھی اور یہ کہ ہم کن بھیانک حالات و خطرات سے دوچار تھے۔ جرمن لمبی مار کی توپیں ہم پر آگ اگل رہی تھیں اور ایک لمحہ کی مہلت نہیں دے رہی تھیں دوسری طرف جرمن طیارے ہمارے ہوش و حواس اڑا رہے تھے۔ ساتھ ہی ہمیں ہر وقت خطرہ تھا کہ دائیں اور بائیں سے جرمن ٹینک اور جرمن فوجیں ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ لہٰذا پہلے دن ہم سب کو یقین تھا کہ تاریخ کا یہ ناقابل فراموش تخلیہ محض چند ہزار جانوں ہی کو محفوظ کرنے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ جرمن بمبرس کا خطرہ الگ تھا کہ تخلیہ کرنے والے فوجیوں کو دور سمندر میں کھڑے جہازوں تک پہنچنے بھی دینگی یا نہیں ساتھ ہی سمندر میں سرنگیں منہ پھیلائے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ مختصر یہ کہ ڈنکرک کا تخلیہ ساری جنگ کا نچوڑ بن چکا تھا۔!

ابتدا میں تخلیہ صرف پچاس ہزار فوجیوں کے لئے تھا لیکن اچانک فرانسیسی افواج نے اس تعداد کو پانچ لاکھ تک پہنچا دیا اور ہمارے ساتھ انگلینڈ جانے کا عزم کر لیا تھا۔ چونکہ فرانس ہمارا اتحادی تھا اور ہمارے ساتھ آگ و خون کی جنگ میں شامل تھا اس لئے ہمارے لئے انہیں فراموش کرنا ممکن نہ تھا۔

تخلیہ کا خطرناک اقدام اور زیادہ پرخطر ہوگیا۔ پھر بھی جلد مصائب کے

باوجود اور ہزار خطروں کے ہوتے ہوئے تخلیہ کا کام جاری رہا۔ چھوٹے جہاز جو کہ چینل میں آسکتے تھے ان کو قریب آنے کا حکم دیا گیا۔ چھوٹے جہازوں نے جب لنگر اٹھائے اور ڈنکرک کی طرف بڑھے اسی وقت جرمن بمباروں کو بمبارڈ کرنے کا سگنل دیا گیا اور پھر قیامت ہی تو آگئی

اس بمباری نے ہر طرف تباہی پھیلا دی۔ نہ صرف جہاز ڈوبے مسطے اور تباہ ہوئے بلکہ جانی نقصان بھی غیر معمولی ہوا۔ رہی کشتیوں کے قافلے کا تو وجود ہی مٹ گیا کوئی جہاز ایسا نہ تھا کہ بغیر نقصان اٹھائے واپس جاسکے۔ جو جہازی قافلہ ہمیں ڈنکرک سے لینے آیا تھا وہ مختلف قسم کے جہازوں پر مشتمل تھا۔ مختلف جہازوں کے ایندھن کے لئے مختلف قسم کا کوئلہ ہمارے پاس نہ تھا اور نہ اس کا انتظام ہمارے بس میں تھا۔ اکثر جہاز مرمت طلب تھے ادھر جرمن ہوائی حملوں اور لمبی مار توپوں نے ہمارے ہزاروں کو موت کی نیند سلا دیا تھا ان کی لاشوں کا انبار بڑھتا ہی جاتا تھا۔ کم ہونے کا سوال نہ تھا۔ ہزاروں زخمی فوجی تڑپ رہے تھے جن کی طبی امداد اور مرہم پٹی کے لئے ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کریں تو کیا کریں۔!؟

۲۶۔ مئی ۱۹۴۰ء اتوار کا دن تخلیہ کرنے والوں کے لئے آگ و خون کے دن سے کم نہ ثابت ہوا۔ اس لئے کہ جرمن طیارے کی طرح غوطہ لگا کر قیامت خیز بمباری کر رہے تھے۔ دشمن نے ہمیں رات میں بھی سکون نہیں لینے دیا۔ یہ بھیانک بمباری جاری تھی اور ہم لرزاں تھے کہ ڈنکرک بیچ کی تنگ جگہ میں جو لاکھوں فوجی جمع ہیں ان پہ اگر بم گرنے لگے تب کیا ہوگا۔ دشمن نے ہمیں مٹھی میں بند کر لینے کا جو اعلان کیا تھا وہ صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ اگر ڈنکرک سے ہم نکل نہ پائے تو یہ حادثہ سیڈان میں نازی فوجوں کی فرانس پر فتح کا جشن عظیم بن جائے اور شاید یہ جنگ کا باب آخر ثابت ہوگا۔!؟

شب کس طرح کٹی یہ بتانا ناممکن ہے ۲۷۔ مئی ۱۹۴۰ء کی سحر ہمارے لئے اور زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ امیرالبحر نیلسن نے ایک بار کہا تھا کہ "بڑھی ہوئی تعداد ہی صرف صفایا کر سکتی ہے"۔ اور اس میں شک و شبہ ہی کیا تھا؟ دشمن کی بالادستی صرف تعداد ہی کے سہارے نہیں بلکہ اسلحہ سے بھی ثابت تھی۔ ہم ایک مختصر گوشے میں چیونٹیوں کی طرح ایک دوسرے میں گھستے ہوئے تھے۔ تین طرف سے موت ہمیں نگلنے کے لئے دوڑ رہی تھی ساتھ ہی آسمان بھی نامہربان تھا اور جرمن ہمارے سروں پہ چیل کوؤں کی طرح منڈلا رہے تھے۔

جرمن نازی ہوائی فوج کی بالادستی ناقابل تردید تھی۔ اس عظیم قوت کی بدولت وہ سارے یورپ پہ چھائے ہوئے تھے۔ فرانس جیسی مضبوط طاقت کا سیڈان میں ایک ہی ٹکر میں پاش پاش ہوجانے کا راز جرمن فضائی فوج تھی۔ جرمن اپنی طاقت کا جو دعویٰ کرتے تھے وہ غلط نہ تھا۔ یقیناً وہ اپنے خواب پورے کر سکتے تھے۔ جرمن نازی جانتے تھے کہ برطانوی فرانسیسی اور بلجیم کی فوج کو اگر ڈنکرک میں تہس نہس کر دیں گے تو دنیا کے ہر اخبار میں جرمن فتوحات کی سرخیاں موٹے حروف میں چھپ جائیں گی

لیکن ہم آگ و خون کے ایک گوشے میں بیٹھے ان موٹے حروف کی سرخیوں سے بے نیاز موت کے جبڑوں کو بند ہونے سے روکنے میں مصروف تھے۔ ہمارے بمبار اور لڑاکا جہاز چھوٹی ٹکریوں میں انگلینڈ کے ساحلی ہوائی اڈوں سے اڑ کر آتے تھے اور جرمن بھاری بمباروں سے الجھ جاتے تھے اور پیٹرول ختم ہونے سے قبل پھر انگلینڈ کی طرف بھاگ لیتے تھے۔ اگرچہ ہمارے بمبار کسی طرح جرمن بمباروں کا جواب نہیں تھے لیکن پھر بھی ہماری مدد کو لپک رہے تھے تاکہ ڈنکرک کا سانحہ نہ ہونے پائے اور جنگ کا باب آخر نہ بننے پائے۔ سقوط کیلاس کے بعد دشمن اونچی جگہ پہ قابض تھا یہ پوزیشن جنگی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھی۔ یہیں سے دشمن نے لمبی توپوں سے ہم پہ گولہ باری شروع کر رکھی۔ اس طرح جرمن توپیں کسی جہاز کو نزدیک پھٹکنے نہیں دے رہی تھیں اور ہمارے جہاز زیر آب غوطے کھا کر ڈوب رہے تھے اور جل رہے تھے۔ اگر کوئی جہاز سخت جان ثابت ہوتا تب جرمن بمبار اپنے گولوں سے سمندر کی تہہ میں پہنچا دیتے تھے۔ اس طرح ۲۷۔ مئی ہمارے لئے بڑی منحوس ثابت ہوئی — لاتعداد کشتیاں ڈوب گئیں اور پچاسوں جہاز ڈوب گئے۔ اس طرح ڈنکرک کا تخلیہ ہمیں دیوانے کا خواب نظر آنے لگا۔!

جرمنوں نے ہمیں موت کے شکنجے میں بند کر رکھا تھا۔ ادھر قدرت بھی ہمارا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ موسم بھی مخالف تھا۔ اور اب ایک طوفان آ رہا تھا۔ جس نے ہمیں اور پریشان کر رکھا تھا لیکن ۲۸۔ مئی کو طوفان ڈنکرک سے کترا کر شمالی آئرلینڈ کی طرف مڑ گیا اس وقت ہماری جان میں جان آئی ہمیں چند کشتیوں کا صرف نقصان اٹھانا پڑا۔ موسم سے تو ہمیں نجات مل گئی لیکن جرمن ہمیں سانس لینے نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سویرے ہی سے تخلیہ کے کام میں دقتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ اب سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہمارے پاس پینے کا پانی نہیں تھا۔ جب کہ آج کسی وقت تیسری بٹالین

ہم سے آکر ملنے والی تھی اس صورت میں پانی کا مسئلہ ہمارے لئے اسلحہ کی کمیابی کی طرح مشکل اور کٹھن بن گیا تھا۔

صبح ہی سے جرمن بمبار ہم پر جھپٹ رہے تھے اور ہمارے بمبار کسی نہ کسی طرح انھیں روکنے اور منتشر کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ بمباری نے اس بری طرح دھواں پھیلا دیا تھا کہ خود دشمن کو بھی معلوم نہ تھا کہ دھوئیں کے پردے کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ لیکن دشمن کو اس کی پرواہ نہ تھی وہ برابر بمباری میں مصروف رہا اور ہمارے جہازوں و کشتیوں کو ڈبو رہا تھا۔ سارے فرانس میں جرمنوں نے یہ خبر اڑا دی تھی کہ ڈنکرک پر نازی قبضہ ہو گیا اور یہ کہ تخلیہ کرنے والی افواج کا خاتمہ کر دیا گیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہم ڈنکرک میں اب تک جمے ہوئے تھے اور موت کے شکنجے میں پھنس جانے کے باوجود موت سے نبرد آزما تھے!

دشمن کی بمباری نے دھوئیں کا جو پردہ پھیلا دیا تھا اس سے ہم نے فائدہ اٹھایا۔ ہم اس آڑ میں اپنے فوجیوں کو ان کشتیوں کی طرف برابر روانہ کر رہے تھے جو انھیں جہازوں تک پہنچانے کے لئے منتظر تھیں۔ بادی النظر میں ہمارا اقدام غلط تھا اس صورت میں کہ کشتیاں کھلے سمندر پر پہنچتے ہی دشمن کے بموں کا شکار ہو جائیں گی لیکن ہمارے لئے موت ہی موت تھی اگر ہم جان ہتھیلی پہ لے کر تخلیہ جاری نہ رکھتے تو کرتے کیا؟ لہذا تخلیہ کی رفتار اگرچہ سست تھی لیکن جاری تھی وہی ہوا جو ہمیں یقین تھا۔ ہماری بہت سی کشتیاں منزل تک نہیں پہنچ سکیں۔ خود کئی جہاز بموں سے ناپید ہوئے کئی جہازوں کو جرمن سب میرین نے تارپیڈو کیا اور ہمیں بھاری جانی و جہازی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

سہ پہر کو جب دھواں ہلکا ہوا تب دشمن یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ ڈوک (DOCK) میں دس جہاز موجود ہیں یہ دیکھتے ہی دشمن سرگرم عمل ہو گیا اور جرمن بمبار فوراً گھڑگھڑانے لگے قریب ڈھائی گھنٹے جرمن بمبار من مانی بمباری کرتے رہے قیامت ڈھاتے رہے اور ہم کچھ نہ کر سکے جب بمباری ختم ہوئی تب دسوں جہاز غائب تھے اور ہر طرف حتیٰ کہ سمندر پر بھی آگ اور دھوئیں کی حکمرانی تھی۔

اتنی خطرناک بمباری کے بعد ہمارے لئے یہ خبر تیر کا کام کر گئی کہ دشمن دونوں جانب دائیں وبائیں سے ہمیں پیس دینے کے لئے اور آگے بڑھ آیا ہے جن غیر معمولی حالات سے ہم گزر رہے تھے ظاہر ہے یہ خبر ہمارے لئے کیا خردہ لائی ہوگی جرمنوں نے مغرب کی طرف "مارڈیک" کا قلعہ فتح کر لیا تھا اور مشرق میں نیوپورٹ پر اس کا قبضہ ہو جانا ہمارے اوسان خطا کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اسی وقت یہ دہشتناک خبر ملی کہ جرمن جنگی اسٹاف نے چار ہوائی ڈیویژنوں کو تیار رہنے اور ڈنکرک کا نام ونشان مٹا دینے کا حکم دے دیا ہے اس کے معنی یہ تھے کہ جرمن فضائی بالادستی میں چار گنا اضافہ ہونے والا ہے یہ بھی خبر ملی کہ جرمن جنرل اسٹاف نے مشرقی انگلینڈ کے بندرگاہوں اور فضائی اڈوں کو بمبارڈ کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے! تاکہ انگلینڈ کے مشرقی ہوائی اڈوں پر جو لڑاکا بمبار طیارے ہیں ان کی آمد روک دی جائے اور کسی قسم کی مدد تخلیہ کے سلسلے میں نہ پہنچے۔

یہی نہیں بلکہ ہمارے فضائی مشاہدوں نے پیغام دیا کہ شمال سے جنوب کی طرف سو جرمن قوی ہیکل ٹینک بڑھ رہے ہیں ان کے ہمراہ فوجی گاڑیوں کا بڑا قافلہ بھی ہے۔ چونکہ بلجیم کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لہذا دشمن ہمیں نیست و نابود کرنے کے عزم کے ساتھ ڈنکرک کی طرف لپک رہا تھا ہم خوفزدہ و ہراساں تھے۔ رات بڑی بھیانک اور موت کے گہرے سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ڈنکرک شہر خموشاں ہے۔ بمباری نے خود ڈنکرک میں چار جگہ کبھی نہ ختم ہونے والی آگ بھڑکا دی تھی اور ہم آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ بلجیم ساحل پر بھی آگ کے شعلے ہی شعلے ہیں ہمارا کیا حشر ہونے والا تھا؟ یہ کوئی چھپا ڈھکا سوال نہ تھا اور نہ ہم غلط فہمی میں مبتلا تھے ہم تو شروع ہی سے موت کے شکنجے میں تھے ہمیں کسی طرف سے امید کی دھندلی کرن بھی نظر نہیں آتی تھی!

۳۰ مئی کی صبح ہمارے لئے قدرے سکون و اطمینان لے کر آئی۔ موسم خوشگوار اور سمندر خاموش تھا جرمن بمبار بھی آج ہم پر کم ہی منڈلا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی انگلینڈ سے ہمارے بمباروں اور لڑاکا جہازوں کی ٹکریاں وقفہ وقفہ سے آکر جرمن بمباروں کو پریشان کرتی رہیں۔ آج پانچ دن کے طوفان کے بعد یہ سکون و اطمینان کا پہلا دن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نئی امیدیں جنم لینے لگی تھیں۔

دن بھر کے سکون کے بعد رات کو جرمنی طیارے پھر گھڑگھڑا رہے تھے۔ لیکن اب وہ سمندر میں سرنگیں بچھانے میں مشغول تھے۔ شاید انھیں احساس ہو گیا تھا کہ ڈنکرک کے سمندر پر سرنگوں کا جال پھیلانا بھی ضروری ہے۔ ادھر سرنگیں بچھائی جا رہی تھیں ادھر جرمن توپوں نے گولہ باری شروع کر دی تاکہ فضائی بمباری

کا احساس نہ ہو۔

صبح ۳۱ مئی کو فرسٹ فرانسیسی ڈویژن نے تخلیہ شروع کر دیا۔ اب تک فرانسیسی فوج قدرے محفوظ دن کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ کل کی خاموشی نے انہیں تخلیہ پر آمادہ کیا تھا۔ لیکن سورج نکلتے ہی مغرب کی طرف جرمن اور آگے بڑھ آئے اور انھوں نے تخلیہ کے کام کو ناممکن بنانے کے لئے توپوں کے منہ کھول دیئے۔ کشتیوں کے قریب نہ آنے سے تخلیہ کرنے والوں کو پانی میں دور تک جانے پر مجبور کر دیا۔ کشتیاں کاغذ کی کشتیوں کی طرح الٹ رہی تھیں اور تباہ ہو رہی تھیں لیکن ہمارے لئے قدم روکنا بھی ممکن نہ تھا

اچانک آٹھ سو ٹن جہاز کے کیپٹن "لیون وڈ" کو حکم دیا گیا کہ جہاز کو آگے بڑھا کر اس ریتیلی زمین تک پہنچا دے جو ساحل کے قریب پھیلی تھی۔ کیپٹن ڈبلیو۔ اے سیٹھ نے شجاعت کا ثبوت دیا اور گولوں کی دیوار سے گزر کر پہنچ گیا۔ جہاز پہنچتے ہی فوجیوں نے جہاز کا رخ کیا اور پانی میں پھاند کر گھبراہٹ کے ساتھ جہاز پر چڑھنا شروع کیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ دشمن کے بمباروں نے جھپٹ کر غوطہ لگایا اور جہاز کے پرخچے اڑا دیئے۔ ہمارے فوجی تکنیکی ٹریننگ سے قطعی ناواقف تھے لہذا سمندر میں ادھر ادھر بکھر گئے اور جرمن طیاروں نے چن چن کر انہیں نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ دوسرا جہاز ایچ۔ ایم ایس "شپ جیک" جب فوجیوں کو لے کر جا رہا تھا کہ سمندر کی طرف روانہ ہوا اسی وقت جرمن طیاروں نے اس پر غوطہ لگایا جہاز بموں سے چکنا چور ہو گیا ایک ہی جرمن بمبار نے پانچ گولے مار کر شپ جیک کو موت کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔ ایک تہائی فوجی اس حادثے میں کام آ گئے۔ ایک حصہ زخمی ہوا اور سب کے سب سمندر میں غوطے کھانے لگے۔

جرمن دن بھر بمباروں کی ٹکڑیاں وقفہ وقفہ سے بھیجتے رہے اور ہلاکت خیزی کرتے رہے ایک غول میں پچیس تیس بمبار اور لڑاکا جہاز ان کی حفاظت کے لئے اڑ رہے تھے۔ جرمن فوجیں تین اطراف سے بڑھ رہی تھیں لہذا ہمارے بمبار شمال اور مشرق و مغرب کی طرف پیش قدمی کرنے والی فوجوں پر ٹوٹ رہے تھے اور کوشاں تھے کہ جرمن پیش قدمی روک دیں اس لئے کہ یہ سہ طرفہ پیش قدمی ڈنکرک میں محصور اتحادی فوجوں کے لئے جو تخلیہ کے لئے جو تا ممکن العمل کام میں مصروف تھیں سخت خطرہ بنتی جا رہی تھیں۔

یکم جون کی نصف رات کے بعد ہی ہمیں جرمنوں کے سخت عزائم کا اندازہ اس وقت ہو گیا جب اچانک انھوں نے گولہ باری شروع کر دی یہ گولہ باری سابقہ گولہ باری سے کہیں شدید اور بھیانک تھی۔ اور اس طرز سے تھی کہ گولوں کی دیوار برابر بنتی چلی جا رہی تھی۔ دو ریڈ کراس کے جہازوں نے زخمیوں کو لے جانے کے لئے ہمت کی لیکن دونوں آناً فاناً ڈوب گئے۔ گولوں کی دیوار نصف رات کے بعد سے صبح پانچ بجے سے قائم رہی۔ تب گولہ باری بند ہو گئی لیکن جرمنوں نے بمباروں کے جھنڈ بھیج دیئے۔ طیارے مسلسل چار گھنٹے تک بمباری کرتے رہے۔ دشمن ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا کہ تخلیہ کا کام معطل ہو جائے مجبوراً شام کو سگنل دے کر باخبر کیا گیا کہ دن میں تخلیہ ممکن نہ ہو سکے گا۔ لہذا دن میں کام معطل کر دیا گیا۔ افسران ان پارٹیوں کی طرف لپک گئے جو اپنی باری کی منتظر تھیں انہیں ایک قدم آگے بڑھنے سے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ رات کا انتظار کریں۔ آخر نو بجے رات تخلیہ کا کام گھپ اندھیرے میں پھر شروع کر دیا گیا۔ قریب ڈھائی سو چھوٹے جہازوں کا بیڑہ تنگ چینل میں بغیر "بیکنس" یا "نیوی گیشن لائٹس" کے آ گیا اس حقیقت کے باوجود کہ جرمن توپیں گولے پھینک رہی تھیں لیکن ہم تخلیہ میں مصروف تھے۔ ہمارے جہازوں اور خود ہمیں ہر قسم کے خطرے اور ہلاکت کا احساس تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جرمنوں نے سمندر کو سرنگیں بچھا کر خطرناک بنا دیا تھا یہ بھی معلوم تھا کہ عین وقت پر دشمن ہم پر بمباری بھی کر سکتا ہے۔ ڈنکرک کے گرد و نواح میں لگی ہوئی آگ ہمیں روشنی ضرور عطا کر رہی تھی لیکن دوسری طرف ہمیں عریاں بھی کر رہی تھی۔ ۲۔ جون کو صبح ساڑھے دس بجے یہ پیغام نشر کیا گیا :۔

" زخمیوں کی حالت ناگفتہ بہہ ہے۔ دن میں صرف اسپتالی جہاز لنگر انداز ہوں گے۔ جنیوا کنونشن کا احترام لازمی ہے "

اس پیغام کے بعد جرمن شرارت کا گمان نہیں رہا۔ اگرچہ اب تک جرمنوں نے اسپتالی جہازوں کو بھی نہیں بخشا تھا اور ریڈ کراس کے جھنڈوں اور نشانوں کے باوجود جرمن طیارے بمباری کرتے رہے لیکن اس کے باوجود ہمیں یقین تھا کہ جرمن جنیوا کنونشن کے خلاف کوئی حرکت نہ کریں گے۔ غرضیکہ بے تار برقی اطلاع کے بعد دو اسپتالی جہاز "پیرس" اور "ورتھنگ" زخمیوں کو لینے آگے بڑھے اس پہ بارہ جرمن بمبار جہاز جھپٹ پڑے اور انہیں

آگے نہیں بڑھنے دیا" پیرس" کو جرمن بمباروں نے بری طرح بمبارڈ کر دیا تھا اور وہ ڈوب رہا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جرمن طیاروں سے ان کشتیوں پر مشین گنوں سے حملے ہونے لگے جن پر نرسیں اور اسپتالی اسٹاف تھا۔

یہ صورت حال ہمارے لئے پریشان کن تھی۔ زخمیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ ان میں شدید مضروب زیادہ تھے ان کی دیکھ بھال ہمارے لئے ناممکن تھی۔ ان کو آگ و خون کے راستے سے لے جاکر جہازوں تک پہنچانا ناممکن تھا مجبوراً ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ زخمیوں کو ڈنکرک ہی میں رہنے دیا جائے اور بعد میں دشمن سے ان کا تبادلہ کر لیا جائے۔

دن بھر تخلیہ کا کام بند رہا۔ دشمن اپنے پروگرام پر عمل کرتا رہا گولہ باری اور بمباری۔ لیکن ہم آٹھ دنوں سے آگ اور خون کی زمین و آسمان میں گزار رہے تھے اور ایک طرح سے بھیانک خطروں کا مقابلہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے اس لئے اپنی جگہ پر ڈٹے اور تخلیہ کے کام میں لگے تھے۔

۳۔ جون کی صبح کا آغاز ہمارے بمباروں کے حملوں سے ہوا جو دشمن کے ٹھکانوں پر تاک تاک کر حملے کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہمیں خوشی اور ساتھ ہی تعجب بھی ہوا کہ ہمارے طیارے خود ہاتھ بڑھا کر حملے کی پہل کر رہے ہیں اس کی ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ تخلیہ کا کام قریب الختم تھا۔ اور دشمن کی سرزمین پر اب صرف دشمن ہی تھا۔ لہذا اس کو نشانہ بنانے کا کام بڑھ گیا تھا۔ اگرچہ برطانوی فضائی طاقت جرمن فضائی طاقت کی ہم پلہ نہ تھی پھر بھی دشمن کو جواب دینا بھی ضروری تھا۔

ہماری کوشش تھی کہ فرانسیسی آج شب تخلیہ کا کام کسی نہ کسی طرح مکمل کر لیں اس لئے کہ سمندر میں سائیکلون کی تیاری تھی اور موسم ہمارا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کہرہ کا دبیز پردہ تن گیا تھا۔ جو ہمارے لئے اور خود دشمن کے لئے بری علامت تھی۔ جرمن طیارے" اسٹارشل" پھینک رہے تھے جو چھوٹ کر روشنی کر دیتے تھے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ کہرے اور دھوئیں کے پھندے میں ہم کیا کر رہے ہیں۔ رات بھر ہر مشکل رکاوٹ کے باوجود تخلیہ جاری رہا اور اب دو جہاز جانے کے لئے تیار تھے۔ ایچ۔ ایم۔ ایس" ایکسپرس" اور ایچ۔ ایم۔ ایس" شکاری ایکسپرس" کو شب کو تین بجکر اٹھارہ پر لنگر اٹھا دینا تھا۔ اور شکاری کو تین بجکر چالیس پر۔ دشمنوں نے" شکاری" کو ڈبونے کے لئے حملہ کیا اور کوشش کی جہاز کو ڈبونے کی لیکن شدید بمباری کے باوجود شکاری خوش قسمت تھا اور بچ نکلا۔" شکاری" اور" ایکسپریس" میں پانچ پانچ سو فوجی تھے اس کے بعد ڈنکرک خالی ہو چکی تھی۔ تھوڑا سا فرانسیسی اسٹاف بندرگاہ پر رہ گیا تھا۔ البتہ چند یونٹ قلعہ میں اس لئے رہنے تھیں تاکہ فرانسیسی کی امداد کر سکیں۔ پچھلے چند دنوں سے وہ پارٹیاں اپنا کام کر رہی تھیں جو ہاربر کے ضروری حصوں کو ناکارہ بنانے کے لئے متعین کی گئی تھیں۔ آج کی رات بھی ان کا کام جاری تھا تاکہ دشمن کو ہاربر برباد شدہ حالت میں ملے دشمن کے کچھ کالم ڈنکرک کے قریب داہنی جانب پہنچ چکے تھے اور ریڈیو کو کبھی کبھی استعمال کرتے اور اپنی موجودگی کی اطلاع دے رہے تھے۔ ہمیں ان کی موجودگی کا علم تھا ہم جانتے تھے کہ بندرگاہ میں داخل ہونے کے لئے بیقرار تھے، ہم ان کی آمد میں تاخیر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ آئیں اور آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ہم نے ڈنکرک جیسے شاندار بندرگاہ کو کس طرح مسخ کر دیا ہے کہ اس کا پہچاننا ہی مشکل ہے ہمارے بعد اب جرمن ان بربادیوں کے مالک ہونے جا رہے تھے۔ جنگ عظیم دوئم کا سب سے خطرناک اور نازک باب" ڈنکرک کے تخلیہ کے ساتھ بالآخر ختم ہو گیا۔!

سیڈان میں اچانک اور غیر متوقع فرانسیسی شکست اور جرمنوں کی عظیم کامیابی کا ڈنکرک حرف آخر تھا جب لندن کی وزارت جنگ میں ڈنکرک کے تخلیہ کا فیصلہ ہوا تھا اس وقت کسی کو اس امر کا یقین نہ تھا کہ جس اقدام کا فیصلہ کیا گیا ہے وہ تکملہ تک پہنچ بھی جائے گا اس لئے کہ جنگ کا رخ سو فیصدی ہمارے خلاف تھا۔ ہماری فضائی طاقت جرمن لفٹ ولیف کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور نہ جرمن ٹینکوں کا ہمارے پاس توڑ تھا کون کہہ سکتا تھا کہ سیڈان میں فرانس جیسی طاقت ایک ہی ٹکر میں آخر ختم ہو سکتی ہے تب ڈنکرک سے ہمارا بچ نکلنا دیوانے کا ایک خواب تھا لیکن ۴۔ جون کو یہ خواب ایک تاریخی حقیقت میں ساری دنیا کے سامنے تھا۔ یقیناً ہم نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ جسے دنیا کی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

حقیقت ہے کہ ہمارے جانی و مالی نقصانات اتنے عظیم ہوئے کہ جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کہ پانچ لاکھ میں سے ہم نصف سے زائد ہی بچکر آ پاتے لیکن جو ستم ہم پر توڑے گئے اور جن حالات سے ہم گزرے ان کو دیکھ کر ہمارا نقصان عظیم نہیں تھا

زندہ ادب

چند سال پہلے ہمارے یہاں اس مسئلہ پر گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں کہ ادب زندگی کا تابع ہے یا اس کے ساتھ کوئی لازمی تعلق نہیں رکھتا بلکہ آپ ہی اپنا مقصود اور آپ ہی اپنا مقصد ہے۔ بحث کا درجۂ حرارت خصوصاً ہمارے ملک میں اتنا اونچا ہوتا ہے کہ عقل اس کی حدت سے بچنے کے لئے دور ہی دور رہتی ہے۔ اور اگر کہیں اتفاق سے قریب آگئی تو پگھل کر رہ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس مسئلہ میں زیادہ قیل و قال کی گنجائش ہی نہ تھی، اس لئے کہ انسان کا ہر خیال، ارادہ یا عمل جو کوئی معنی رکھتا ہے کسی نہ کسی طرح زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض صورتوں میں یہ وابستگی بالواسطہ ہوتی اور بعض میں بلاواسطہ۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ اس کا رابطہ زندگی سے بالکل سیدھا۔ صاف اور گہرا ہونا چاہئے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ ادب کہتے کس کو ہیں؟ ہر چیز جو نثر یا نظم میں لکھی جائے ادب تو نہیں ہے۔ نثر میں علوم و فنون کی کتابیں کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹیں، پٹواری کے کاغذات، کارخانوں کے مال کی فہرستیں، غرض بیسیوں چیزیں لکھی جاتی ہیں، جن کا شمار کوئی صحیح العقل آدمی ادب میں نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر کوئی فقہی مسائل کو، تاریخ و جغرافیہ کی معلومات کو، گنتی اور پہاڑوں کو نظم

الشجاع

کردے۔ اور کرنے والے ظالم کر ہی ڈالتے ہیں تو ان پر کسی طرح ادب کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ان چیزوں کو زندگی سے صرف جزوی سطحی اور بالواسطہ تعلق ہے۔ ادب اس نظم یا نثر کا نام ہے جو زندگی کو کسی خاص نظری یا عملی مقصد کے لئے سرد اور بے جان تصورات میں تحلیل کر کے نہ دیکھے۔ بلکہ مجموعی حیاتِ انسانی یا اس کے کسی ایک پہلو کی معاونت اس طرح حاصل کرلے کہ اس کے بہتے ہوئے۔ کھولتے ہوئے۔ ابلتے ہوئے دھارے میں ڈوب کر اس کی ایک لہر بن جائے اور اس کی روانی اور حرارت کو اپنے اندر جذب کرلے۔

نئے ادب کا پرانے ادب پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ وہ زندگی کی مصوری یا تعبیر نہیں کرتا۔ اس میں اگر کچھ اصلیت ہو سکتی ہے تو صرف اتنی کہ پرانے ادب میں زندگی کی ترجمانی عموماً کھلی ہوئی نہیں۔ بلکہ فن کے پردے میں چھپی ہوئی ہے اور یہ عیب نہیں ہے بلکہ بہت بڑی خوبی ہے جس کی نئے ادب کو تقلید کرنی چاہئے۔ ادیب اور شاعر کا بانگ دہل یہ اعلان کرنا کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں زندگی کی تصویر یا تفسیر ہے، ادب اور شعر کا لطف کھو دیتا ہے۔ اور اس کے اخلاقی اثر کو تو بالکل ہی ضائع کر دیتا ہے۔

● نئے ادب کی خصوصیت

محض زندگی کی ترجمانی کرنا نہیں، اس کی رگوں میں گرم خون دوڑانا، کاہلی اور جمود کے طلسم کو توڑنا، شیش محل کی اونچی دیواروں کو گرا کر تازہ ہوا کے جھونکوں کو راہ دینا ہے۔

اس نئے ادب کی لے اردو میں حالی نے چھیڑی تھی اس میں شدت اقبال نے پیدا کی اور وسعت و تنوع ترقی پسند مصنفین نے پیدا کرنا شروع کیا۔

دراصل یہاں اعتراض کم سے کم اردو کے پرانے ادب پر ہو سکتا ہے اور ضرور ہونا چاہئے۔ یہ ہے کہ جس زندگی کی اس میں ترجمانی کی گئی ہے وہ تھکی ہوئی اور تھکی ہوئی بیمار مریل زندگی ہے، ان لوگوں کی زندگی ہے جو زمانے کی مشکلات سے گھبرا کر کشمکش حیات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اور رندی یعنی جسمانی عیش پرستی یا ترک و تجرد، یعنی روحانی عیش پرستی کے شیش محل میں بیٹھے، خودستائی و خود پرستی کے مزے لے رہے ہیں۔ وہ ایک مخصوص طبقہ کی محدود زندگی ہے۔ اور اس قدر بے جان ہے کہ اس پر موت کا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر ہمارا پرانا ادیب یا شاعر اس "چہ خفتہ، چہ بیدار" زندگی کو ٹھوکتے۔ فنکار نے جھنجھوڑنے کے بجائے الٹا تھپکتا اور لوریاں سناتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس سے روٹھ کر تجرد کے اندھیرے خلوت خانے میں جا چھپتا ہے۔ یا پھر غالب کی طرح مایوسی کے اندھے کنوئیں میں گر جاتا ہے اور وہاں سے یہ دردناک نغمہ سناتا ہے جس سے دل ہلتے ہیں۔ مگر ہل کر ابھرتے نہیں بلکہ ڈوب جاتے ہیں ؎

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم سازِ ہستی
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

اس کے مقابلے میں حافظؔ کے دو شعروں کو لیجئے تو ان میں آپ کو زندہ ادب کی ایک جھلک نظر آئے گی۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

حافظؔ کا زمانہ تمدنی میزانِ قدر میں شاید غالبؔ کے عہد سے کچھ زیادہ بھاری نہ ٹھہرے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک زندگی کو بے دلی اور یاس کے کالے سانپ نے نہیں ڈسا تھا یا اس کے زہر کی لہر چڑھنے نہیں پائی تھی اس لئے ادیب کا ردِ عمل انفعالی یا انشجاعی

فراری نہیں، بلکہ فعالانہ اور جارحانہ تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ حافظؔ اور ان کے ساقی دونوں مل کر غم کے لشکر جرار کا مقابلہ کہاں تک کر سکتے تھے لیکن ان کے تیور ضرور کڑے ہیں اور شعر کو زندہ شعر بنانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

غرض نئے ادب کی خصوصیت محض زندگی کی ترجمانی کرنا نہیں بلکہ اسے جھنجھوڑ کر جگانا۔ اس کی رگوں میں گرم خون دوڑانا۔ کاہلی اور جمود کے طلسم کو توڑنا شیش محل کی اونچی دیواروں کو گرا کر تازہ ہوا کے جھونکوں کو راہ دینا ہے۔ اس نئے ادب کی لَے اردو میں حالیؔ نے چھیڑی تھی اس میں شدت اقبالؔ نے پیدا کی اور وسعت اور تنوع ترقی پسند مصنفین نے پیدا کرنا شروع کیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سچے ترقی پسند ادیبوں میں خلوص و جوش تھا۔ ان کی تحریروں میں ندرت اور تازگی، قوت اور اثر تھا۔ لیکن ان کی صف میں کچھ ملمع ساز بھی شامل ہو گئے تھے جنھوں نے پرانے ادب کی کھوکھلی رومانیت اور جذبات پرستی پر انقلابی شورش کا رندی اور بوالہوسی پر بغاوت کا اور ترک و تجرد پر فلسفیانہ بے نیازی کا جھول چڑھا دیا۔ اب کچھ دن سے ہمارے نقادانِ ملمع کی چیزوں کو چھانٹ کر الگ کر رہے ہیں۔ مگر ابھی یہ کام آدھا بھی نہیں ہوا۔

سچے ترقی پسندوں میں بھی بعض عیب تھے۔ جن میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ ایک تو انھیں اپنے مشن کا شعور اتنا زیادہ تھا اور اس کے اظہار میں اہتمام اتنا کرتے تھے کہ وہ بے خودی اور بے ساختہ پن جس پر ادب کے حسن و لطافت کا بہت کچھ مدار ہے۔ جاتا رہتا تھا۔ انھیں اپنی اور ایک دوسرے کی تحریروں پر خواہ مخواہ تبصرے کرنے کا اتنا شوق تھا کہ کبھی کبھی "اپنے منہ میاں مٹھو" کی اور اکثر "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کی پھبتی صادق آتی تھی۔ اس خود بینی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بار کچھ ایسی ہوا چلی کہ ہر افسانہ نگار "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" کے عنوان پر خامہ فرسائی کرنے لگا ظاہر ہے کہ تنقیدی شعور کی اتنی شدت تخلیقی اپچ کو کم کر دیتی ہے جیسے یہ فکر رہنے لگے کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" اس کا

افسانہ۔ کیونکہ سپاٹ ہو کر رہ جاتے تو کیا تعجب ہے۔ شکر ہے کہ اب ایسی بدمذاقیاں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

اسی طرح شروع میں بہت سے حضرات جو آپ کو ترقی پسند کہتے تھے۔ ادب اور خصوصاً شاعری کے سب قاعدوں اور ضابطوں کو توڑ کر فطری آزادی سے کام لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ شعر کے نام سے اکثر چڑیوں کی فطری "چوں چوں" اور کوّوں کی فطری "کائیں کائیں" سے ملتی جلتی آوازیں سننے میں آیا کرتی تھیں۔ مگر جب ان بولیوں کے بولنے والوں کو سننے والوں نے بری طرح دھتکارنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ بے قید فطرت کو انسان کی منضبط فطرت خدا پڑا۔ اب ترقی پسند ادیب اور شاعر اصول فن کا بہ قدر ضرورت لحاظ رکھتے ہیں، اور زبان و بیان کے معاملہ میں بھی پرانے استادوں کے چھوڑے ہوئے خزانے سے مناسب حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تیسرا عیب وہ تھا جو ہر ادیب میں، جس کا کوئی عقیدہ اور جس کے سامنے کوئی مقصد ہو، تھوڑا بہت پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر حد سے بڑھ جائے تو فن کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے یعنی زندگی کا مشاہدہ بے لاگ نظر سے نہیں بلکہ کسی نظریے کی عینک سے کرنا۔ جو فنکار زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے، اسے ہر رنگین چشمے سے بچنا چاہیئے۔ کٹر کمیونسٹ ہو یا کٹر مُلّا اگر وہ شعر کہنے یا افسانہ لکھنے کی بدعت کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اسے اپنے مذہبی یا سیاسی شعور کو تحت شعور میں رکھ کر خالص فن میں گم ہونا پڑے گا۔ ورنہ زندگی کی سچی معرفت نصیب نہیں ہوگی شاعر اور ادیب بھی اپنے رنگ میں حق کا مشاہدہ کرنے کے لئے صوفی کی طرح اس پر مجبور ہے کہ ماسوا پردہ اٹھا کر دیکھے۔

حرم جویاں درے را می پرستند
فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے را می پرستند

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکثر ترقی پسندوں کو بڑی حد تک اس حقیقت کا احساس ہوگیا اور انھوں نے وعظ کہنے کے بجائے شعر کہنے کی کوشش کی۔

اشتہا ع

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف ترقی پسندوں کی ناہمواریاں بہت کچھ دور ہو چکی ہیں اور دوسری طرف ان کی تقلید میں یا ان کی چوٹ پر دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے بھی عام طور پر مریضانہ اور مجروح زندگی کی محض آئینہ داری یا نانبداری کرنے کے بجائے نعرہ زنی اور چارہ گری کی طرف توجہ شروع کر دی ہے اور ان دونوں گروہوں میں جو کبھی ایک دوسرے کے مد مقابل تھے، حد فاصل اب مٹتی جا رہی ہے۔ اسے ترقی پسندوں کی کامیابی سمجھئے یا ناکامی یہ تو نقطۂ نظر کا فرق ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ادیب اب ان سے ہم رنگ ہو گئے ہیں کہ ان کے لئے جداگانہ اور ممیز وجود کا قائم رہنا مشکل ہے۔

زندہ ادب کی راہ اردو میں جہاں اس حد تک صاف ہو گئی ہے کہ اس کی ماہیت کا شعور اور اس کی ضرورت کا احساس عام ہو گیا ہے وہاں اس کی راہ میں ایک اور سنگ گراں حائل ہے جسے دور کرنے کیلئے ہمیں ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ ہمارے ادیب زیادہ تر اور شاعر کمتر صحتمند تنومند، جاندار ادب کے خالق سمجھے جانے کے شوق میں یہ غضب کر رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں کے ادب کے منتخب نمونے لے کر ان کا چربہ اردو میں اتار لیتے ہیں اور اسے اپنی اپج کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض اخلاقی بددیانتی ہی نہیں ہے بلکہ اصلیت کا منہ چڑانا ہے، جو فن کی شریعت میں اس سے بھی بدتر گناہ ہے۔ اس لئے کہ یہ نقلیں کتنی ہی کامیاب کیوں نہ ہوں ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی جیسے کسی ماہر فن نقاش کے شاہکار کا عکسی فوٹو لے لیا جائے جس میں اصل کے موٹے موٹے خد و خال تو آ جاتے ہیں۔ لیکن وہ باریکیاں اور نزاکتیں نہیں آتیں جن سے تصویر میں جان پڑتی ہے۔

اگر ہم زندہ ادب پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے نقادوں کو اپنی نظر امتیاز کو تیز اور احساس مروّت کو کند کر کے ان ادبی چوریوں کو پکڑنا اور بے تکلف ظاہر کرنا چاہیئے۔ ورنہ جب تک یہ قلب سازی کا کاروبار ہے کسی ادیب یا شاعر کو کیا پڑی ہے کہ اچھوتے خیالات کا زر خالص کھود کر نکالے اور اسے اصول فن کی ٹکسال میں ڈھالنے کی زحمت اٹھائے۔

ایک دن کا سلطان

نرس پہیے والی کرسی میں بٹھا کر اسے لان میں لے آئی تھی۔

اس نے ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ گہرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کی چھوٹی بڑی ٹکڑیاں آوارہ خرامی کر رہی تھیں۔ نرم و مدھم ہوا کے جھونکوں سے گلاب کیاریوں پر ہنڈولوں کی طرح جھول رہے تھے۔ انار کی جھاڑیاں سرخ کلیوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں۔ بہار کی رُت کبھی انگڑائیاں توڑ رہی تھی۔

اتنے میں طوطوں کی ایک ڈار عین اس کے سر سے اوپر سے ٹیں ٹیں کرتی تیزی سے گزر گئی۔ اس کی نگاہیں۔ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے طوطوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ اور حیران سا ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پچھلے چالیس، پینتالیس برس میں اس نے ایسا دلفریب نظارہ نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا بھی ہوگا تو اسے یاد نہیں تھا۔ اس نے پیسہ کمانے اور اپنے کاروبار کو وسعت دینے میں اپنے آپ کو اسقدر مصروف رکھا تھا کہ اسے رات دن کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ کاروبار کی بے پناہ مصروفیتوں کے جھگڑے میں زندگی کی کوئی لطیف لہر اس کے دل کو گدگدا سکی تھی۔ کوئی رنگین جذبہ اس کے من میں ترنگ پیدا نہیں کر سکا تھا۔ چالیس سال کا عرصہ طوطوں کی ڈار کی طرح تیزی سے اڑ کر افق کی کوکھ میں غائب ہو چکا تھا۔ اور آج وہ اپنے گرد و پیش کو اس طرح اشتیاق

حیران حیران نگاہوں سے تک رہا تھا جیسے اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ آنکھ کھولی ہو۔ یا رپ وان ونکل کی طرح ایک طویل خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اس کی حالت اس شیر خوار بچے کی سی ہو رہی تھی جو شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ رہا ہو اور احساس کے کھل سم سم نے پلک جھپکنے میں چالیس چوروں کے عجیب و غریب غار کا سنگین پھاٹک اس کی آنکھوں کے سامنے وا کر دیا ہو۔

چند ماہ پہلے اسے دل کا سخت دورہ پڑا تھا جو اس قدر شدید تھا کہ ذرا سی غفلت بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ بہترین ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں اور قابل ترین نرسوں کی رات دن کی دیکھ بھال کے نتیجے میں اسے ایک دوسری زندگی نصیب ہوئی تھی اور کل ہی شام کو وہ ایک طویل عرصے کے بعد شہر کے بہترین نرسنگ ہوم سے گھر واپس آیا تھا۔

لان کے سامنے بجری کی سرخ روش پر دھوبن سر پر دھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھڑی لادے۔ کمر لچکاتی ہوئی بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھوبن کا تعاقب کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ دھوبن دروازے کے پٹ کھول کر تیزی سے بنگلے کے اندر غائب ہو گئی۔ اس کے من میں ایک میٹھی سی ہوک اٹھی۔

اس کا تصور پینتالیس سال پیچھے کی طرف پلٹا اور اس کے سامنے اس کا وہ دیہاتی گاؤں جہاں اس کا لڑکپن گزرا۔ جب وہ کر

پہنچاتی ہوئی چلی تھی تو اسے ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ اس کا دل اپنے قدموں تلے مسلتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ رادھیکا کا بھولا بھالا چہرا اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ اس کی بوڑھی سرد رگوں میں جوانی کا گرم لہو ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اور اس کے اندھیری راتوں کا جادو بنسری بجانے لگا جب وہ دھڑکتے دلوں سے پھونک پھونک کے قدم رکھتے ہوئے ایک ایک سیڑھی ٹٹول ٹٹول کر چڑھتے ہوئے کوٹھے پر پہنچ کر ایک دوسرے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اس انتظار میں بھی کیسی میٹھی کسک ہوا کرتی تھی! جیسے کوئی من کو سہلے ہوئے روئی کے گالوں کی طرح ملائم انگلیوں سے گدگدا رہا ہو۔ پھر ان کا سرگوشیوں میں باتیں کرنا۔ بالکل بے معنی سی۔ بے ربط باتیں۔ لیکن ان بے ربط باتوں میں بھی کس قدر موسیقی ہوتی تھی! جیسے افق کے اس پار کوئی چرواہا الغوزے سے بجا رہا ہو۔ پھر ان کا پہروں بالکل خاموش بیٹھے رہنا۔ اس خاموشی میں بھی کس قدر تکلم پنہاں ہوتا تھا! ۔ پھر اس کا اندھیرے میں رادھیکا کا گول مٹول چہرا ٹٹولنا اور اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے کٹوروں میں سمیٹ کر اس کی خمار آلود آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دینا۔ رادھیکا کی گرم گرم سانسوں کی مہک! — اسے ایسا لگا جیسے وہ مہکار اس کے نتھنوں کے آس پاس ہی منڈلا رہی ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں کہ شائد رادھیکا اس کے قریب بیٹھی اس کے گھنگھریالے بالوں کو سہلا رہی ہوگی۔ لیکن رادھیکا نہیں تھی۔ اس کی سانسوں کی مہک نہیں تھی۔ اس کی خاموش نگاہوں کا تکلم بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا کہ شائد رادھیکا کی انگلیاں اس کے گھنگھریالے بالوں میں پھنسی ہوں گی۔ لیکن اس کا سر چٹیل میدان کی طرح صفا چٹ ہو چکا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کی چندیا پر پھسلتا ہوا اس کی گود میں آرہا تو اسے احساس ہوا کہ ماہ و سال کی گردش نے اس کا کسرتی چھریرا بدن کھنڈر میں تبدیل کرکے رکھ دیا تھا۔

چالیس سال دھن دولت بٹورنے میں وہ اس قدر مگن رہا تھا کہ اسے اردگرد کا کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ اچٹتی ہوئیں۔ بکھری بکھری سی یادیں خواب کے ٹکڑوں کی مانند ذہن کے گوشوں میں۔ خشک تالاب میں مدت سے ہم کنار مچھلیوں کی طرح تلملا رہی تھیں۔ ان مٹتی۔ سانس توڑتی الشباہ

نیم جاں یادوں کے علاوہ اس کا ذہن ایک بے آب و گیاہ ریگستان کی طرح بن چکا تھا۔ جہاں سبزے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ برکھا کی ایک ننھی سی بوند بھی نہیں تھی۔ زندگی کا ہرا بھرا چمن تپتی ہوئی ریت کا صحرا بن چکا تھا۔

اس نے شادی کی رادھیکا سے نہیں بچے ہوتے۔ پھر بیوی مرگئی۔ بچے بڑے ہوتے۔ ان کی شادیاں ہوئیں۔ ان کے بچے ہوئے۔ لیکن یہ سب واقعات جیسے حقیقت کی دنیا سے دور دور کسی گہری دھند میں لپٹے ہوئے گم سم سے گزر گئے۔ کہ وہ دولت کمانے میں۔ دولت کے انبار لگانے میں اس قدر مگن رہا تھا کہ اسے دنیا کے کسی کاروبار سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اور اب اگرچہ وہ لکھ پتی کہلاتا تھا۔ ایک بڑا محل عالیشان عمارتیں اس کی ملکیت تھیں۔ ایک بہت بڑے عالیشان بنگلے میں رہتا تھا لیکن اس تگ و دو۔ اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ تھا کہ آج وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ زندگی کے لطیف جذبے۔ جوانی کی امنگیں۔ امنگوں کی خلش۔ ولولے۔ چاہتیں۔ سب ہوا کے ایک نامعلوم جھونکے کی طرح اس کے پاس پاس سے گزر گئے تھے لیکن اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اور آج وہ اپنے چاروں جانب اجنبی نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اور حیران ہو رہا تھا کہ زندگی اس قدر حسین تھی۔ دنیا اس قدر رنگین ہے! اس کے چاروں طرف بہار انگڑائیاں لیتی رہی تھی لیکن اس کی زندگی میں پت جھڑ اپنا زہر گھولتی رہی تھی۔ کچھ لوگ اس لئے بدقسمت کہلاتے ہیں کہ مسرتیں ان کے مقدر میں نہیں ہوتیں لیکن وہ اس لئے بدقسمت رہا تھا کہ مسرتیں اس کا تعاقب کرتی رہیں لیکن اسے پیچھے مڑکر دیکھنے کی فرصت نہیں تھی! ۔

اتنے میں آیا اس کے منجھلے بیٹے کی سب سے چھوٹی لڑکی کو گود میں اٹھائے باہر پورچ میں آکر ٹہلی ہوتی تھی۔ گول گوتھنا سی لڑکی آیا کی گود میں اپنے آپ خوش ہو ہو کر ہاتھ پاؤں مار مار کر ہمک رہی تھی۔ سامنے درخت کی شاخ پر چہکتی چڑیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر بلا رہی تھی۔ اور منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال رہی تھی۔

وہ ابھی بیتی ہوتی ویران بہاروں کا سوگ منا رہا تھا۔ لیکن اس کے سامنے آنے والی بہاریں شہنائیاں بجا رہی تھیں! اس نے

اپنے ذہن کو جھٹکا دیا اور مردہ خوابوں کی لاش کو کسی گہری قبر میں دفن کر کے دونوں باہیں پھیلا کر نئی بہاروں کے استقبال کے لئے تیار ہو گیا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے آیا کو قریب بلایا۔ اور بچی کو اس سے لے کر اپنی گود میں اٹھا لیا۔ منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال کر چہرے کے عجیب و غریب زاویے بنا بنا کر اسے ہنسانے لگا۔ پھر اس کے ننھے منے سے پیٹ پر اپنا منہ رکھ کر ہونٹوں سے تھرتھراہٹ پیدا کر کے اسے گدگدایا تو وہ خوشی سے چیخیں مارنے لگی۔ اور کھلی مٹھیوں کو زور سے ہوا میں لہرایا تو اس کی ننھی منی انگلیوں کی جکڑ میں اس کی مونچھیں پھنس گئیں۔ وہ کھینچتی رہی اور وہ اس انداز میں انہیں چھڑانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ انگلیوں کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکیں۔ اور پھر خوش ہو ہو کر پیار بھری ننھی منی بے فضول سی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس کے ننھے سے سر اپنے کو اپنے سینے سے چپٹا کر اس کی پیٹھ پر ممتا بھرا ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور اسے ایک عجیب و غریب ان جانی مسرت کا احساس ہونے لگا۔ ایک ملکوتی سکون اس کی رگ رگ میں سرائیت کرنے لگا۔ اس کے منہ میں مٹھاس سی گھلنے لگی جیسے کوئی بوند بوند شہد ٹپکا رہا ہو۔

پھر تھک کر اس نے بچی کو آیا کو دے دیا۔ آیا بچی کو لے کر واپس اندر چلی گئی۔ بچی اس کی گود میں مچلتی، کلکاریاں مارتی رہی۔ زور زور سے ہاتھ ہلاتی رہی۔ وہ بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اس کی طرح حرکتیں کر کر کے خوش ہوتا رہا۔

بچی کے چلے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک خوشی کی لہریں اس کے جسم میں بجلی کی رو کی طرح دوڑتی رہیں اس کے چہرے پر مسکانیں کھیلتی رہیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنے آپ کو اس قدر ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا تھا کہ جیسے زندگی کی ساری خوشیاں اس کی جھولی میں آن پڑی ہوں۔ ایسی خوشیاں جن کے سامنے اس کی ساری دولت کے انبار بھی ہیچ تھے۔

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اور ایک مرتبہ پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کا باغ رنگا رنگ پھولوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس کا باغ اتنا خوبصورت تھا۔ آج تک اسے اس کا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ آم کی کونپلوں۔ گلاب کے پھولوں اور انار کی کلیوں کی مہک فضاؤں میں مہک رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا جیسے ساری مہک اپنے پھیپھڑوں میں بھر لے گا۔ ہر طرف ہریالی مہک اور رنگوں کا راج تھا۔ ہواؤں میں جیسے اشجار ع

موسیقی سی پھوٹ رہی تھی۔ فضا جیسے غسل کے بعد نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ اس نے حیران ہو کر ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ چاروں طرف رنگوں۔ خوشبوؤں اور مسرتوں کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ آج اتنی ڈھیر ساری خوشیاں کہاں سے دبے پاؤں چلی آئی تھیں!

لنچ کے بعد اس نے دو تین گھنٹے بھرپور آرام کیا۔ اور جب پوری طرح تازہ دم ہو گیا تو نرس اس کے کہنے پہ اسے کرسی پر بٹھا کر برآمدے میں لے آئی سہ پہر کے قریب بچے اسکول سے آ گئے۔ کار پورچ میں رکی اور بڑے چھوٹے سب بچے شور و غل مچاتے ہوئے کار سے اترنے لگے۔ وہ برآمدے میں بیٹھا سب منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ سے اندازہ کر لیا کہ آٹھ دس بچے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے نام بھی وہ نہیں جانتا تھا اور کچھ بچوں کو اگر وہ گھر سے باہر دیکھتا تو شاید انہیں پہچان بھی نہ پاتا۔ اس نے ساری زندگی میں چند لمحے بھی بچوں کے ساتھ نہیں گزارے تھے۔ بہر حال اس کا سینہ فخر سے پھول گیا کہ وہ دس بارہ بچوں کا دادا بن چکا تھا۔ اس کے من میں بچوں کے لئے ممتا کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

بچے جب برآمدے کے قریب پہنچے اور دادا جی کو برآمدے میں موجود پایا تو بڑے بچوں نے مڑ کر منہ سے 'شی شی' کی آواز نکالتے ہوئے اور منہ پر انگلی رکھ کر باقیوں کو چپ کرانے کے انداز میں سرگوشی میں کہا 'چپ کرو' دادا جی بیٹھے ہیں۔ سارے بچے سہم سے گئے۔ اور باملاحظہ، ہوشیار کے انداز میں فرش پر نگاہیں گاڑے گزرنے لگے۔

" ارے بچو میں دادا ہوں بھوت تو نہیں ہوں۔ ادھر آؤ سب میرے پاس۔ خوب شور و غل مچاؤ۔ آج کوئی تمہیں روکنے والا نہیں۔ آؤ میرے پاس آج سے تم آزاد پنچھی ہو" اس نے اپنی دونوں باہیں وا کر کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کہا۔

بچے چند لمحے اس طرح ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے جیسے انہیں اپنے کانوں پر اعتبار ہی نہیں آ رہا ہو۔ لیکن جب دادا جی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تو ان کے سارے خدشے دور ہو گئے۔ بچوں کے من میں میل نہیں ہوتا اس لئے محبت بھری نگاہ میں دوستی کے جذبات پڑھنے میں دیر نہیں ہوتی

سب ہی بچے اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ان سے محبت بھری باتیں کرتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے سنا کر انھیں ہنساتا رہا۔ چھوٹے بچوں کے پھولے پھولے گالوں کو پیار سے کھینچ کر ان پر پیار ثبت کرتا رہا۔ ان سے توتلی زبان میں باتیں کرتا رہا۔ کتے بلی کی آوازیں نکال کر انھیں ہنساتا رہا۔ اور سب بچے اس سے اس طرح گھل مل گئے جیسے برسوں سے دادا جان ان کے ساتھ اسی طرح پیش آتے رہے ہوں۔ وہ برسوں کا یہ دستور بھی بھول گئے تھے کہ دادا جان کی موجودگی میں کوئی بچہ اونچا سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ دادا جان کی گھر میں موجودگی کے دوران بچے سہمے سہمے سے اپنے کمروں میں چھپے چھپے پھرتے تھے۔ گھر بھر میں موت کا سا سکوت چھایا رہتا تھا۔ لیکن اس کے ایک ہی قدم سے گھر کی سامنت وادی فضا بدل گئی تھی۔ سب بچوں کے چہرے خوشی سے تمتا رہے تھے اور بچوں کے چہرے پر مسرت دیکھ کر اس کے اپنے چہرے پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں۔

اس نے بچوں کو بتایا کہ رات کے کھانے کے بعد سب بچوں کو چاکلیٹ اور ٹافیاں ملیں گی۔ بچے خوشی سے تالیاں بجاتے اپنے کمروں کی طرف بھاگے۔

رات کے کھانے کے بعد سب بچے اس کے کمرے میں اکٹھے ہوئے۔ ان کے والدین بھی تھے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹوں کا راج تھا۔ ایسا غیر رسمی اجتماع سب کی زندگی میں پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ اس لئے بچے بھی چہک رہے تھے۔ بڑے بھی خوش ہو رہے تھے۔ کہ ایسی آزاد فضا میں وہ پہلی مرتبہ سانس لے رہے تھے۔ دا داجی نے چاکلیٹ اور ٹافیاں منگوا رکھی تھیں۔ انھوں نے سب بچوں میں ٹافیاں اور چاکلیٹ تقسیم کئے۔

"داداجی! بے بی کو بھی ٹافی دو" ننھے رمیش نے اپنی شیر خوار بہن کی سفارش کی۔

"بے بی کے ابھی دانت نہیں نکلے بیٹے۔ وہ کیسے کھائے گی!" رمیش کی ممی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بے بی کے دانت کب نکلیں گے ممی!"

اشجاع

"جب وہ بڑی ہوگی تب اس کے دانت نکلیں گے اور وہ بھی ٹافیاں کھائے گی"

"ممی! دادا جی اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے دانت کیوں نہیں نکلے؟"

معصوم رمیش نے بڑے بھولے پن سے دادا جان کے پوپلے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رمیش کی بھولی بھالی بات سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا وہ ہنستا رہا، خوب زور زور سے۔

اور ہنستے ہنستے اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔

صفحہ ۱۹ کا بقیہ۔ ایرانی تہذیب

اپنے میں جذب کر لیا

ایک شاعری پر کیا موقوف ہے۔ ہر معاملے میں یہی اصول کارفرما رہا۔ ہماری فن تعمیر پر بھی ایرانی اثرات کا غلبہ ہے۔ ہمارے یہ مقدس مینار و مقابر مساجد و محلات، امام باڑے اور بارہ دریاں، باغات، حویلیاں، شہ نشین وغیرہ۔ یہ سب کے سب تمام و کمال ایرانی طرز کے اختراعات ہیں اور اس کا البیلا حسن اور بانکپن ہمیں ایرانی تہذیب کا جلوہ صد رنگ دکھاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ ہندو مندر، دھرم شالا، اور سکھوں کے گردوارے ان سب پر ایرانی طرز فکر کی چھاپ ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ہم تہذیب کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لینے سے قاصر ہیں۔ اس مضمون کا مقصد نقطہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارا کلچر ہماری زبان اردو کی طرح مختلف اقوام کے جذب باہمی اور دصل کا نتیجہ ہے۔ اور ہماری تہذیب پر ہر قوم کے علوم و فنون اور خصوصیت کے ساتھ ایرانی تہذیب کا بہت گہرا اثر ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمارا اپنا اجتماعی شعور ہے۔ ہماری اپنی روحانی روایات اور فلسفہ حیات ہیں یہ ہمارا سماجی، قومی اور ملی سفر ہم سے اس طرح سے وابستہ اور ہم آہنگ ہے کہ اس میں ہمیں اپنے ہی قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور اپنی صدائے بازگشت محسوس ہوتی ہے۔

اختر جبین

شدتِ کرب سے اس نے چہرہ تکیے پر پٹخ دیا۔
"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"
تو پھر یونہی بیٹھی اپنے نصیبوں کو روتے رہنا۔
"مگر امی" وہ رو دی پڑی ...... "مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوتا"
وہ چپ چاپ آنگن چھوڑ آنگن میں بچھے پلنگ پر آگری۔
تو یہ ہے ہم لڑکیاں ماں باپ پر بوجھ ہیں۔ جبھی تو ... سجا بنا کر
... سب کے سامنے پیش کی جاتی ہیں ... دیکھو سنو ...... پرکھو ...
بھویں آئیں تو پھر جہیز کی بات چلے ..... اس نے بڑی حقارت سے
بے ترتیب سے خیالات کے ساتھ سوچا۔ میں نے جب اسے آنگن میں سر
گرائے بیٹھے دیکھا ..... تو سب کچھ سمجھ گئی۔ کمرے سے پھوپی امی کی
بڑبڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

"اپنی خودداری میں مری جاتی ہیں ..... اب ایسی کونسی پری
صفت ہیں کہ لوگ خود بخود آجائیں گے۔ کہاں تک کون بوجھ اٹھائے
... ہی سمان ہے لڑکیوں ایسے گھر میں پیدا ہوگئیں تھیں ..... اکیلی تو ہو
...... اور چھوٹی بہنیں بھی ہیں۔
میں برآمدے سے چلتی ہوئی اس کے پلنگ پر آبیٹھی۔
اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میرے شانے پر سر ٹیک دیا۔
"آپی امی سے کہہ دو۔ وہ میری فکر نہ کریں۔ چاہے تمام عمر
... . میں یوں ہی کسی کے قدموں پر نہ جھکوں گی۔ میرا
... ...

فائنل ایر ہے۔ اس کے بعد میں خود سروس کر لوں گی۔"
"چپ رہو اسماء" ...... میں نے اس کے منہ پر ہاتھ
رکھ دیا۔ "پھوپی امی کو دکھ ہوگا"
"دکھ" وہ ہنس پڑی۔ "پگلی یہ سارے رشتے سراب
ہوتے ہیں۔ ماں، باپ، بھائی، بہن ...... یہاں کوئی کسی سے
محبت نہیں کرتا۔"

اس کے چہرے پر مایوسی کے گہرے دھندلکے بکھر رہے
تھے۔ میں اٹھ کر چلی آئی ...... وہاں بیٹھ کر کرتی بھی کیا...؟
کتنا عظیم فرق ہے اسماء، ہم دونوں میں ..... میں حقیقت کی
تلخی کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی امرت کا گھونٹ سمجھ کر اتار رہی ہوں۔
تم حقیقت ..... کو حقیقت سمجھ کر اس سے ٹکرا رہی ہو۔ کتنا
تضاد ہے تم میں اور مجھ میں۔ لیکن اس تضاد کے باوجود مجھے تم
سے پیار ہے۔ کسی کو تم اچھی لگتی ہو یا نہ لگتی ہو۔ پر میں تمہیں دل کی
تمام تر گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔ تم سب کی نظروں میں آگری رہیں
مگر میری نظروں میں ہمیشہ بلند سے بلند تر رہیں۔ میں تو کہتی ہوں اسماء،
تمہیں اس دور سے بہت پہلے پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ مگر میں کہوں کیا؟
تم نے گھٹے گھٹے سے گھرانے میں جنم لیا ...... یہ سب کچھ کتنا
عجیب سا تھا۔ پھوپا ابا کی متوسط آمدنی۔ اس پر سے بچوں کا
دھیر ... تم اس زندگی سے بیزار تھیں ...... دن بھر تھک ہار کر

شام کو جب ہم مل بیٹھتے تو تم سیدھی کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیتیں
"آشی میں تو تھک گئی زندگی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے" جانے
بچپن سے میں ماں بن گئی ہوں"...... ایسے میں کوئی بھائی
بہن آپس میں لڑ پڑتے تو تم نیم وا آنکھوں سے دیکھتیں ...... پھر
آنکھیں بند کرلیتیں ...... اتنے سے لمحوں میں تمہارے چہرے پر
سارا درد سمٹ کر آ جاتا ...... قریب ہی پھوپی امی روتے بچے کو کاندھے
سے لگائے ...... چہرے پر بکھری زلفوں کو سمیٹتے ہوئے ......
غصے سے بیتاب ہو کر لڑنے والوں کو کوستیں تو تم نڈھال سی ہو جاتیں۔
" کتنے عجیب ہیں آشی یہ لوگ ...... اپنے گلستان میں
ان گنت پھول تو مہکا لیتے ہیں ...... مگر پھر بھول جاتے ہیں۔
...... کہ کچھ حق بھی ہے ...... کچھ ان کے تقاضے بھی ہیں ......
آشی روٹی کپڑا ہی تو جینے کے لئے سب کچھ نہیں ہوتا ......
رہی کرو دیکھو ہماری فکروں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ...... امی
ابا اس جنجال سے پریشان ...... کوئی ہمارا نہیں کہ دو گھڑی
کسی سے لپٹ کر رو لیں ...... ہم سب ایک گھر میں رہتے ہوئے
بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہیں ...... اپنی دنیا میں اکیلے
بالکل اکیلے۔ زندگی کے ہولناک سناٹوں کے ساتھ ...... ایسے میں
میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہتی ...... میں اس سے کہتی
بھی کیا ......؟

کبھی کبھی کتابیں پڑھتے ہوئے یا مرچی خانے کے دھوئیں تلے
...... جب تھک سی جاتی تو رو رو سی پڑتی ......
" خدا مجھ سے میرا احساس کیوں نہیں چھین لیتا آشی؟ یوں تو
میں جی نہ سکوں گی "
" پگلی ہمت کر۔ مگر کس امید پر ......"
وہ میرا سہارا بھی مجھے لوٹا دیتی۔

ایسے میں پھوپی اماں نے اس کی اٹھان کو دیکھا تو چونک
پڑیں ...... اب کیا ہوگا ...... وہ سر تھام لیا کرتیں ...... تو
میرے سامنے آ کر آ بسی"
" کچھ ہوگا اتنا سب کچھ ......" پھوپا ابا ...... حقیقت

کو اتنے قریب دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے ...... تب پھوپی امی
کی تمام سوچیں جہاں کے تہاں رہ گئیں۔ انہوں نے دوڑ کر پھوپا ابا کو
سنبھالا ...... یہ لڑکیاں کن گناہوں کی سزا ہیں مالک۔ انہوں نے
پاس کھڑی ردا نہ کو دھکا دے دیا۔ دن رات زندگی عذاب ہوگئی
ہے۔ آخر کہاں تک پہنیں۔ کہ جہیز جوڑتے پھریں ......
امی یہ سب دیکھ کر چولہے کے پاس سے اٹھ آئی ......
" امی کون کہتا ہے آپ سے کہ اتنا سوچا کیجئے ...... اس
نے اپنی تمام شرم و حیا کو سمیٹ کر جیسے کہیں پھینک دیا ...... بغیر
شادی کے کیا کوئی نہیں جیتا ......"

جب پھوپا ابا کو ہوش آیا تو وہ آنچل سنبھالتی ہوئی اٹھ
کھڑی ہوئی۔ میرے پاس آکر بڑے تلخ لہجے میں بولی۔
فضول۔ امی۔ ابا پریشان ہوتے ہیں۔ کوئی مجھے اپنا
بھی سکتا ہے۔ "بڑا وسیع دل چاہیئے"

میں اس کا سوگوار چہرہ دیکھ کر پھر نہ رک سکی۔ ایک دن
میں نے امی سے کہا۔
" امی آپ اسما کو اپنی بہو بنا لیں نا"
امی سے پہلے بھیا چونک اٹھے۔
" توبہ کرو آشی۔ سراسر حماقت ہوگی۔ نری دقیانوسی ٹائپ"
میں تو سوچتی رہ گئی جب سہارے ہی سہارا نہ دیں گے تو پھر
غیر تو غیر ہیں۔ وہ دنیا کے سارے غم سمیٹے ہوئے اپنی زندگی سنوارنے
کی جدوجہد میں مصروف تھی ...... جس دن رزلٹ آیا تو میں
نے پہلی بار اس کے چہرے پر ہلکی پیاری سی مسکراہٹ لرزتے دیکھی۔
" آشی میری جدوجہد کا صلہ مجھے مل گیا ہے۔ جانو ایسا
لگتا ہے ریگ زار حیات میں خنک خنک سا سایہ مل گیا ہو۔ اب
سروس کرلوں گی۔ کچھ تو دکھ کم ہوں گے؟ آخر زندگی تو کسی طرح جینا
ہے نا ......"

میں بجائے اسے مبارکباد دینے کے اس سے پوچھ بیٹھی۔
" ایک بات بتاؤ، اسمی، تمہاری بیشتر سہیلیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں
وہ اپنے گھروں میں بڑے سکھ سے رہ رہی ہے۔ ان کی ہنستی مسکراتی

کائنات کو دیکھ کر کیا تمہیں کبھی خواہش نہیں ہوتی کہ کوئی تمہارا اپنا ہو۔
..... تمہارا بھی ایک اپنا گھر ہو ...... اور ؟"

وہ ہنس پڑی۔

"پگلی" جو چیز نہ مل سکے ..... اس کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے۔ ورنہ احساس محرومی اور بھی بڑھ جاتا ہے"....
میری زندگی میں ویسے ہی کیا کم دکھ ہیں جو اور دکھ سمیٹ لوں"....

میں نے حیرت سے اسے دیکھا باوجود مسکرانے کے اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں جانے کیوں ......؟

جب اسے ملازمت مل گئی تو میں نے سوچا اب اس کی زندگی سنور جائیگی۔ اب اس کے چہرے پر بکھری ہوئی مایوسیاں ختم ہو جائینگی۔ اس کے خشک خشک ہونٹ خوشی سے مسکرا اٹھیں گے۔

پھر جب وہ ملی تو پہلے سے زیادہ افسردہ اور نڈھال تھی۔

تب میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

" اب یہ جوگ کس کے کارن لادا ......" تو وہ افسردگی سے مسکرا اٹھی۔

" اب چھوڑ بھی اسی زندگی کی اس روش کو اپنے اس خول سے باہر نکل کر دیکھ لوگ کیسے جیتے ہیں ......"

پھوپی اماں نے سنا تو وہ جلدی سے بولیں... تو ہی سمجھا آشی ... لوگ ظاہری چمک دمک کو دیکھتے ہیں۔ روح کے حسن کو پوچھا کس نے ہے؟ .... اگلے ہفتے کامران آرہا ہے میں تو کہتی ہوں۔ اب بھی سنبھل جائے سنہری موقع ہے "

ظاہر خود بخود فنکاری کے پاس نہیں آتا ہے۔ اسے تو جال کے ذریعے پھانسا جاتا ہے۔ میں نے سوچا۔

کامران آئے تو میں نے اسے جالیا۔

پھوپی امی سچ کہتی ہیں۔ سوچتا تو میں بھی اتنی انسان بنی سنوری سی دنیا کو چھوڑ کر کیا ...... تمہاری اجاڑ سی صورت کو دیکھنا پسند کرے گا ...... تم نے تو اپنی تمام آرزوئیں دل کے نہاں خانے میں چھپا کر رکھ دی ہیں۔ نہ جانے کیوں اور کس کے لئے۔

وہ روانسی سی ہوگئی۔

پگلی وہ چاہتے ہیں کہ میں لطافت کا اظہار کروں پر مجھے تو اتنا ملنا نہیں آتا۔

کھانے کی میز پر کامران نے کہا تعجب ہے اسماء نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ اسماء ہی ہیں۔"

وہ تڑپ اٹھی "کامران صاحب میں نے آپ کو اپنے اوپر تبصرہ کرنے کی اجازت قطعی نہیں دی۔"

پھوپی نے اسے ٹوکا۔

" اف باجی" روانہ اٹھلائی۔

کامران جو کہ اسماء کی نظروں سے سٹپٹا سے گئے تھے۔
..... روانہ کے اس انداز پر جیسے قربان ہو گئے۔ اپنے گھر جانے سے ایک دن پہلے انہوں نے بے سوچے سمجھے پھوپی امی سے روانہ کو مانگ لیا۔

یہ رنگ دیکھ کر پھوپی امی نے ایکبار پھر سمجھایا۔
دیکھا نا روانہ تم سے چھوٹی تھی مگر اس نے کس طرح کامران کو اپنا لیا۔ تم اب بھی سنبھل جاؤ آشی "......

وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح تلملا اٹھی ......
مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا"

"جب ہی تو یہ عالم ہے آج جو میرا کہنا مانتیں تو تمہاری دنیا سنور چکی ہوتی" پھوپی امی بڑبڑائیں ...
اس نے گھبرا کر پھوپی امی کو دیکھا اور تیز تیز قدموں سے برآمدے میں نکل آئی۔

جب میں اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہوں تو پھر سب کو میری اتنی فکر کیوں ....؟؟؟

سچ بتاؤ آسی! کیا واقعی تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو خوش ہو
وہ چڑھ سی گئی۔ تو پھر کیا کروں ....؟؟؟
وہ خاموشی سے اپنے آپ بکھر کر دوسروں کو سنوارتی چلی چلی جارہی تھی ایک مشین کی طرح ...... جب میں اس کی روش سے تنگ آجاتی تو اس سے لڑ بیٹھتی .... اسی کبھی اپنے لئے بھی تو کچھ کیا کرو ....

اپنے لئے وہ کرتے ہیں۔ جن کی کسی کو ضرورت ہوتی ہے۔ میری کس کو ضرورت ہوتی ہے؟ وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی۔

دیکھتے دیکھتے اس کے سامنے کی لڑکیاں اب اپنے بچے کو کھلا رہی تھیں..... مگر وہ زندگی کا سفر تنہا طے کر رہی تھی وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ سوائے اس کے کہ چہرے پر کچھ زردی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔

پھوپی امی اس سے بیزار تھیں۔ ان کی چڑچڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو وہ چیخ چیخ کر کہتی تھیں۔

"جانے کن گناہوں کی سزا ہے جو ایسی لڑکی میرے نصیب میں لکھی تھی۔"

مگر وہ ان سب باتوں سے بے نیاز سی رہی۔ ان ہی دنوں میں پھوپی امی نے آصف کو دیکھا۔ وہ اس کی کار اور عہدے سے مرعوب ہو گئیں۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ اس دن خوشی سے ان کے قدم نہیں ٹھہر رہے تھے۔...

"آشی"..... وہ دن بھر دعوت کے اہتمام کے بعد مجھ سے بولیں۔

تم اسمی کو سمجھاؤ کہ یہ آخری موقع ہے۔ اس سے کہہ دو تھوڑی دیر کو وہ اپنی خودداری کو چھوڑ دے اور میک اپ کر کے آصف کے سامنے آئے۔

جب میں نے اسمی سے کہا۔

تو وہ رو سی پڑی..... آشی یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔

پھوپی امی غصے سے بیتاب ہو گئیں۔ اسمی تو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ کس کس کو بتائیں کہ تجھے کوئی آج تک اپنانے نہیں آیا۔ لوگ ہمیں الزام دیتے ہیں کہ بیٹی کی کمائی کھا رہے ہیں۔ اس لئے اس کی شادی نہیں کرتے میں تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی..

وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ جب میں اس کے پاس پہنچی تو وہ میرے شانے پر سر رکھ کر سسک اٹھی۔

"کیا یہ سب کچھ زندگی گزارنے کے لئے بہت ضروری ہے آشی..........."

"ہاں امی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں"

"پر آشی...... میں تو وہ پھول ہوں جو مرجھایا ہوا ہی کھلا......."

اب چھوڑ بھی یہ شاعری۔ زندگی میں ایکبار میرا کہنا مان لے...... اس نے سر اٹھا کر اشک بھری آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ آخری چیز جو میرے پاس بچی ہے وہ ہے عزت اور وفا...... تو اسے بھی داؤں پر لگانے کو کہہ رہی ہے۔ اچھا میں نے تیرا کہنا کبھی نہیں ٹالا..

جب وہ آصف کے پاس سے اٹھ کر آئی...... تو ہمیشہ کی طرح میرے شانے پر سر ٹیک کر آنکھیں نہیں بند کیں بلکہ..... صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

آصف کا گھر میں آنا جانا بڑھ گیا۔ پھوپی اس کے التفات پر پھولی نہیں سماتی تھیں۔

اسمی۔ وہ بھی پہلے سے بدل گئی تھی۔ امید، یاس کے مدھم ستاروں کو وہ اپنی آنکھوں میں چھپائے وہ مجھ سے چھپی چھپی پھرتی تھی..... جو کہیں اس کو جا کر پکڑ لیتی تو وہ صرف مسکرا دیتی...... اس کے رہن سہن نے اس کی شخصیت کو پہلے سے زیادہ پرکشش بنا دیا تھا....

ایک شام کو پکچر کا پروگرام بنا۔

اسمی نے ٹالا۔

مگر پھوپی امی پھنسے ہوئے طائر کو پرواز کرتا ہوا نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔

چلی جاؤ نا اسمی جی بہل جائے گا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے چپ چاپ بڑھ کر اسے مبارکباد دیدی۔

وہ مسکرائی اس نے میرا ہاتھ ہولے سے تھاما۔ پھر چھوڑ دیا۔ پھوپی امی نے مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔

(باقی صفحہ ۱۰۱)

(مشیدہ)

انور عباس

جواب

بس تقریباً خالی تھی۔ اگلی قطار میں ایک بچہ بیٹھا تھا۔ چھ سال کی عمر، سرخ رخسار۔ نیلی بشرٹ۔ نیلی پتلون۔ کندھے پر بس کنڈکٹروں کے انداز میں لٹکا ہوا بستہ۔ دائیں ہاتھ میں ایک فٹا۔ ایک نظر میں۔ میں اس بچے کی صرف اتنی ہی تفصیلات کا جائزہ لے سکا تھا۔ لیکن دوسری نظر میں معلوم ہوا کہ اس کے چہرے میں کچھ اور قابل توجہ خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ چمکیلی تھیں۔ ناک ناگوار حد تک چھوٹی اور دانت اتنے سفید تھے کہ کوئی بھی ٹوتھ پیسٹ کی کمپنی۔ اشتہار کے لئے اس بچے کی تصویر استعمال کر سکتی تھی۔ اس بچے میں مجھے کچھ ایسی کشش محسوس ہوئی کہ میں دائیں بائیں کی خالی سیٹوں کو چھوڑ کر بالکل اس بچے کی پیچھے والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بچے نے پیچھے مڑ کر مجھ کو دیکھا اور بڑی تیزی کے ساتھ سیٹ پر بکھری ہوئی ٹافیوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنی جیب میں رکھنے لگا۔ بچے کی یہ ادا مجھ کو بھا گئی۔ اور میں نے اسے مزید ہراساں کرنے کے لئے کافی زور سے کہا۔ "ارے بھئی تم یہاں کہاں؟ خوب ملاقات ہوئی۔" بچے نے گھبرا کر پہلے مجھ کو دیکھا اور پھر بس کے باہر سامنے پنواڑی کی دکان پر ایک صاحب کو۔ جو سفید قمیص۔ سفید پتلون پہنے۔ سگرٹ سلگا رہے تھے۔ بچے کو تسلی تو اس کو۔ سفید لباس میں ملبوس ان حضرت کو دیکھ کر ہوئی اور اس کی رہی سہی بے اعتمادی اور بے اطمینانی میری شفیق مسکراہٹ نے جذب کر لی اور اس کی گھبراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ ذہین بچوں کی طرح ہنسا۔ ایک ہلکی سی ہنسی۔ اور بولا "ہم تو آپ کو نہیں جانتے۔ دیکھئے وہ ہمارے ڈیڈی ہیں۔" چھوٹی سی سفید انگلی پنواڑی کی دوکان پر کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ انداز بیان کچھ ایسا تھا جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو۔ "حضرت میں خوب جانتا ہوں کہ آپ مجھے ستا رہے ہیں مگر آپ نے میرے ڈیڈی کو دیکھا ہے؟ ذرا ان کے مضبوط ہاتھوں پر تو غور کیجئے۔"

میں نے کہا "وہ تمہارے ڈیڈی ہیں؟" بچے نے سرسری لہجے میں کہا "جی ہاں"۔ میں نے پوچھا "اور ہم تمہارے کون ہیں؟" اس بات کا جواب دینے سے پہلے وہ کچھ جھجکا۔ چہرے پر غور و فکر کی علامات بکھر گئیں۔ گویا وہ اپنے ننھے منے دماغ کے کونوں کھدروں میں میری جیسی صورت رکھنے والے کسی شخص کی شبیہ ٹٹول رہا ہو۔ آخرکار رکتے رکتے بولا "ہم آپ کو نہیں جانتے۔ آپ ہمارے کوئی بھی نہیں ہیں۔" آخری جملہ ادا کرتے ہی وہ ہنس پڑا جیسے میری شرارت سمجھ گیا ہو۔ میں نے کہا "ارے بھئی مجھ کو بھول گئے۔ میرا نام انور ہے اور دیکھو تمہارا نام۔۔۔ تمہارا نام ہے۔۔" میں نے اس انداز میں سر کو جھٹکا اور انگلیاں بالوں میں ڈالیں گویا اس کے نام کے یاد نہ آنے کے سلسلے میں سخت پریشان ہوں۔ وہ اطمینان سے بولا "میرا نام آپ نہیں جانتے۔ سعید اختر ہے میرا نام۔" "ہاں ہاں بھئی یاد آ گیا۔ اختر۔" "نہیں نہیں۔" اس نے میرے چشمے کے سامنے انگلی

بچانی - اختر نہیں۔ سعید اختر۔"

"اچھا اچھا" میں ہنس پڑا۔ "سعید اختر بھئی سعید اختر۔ اب تو خوش ہوئے۔" اس بات کے جواب میں اس نے مجھ کو کچھ اس طرح گھورا۔ گویا کہ سوچ رہا ہو کہ اس نے مجھ کو چڑیا گھر کے کس کٹہرے میں دیکھا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر غالباً مجھ کو بے ضرر آدمی سمجھ کر اس نے اپنی ٹافیاں نکالیں اور سیٹ پر بکھیر دیں۔

سعید اختر بڑا پیارا بچہ تھا۔ ایسا بچہ کہ جس کو دیکھ کر ہر کنوارا شادی نہ کرنے پر خواہ مخواہ افسوس سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دل چاہتا تھا کہ اسے چھیڑے جاؤں یہاں تک کہ وہ رو پڑے میں نے پوچھا "کونسی کلاس میں پڑھتے ہو؟" کلاس کا نام سن کر اس کے ننھے منے گلگوتھنے سے گال خوشی سے چمک اٹھے۔ مسکرا کر بولا "تھرڈ کلاس میں پڑھتا ہوں۔ تھرڈ کلاس میں۔" میں نے سوچا کہ یہ جدید تعلیم کی برکات ہیں جو کہ یہ بچہ کلاس کا نام سن کر بھی مسکرا رہا ہے۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ ہمیں وہ مہمان یا عزیز جو کہ ہم سے اسکول کے بارے میں اینڈے بینڈے سوال پوچھا کرتے تھے۔ ہوا نظر آیا کرتے تھے۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"بس تھرڈ کلاس میں!!! جب میں تمہارے برابر تھا تو میں سکنڈ کلاس میں پڑھا کرتا تھا۔"

سعید اختر تالی بجا کر ہنسا۔ "واہ واہ آپ تو ہم سے ایک کلاس پیچھے تھے۔" میرا جی چاہا کہ واقعتاً میں اس سے ایک کلاس پیچھے ہو جاؤں تاکہ اس کا یہ ننھا سا قہقہہ یوں ہی گونجتا رہے۔

ڈرائیور اور کنڈکٹر بس میں داخل ہو چکے تھے۔ سعید اختر کے ڈیڈی بھی میری پشت کی نشست پر بیٹھ چکے تھے اور مجھ کو سعید اختر سے محوِ گفتگو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ فخریہ مسکراہٹ۔ ان کی مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ ان کو یقین ہے کہ ان کا ننھا سا سعید اختر اتنا ذہین اور خوبصورت بچہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت تھی۔ بس میں اتا دکا مسافر بکھرے ہوئے تھے۔ کنڈکٹر انہا چائے سے بھیگی ہوئی مونچھوں کو پونچھتے ہوئے چلا آیا۔ صدر جہانگیر روڈ۔ تین ہٹی۔ پیر کالونی۔ اور بس چل دی۔

بلند و بالا عمارتیں پیچھے چھوٹتی جا رہی تھیں۔ کہیں کہیں مہاجر بھی خیمہ زن تھے۔ غرضکہ سب کچھ تھا اور بہت خوب تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں، جلدی جلدی سڑک پار کرتی ہوئی انگریز ماہ پارہ کی پنڈلیوں کو دمکا رہی تھیں۔ سائے لمبے لمبے زمین پر لیٹے ہوئے تھے، مجسم نور پنڈلیوں کے تاریک سائے، بھیانک حد تک لمبے ہو گئے تھے اور پوری سڑک عبور کر کے، سامنے فٹ پاتھ پر پڑی سوتی ہوئی بھکارن کو چھو رہے تھے۔ میں قدرت کی اس نیرنگی پر غور کر ہی رہا تھا۔ کہ کسی نے میرے کان میں کچھ کہا۔ مڑ کر دیکھا تو سعید اختر تھا۔ بولا۔ "دیکھئے میں انگریزی بھی جانتا ہوں۔ ایس۔ ٹی۔ او۔ اور پی۔ بتایئے کیا ہوا؟۔۔۔ میں بتاؤں اسٹاپ جہاں بسیں ٹھہرتی ہیں۔" اسے چھیڑنے اور پریشان کرنے کا خیال جو لمحہ بھر کے لئے غروب ہوتے ہوئے سورج، اور لمبے لمبے تاریک سایوں تلے دب کر رہ گیا تھا پھر عود کر آیا۔ میں نے کہا "ارے بھئی سعید اختر مجھے کل تمہارے ماسٹر ملے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ۔۔۔۔" سعید اختر نے پرسکون لہجے میں میری بات کاٹ دی اور بولا۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں ہمارے اسکول میں کوئی ماسٹر نہیں ہے۔ وہاں تو بس انٹی ہیں۔"

"ہاں ہاں بھئی انٹی۔ میں بھول گیا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھیں کہ تم بڑے بدھو ہو۔ پڑھتے پڑھاتے کچھ بھی نہیں ہو۔"

"ڈیڈی۔ ڈیڈی۔ بدھو کسے کہتے ہیں؟"

ڈیڈی جو مطمئن بیٹھے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ کھل اٹھے۔ مسکرا کر بولے۔ "بدھو کہتے ہیں کے۔ بدھو بیوقوف کو کہتے ہیں۔"

سعید اختر کی پریشانی قابل دید تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس زبردستی کے منڈھے ہوئے خطاب "بدھو" سے نجات حاصل کرے۔ آخر کار ہوشیار وکیل کی طرح اس نے میری بات ٹال دی اور جارحانہ طریقہ سے کہنے لگا۔ "آپ ہماری انٹی کو جانتے ہی نہیں۔ اگر جانتے ہیں تو بتلایئے ان کا کیا نام ہے؟" قریب تھا کہ میں ہتھیار ڈال دوں کہ سعید اختر کے ڈیڈی نے جو کہ غالباً اپنے بچے کی پریشانی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ میرے کان میں کہا

"مسز انیس ہے۔" اتنا اشارہ کافی تھا۔ میں نے فتحمندانہ مسکراہٹ سے کہا۔ "میں تمہاری آنٹی کو جانتا ہوں۔ ان کا نام مسز انیس ہے۔ وہ چشمہ لگاتی ہیں ذرا موٹی سی اور بڑھی ہیں۔ کیوں؟"

سعید اختر اچھل کر سیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ پھر شاید بس کے ہلنے جلنے سے مجبور ہو کر یا اپنے ڈیڈی کو دیکھ کر جلدی سے ادب سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ مگر چہرہ میری ہی طرف رکھا۔ کہنے لگا۔ "واہ۔ واہ۔ ہماری آنٹی موٹی نہیں ہیں۔ نہ وہ چشمہ لگاتی ہیں بڑھی بھی نہیں ہیں۔ وہ تو جوان ہیں۔"

میرے قریب دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ نے ہنس کر کہا۔ "کیوں بھئی تمہیں کیسے معلوم کہ آنٹی جوان ہیں۔" دو چار مسافروں نے قہقہے لگائے۔

سعید اختر اس سوال پر بری طرح گھبرا گیا۔ اول تو اس نے سوچا کہ یک شد نہ دو شد۔ ابھی تک تو ایک ہی سے مقابلہ تھا۔ اب یہ دوسرے صاحب بھی میدان میں اتر آئے۔ اور اس نے اپنے ناپختہ دماغ میں شاید یہ حساب لگانا شروع کر دیا ہوگا کہ اگر اسی طرح سب مسافر شامل گفتگو ہوتے رہے تو آیا وہ بخیریت اپنے گھر تک پہنچ سکتا ہے کہ نہیں۔ دوسرے اس کے پاس اس سوال کا کہ "تمہیں کیسے معلوم کہ آنٹی جوان ہیں" کوئی جواب ہی نہ تھا۔ اس نے تو ایک غیر شعوری انداز میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ آنٹی بڑھی نہیں بلکہ جوان ہیں۔ شاید اسی لئے وہ بری طرح گھبرا گیا اور گھبرا کر اس نے ایک نظر اپنے ڈیڈی پر ڈالی۔ مگر ڈیڈی بھی مسکرا رہے تھے۔ آخر کار وہ جھینپ کر رہ گیا۔ میں نے جھینپ کو رفع کرنے کے لئے اس کے دمکتے ہوئے گال پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی۔ اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے مجھے کیوں مارا؟" میں نے اسے ستانے کو کہا۔ "آہا جیسے آپ کبھی پٹے ہی نہیں ہیں؟"

سعید اختر چڑ سا گیا بولا۔ "مجھے کوئی نہیں مارتا۔ آنٹی بھی نہیں۔ آنٹی سب کو مارتی ہیں مگر مجھ کو نہیں مارتیں۔"

"میں نے کہا۔ تمہارے بڑے بھائی تم کو مارتے ہوں گے۔"

اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ "میرا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے۔"

میرا جواب سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ "بڑی بہن پیٹتی ہوں گی۔"

وہ خوش خوش چہک کر بولا۔ "میری کوئی بہن نہیں ہے بس ایک چھوٹا بھائی منا ہے۔ میں منے کو اٹھا کر ایسے پھینک دیتا ہوں کہ۔" اور اس نے اپنے ننھے ننھے گول مٹول بازو میری طرف بڑھائے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ سچ مچ مجھ کو اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ غیر ارادی طور پر میں سمٹ کر رہ گیا۔ مگر وہ ہنس پڑا اور اپنے بازو سمیٹ لئے۔ میں بھی ہنسنے لگا اور ہنس چکا تو بولا "میاں سعید اختر کم از کم تمہارے ڈیڈی تو تم کو مارتے ہوں گے۔"

"ڈیڈی بھی نہیں مارتے" اس کے ہونٹ تو ہونٹ آنکھیں تک مسکرا اٹھیں "وہ تو ہم سے بہت پیار کرتے ہیں صبح اسکول پہنچاتے ہیں شام کو اسکول سے لے کر آتے ہیں مارتے بالکل نہیں۔ پوچھ لیجئے ڈیڈی سے۔" میں بھی اس نازک سے پھول کو ستانے پر تلا ہوا تھا ہنس کر کہا۔ "اچھا بھائی تمہاری ممی تو تم کو ضرور ہی مارتی ہوں گی کبھی کبھار ایک آدھ طمانچہ۔" "جی نہیں۔ جی نہیں۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "ہماری ممی نہیں ہیں۔ دادی کہتی ہیں، وہ بھاگ گئیں ہم کو چھوڑ کر ایک آدمی کے ساتھ۔" جیسے ہیروشیما پر ایٹم بم گر گیا۔ بس میں سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا سب کی نظریں ایکدم ڈیڈی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں اور وہ چالیس سال کا دہرا بدن رکھنے والا آدمی اتنی ساری نظروں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے سعید اختر کو سیٹ سے نیچے کھینچ لیا اور تابڑ توڑ دو طمانچے رسید کئے۔ پھر گھبرا کر اس نے ایک نظر مسافروں پر ڈالی۔ دوسرے لمحے وہ سعید اختر کو جو کہ رو رہا تھا گھسیٹتے ہوئے بس کے دروازہ تک لے گیا اور بس سے جو پوری طرح رکی بھی نہیں تھی سڑک پر کود گیا بس سے چھلانگ لگانے سے پہلے اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ یہ نہ پوچھئے کہ اس نظر میں کیا تھا۔ نہ غصہ تھا نہ تنفر اور نہ احتجاج بس ایک بے چارگی اور ایک حسرت تھی اور وہ حسرت بھری نگاہ آج تک میرے دل میں ترازو ہے۔ اس شخص کے طمانچوں کی چوٹ اب تک میرے دل پر ہے۔ سڑک پر قلابازی کھاتے ہوئے معصوم سعید اختر کی چیخ اب بھی میرے کانوں میں تازہ ہے۔ اس واقعہ کو گزرے کئی سال ہو چکے ہیں مگر آج بھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاش سعید اختر کی ماں مجھے مل جائے تاکہ میں اس سے پوچھوں کہ محترمہ! کیا آپ کے پاس سعید اختر کے ڈیڈی کی حسرت بھری نگاہ کا کوئی جواب ہے۔

سائنس فکشن کہانی

نوشتہ: باشڈ

تلخیص و ترجمہ: احمد صغیر صدیقی

روباٹ ۱۳

روباٹ" فائلر ۱۳-بی" کی مصیبت یہ تھی کہ وہ ایسی چیزوں میں دلچسپی لینے لگا تھا جو اس کے دائرہ عمل سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں۔ سچی بات تو یہ تھی فائلر تھا ہی کچھ عجیب اور سب سے مختلف قسم کا روبوٹ۔

اپنی اس الجھن کا پتہ تو اسے اسی وقت چل گیا تھا جب اس نے پہلی بار اس نوجوان لڑکی میں اپنے لئے بے پناہ دلچسپی سی محسوس کی تھی جو لائبریری میں داہنے کونے کے آخری شیلف میں کوئی کتاب تلاش کرنے میں منہمک تھی۔ وہ اپنی جگہ سے غیر ارادی طور پر اٹھا تھا۔ اور پھر اس کے پیچھے جا کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ اس کی آہنی آنکھوں میں عجیب سی چمک بھی عود کر آئی تھی۔

اور پھر وہ لڑکی یکایک جھکی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی روباٹ فائلر ۱۳-بی نے محسوس کیا تھا کہ جیسے اس کی آنکھیں اس لڑکی کے سڈول ٹانگوں پر چسپاں ہو گئی ہوں۔

"کتنی خوبصورت" تھیں وہ ٹانگیں۔ اس نے محسوس کیا تھا۔

حالانکہ ایک روبوٹ ہونے کے باعث اسے لڑکی کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہ متوجہ ہو چکا تھا اور یہ ایک انتہائی عجیب سی بات تھی۔

تبھی وہ لڑکی یکایک چونک کر مڑی تھی۔ پھر اسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی تھی کہ فائلر کی نظریں کہاں مرکوز ہوتی تھیں۔

"بائرڈ — اگر تم ایک روباٹ نہ ہوتے تو میں تمہیں مزہ چکھاتی۔" اس نے درشت لہجہ میں کہا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

جواب میں ہچکچائے بغیر اس نے کہا تھا۔ "میں ایسا محسوس کر رہا ہوں... تم دراصل مجھے کچھ عجیب سی لگ رہی ہو..." پھر وہ یکایک مڑ گیا تھا اور سیدھا چلتا ہوا اپنی جگہ پر جا بیٹھا تھا۔

لڑکی کو اگر صحیح بات کا علم ہو جاتا تو شاید وہ متعجب ہوتی۔ فائلر نے ویسے جواب میں جھوٹ نہیں کہا تھا۔ دراصل وہ جھوٹ بولنے پر قادر بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں خود بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ یکایک اس لڑکی میں کیوں دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ ایک عجیب سے مسئلے سے دوچار تھا۔ ایسے مسئلے سے جس کا سابقہ شاید کسی اور روباٹ کو کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

محبت — رومان — اور جنس کے موضوعات اسے یکایک بے حد دلچسپ لگنے لگے تھے۔

ٹھیک ہے کہ اس کی دلچسپی سراسر تحقیقی تھی۔ وہ بنایا ہی گیا تھا کچھ اس طرح۔ فائلر ایک ایسا روباٹ (مشینی انسان) تھا جو عام طور پر نہیں بنائے جاتے تھے۔ اس کا دماغ اے کلاس تھا۔

وہ اس وقت وہ ایک بہت بڑی لائبریری کا انچارج تھا۔ اپنے حیرت انگیز دماغ کی ساخت کے باعث کیٹلاگنگ کا مشکل ترین کام وہ

وہ لڑکی لائبریری والی لڑکی تھی۔

"یہ رقص ہمارا ہے" اس نے اسے مدعو کیا۔

دوسرے ہی لمحے لڑکی کا نازک ہاتھ اس کے ہاتھوں میں آ گیا — پھر وہ والز میں محو ہو گئے۔

"کون ہو تم؟" لڑکی نے سرگوشی کی۔ اس نے رومانی لہجہ میں جواب دیا۔

"میں ہوں تمہارا شہزادہ!"

وہ نقرئی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "باتیں خوب بنا لیتے ہو۔"

اشتہار

نہایت آسانی سے انجام دے سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی یادداشت انتہائی تیز تھی۔ نیز کئی زبانوں پر اسے عبور حاصل تھا۔ اور پچاسوں مضامین پر مشتمل ہزار ہا کتابیں اسے از بر تھیں۔ وہ باآسانی بتا سکتا تھا کہ کون سا مضمون کس کتاب میں مل سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں کون کون سی کتابیں مزید استفادے کے لئے کام میں لائی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دوسرے روبٹوں کے مقابلے میں بے انتہا ذہانت کا مالک تھا اور یہ اس کی خطا نہ تھی۔ یہ قصور تو اس کے بنانے والے کا تھا۔

اور پھر وہ اپنے اندر پیدا ہونے والی دلچسپی کا تابع ہو کر اپنے کام میں لگ گیا۔ وہ دراصل لڑکیوں کی ٹانگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کتابوں کا ایک ڈھیر اس کے میز پر رکھا ہوا تھا۔ پھر اسے اپنے مطلب کی چیزیں قدیم زمانے کی ناولوں میں مل گئیں۔

شروع شروع میں محبت، حسن، عاشقی، اور جنس وغیرہ کی اصطلاحات اسے خاصی عجیب سی لگیں۔ اور یہی ناسمجھی اس کی دلچسپی میں مزید اضافے کا سبب بنتی چلی گئیں۔ لوگوں کو پتہ بھی نہ تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ چند ہی دنوں میں عشق و محبت کے موضوع "پر سند" بن چکا تھا۔

اسے شروع ہی میں یہ پتہ چل گیا تھا۔ کہ وہ ایک انتہائی نازک انسانی موضوع پر تحقیق کر رہا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی تحقیقات کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں رکھا تھا صرف اسے دماغ میں محفوظ کر لیا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک دفعہ اس نے ایک شام لائبریری کا دیدوریں ایک جوڑے کو بوس و کنار میں مصروف دیکھا۔ اور اس کا آہنی دماغ ایک بار پھر نئی الجھن میں دوچار ہو گیا۔ اس نے سوچا مجھے اپنی تحقیق کو مزید بڑھانا چاہئے۔ کیوں نہ میں عملی طور پر بھی تحقیق کر دیکھوں۔ آخر یہ سب کیا ہے ؟۔

خاموشی سے وہ واپس ہو گیا۔ اس کے دماغ میں وہ ڈائیلاگ ابھی تک محفوظ تھے جو اس نے کاریڈور میں اس جوڑے کی زبان سے سنے تھے۔ یہ مکالمے اس کے لئے نئے نہ تھے وہ انھیں مختلف کتابوں میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے سوچا مجھے عورتوں کو مردوں کے نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے ۔۔۔ انھیں دنوں لائبریری میں آنے والے ایک شخص کی جیب سے اشتہار

ایک کارڈ کسی طرح کھسک کر زمین پر جا گرا۔ فائلر کی نظر پڑی تو اس نے اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور اسے اس کے مالک کے حوالے کر دیا۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کارڈ کا مضمون اس کے دماغ میں جونک کی طرح چمٹ چکا تھا۔

یہ کارڈ نقاب پوش رقص "کی کسی تقریب کا دعوت نامہ تھا۔ فائلر اس قسم کی رقص کی تقریبات سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ قدیم ناولوں میں ان کا حال تفصیل سے دیا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لوگ بھیس بدل کر ان رومانی تقریبات میں حصہ لیتے ہیں۔

پھر اس کے دماغ میں ایک انوکھا خیال ابھرا۔ کیا میں اس رقص میں شرکت نہیں کر سکتا۔ خیال بہت عجیب سا تھا۔ شاید اس سے قبل کسی اور روبوٹ نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ فائلر نے اس خیال کے ساتھ محسوس کیا جیسے وہ اس تحقیقی میدان میں بہت آگے بڑھ چکا ہے اور جلد ہی وہ رومان اور عشق کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا۔ یہیں سے اس کی دلچسپی اور بڑھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پوشاک اور نقاب کہاں سے حاصل ہو۔ لیکن جلد ہی اس کے دماغ نے ایک راہ نکال ہی لی۔ اسٹور روم میں چند پرانے پردے پڑے ہوتے تھے۔ لباس کو تراشنے خراشنے کی ترکیبیں اس نے کتابوں سے حاصل کر لیں۔ بس پوشاک تیار تھی ۔ اپنی یادداشت کی مدد سے اس نے اسی دعوت نامہ کی ایک دوسری کاپی اپنی پرنٹنگ مشین پر تیار کی اور ان کتابوں کو دیکھنے لگا جن میں اس قسم کے رقص کے طریقے تفصیل سے درج تھے ۔ اور پھر تقریب کی رات آ ہی گئی۔ اس رات وہ دیر تک لائبریری میں رکا رہا حتیٰ کہ سب کے سب رخصت ہو گئے اور پھر وہ خود بھی انتہائی خاموشی سے اٹھا اور لباس تبدیل کر کے روانہ ہوا۔ اس نئے لباس میں اسے پہچاننا آسان کام نہ تھا۔ تقریب گاہ کے ہال کی سیڑھیاں اس نے نہایت اطمینان سے طے کیں اور پھر ہال کے دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی کو اس نے ایک شان بے نیازی سے کارڈ تھمایا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

اندر پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے "بار" کی جانب رخ کیا۔ اور شمپین کے دو تین گلاس حلق میں انڈیلے۔ ظاہر ہے کہ اس کے جسم کے اندر ربڑ کی جھلی میں یہ ساری شراب جمع ہو گئی تھی جو کہ اس کے لئے قطعی

بے خود تھی۔ پھر چند ہی لمحے بعد اس نے اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے حسن کو دیکھا۔ خوبصورت عورتوں کا سیلاب سا آگیا تھا۔ تبھی یکایک اس کی نظریں اس لڑکی پر جا کر ٹھہر گئیں جس نے دوسری عورتوں کی مانند اپنا چہرہ نقاب میں چھپا لیا تھا۔ یہ لڑکی وہی لائبریری والی لڑکی تھی پھر اس نے پیار کرنی اور اس تک پہنچ. لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس نے اسے جا لیا۔

"یہ رقص ہمارا ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اسے مدعو کیا۔ دوسرے ہی لمحے لڑکی کا نازک ہاتھ اس کے ہاتھوں میں آگیا۔ پھر وہ "والز" میں محو ہو گئے۔

لڑکی نے اس کے بازوؤں پر انگلیاں گھماتے ہوئے سوچا۔ اف کس قدر سخت ہیں یہ بازو لوہے کی مانند۔ اور اس کے رقص کا انداز کتنا اچھا لگتا ہے"۔

"کون ہو تم ؟" لڑکی نے سرگوشی سی کی۔

"میں۔ تمہارا شہزادہ!" جوابی سرگوشی کرتے ہوئے اس نے رومانی لہجہ میں جواب دیا۔

"ہوں" وہ نقرئی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "باتیں خوب بنا لیتے ہو"

رقص کرتے ہوئے وہ اسے بالکونی کی جانب لے گیا۔ اور پھر لڑکی نے جذبات سے بے خود ہوتے ہوئے جیسے اپنے کو اس کے سپرد کر دیا۔ دوسرے لمحے اس نے انتہائی دلکش انداز میں اپنے بڑے کے ہونٹ لڑکی کے نازک لبوں پر رکھ دیئے۔ جن میں ایک سو دو ڈگری حرارت دوڑ رہی تھی۔ جبکہ وقت وہ اپنے جسم کو اس ڈگری کا پرست کرنا نہیں بھولا تھا۔

"آہ...." جذبات سے لڑکھڑاتے ہوئے لڑکی نے کہا۔ "ہمیں ادھر کہیں بیٹھ جانا چاہئے"۔

اس کا کر تھامے ہوئے وہ ایک گوشے میں پڑی ہوئی بنچ پر جا بیٹھا۔ اور پھر وہ ان کتابوں کے مکالمے دہرانے لگا جو اسے ازبر تھیں۔ مکالموں کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب سامنے ہال سے موسیقی کا ایک سیلاب سا امنڈ پڑا۔

"آدھی رات ہو چکی ہے۔" لڑکی نے گرم گرم سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب نقاب ہٹا دو" پھر لڑکی نے اپنی نقاب نوچ کر پھینک دی۔ جواب میں وہ چند لمحے ہچکچایا۔ یکایک لڑکی نے پھر کہا۔

"میرے محبوب۔ اب نقاب ہٹا دو"

یہ ایک حکم تھا۔ اور روبارٹ ہونے کے ناطے وہ حکم ماننے پر مجبور تھا۔ ہچکچاتے ہوئے اس نے نقاب اتار دی۔

یکایک لڑکی کے منہ سے ایک دھیمی چیخ سی بلند ہوئی۔ پھر غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "ٹین کے ناقص ڈبے" وہ چیختے ہوئے بولی۔ "یہ کیا بدتمیزی تھی"

"میں اسے محبت کہوں گا" یہ محبت ہی تھی جو مجھے یہاں کھینچ لائی تھی"۔

اس کا جواب سچا بھی تھا اور سیدھا بھی۔

جواب میں لڑکی کے منہ سے ایک اور چیخ برآمد ہوئی۔ وہ یقیناً بیوقوف بن گئی تھی۔ دوبارہ چلاتے ہوئے اس نے کہا۔ "ٹین کے بدبخت گندے ڈبے تمہیں جرأت کیسے ہوئی۔ یہ کس کی شرارت ہے بچ بتاؤ کس نے تمہیں یہاں بھیجا تھا میرے پاس۔ بتاؤ۔ بتاتا کیوں نہیں اے روبارٹ کے بچے ؟"

یکایک فائبر بنچ سے اٹھ پڑا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں میں ایک روبارٹ ہوں۔ ٹین کا ڈبہ۔ صرف ایک روبارٹ"۔ اس کے لہجے کی نرمی ختم ہو چکی تھی۔ اور آواز میں مشینی انداز ابھر آیا تھا۔ اس کے سارے دماغ میں بار بار یہی گھوم رہا تھا۔ کہ میں ایک منہ بات ہوں۔ ایک روبارٹ۔ ہاں یہ میں بھول گیا تھا کہ میں ایک مشین ہوں۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ عورت کسی روبارٹ سے محبت نہیں کر سکتی۔ مگر ابھی ابھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ مگر میں ایک روبارٹ ہوں۔ میں صرف ایک روبارٹ ہوں"

ایک مشینی تھرتھراہٹ لئے وہ تیزی سے پلٹا اور پھر اپنی آہنی انگلیوں سے اس پوشاک کو نوچتا ہوا چل پڑا جو اس کے جسم پر تھی۔ پوشاک کے بعد اس نے اپنے آہنی جسم پر چڑھے ہوئے پلاسٹک کو بھی پھاڑ ڈالا۔ چند ہی قدموں چلنے کے بعد وہ تقریباً عریاں ہو چکا تھا۔ اس کا لوہے کا بدن اب ہر خول سے بے نیاز تھا۔ راستہ بھر اس کے دماغ میں چکی سی چلتی رہی۔ ایک ہی خیال اس کے دماغ میں کوندتا رہا تھا

کی ہیجانی کیفیت کے زیر اثر اس کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ اور جسم کا مرکزی تیل پھینکنے والا پمپ کسی دھونکنی کی مانند چل کر تیزی کا سے اپنا اسٹاک ختم کرنے لگا۔ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے یکایک اس نے ہاتھ آگے کو پھیلائے اور ایک تیز آواز کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ پھر اس کا سر سامنے کے زینے سے بری طرح ٹکرایا۔ دوسرے لمحے اس کا نازک مشینی دماغ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ روباٹ فائلر ۱۳۔بی مر چکا تھا۔

فائلر کے ڈھانچے کو جانچنے والے دونوں مکینکوں نے اس کی آہنی لاش کا اچھی طرح معائنہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ اب اسے دوبارہ ٹھیک کرنا ممکن نہ ہوگا۔

" دراصل کسی وجہ سے اس کا مرکزی تیل پھینکنے والا آلہ بگڑ گیا تھا نتیجہ میں اس کے گھٹنے جام ہو گئے اور جب یہ گرا تو اس کا دماغ بکھر گیا۔"

جواب میں دوسرے مکینک نے اپنے ہاتھوں میں لگا ہوا گریس کپڑے میں پونچھتے ہوئے خراب پمپ کا معائنہ کیا۔ اس کے اندر ایک سوراخ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے پر مذاق لہجہ میں کہا۔

" بے چارہ کا دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔ تو وہ کیا بچتا۔؟!"

جواب میں دونوں نے قہقہہ بلند کیا اور پہلے مکینک نے اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے فائلر تیرہ۔بی کے ٹوٹے ہوئے دل کو بھی ادھر ہی پھینک دیا جدھر اس کے جسم کے دوسرے آہنی اعضا ڈھیر کی شکل میں پڑے ہوئے تھے۔

(بائنڈ کے افسانے سے ماخوذ)

نئے لکھنے والوں

کا وہ بیزار گروہ جو گندگی۔ جنس زدگی۔ مریضانہ داخلیت اور دوسری الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں دراصل انقلابی مزاج کے بت شکن نوجوان ہیں۔ جنھیں برا بھلا کہنے سے زیادہ ہمدردی کے ساتھ مثبت انداز میں سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے لکھنے والوں کے اس نئے گروہ کی حیثیت دور قدیم کے انحطاطی جاگیردارانہ دور میں صوفی شعرا کی سی ہے جن کے سامنے انقلاب کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ مگر انسان دوستی اور جمہوریت کے تصورات کے پیش نظر وہ ارباب اقتدار سے عدم تعاون کر کے ایک ترقی پسند رول ادا کرتے تھے۔ ترقی پسندی سماجی تبدیلی کی جس خواہش سے جنم لیتی ہے وہ ان میں بھی موجود ہے البتہ یہ خواہش بے حد مضطرب اور جاندار ہوتے ہوئے بھی ادھوری اور ناکافی ہے۔ کیوں کہ یہ "خود اپنی آگ کی خس و خاشاک" بن کر رہ جاتی ہے اور قابل نفرت نظام کی توڑ پھوڑ کرنے کے بجائے خود اپنے توڑ پھوڑ میں لگ جاتی ہے ان کی ہمدردانہ تنقید ضروری ہے تاکہ انھیں یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی تبدیلی کی خواہش اور بت شکنی کی آرزو مستحسن ہے مگر منفی اور ناکافی ہے اور "ستاروں سے آگے دوسرے جہاں" بھی ان کے منتظر ہیں ان کی پرواز کی یہی حد نہیں دوسرے افق بھی ہیں اس دور کے لکھنے والوں میں ایک واضح رجحان چلتے چلتے ترقی پسندی پر چھینٹے پھینکنا یا ترقی پسند آرٹ کی تضحیک اور تذلیل کرنے کا بھی ہے مگر یہ شاید اس نراجی مزاج کا آئینہ دار ہے جسے ابھی اپنے دوست دشمن کی صحیح پہچان نہیں ہے۔

(ڈاکٹر محمد حسن)

حاصلِ مطالعہ

• اِس عنوان کے تحت اُردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا اِنتخاب پیش کیا جاتا ہے" (ادارہ)

فارسی افسانہ

نوشتہ:
جمال میر صادق

ترجمہ:
رضوان غنی

• عزاداری کے دنوں میں

کوکب خانم ! صبح مسجد میں گزارتی اور رات روضہ خوانی کی مجلس میں بسر کرتی۔

• اُن دنوں

اُس کے چہرے پر ایسی مسرت دکھائی دیتی کہ میں نے اب تک بہت کم کسی اور کے چہرے پر ایسی خوشی کی کیفیت دیکھی ہے۔

وہ جب بھی زیارت کر کے واپس آتی اس کی مغموم آنکھوں میں ایک خاص چمک ہوتی اور اس کے چہرے سے اطمینان اور تسکین کے احساس کا اظہار ہوتا۔ پرشفقت انداز میں اور ہمدردانہ نگاہوں سے وہ لوگوں کو دیکھتی اور ان سے باتیں کرتی اس وقت اس کی آواز میں ایک خاص مٹھاس اور نرمی ہوتی۔

وہ زیادہ تر زیارت کے لئے تنہا جایا کرتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ محلے کی عورتیں اس کے ساتھ ہوتی۔ اس صورت میں اس کے ساتھ چلنے والیوں میں بوڑھی اور بیوہ عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی، وہ اس کے ساتھ جاتی تو تھیں۔ لیکن دو تین دن کے بعد وہ تنہا واپس آ جاتی تھیں۔ کیونکہ ان کی زیارت اور کوکب خانم کی زیارت میں بڑا فرق تھا۔ کوکب خانم اپنا بقچہ سنبھالتی اور زیارت کے لئے چل پڑتی تھی اور جب تک اس کا ایک ایک پیسہ ختم نہیں ہو جاتا وہ لوٹتی نہیں تھی۔

دو تین دن گھر میں ٹھہرتی اور وہ تھوڑے سے پیسے جو اس کے شوہر کے آفس سے اسے "بیوہ الاؤنس" کے طور پر ملتے تھے۔ سیکر سامانِ سفر درست کرتی اور پھر زیارت کے لئے نکل پڑتی تھی اور پھر مہینہ کے آخر تک وہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ قم جائے اور مزار کی مجاورت اسے مل جائے اور وہ وہیں کی ہو کر رہ جائے تاکہ آمد و رفت کی زحمت اسے نہ اٹھانی پڑے اور اپنے زخمی پیروں سے چل کر بار بار آنے جانے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔

اس کا چوڑا اور بھرا بھرا چہرہ، اپنے ان بالوں سمیت جو بالکل سفید ہو چکے تھے۔ تھکا ماندہ سا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے بس ابھی اس نے رونا بند کیا ہو۔ وہ اپنے بڑے اور صحت مند ڈیل ڈول کو کمزور اور ناتواں پیروں سے گھسیٹتی ہوئی اور اس طرح چلتی کہ قدموں کی چاپ تک سنائی نہ دیتی۔ اپنے پیروں کی تکلیف اور کمزوری کی وہ کبھی کبھی شکایت کرتی۔ لوگوں نے اسے اپنے صرف پیروں کا شکوہ کرتے ہوئے سنا ورنہ اور کبھی اسے کسی تکلیف کی شکایت نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنی سیاہ اور خاموش نگاہوں کو اپنے مخاطب کے چہرے پر جما کر کہتی۔

"پیروں میں بہت درد ہے، بہت"، اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔

"یہ پیر اب پیر نہیں رہ گئے ہیں" کبھی کبھی اس کے پیر بے حد ورم کر جاتے، تب اس کے چہرے سے غم جھلکتے، وہ کہتی "اگر میں بالکل معذور ہو گئی تو زیارت کیلئے سفر نہ کر سکوں گی"

جن دنوں وہ گھر میں ہوتی اپنے کمرے سے بہت کم باہر نکلتی دن بھر لیٹی رہتی اور اپنے تیل لگے ہوئے پیروں کی مالش کرتی۔ اس کی کوئی آواز سنائی نہ دیتی، وہ چپ چاپ

اور خاموش رہتی ، جب میں اپنے ایک کزن کے ساتھ اس کے کمرے میں جاتا تو دیکھتا کہ اسٹوو پر کیتلی رکھی ہوئی ہے - پانی کھول رہا ہے۔ اور چائے دان میں چائے تیار ہے ۔ صاف ستھرے فنجان لیمپ کے پاس سینی پر رکھے ہوئے ہیں - کمرے میں جھاڑو دی گئی ہے ۔ اور سب کچھ بالکل صاف ستھرا ہے۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے ، دو بڑے لیمپ ، ایک گلاب پاش چینی کا دو خوبصورت گلدان ، آتش دان پر رکھے ہوئے گلدان کے درمیان معصومہ اور ملوک کے فریم کئے ہوئے فوٹو ۔ معصومہ اسکول کے یونیفارم میں اور ملوک پھولدار چھینٹ کا اونچا کرتا پہنے نظر آتے ، آتش دان کے اوپر دیوار پر ایک بڑے فریم میں رحمت اللہ خاں کا فوٹو تھا ۔ ان کا چہرہ اور اسی کرب سے تصویر میں تھا جو زندگی میں نظر آتا تھا ۔ کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا اور اب وہ ہم لوگوں کے درمیان نہیں رہا ۔ کمرے میں مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ۔ جب میں اپنی آنکھوں کو بند کرتا تو ان کی آواز مجھے اپنے کانوں میں سرگوشی کرتی ہوئی سنائی دیتی ۔ "جعفر تم ہو؟" کوکب خانم میری جانب دیکھتی اور بڑی مدھم غمناک آواز اور دھیمے لہجے میں کہتی ، جعفر خاں ، معصومہ اور ملوک تمہیں یاد ہیں نا؟ ابھی وہ زندہ ہوتے ...." وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پاتی اور اپنی بھیگی ہوئی نگاہوں کو تصویر کے فریم پر جما کر خاموش ہو جاتی ۔
بعد میں جب اپنے عزیز کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکلتا تو میں ایک گھٹی گھٹی سی آواز سنتا ۔ میرا ساتھی کہتا کہ خانم رو رہی ہے ۔

کوکب خانم اپنے پرانے سیاہ برقعے اور صاف ستھرے دھلے ہوئے لباس جس کی چمک اور تازگی ختم ہو چکی تھی اس کے باوجود کچھ بہت زیادہ باوقار حیثیت کی مالک نہیں تھی لیکن اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ کی وجہ سے لوگ اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے کوکب خانم اپنے پرانے سامان کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ۔ اگر حاجی آقا اور عزیز کبھی کبھی سامان خرید کر اسے نہ دے دیا کرتے تو شاید وہ خود سے تو اپنے لئے کوئی چیز نہ خریدتی ۔ اپنے کپڑوں میں پیوند اور جوڑ لگا کر پہنتی رہتی ۔ اس کے شوہر کے دفتر سے اسے جو روپے ملتے وہ تمام کے تمام زیارت گاہوں کی آمد و رفت پر خرچ ہو جاتے ، اور پھر وہ بڑی

المشہد

دشواریوں سے مہینہ کی آخری تاریخوں تک اپنا خرچ چلا پاتی ۔

صحن کے کنارے والے ایک کمرہ کو اس نے کرایہ پر اٹھا دیا تھا اور شکر اور چائے وغیرہ کے خرچ کو ممکن حد تک اسی کے کرایہ سے پورا کرتی ۔ اور اسی پیسے سے وہ یہ چیزیں اپنے ساتھ لیجاتی ۔ وہ اکثر کہا کرتی کہ زندگی بڑی دشوار ہو گئی ہے ، روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے ۔

وہ اکثر زیارت کر کے لوٹتی تو کوئی چھوٹی اور خوبصورت سی چیز احمد کے لئے سوغات کے طور پر لاتی ۔ ایک چھوٹا اور خوبصورت سا پنسل تراش ، رنگین پنسلوں کا ایک ڈبہ ، کئی رنگ والی پنسلیں ،

جب موسم گرما ہوتا اور دھوپ نکلی ہوتی اور خانم کے پیر کا درد کم ہوتا تو وہ کمرے سے باہر نکلتی اور بڑے پُر مسرت لہجہ میں سب سے کہتی میرے پیر اب ٹھیک ہو گئے ، ان کا درد ختم ہو گیا ۔

وہ اپنے کمرے کے سامنے بیٹھ جاتی ، اس کے سامنے سے گذرنے والی ہر چیز اس کی خاموش اور خالی نگاہوں میں ایک جگہ پیدا کر دیتی ، مگر وہ کچھ بولتی نہیں ۔ کوئی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور کیوں اس طرح ساکت اور خاموش بیٹھی ہوئی ہے ۔ اس کی نگاہیں لوگوں کا پیچھا کرتی رہتیں ، بالکل ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے کبھی کبھی ایسا خیال ہوتا کہ اپنے دل کا درد سنانے کے لئے اس کی نگاہیں کسی کا پیچھا کر رہی ہیں ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خانم کی ہلکی سی آواز مجھے پیچھے سے سنائی دیتی ۔ مگر جب میں اس کی طرف مڑتا تو اسے خاموش بیٹھا ہوا پاتا ۔

لوگ اکثر اس کے پیچھے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے کہ بیچاری نے کیا لمبی زندگی پائی ہے ۔ اگر کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا تو اب تک غم سے گھل گھل کر مر گیا ہوتا ۔ بیچاری نے اپنے دو جوان بچوں کی موت دیکھی ہے ، اور پھر بھی اب تک زندہ ہے ۔ خانم کا کمرہ صحن کے پیچھے تھا کمرے کے دروازے پر پردہ لٹکا رہتا ۔ کمرہ مرطوب اور تاریک تھا ۔ آسیب مانیں یا نہ مانیں خانم اسی کمرے میں رہتی تھی ۔ کبھی کسی صبح کو جب ہم سو کر اٹھتے تو معلوم ہوتا کہ کمرے کا دروازہ بند ہے اور خانم لاپتہ ہے ۔ کئی راتوں کے بعد خانم کے کمرے میں دوبارہ روشنی ہوتی تو معلوم ہوتا کہ خانم

واپس آگئی ہے احمد کو خانم کے پاس بھیجکر کہلواتا کہ وہ فوراً میرے پاس آئے۔ کیا تنہائی سے اسے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟۔

احمد جاتا اور پھر واپس آکر کہتا کہ کوکب خانم کہہ رہی ہے۔ "تمہاری محبت کے قربان، اگر اللہ نے چاہا تو کسی دن آؤنگی۔ اس وقت نہیں آسکتی تھوڑی دیر تنہا میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی میں اکیلی نہیں ہوں۔"

عزاداری کے دنوں میں کوکب خانم اپنے کمرے سے باہر آتی کمرے کا دروازہ بند کرتی اور پھر کہیں چلی جاتی صبح مسجد میں گذارتی اور رات روضۂ خوانی کی مجلس میں بسر کرتی۔ صرف سونے کے لئے اپنے کمرے میں جاتی۔ ان دنوں اس کے چہرے پر ایسی مسرت دکھائی دیتی کہ میں نے اب تک بہت کم کسی اور کے چہرے پر ایسی خوشی کی کیفیت دیکھی ہے۔ ہم لوگوں کے کمرے میں آکر بیٹھ جاتی کہتی! "تم لوگ نہیں جانتے لوگ کتنے بدبخت اور بدنصیب ہو چکے ہیں، آدمی کا دل ان کی حالت پر کڑھتا ہے۔"

اور پھر اس وقت وہ ان لوگوں کے بارے میں بتانا شروع کرتی فلاں غریب عورت کا بچہ سرکاری اسپتال کے ایک گوشے میں پڑا پڑا مر گیا اور فلاں کی لڑکی ختم ہو گئی۔ دوسری عورت کا شوہر چھت پر سے گر جانے کی وجہ سے مفلوج ہو کر خانہ نشین ہو گیا تھا اور اب وہ دانے دانے کیلئے محتاج ہے۔ بوڑھی عورت کو اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور اب وہ گلیوں میں ماری پھری ہی ہے۔ اور بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پال رہی ہے۔ کبھی کبھی مغموم لہجہ میں کہتی۔

"انسان بہت مجبور ہے۔ خدا کی مصلحتوں کے قربان، کبھی وہ گھر آتی تو ایک دو عورتیں اس کے ساتھ ہوتیں خستہ حال اور مری لٹی ستھائی ہوئی عورتیں۔ عزیز ہنس کر کہتا کہ ایسی عورتیں کہاں سے مل جاتی ہیں، جن کو وہ اپنے ساتھ اٹھا کر لے آتی ہے؟

کوکب خانم سماور گرم کرتی، سب عورتیں بیٹھ کر چائے پیتیں اور گھل مل کر باتیں کرتی۔ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کوکب خانم کو دھیمی آواز میں یہ کہتے ہوئے سنتے۔

"بہن رنج نہ کرو۔ یہ دنیا ناپائیدار ہے۔ یہاں کون ہے جو پریشان نہیں ہے، ہر ایک کو کوئی نہ کوئی پریشانی ہے۔ خدا کی مصلحتوں کے قربان جاؤں کہ اس نے ہر شخص کو کسی نہ کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا رکھ چھوڑا ہے۔"

محلے والے کوکب خانم کی آمد و رفت، ورزیارت کرنے کی اس عادت سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ وہ جب اسے گلی میں دیکھتے کہ اپنے بھرے ہوئے اور زخمی پیروں کے سہارے گھسیٹ رہی ہے اور لنگڑا لنگڑا کر چل رہی ہے تو وہ مسکرا کر کہتے!

"چہ چہ کوکب خانم، یہ تمہاری کیا حالت ہے، تمہارا پیر تو ٹھیک ہے نا؟" کوکب خانم کھڑی ہو جاتی، مسکراتی، اپنے پیروں پر ایک نگاہ ڈالتی اور پھر کہتی؟ "یہ پیر اب اچھے ہونے والے نہیں۔ شاید عزرائیل ہی اب انھیں اچھا کر سکیں گے۔" وہ بولتی رہتی اور محلہ والے اس کے پاس سے کھسک جاتے اور اس کی شکایت نہ سنتے۔ کوکب خانم کے چہرے پر مسکراہٹ برقرار رہتی، وہ اسی طرح کھڑی رہتی اور اس کی نگاہیں محلہ والوں کا اس وقت تک پیچھا کرتیں۔ جب تک کہ وہ کوکب خانم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو جاتے۔ محلہ والوں کے چلے جانے کے بعد وہ مڑتی اور دوبارہ چپ چاپ اپنا راستہ لیتی۔

اس روز ہم سب اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم نے کوکب خانم کے کمرے سے اس کے رونے فریاد کرنے کی آواز سنی جب ہم لوگ کمرے کے اندر خانم کے سرہانے پہنچے تو دیکھا کہ وہ صحن کے پاس اینٹوں پر بے حرکت پڑی ہوئی ہے۔ اس کے منہ میں جھاگ ہے۔ ہم لوگ کسی طرح سے اس کو اٹھا کر کمرے میں لائے۔ اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ بہت مشکل سے وہ سانس لے پاتی تھی بہت دیر ہوئی جب اس نے کہا تھا کہ اس کے جسم کے ایک حصے میں درد رہتا ہے، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھر جیسی کوئی چیز اس کے سینے کو دبا رہی ہے۔ عزیز نے کوکب خانم سے کہا تھا کہ تمہیں سردی لگ رہی ہے تولیہ گرم کر کے سینہ کو سینک لو۔

سورج ڈوب چکا تھا ۔ اور فضا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی ۔ ہوا کی تیزی اور تندی کے باعث درخت جھوم رہے تھے جس کی وجہ سے فضا غبار آلود ہو گئی تھی ۔ ہوا کی وجہ سے ہمیں اپنی آنکھیں بند کر لینی پڑتی تھیں ۔ اور ہمارے سامنے غبار کی ایک چادر سی تن جاتی تھی ۔ ہم اور حاجی آقا ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ایک گلی میں تیز تیز قدم بڑھا رہے تھے ۔

راستے بھر ہم لوگ بالکل خاموش رہے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں کے ہونٹ سی دیئے گئے ہوں اور کسی نے ہمارے سر پر ہتھوڑا لگایا ہو ۔ جس وقت ڈاکٹر اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر ہم لوگوں کے ساتھ روانہ ہوا میں نے حاجی آقا کو بوڑھی اور تھکی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کو جھلملاتے ہوئے دیکھا ۔

جب ہم لوگ گھر میں داخل ہوئے ، عزیز اشک آلود آنکھوں کے ساتھ دروازے کے کنارے دہلیز پر پاس کھڑا ہوا ہم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا ۔

کوکب خانم کے جسم کے ایک حصے پر فالج گرا تھا ۔ اور اس طرف کا بدن بالکل سن ہو گیا تھا ۔ اور وہ آہ آہ کر رہی تھی ۔ ہمارے گھر میں ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی ۔ پڑوس کی عورتیں کمرے میں کوکب خانم کے چاروں طرف کھڑی تھیں اور کوکب خانم نہ سمجھی جانے والی اور لکنت زدہ آوازیں معصومہ اور ملکوک کے بارے میں باتیں کر رہی تھی ۔ اور رو رہی تھی .... تقریباً نصف شب میں کوکب خانم کی آواز بیٹھ گئی ۔ اور صبح بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں ۔ (مریخ پٹنہ) ●●

صفحہ ۵۰ کا بقیہ — مہرہ

جب وہ رات گئے واپس آئی تو میرے پاس چلی آئی ۔
بہت دنوں کے بعد آئی تھی ۔ میں نے کتاب بند کر کے رکھ دی ۔

وہ بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی ۔
اُس نے میرے پاس والی کرسی کھینچ کر اس پر اپنا تھکا ماندا وجود گرا دیا ۔
کیسی تھی پکچر...؟
وہ مسکرائی .... مگر اندھیرے میں بھی اس کی نیند وا آنکھوں میں کانپتے آنسو .... جھلملا ... کر مجھے تڑپا گئے ۔
میں نے ٹیبل لیمپ کا رخ اس کی طرف کر دیا ۔
لٹا لٹا سا چہرہ میں سہم گئی ۔
پھوپی امی آواز سن کر ادھر آ گئیں ۔
وہ پھوپی امی کو دیکھ کر روتے روتے مسکرائی ۔
پھوپی امی نے آصف کے متعلق پوچھا ۔ تو اُس نے بے پروائی سے کہا ۔
اب وہ شاید کبھی نہ آئیں ۔
پھوپی امی گھبرا کر اس کی طرف جھک گئیں ۔
اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں سب کچھ اُگل دیا ۔
پھوپی امی چکرا کر فرش پر گر پڑیں ۔
یہ کیا کیا کمبخت ۔ ؟ ۔ خاندان کی ناک کٹوا دی ....
وہ جذباتی لہجہ میں اُسے گالیاں اور کوسنے دے رہی تھی ۔
پھر وہ میری طرف جھکی " اور کرب ناک لہجہ میں آہستہ سے کہا ..... "
" تمہیں لوگوں نے تو زندگی کی بساط پر مجھے مہرہ بنا کر چال چلی تھی ۔ ضروری نہیں کہ ہر چال کامیاب ہو ۔ ہاں آپی ! کبھی کبھی مہرے بھی پٹ جاتے ہیں " اور پھر اُس نے ہمیشہ کی طرح میرے شانوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر دیں ۔ ●●

خلیل الرحمٰن اعظمی

دو نظمیں

لمحے کی موت

کچھ دور تلک
کچھ دور تلک
وہ لمحہ اس کے ساتھ چلا
اور اس نے دل میں یہ سوچا
یہ گرتی دیواریں
یہ دھواں
یہ کالی چھتیں
یہ اندھے دیے
سنولائے ہوسارے چہرے
اب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے
جب نگر نگر کی سیاحی
ان ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کی
آوارہ گردی
ہنستے جسم
کھنکتے پیالوں کی موسیقی
اس کو راس نہ آئی
اس نے کہا
آؤ اب لوٹ چلیں
اک شام وہ اپنے گھر پہنچا
اور اس سے ملنے کو آئے
سب ساتھی اس کے بچپن کے
اور کہنے لگے
ان جگمگ کرتے شہروں کا
کچھ حال سناؤ
اپنے سفر کی کچھ روداد کہو
وہ خاموش رہا
وہ دیکھ رہا تھا
اس میلے سے طاق کو
جس پر اب بھی ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی۔

الشجاع

کرب

روز جب صبح کو
اپنے گھر سے نکلتا ہوں میں
راستے میں کوئی دوست مل جائے
یا جان پہچان والا
میں بڑی گرم جوشی سے اُس کی طرف
بڑھ کے جاتا ہوں
آداب کرتا ہوں
اور مسکراتا بھی ہوں
[جیسے میں آج کے دن
اور گھر پہ سب خیریت ہے]
مجھ کو ہر ہر قدم پر
کئی طرح کے لوگ ملتے ہیں
جو اونچی اونچی دکانوں پہ بیٹھے ہوئے ہیں۔
کئی ایسے افراد
میں جانتا ہوں وہ کتنے غبی ہیں
مگر کرسیوں پر ڈٹے ہیں
انہیں لوگ
جھک جھک کے تسلیم کرتے ہیں
[وہ لوگ
جو اُن سے بہتر ہیں
تہذیب و شائستگی
دانش و آگہی میں
مگر اس کو کیا کیجئے
ان کی قسمت میں
وہ خاص کرسی نہیں ہے
کہ جس پر کوئی مسخرا بیٹھ جائے
تو اس کو کوئی مسخرا کہہ نہ پائے]
میں یہ محسوس کرتا ہوں
خود میرے اندر
کوئی بیٹھا ہوا
کہہ رہا ہے
جی میں آتی ہے
اِن مسخروں پہ ہنسوں
کھوکھلے آدمی جو بھی ہیں
ان سے کہہ دوں
کہ تم کھوکھلے ہو
اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا
کوئی احمق
اونٹ کی طرح سے بلبلائے
تو کہہ دوں
کہ کیا بک رہے ہو؟

شب خون الہ آباد

غلام ربانی تاباں

○

لطف یہ ہے جسے آشوب جہاں کہتا ہوں
اسی ظالم کو فروغِ دل و جاں کہتا ہوں

غیر کا ذکر ہی کیا مفت میں الزام نہ دو
دل کی ہر بات میں تم سے بھی کہاں کہتا ہوں

کون سمجھائے تری تمکنت بے حد کو
بے زبانی کو بھی اکثر میں زباں کہتا ہوں

کسی محبوب کے ہونٹوں پہ جو آ جاتا ہے
اس تبسم کو میں اعجازِ فغاں کہتا ہوں

میں نہ زندانیِ صحرا نہ اسیرِ گلشن
کوئی بندش ہو اسے جی کا زیاں کہتا ہوں

دل شکستہ سہی مایوس نہیں ہوں اے دوست
یں کہ ہر درد کو دردِ گزراں کہتا ہوں

کوئی حد ہے مری آشفتہ سری کی تاباں
اُن کی زلفوں کو چراغوں کا دھواں کہتا ہوں

(کتاب لکھنؤ)

عادل منصوری

○

ابلاغ کے بدن میں تجسس کا سلسلہ
ٹوٹا ہے چشم خواب میں حیرت کا آئینہ

جو آسمان بن کے مسلط سروں پہ تھا
کس نے اُسے زمین کے اندر دھنسا دیا؟

بکھری ہیں پیلی ریت پہ سورج کی پڑیاں
ذرّوں کے انتظار میں لمحوں کا جھومنا

اہرام ٹوٹتے ہیں کہاں سنگِ وقت کے
صحرا کی تشنگی میں ابوالہول ہنس پڑا

انگلی سے اس کے جسم پہ لکھا اسی کا نام
پھر بتی بند کر کے اسے ڈھونڈتا رہا

(تحریک دہلی)

نشور واحدی

○

اک کشمکشِ غم ہے اور شوق کی منزل ہے
دامن بھی بچانا ہے، شعلہ بھی مقابل ہے

آنکھیں ہیں ستارے ہیں وقت خلشِ دل ہے
دن ہو تو گزر جائے رات آئی تو مشکل ہے

ہستی ہے سفر لیکن احساس نہیں ہوتا
ہر سانس مسافر ہے رستہ ہے نہ منزل ہے

اس عہد ترقی میں دشوار نہیں کچھ بھی
وہ لوگ بھی جیتے ہیں جینا جنہیں مشکل ہے

ہر گوشۂ ارماں میں غم اور ہجومِ غم
تم اس میں کہاں آئے یہ انجمنِ دل ہے

(شاہراہ دہلی)

گزشتہ شمارے میں جو سوالات شائع ہوئے تھے ان میں جناب انیس الحسن کراچی کا سوال سب سے بہتر اور انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اعلان اس ماہ سے انکے نام ایک سال کیلئے الشجاع جاری کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

نجیب اشرف ساهیوال

س :۔ اگر یہ صحیح ہے کہ واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تو بتائیے کہ وہ سب سے پہلے کس بندرگاہ پر اترا اور اسکی آمد کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

ج :۔ نجیب صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ واسکوڈی گاما نے خود ہندوستان کا راستہ دریافت نہیں کیا تھا بلکہ ایک عرب ملاح نے اس کو ہندوستان پہنچایا تھا اور وہ کالی کٹ کی بندرگاہ پر اترا تھا راجہ زمیورن والی کالی کٹ نے اس کا استقبال کیا اور روایاتی مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ اس مہمان نوازی کے نتیجہ میں چند سال بعد کالی کٹ پر پرتگالیوں نے قبضہ کر لیا اور راجہ زمیورن کے محلات نذر آتش کر دیے گئے۔

عارفہ شاہین لاڑکانہ

:۔ جاتا ہے کہ غالب نے اردو غزل کو حسن دوام بخشا، مگر میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ غالب نے اردو غزل کو کون سا نیا رنگ دیا ہے جو دوسرے شاعروں پر ان کو فوقیت حاصل ہے۔ براہ کرم جواب ضرور دیں مگر مفصل۔

ج :۔ محترمہ آپ نے جو سوال کیا ہے اس پر بلا مبالغہ سینکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ اس لئے تفصیلی جواب دینے کے بجائے ہم اردو کے نقاد مجنوں گورکھپوری کے مضمون کی چند سطور درج کر رہے ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔ "غالب نے اردو غزل کو مجہولی داخلیت اور سطحی خارجیت دونوں کے تنگ دائرے سے نکال کر فطرت انسانی سے قریب کیا۔ اس کو لفظی جسامت کا شکار ہونے سے بچا کر اسکے اندر معنوی حجم پیدا کیا۔ غالب سے اردو غزل میں فکر و تامل کی ابتدا ہوتی ہے انہوں نے دلی واردات اور کیفیات کو محض بیان کر دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ غور کرنا سکھایا اور انکے متعلق ہم کو نیا شعور دیا۔"

خالد عباسی کراچی

س :۔ ہمارے دور کا المیہ ہے کہ گزشتہ چند سال سے اردو تخلیقی ادب کی رفتار بہت سست ہے اور تراجم کی بھرمار ہے۔ میری رائے میں تراجم سے اردو زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ تراجم کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تاکہ تخلیقی کاموں میں تیز رفتاری پیدا ہو۔ میری رائے میں یہ ذمہ داری مدیران جرائد کی ہے اور وہ اردو ادب کو تراجم کی وبا سے بچا سکتے ہیں۔

ج :۔ محترم! آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ تعجب خیز ہے اس لئے کہ موجودہ دور میں تخلیقی ادب کی رفتار کسی اعتبار سے بھی سست نہیں اور نہ ہی تراجم کی بھرمار ہے۔ اچھے ترجمے تو بہت کم ہو رہے ہیں اور آج تو بالخصوص اس کی ضرورت ہے کہ مغربی ادب کی بہترین کتابوں کو زیادہ سے زیادہ اردو میں منتقل کیا جائے۔ آپ کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ تراجم سے اردو زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بقول آل احمد سرور "اردو ادب نے جو ترقی کی ہے اس میں تراجم کا بڑا ہاتھ ہے۔ تراجم نے نہ صرف ہمارے معلوماتی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ نہ صرف عالمی ادب سے آشنا کر کے ہماری ذہنی تربیت کی ہے بلکہ براہ راست ہماری تخلیق کو متاثر کیا ہے اور ہماری نظم و نثر کے جدید اسالیب کی تشکیل میں حصہ لیا ہے اس لئے ہمیں نہ صرف تراجم کی لے کو اور تیز کرنا چاہیئے بلکہ اپنے ادب کے سرمائے میں ہر موضوع کی معیاری کتابوں کے ترجمے کا اضافہ کرنا چاہیئے تاکہ اردو ادب طاقت کے علاوہ آگہی کا ادب بھی کہلایا جا سکے بلکہ نئی آگہی کے ذریعہ سے نئی طاقت پیدا کرے یا اقبال کے الفاظ میں عشق عقل خداداد کی پیروی کر کے کہنہ پیکر کو نئی روح سے آباد کر سکے۔"

ہونہار شہری

پیارے ساتھیو!

اس بار تمہارے صفحات کی زینت ایک دلچسپ کہانی اور ایک مزاحیہ مضمون ہے۔ امید ہے کہ یہ دونوں تخلیقات تم کو پسند آئیں گی اور تم ان کے بارے میں ہمیں اپنی رائے سے ضرور مطلع کروگے۔ ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے صفحات کے لئے خوبصورت تصویریں ارسال کریں تاکہ ان کا حسن دوبالا ہو۔

(نگران ہونہار شہری)

شاہدہ برنی

سوتیلی ماں

عارفہ ابھی دس سال کی ہی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ دو چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال اور گھر کی دیگر ذمہ داریوں کا بار عارفہ پر آن پڑا۔ اگرچہ اس کی عمر بہت کم تھی لیکن ماں نے اس کی تربیت شروع سے ہی اس طرح کی تھی کہ دیکھ کر اکثر لوگ کہتے تھے "بچی کیا ہے ہیرا ہے"۔ روایت کے مطابق عارفہ کے والد کمال صاحب سے سب عزیزوں اور دوستوں نے نکاح ثانی کے لئے کہا۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا مگر چار سال کے بعد آخر انھوں نے دوسری شادی کرلی۔ اور ایک شام۔ عارفہ کی سوتیلی ماں ثریا آگئی۔ صورت شکل کی اچھی تھی اور بی اے پاس تھی۔ اور ایک اسکول میں استانی تھی۔ عارفہ ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح ماں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ اسے ان سب باتوں کا سامنا کرنا

الشیخ؟

پڑ گیا جن سے اس کے کان پہلے ہی آشنا ہو چکے تھے۔ ثریا نے اسے بیٹی کی بجائے خادمہ سمجھا۔ اٹھتے بیٹھتے دس باتیں سناتی اور جس طرح چاہتی خدمت لیتی تھی۔

ایک دن کمال صاحب نے اپنی دوسری بیوی کو سمجھایا تو وہ بپھر اٹھی اور کمال صاحب خاموش ہو گئے کیونکہ نئی نئی بیوی تھی اور وہی بات کر دوسری تھی اور بچوں کی سوتیلی ماں۔ چند ماہ بعد ثریا نے عارفہ کا اسکول جانا بند کرا دیا۔ اور خود ملازمت پر جاتی رہی۔ عارفہ بہت روئی کہ میں پڑھنا ترک نہیں کروں گی۔ کمال صاحب نے بھی بیوی کو سمجھایا لیکن ثریا نے ایک نہ سنی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اب عارفہ سولہ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے رشتے آنے شروع ہو گئے تھے ابھی کمال صاحب ان رشتوں پر غور ہی کر رہے تھے کہ اسی درمیان ان کی دوسری بیوی ثریا کے بھتیجے کی نوجوان بیوی اچانک فوت ہوگئی۔ چند ہفتے بعد ثریا نے اپنے بھتیجے کے لئے عارفہ کا پیغام دیا تو

ہونہار سیشن کے نئے ممبر

سید منصور علی جعفری - بھوپال

تو کمال صاحب بگڑ بیٹھے ویسے لڑکے میں کوئی بُرائی نہیں تھی۔ پڑھا لکھا شکیل اور اچھے عہدے پر فائز تھا اس کے ایک چار سالہ بچہ بھی تھا۔ کمال صاحب سوتیلی ماں کا سلوک اپنے بچوں کے ساتھ دیکھ کر تجربہ ہو گیا تھا لیکن ادھر ثریا بضد تھی اور اس نے کمال صاحب سے صاف صاف کہہ دیا "اگر آپ عارفہ کی شادی خالد کے ساتھ نہیں کریں گے تو آپ کو مجھ سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

ثریا کی ضد سے مجبور ہو کر کمال صاحب نے عارفہ سے تحریری عارفہ سے مشورہ لیا۔ عارفہ نے ایک سال پہلے ہی خالد کو دیکھا تھا وہ خوبصورت شوخ اور پرکشش نوجوان تھا۔ اس کا بچہ بھی پیارا سا تھا۔ عارفہ نے معاملہ باپ پر چھوڑ دیا جس سے اس کی رضامندی ظاہر ہو گئی

عارفہ اگرچہ اپنی سوتیلی ماں کا سلوک اپنے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ دیکھ چکی تھی مگر خود اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ دنیا کو دکھائے کہ "ماں" سوتیلی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ماں کے مقدس رشتے سے پکاری جاتی ہے تو پھر وہ صرف ماں ہوتی ہے

عارفہ جب سسرال پہنچی تو وہاں بھی وہی باتیں سننی پڑیں جو اپنے یہاں ماں کے آنے پر سننی پڑی تھیں یعنی یہ کہ "سوتیلی ماں کا برتاؤ معصوم بچے کے ساتھ جانے کیسا ہو گا۔ پرائی اولاد کو کون سینے سے لگاتا ہے؟ اس کے گھر میں خود بھی سوتیلی ماں ہے، جو برتاؤ اس کے ساتھ کئے گئے ہوں گے وہی یہ اس بچے کے ساتھ کرے گی۔" عارفہ نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وقت سب کو جواب دے گا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ عملی جواب دینا چاہتی تھی۔ خالد کی ساس بھی شادی میں آئی تھیں۔ ان کے ساتھ خالد کا پانچ سالہ بچہ ندیم بھی تھا جو اپنی نانی ہی کے پاس رہتا تھا۔ نانی کا دل انجانے خوفوں سے دھڑک رہا تھا۔ ویسے انہیں عارفہ ہر لحاظ سے پسند آئی تھی چند روز وہ خالد کے یہاں رہیں اور پھر نواسے ندیم کے ساتھ چلی گئیں۔

عارفہ کی شادی کو دو ماہ گزر گئے تھے۔ اس دوران میں اس نے کئی مرتبہ خالد سے ندیم کا ذکر کیا۔ ایک دن اس نے کہا: "میرا خیال ہے کہ ندیم کو لے آنا چاہیئے۔" خالد چونک گیا: "کیا کرو گی ندیم کو بلا کر؟ وہ اپنی نانی ہی کے پاس خوش ہے۔" "اگر ہم خوش رکھیں گے تو وہ یہاں بھی خوش ہی رہے گا" "کیا تم بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بوجھ برداشت کر سکو گی۔؟" خالد متعجب تھا۔ "آپ اسے بوجھ کہہ رہے ہیں؟ وہ ہمارا بچہ ہے۔"

"میرا بچہ تو ہے۔ مگر تمہارا تو نہیں؟" خالد مسکرایا۔

"یہ کیا کہا آپ نے؟ اگر وہ آپ کا بچہ ہے۔ تو میرا کیسے نہیں ہوا؟ کیا آپ میرے نہیں ہیں؟" خالد اس منطق پر حیران رہ گیا۔ "کیا واقعی تم اسے بلانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ اپنے بچے اپنے ہی پاس اور اپنی ہی نظروں کے سامنے ٹھیک رہتے ہیں۔ دوسروں پر یہ ذمہ داری کیوں ڈالی جائے؟"

"اچھی بات ہے۔ کسی دن خط لکھ دوں گا اور جا کر ندیم کو لے آؤں گا۔" خالد نے عارفہ کو دیکھا۔

"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔ اماں کو جو میری آمد سے تکلیف پہنچی ہے۔ میں اس کی کچھ نہ کچھ تلافی کرنا چاہتی ہوں۔"

"تکلیف پہنچی ہے تم سے؟ کیا تکلیف پہنچی ہے انہیں؟"

"کیا یہ تکلیف کم ہے کہ ان کی نوجوان بیٹی اچانک مر گئی اور اس کی جگہ میں آ گئی۔ میں نے دیکھا تھا شادی والے دن ان کے چہرے پر حزن و ملال کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ ندیم کو بار بار سینے سے لگا رہی تھیں۔ خالد مسکرایا۔ "تم بہت سمجھدار ہو۔ میں نے تو کسی بات پر غور نہیں کیا۔" بہر نوع اگر تم بضد ہو تو اگلے ہفتہ میری تین روز کی چھٹی ہے اس میں چلے چلیں گے

"بس ٹھیک ہے۔ میں ضروری تیاری کر لوں گی۔" آپ ان کو لکھ دیں کہ ہم

لوگ آرہے ہیں

پروگرام کے مطابق جب خالد اور عارفہ خالد کی ساس کے یہاں پہنچے تو سب کے منہ اترے ہوئے تھے۔ عارفہ بہت سارے پھل۔ ساس کے لئے ایک دوپٹہ۔ قمیص کا کپڑا اور ایک سوئٹر اپنے ہاتھ سے بن کر لے گئی تھی۔ ندیم کے لئے کئی جوڑ کپڑے اور کھلونے تھے۔ ندیم کی خالاؤں کے لئے دوپٹے اور چوڑیاں تھیں۔ سب عارفہ کے اس رویہ پر حیران رہ گئے۔ عارفہ نے خالد کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ ندیم کو گھر لانے کے لئے اماں سے میں نہیں کہوں گی بلکہ آپ میری موجودگی میں کہیں گے لہٰذا طے شدہ پروگرام کے مطابق خالد نے دوسرے دن دوپہر کو ساس سے کہا۔" اماں۔ میں ندیم کو لینے آیا ہوں پہلے تو یہ دقت تھی کہ گھر پر کوئی نہیں تھا، مگر اب تو یہ آگئی ہیں۔" اس نے عارفہ کی طرف اشارہ کیا۔ خالد کی ساس نے صاف انکار کر دیا۔" دیکھو خالد۔ ندیم میرے پاس ایک سال سے ہے۔ اب میں اس کو اپنے سے جدا نہیں کرسکتی البتہ جب وہ بڑا ہو جائے تو لے جانا۔

خالد نے عارفہ کی طرف دیکھا۔ عارفہ بولی۔" اماں اگر آپ ندیم کو نہیں دینا چاہتیں تو آپ کی خوشی کی خاطر ہم نہیں لے جائیں گے۔ مگر میری طرف سے جتنے خدشات آپ کے دل میں ہوں وہ سب نکال دیں میں روایتی بہو اور روایتی "سوتیلی ماں" نہیں بنوں گی۔ میں آپ کو ماں سمجھتی ہوں۔ کاش آپ بھی مجھے اپنی بیٹی ہی تصور کریں۔

خالد کی ساس عارفہ کی باتوں سے بڑی متعجب ہوئیں۔ پاس بیٹھے ہوئے سب لوگوں نے بھی اس کو دیکھا۔ عارفہ انھیں اپنی بیٹی ہی معلوم ہونے لگی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اس کو سینے سے لگا لیا۔ اسی وقت ندیم کھیلتا ہوا باہر سے آگیا۔ اس نے اپنی نانی اور عارفہ کو روتے ہوئے دیکھا تو سہم گیا۔ عارفہ نے اس کو پیار سے گود میں بٹھا لیا۔ اور پیار کرنے لگی۔ اس کی نانی نے کہا۔ "بیٹے۔ یہ تمھاری امی ہیں۔" ندیم بہت خوش ہوا۔ وہ بچہ عارفہ سے کھلونے اور شاندار چیزیں پاکر اس سے مانوس ہوگیا تھا

تیسرے دن خالد کی ساس نے بچے کے کپڑے اور سب چیزیں عارفہ کے سامنے رکھ دیں اور کچھ چیزیں نئی منگوا کر دیں۔ لیکن بچے کی جدائی خیال اور دوسرے یہ خوف پریشان کئے ہوئے تھا کہ گھر سے جا کر عارفہ سلوک نبھائے گی ندیم کے ساتھ کیا ہو۔ اگرچہ عارفہ نے ساس کو ہر طرح تسلی

اطمینان دلایا تھا۔ اور انھیں اپنے آنے کی دعوت بھی دی پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھیں۔

ہونہار شہری کے نئے ممبر

شمیم احمد بمبئی

گھر آنے کے بعد عارفہ نے ندیم کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ اپنے بچے کے لئے کرسکتی تھی۔ چند ہفتہ بعد اس نے شاندار طریقہ پر ندیم کی بسم اللہ کی۔ اور سارے خاندان کو مدعو کر کے یہ دکھا دیا کہ سوتیلی ماں بھی چاہے تو سگی سے بڑھ کر ہو سکتی ہے۔ ندیم باپ سے زیادہ ماں سے خوش تھا۔ لیکن جب بھی وہ باہر کھیلنے جاتا۔ ملول واپس آتا۔ ایک دن پوچھنے لگا۔" امی مجھے سب چھیڑتے ہیں۔ کہتے ہیں تمھاری ماں سوتیلی ہے امی سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے؟

عارفہ نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔" بیٹے سوتیلی ماں اسے کہتے ہیں جو بچوں کو بہت پیار کرتی ہے۔" "تو کیا آپ مجھے اس لئے زیادہ پیار کرتی ہیں کہ آپ سوتیلی ہیں؟ معصوم ندیم نے معصومیت سے سوال کیا "ہاں اور کیا؟ کیا میں اچھی نہیں؟

ندیم نے ماں کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔" امی آپ تو بہت اچھی ہیں۔ مگر راشد۔ ناصر اور حمیرہ سب کیوں کہتے ہیں کہ تمھاری امی سوتیلی ہیں اس لئے وہ تمھیں خوب مارا کریں گی

" نہیں بیٹے میں تمھیں کبھی بھی نہیں ماروں گی۔ اور دیکھو تم باہر کھیلنے بھی مت جایا کرو۔

" تو امی میں اکیلا تو ہوں۔ گھر میں کس کے ساتھ کھیلا کروں؟

ہونہار شہری کے نئے ممبر

شہزادہ سلیم کراچی

" تمہارے پاس اتنے کھلونے ہیں گھوڑا۔ اونٹ ہاتھی۔ بلی اور گیند بلا۔ تم ان سے کھیلا کرو۔"

عارفہ ندیم کی پرورش بڑے نازو نعم سے کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی عارفہ کے کانوں میں یہ آوازیں برابر آتی رہتی تھیں۔ حیرت ہے سوتیلی ہوکر ندیم کے لئے اتنا کرتی ہے۔ " ارے ابھی نئی بات ہے۔ آئندہ بھی ایسی ہی رہے تو جانو۔ ہنہ! اپنے بچہ ہو جائے گا تو ندیم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ یہ باتیں سن کر عارفہ کا دل تو جلتا تھا۔ لیکن وہ جواب زبانی نہیں، صرف عمل سے دینا جانتی تھی۔ ایک دن عارفہ نے ندیم کو نہلا دھلا کر سفید قمیص پاجامہ۔ اور براؤن شیروانی پہنا کر خالد کے ساتھ کسی تقریب میں بھیجنے کے لئے تیار کیا ہی تھا کہ ندیم کی نانی آگئیں وہ دانستہ اچانک آئی تھیں۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ سوتیلی ماں کا بچے کے ساتھ برتاؤ کیسا ہے۔ مگر وہ ندیم کو نہایا۔ دھویا۔ دولھا سا بنا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ندیم پہلے سے زیادہ صحتمند ہو گیا تھا۔ نانی یہ دیکھ کر مسرور ہوئیں۔ انھوں نے عارفہ کو کلیجے سے لگا لیا۔ " آج مجھے یقین آگیا کہ میری بیٹی مری نہیں۔ بلکہ زندہ ہے۔ ندیم کی نانی ایک ہفتہ رہیں۔ عارفہ نے ان کا اتنا خیال اور احترام کیا کہ وہ اس کی خوبیوں کی مزید معترف ہو گئیں۔

شادی کے دو سال بعد عارفہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے سب سے پہلے ندیم کو دکھایا۔ " دیکھو۔ یہ تمہارا بھائی ہے"؟

ندیم بچے کو بھینچ کر پیار کرنے لگا تو عارفہ نے اسے الگ کیا۔

" میاں اس طرح پیار نہیں کیا کرتے۔ آہستہ سے کرتے ہیں"۔

عارفہ اسپتال سے آئی تو ہر کسی کی زبان پر یہی تھا۔ " اب ندیم سے محبت باقی رہے تو جانو..... اپنے بچے کے آگے سوتیلے بچے کا کیا خیال کرے گی.... وغیرہ وغیرہ

ایک دن ندیم باہر سے آیا۔ " امی۔ لڑکے کہہ رہے ہیں کہ اب تمہارے سوتیلا بھائی پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بڑا ہو کر تمھیں مارا کرے گا۔ امی سوتیلا بھائی کسے کہتے ہیں؟ کیا یہ مُنا مجھے مارا کرے گا؟"۔ " تم تو بیوقوف ہو ندیم۔ یہ مُنا تمھیں مارے گا، تو میں منے کو نہ ماروں گی؟ بیٹے سوتیلا بھائی اُسے کہتے ہیں جو بہت دن بعد اپنے بھائی کے ساتھ کھیلنے کے لئے آتا ہے۔ تم ہی تو کہا کرتے تھے۔ امی کسی کو بلا دیجئے، ہم کس کے ساتھ کھیلیں؟ تو اب منا بھائی آگیا ہے۔ دیکھو کتنا پیارا ہے۔

" ہاں امی یہ سچ مچ بہت پیارا ہے۔ مگر یہ بڑا کب ہوگا؟ عارفہ مسکرائی۔" ہو جائے گا ایک دن بڑا بھی"۔

وقت گزرتا رہتا ہے۔ پتہ بھی نہیں چلتا۔ ندیم اب جوان تھا۔ اور پڑھ لکھ کر ملازم ہو چکا تھا۔ شمیم پڑھ رہا تھا۔ عارفہ کو ندیم کی شادی کی فکر تھی۔ ندیم خاندان کی جس لڑکی کو چاہتا تھا۔ اتفاق سے اس لڑکی کو شمیم بھی پسند کرتا تھا۔ عارفہ پریشان تھی۔ وہ شمیم کو' ندیم پر ترجیح دینے کو تیار نہ تھی۔ لہٰذا ایک دن عارفہ نے شمیم کو سمجھایا۔ "میاں تمھیں معلوم ہے کہ ندیم تمہارا بڑا بھائی ہے' اور بھائی بھی کیسا جو تم پر اپنی جان نچھاور کرتا ہے۔ اس کی خوشی مجھے عزیز ہے۔ تمھیں بھی اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہئے۔

شمیم یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ عارفہ نے تیز لہجہ میں کہا۔ بولو۔ جواب دو۔" یاد رکھو ندیم میری روح ہے۔ اور تم جسم"۔ شمیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بولا۔" پیاری امی آپ شوق سے ندیم بھائی کی شادی شاہینہ کے ساتھ کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

عارفہ ندیم کی شادی کی تیاریاں بڑے اہتمام سے کر رہی تھی مگر ندیم اپنی شادی اس شرط پر کرنے کو آمادہ تھا۔ جب کہ شمیم کی

شادی شاہینہ کی چھوٹی بہن سے کی جائے۔ بالآخر ندیم کے اصرار پر شاہینہ
کی چھوٹی بہن شبانہ سے شمیم کا رشتہ طے کر لیا گیا۔ جس وقت دونوں
دلہنیں بیاہ کر آئیں تو عارفہ اپنی بڑی بہو پر زیادہ نثار ہو رہی تھی
یہ دیکھ کر بہت سے لوگ کہہ رہے تھے اٹھے۔ "ہم نے نہیں دیکھی ایسی
سوتیلی ماں۔" اور عارفہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے کانوں
میں کسی نے گرم گرم پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔

نسرین حبیب

"اللہ! ادیب کیسے بنیں"

جس دن ہم کو معلوم ہوا کہ عطیہ بھی ایک دو بار اخبار اور رسالے
میں چھپ چکی ہے تو ہمارے حسد کے آدھی جان مکمل طور پر جل کر بھسم
ہو گئی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا کہ ہم جو عطیہ سے ہر بات میں زیادہ نہیں تو
کچھ نہ کچھ آگے رہے ہیں تو وہ اب یوں ہم سے آگے ہو جائے۔ بچپن سے لیکر
کالج تک ہم نے ہمیشہ اسے شکست دی۔ اگر اس کے پاس ایک گڑیا ہوتی
تو ہم دو لے کر آتے چاہے اس سے قیمت میں کتنی ہی سستی کیوں نہ ہوتیں
اگر وہ ہم کو ایک دھول کا جاتی تو ہم اس کو دو جما دیتے اگر وہ کہیں جانے
کے لئے تیار ہوتی تو ہم اس سے بھی پہلے اچھل کر گیٹ کے پاس پہنچ جاتے۔
اور پھر اسکول کالج میں بھی پڑھائی میں ہم آگے رہے حساب میں اگر اس
کے ۳۴ نمبر آتے تو ہمارے ۳۵۔ وہ اگر انگریزی میں فیل ہوتی تو ہم
اس سے بھی بڑھ کر فیل ہوتے۔ "سپورٹس" میں اگر وہ ایک بار گرتی تو
ہم دس بار گرتے۔ بس ہر بات میں آگے رہتے آئے تھے۔ بھلا یہ ممکن ہی
کیسے تھا کہ اب عطیہ صاحبہ شائع ہونے لگیں اور ہم شائع ہونے
سے رہ جائیں۔ ویسے بھی پچھلے چند مہینوں سے وجود میں کھلبلی مچی ہوئی
تھی ادیب بننے کا شوق اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا لیکن اب عطیہ کا
سن کر ایسا تازیانہ لگا کہ بس کچھ مت پوچھئے۔

شام ڈھل رہی تھی وہ بھی ماہ فروری کی اور افراد خانہ کسی کے
گھر جانے کی تیاری میں مشغول تھے۔ ہم جو فطرتاً سیلانی واقع ہوئے ہیں ہمیں
کھڑکی میں سے شفق کا نظارہ کرتے دیکھ کر امی اور بھیا کو حیرت ہوئی کہ
الشباع
اس جانے کے ہنگامے میں یہ محترمہ خلافِ معمول شفق کی گہرائیوں
میں کس خوشی میں غرق ہیں۔ اس حیرت کو مٹانے کے لئے امی جان خود
سے ملا آئیں۔

"ارے نازو جانا نہیں ہے کیا؟"

"نہیں امی جان!" آج شاید زندگی میں پہلی بار ہم نے جانے
سے انکار کیا تھا۔ سب ہی یوں چونکے جیسے گلاب کے پودے میں چنبیلی
کے پھول نکل آئے ہوں۔ خیر صاحب خدا خدا کر کے گھر کی پلٹن سدھاری
امی جان نے جاتے ہوئے زور سے پکارا۔

"ارے نبو ذرا باورچی خانے کا دروازہ بند کر لینا ورنہ بلی
گھس جائے گی۔"

ہم دوبارہ شفق کے سمندر میں غرق ہو گئے۔ اب پورے
سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شفق کی گہرائیوں میں ڈوبے جا رہے ہیں
لیکن اتنا حساس ہونے کے باوجود کوئی بات ڈھنگ کی نہیں مل
رہی جسے لکھا جائے۔ سنا تھا کہ ادیب لوگ فطرت کا مشاہدہ بڑی گہرائی
سے کرتے ہیں اور یہ بات ان کی تخلیقی قوت میں معاون ثابت ہوتی
ہے۔ مگر یہاں ہاتھ پلے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ اللہ کیا لکھیں۔ کس
موضوع پر لکھیں۔ سوچے جا رہے ہیں مگر یہی مسئلہ کسی طرح طے
نہیں ہو پاتا تھا کہ کس موضوع پر لکھا جائے۔ یونہی کھڑے کھڑے
آدھ گھنٹہ بیت گیا۔ "یہ کیا مصیبت ہم نے پال لی ہے۔ ہم گھر
والوں کے ساتھ چلے جاتے تو کتنا مزہ رہتا۔" ہم ابھی مکمل طور پر
پچھتا بھی نہ پائے تھے کہ باورچی خانے میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔
ہم بھاگے بھاگے باورچی خانے میں گئے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔
سامنے دودھ کی دیگچی فرش پر الٹی پڑی تھی اور سارا دودھ فرش پر
بکھرا ہوا تھا اور بی بلی صاحبہ چھلانگیں مارتی بھاگی جا رہی تھیں۔ ہم
تلملا کر رہ گئے۔ اب یہ بتلانے کی کیا ضرورت ہے کہ فرش کو صاف کرنے
میں کتنی دیر لگی اور ہم نے اپنے آپ کو جھڑکیاں سہنے کے لئے کس طرح
مستعد کیا۔

"اب تو ضرور کچھ نہ کچھ لکھ ہی لیں گے اور صبح کی ڈاک سے
یقیناً کسی رسالے کو پوسٹ کروا دیں گے۔" سوچیں پھر معمول

کے مصداق ہمارے ذہن میں عود کر آئیں اور اس دفعہ تو ہمارے دل میں یہ امنگ اس زور سے بڑھکی کہ ہم فوراً کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے ۔" ابھوں بھلا خاک لکھا جائے گا اس دور میں کہ چھ سے آٹھ آنے کی کاپی پر! ادیب لوگ تو "پارکر" یا "شیفرز" سے لیپس کاغذوں پر لکھا کرتے ہیں۔ آٹھ آنے کی کاپی پر تھوڑا ہی لکھتے ہیں" ہم نے بڑی بے چارگی سے اس خیال کو جھٹک دیا اور پھر لکھنے پر مستعد ہو گئے لیکن ابھی تک یہ طے ہی نہیں ہو پایا تھا کہ لکھا کیا جائے۔ "بیٹھے ہیں تصور موضوع کئے ہوئے" کے مصداق ہم بیٹھے رہے کبھی ایک ٹانگ دوسری پر چڑھا لیتے اور کبھی دوسری پہلی پر۔ کبھی آنکھیں بند کر لیتے۔ کبھی بالوں کی پنیں درست کرنا شروع کر دیتے اور کبھی دوپٹے کے پلو کو مروڑنے لگتے۔ شاید یہ دوپٹے کا بوجھ سوچوں میں حائل ہو رہا ہے ۔ اس سوچ کے آتے ہی ہم نے دوپٹہ گلے سے کھینچ کر جو مارا تو وہ سیدھا ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سینٹ کی شیشی سے اس طور ٹکرایا کہ وہ پہلے وار میں ہی فرش پر گر کر شہید ہو گئی۔ ہم نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے صورتِ حال کا جائزہ لیا پھر بڑی بے نیازی سے موضوع کی تلاش میں سوچوں کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گئے۔ شائد کاغذ اچھا نہیں اسی لئے قلم کے لب اس پر نہیں ٹک رہے اور قلم بھی کونسا اچھا ہے — کاغذ — قلم — قلم کاغذ — نہیں نہیں — یہ بات نہیں — اصل میں — اصل میں — بات کچھ اور ہے۔

ہم دھیرے دھیرے اٹھے اور وہ دونوں اخبار اٹھا لائے جن میں عطیہ ظہور کا نام پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ ہم دل میں حسد کی آگ دہکائے اس کے مضامین پڑھنے لگے (گو ہم اس کے سامنے اس کے مضامین سے بالکل بے نیاز بنے رہتے تھے) اور پھر فوراً اخباروں کو مخصوص جگہ پہ رکھ آئے۔ ہم نے تین بار بسم اللہ پڑھی۔ آستینیں کہنی سے اوپر چڑھائیں اور لکھنا شروع کیا۔ اصل میں ہم مسلسل تین گھنٹے سے ایک افسانے کا پلاٹ سوچ رہے تھے بلکہ تو یہ ہی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہیرو اور ہیروئن میں سے کس کو غریب اور کس کو امیر دکھایا جائے۔ آخر پلاٹ کو ہم نے کچھ اس طور اپنے ذہن میں جگہ دی۔ ہیروئن کو چمارن ہونا چاہئے اور ہیرو کو راجپوت الشجاعت

جو کسی مہاراجہ کا صاحبزادہ ہو اور باقی کردار چمارن کی ماں، ہیرو کا دوست، ایک کتا جو ہیرو بڑے شوق سے پالتا ہے اور ایک چمار جس کو سائیڈ ہیرو کہہ سکتے ہیں۔ بمشکل ہم اتنے کردار ہی ذہن میں جمع کر پائے تھے۔ ہیروئن کو خاص طور سے چمارن ہم نے اسلئے منتخب کیا کیونکہ اس طرح ہمارا نام ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو سکتا تھا کیونکہ ترقی پسند مصنفین مثلاً راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور وغیرہ کے کردار بھی یونہی ہوا کرتے ہیں۔ اب ہم نے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ یکبارگی ہم کو خیال آیا کہ افسانے کا عنوان تو سوچا ہی نہیں — "اہو وَنڈرفل" ہم اپنے آپ بڑبڑائے اور لگے ہی لمحے ہمارے پسندیدہ شعروں کی کاپی ہمارے ہاتھ میں تھی۔ کسی خوبصورت شعر کا ایک مصرع ٹھیک رہے گا۔ کیونکہ آجکل مصرعوں کے عنوانات کی بھی بڑی بھرمار ہو رہی تھی۔ اب خدا جھوٹ نہ بلوائے آدھا گھنٹہ تو عنوان ڈھونڈنے میں لگا۔ لیکن وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔ کوئی مصرعہ بھی ایسا نہ تھا جو ہمارے افسانے کے معیار پہ پورا اترتا۔ ہم کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ یہ پسندیدہ اشعار جو ہم نے اتنے جتنوں سے جمع کئے ہیں سب بکواس ہیں۔ ہم جب شعروں کی کاپی واپس کتابوں میں رکھ رہے تھے تو عین اسی وقت گھر کی پلٹن پہنچ گئی۔ وہ سب کیونکہ دعوت سے لوٹے تھے اس لئے آتے ہی سب سو گئے۔ بلکہ آدھے تو راستے سے ہی سوتے آ رہے تھے۔ والدہ محترمہ نے دعوے کرنے اور عطر کی شیشی ٹوٹنے پہ ہماری جو گت بنائی اس کا اب میں کیا بیان کروں۔ اگر بیان کر دوں تو آپ کے دل میں ہماری جو ذرا سی عزت ہے وہ بھی خاک میں ملنے کا اندیشہ ہے۔

اس وقت رات کے گیارہ کا عمل ہوگا۔ کافی دیر ہو رہی تھی اس لئے امی صاحبہ ڈانٹتی ڈانٹتی فوراً سو گئیں۔ کچھ لمحوں تک ہم کو اپنے کمرے میں یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اب سوتے میں بھی ہم کو ڈانٹ رہی ہیں۔ کاش ہم ان کو سمجھا سکتے کہ آپ جن الفاظ میں ہماری شان میں اپنی زبان چلا رہی ہیں وہ ایک ادیب کے شایانِ شان نہیں ہم نے اپنے دل کو بڑے جتنوں سے سمجھایا کہ اس سے اچھا

باتوں کا اثر لینا ایک ادیب کو زیب نہیں دیتا۔ جانے کیوں اس وقت ہم مغرور سے ہو گئے تھے گو ایک لفظ بھی ڈھنگ کا نہ لکھ پائے تھے لیکن اپنے آپ کو یوں سمجھ رہے تھے جیسے ہم واقعی ادیب ہیں۔

ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے اب گھر مکمل طور پر خوابِ استراحت کے مزے لینے لگا تھا اور ہم شام سے اب تک کانٹوں پر لوٹ رہے تھے۔ ہم نے اپنے بالوں کا جوڑا کھول کر ڈھیلی سی چٹیا باندھی کہ شاید یہ جوڑا ہی ہماری تخلیقی صلاحیت کو روک رہا ہو۔ کمبل کو بستر پر سے اٹھا کر رائٹنگ ٹیبل پر رکھا کہ کہیں یہ ہم کو سونے پر آمادہ نہ کر لے اور خود بستر پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ "چارن ایک عظیم محبت"۔ "ڈھلتے سایوں کی دھوپ اور بارش"۔ "زندگی کے فرش پر کچھ مٹی"۔ "غریبوں کی اتھاہ گہرائیوں کے من کا ساگر"۔ آہستہ آہستہ اس طرح کے عنوانات آخر کار ہمارے ذہن میں آنے لگے۔ ہم نے فوراً "ڈھلتے سایوں کی دھوپ اور بارش" اپنے افسانے کے لئے عنوان منتخب کر لیا۔ کچھ تو ہم کو اس میں نیاپن نظر آیا اور دوسرے اس میں پیچیدگی سی نظر آئی جو قاری کو افسانہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ افسانہ لکھنے کے آغاز سے قبل ہم کاپی پر مستقل ڈرائنگ کرتے رہے تھے کہیں کوئی آنکھ بنائی۔ کہیں ٹانگ کہیں پیالی۔ اور جانے اپنی دھن میں مست افسانہ سوچتے وقت کاپی کے صفحات پر کیا کیا بناتے رہے۔ ہم نے بہت سے اوراق پلٹ کر صاف صفحہ نکالا اور تاریخ ڈالی اور وقت لکھا (بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تبصرے کرنے وقت اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کس تاریخ اور کس وقت افسانہ لکھا گیا تو تبصرہ زیادہ جاندار ہوتا ہے) اور پھر لکھنا شروع کیا۔

" ہرے ہرے کھیت بڑے سبز معلوم دے رہے تھے۔ چڑیاں بڑا پیارا گانا گا رہی تھیں۔ نا ملکیشکر سے بھی اچھا اور ستھرا! آسمان پر بادل لہرا رہے تھے بغیر فل سٹاپ کے لہراتے چلے جا رہے تھے اور ایسے حسین موسم میں ایسے بیوٹی فل سیزن میں چارن افسری اپنی دھن میں مست کھیت کی منڈیر پر بیٹھی مٹی سے کھیل رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ اپنے کنگن بھی بجا رہی تھی۔ اتنے میں ایک بہت ہی "

" ٹرن۔ ٹرن...." ہم بہت ہی لکھنے پائے تھے کہ فون کی گھنٹی نے ہمارے تسلسل کو شیشے کی طرح توڑ کر رکھ دیا۔ آگے نہ پیچھے یہ آدھی رات کو پورے ساڑھے بارہ بجے کس کم بخت نے فون کیا ہے۔ ہم بادلِ نخواستہ اٹھے۔ فون ریسیو کیا۔ اُدھر سے ہماری بھی گویا ہوئیں۔

" کون نازو۔ دیکھو تمہاری منجھلی بھی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا ہے "

" کون چارن؟" ہاں... نہیں۔ ہاں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ دراصل میں سوئی ہوئی تھی۔ اس لئے ذرا.... ہاں تو مبارک ہو۔ بہت ہی مبارک ہو۔ جاتے بھاڑ میں۔ اللہ نے بھی بیٹا اسی وقت عطا فرمانا تھا۔ افسانے کا مزا کرکرا کر دیا۔ اتنے نازک مقام پر فون کیا کہ افسانے کی ساری تکنیک اور اس کی بلندی پستی میں مل گئی۔

" لعنت ہے" ہم بڑبڑائے۔ اور بجائے گھر والوں کو خوش خبری سنانے کے دوبارہ افسانہ لکھنے پر ڈٹ گئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ فون کی گھنٹی پر اہلِ خانہ جاگے نہیں ورنہ خواہ مخواہ اودھم مچتا۔

ہم نے اپنے خیالات کو پھر مجتمع کیا اور جو لکھنا شروع کیا تو واقعی لکھتے چلے گئے۔ خاص کر ہم کو اس لئے خوشی ہو رہی تھی کہ عطیہ نے تو صرف مضمون لکھا ہے ہم افسانہ لکھ رہے ہیں جس کو لوگ زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں اور کوئی بعید نہیں کہ فلم والوں کی اس پر نظر پڑ جائے اور وہ اس پر فلم ہی بنا لیں۔ اُف کیسے کیسے عظیم خیالات کے ساتھ ہم نے اپنا افسانہ پورا کیا۔ مت پوچھئے۔ خدا آپ کا بھلا کرے جب ہم نے دوبارہ افسانہ پڑھا تو دل بلیوں اچھلنے لگا لیکن افسانے کا عنوان ذرا ہم کو کھٹکا۔ ہم نے فوراً اس کو کاٹ کر نیا عنوان "ساحل سے پار بادلوں کے پاس" لکھ دیا۔

تقریباً تین بجے اس کارِ خیر سے نجات ملی اور پھر جو ہم سوئے تو اپنے افسانے کو خواب میں دیکھتے رہے جیسے وہ چھپ گیا ہے اور وہ ایک مقابلے میں اوّل آیا ہے جس کی بنا پر ہمیں گولڈ میڈل ملا ہے اور ایک بہت بڑے فلم ساز اس کے بارے میں ہم سے معاہدہ کرنے کے لئے ہمارے پیچھے پھر رہے ہیں وہ ہمارے افسانے کی فلم بنانا چاہتے ہیں اور ہم ہیں کہ ان کو لفٹ تک نہیں دے رہے لیکن

انھوں نے ہم سے افسانہ چھین لیا اور ہم "نہیں — نہیں" چلانے لگے علیہ اور شاتی ہمیں چلاتے دیکھ کر بیساختہ ہنسنے لگے —
"کیا نہیں نہیں چلا رہی ہو۔ کونسا خواب دیکھا ہے۔"
ہم آنکھیں ملتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ واقعی خواب دیکھا تھا۔

ہم نے اگلا سارا دن افسانہ "نیٹ" کرنے میں لگایا اور تیسرے دن رجسٹری کروانے کے لئے لفافے میں بند کر دیا۔ پہلے تو یہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کہاں بھیجا جائے۔ اصل میں ہم اس کو بڑے سے بڑے رسالے میں بھیجنے کے حق میں تھے۔ پہلے سوچا احمد ندیم قاسمی کا "فنون" ٹھیک رہے گا۔ نہیں طفیل احمد کا "نقوش" زیادہ مناسب ہے۔ نہیں یہ سب بکواس ہے — اہو۔ اگر "ادب لطیف" میں بھیج دیا جائے تو کیسا رہے گا۔ "ادب لطیف" نام تو اچھا ہے مگر وہ دیکھنے میں اتنا رعب دار نہیں لگتا۔ آخر کس میں بھیجا جائے۔ "عورت" "زیب النساء" — نہیں۔ یہ سب بیکار ہیں۔ آخر تھک ہار کر ہم نے ایک پرچہ بھیجنے کے لئے منتخب کر ہی لیا — لیکن۔ فوراً خیال آیا اس کا تو ایڈریس ہی ہمارے پاس نہیں — "چلو بھیا کی الماری کھوجتے ہیں جو پرچہ ملا اسی میں بھیج دیں گے۔" دو گھنٹے مسلسل بھیا کی الماری میں رسالے ڈھونڈنے میں لگے۔ پھر کہیں جا کر پانچ چھ رسالے کتابوں میں چھپے ہوئے ملے۔ ایک پرچہ واقعی پسند آیا لیکن اسی وقت انکشاف ہوا کہ وہ پرچہ تو آنا ہی بند ہو گیا ہے۔
خوب اچھی طرح گوند لگا کر لفافہ بند کیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور شخص ہی ہمارا شاہکار راستے میں کھول کر ہمارا نام کاٹ کر اپنا نام لکھ دے۔

نوکر کو ہدایت کی کہ ابھی اسی وقت اس کی رجسٹری کروا کے آؤ — ہم آپ کو یہ نہیں بتائیں گے کہ ہم نے افسانہ کس پرچے میں بھیجا۔ آخر بھیجا تو ہوگا ہی نا کسی میں۔ اب آپ کو نام بتانا کیا ضروری تھوڑا ہی ہے۔

اب صاحب! ہم نے افسانہ بھیج کر ڈاک کا جو انتظار کرنا شروع کیا تو مت پوچھئے اس انتظار کی کوفت — لیکن الشیاع

جوابی لفافہ ہونے کے باوجود افسانے کی کوئی خیریت معلوم نہ ہوئی۔ ہمارا ڈھیٹ پنا ملاحظہ کیجئے کہ ہم روزانہ امید لے کر بستر سے اٹھتے کہ شاید آج ہی کوئی اطلاع موصول ہو آخر تھک ہار کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ افسانہ قابل اشاعت ہوگا۔ اسی لئے انھوں نے اطلاع دینی ضروری نہیں سمجھی۔
جب مخصوص تاریخ کو پرچہ بازار میں آیا۔ تو ہم بھوکوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے۔ ہم کو سو فیصد امید تھی کہ افسانہ ضرور بضرور شائع ہو چکا ہوگا۔
لیکن ہائے ری قسمت۔ فہرست دیکھتے ہی ہم پر خیلاؤ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ ہم نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور رسالہ دوکان پر ہی پھینک کر گھر واپس آ گئے۔

اس بات کا ہم پر اتنا اثر ہوا کہ مستقل دو دن ہمارے حواس غائب رہے۔ اور جب حواس کچھ درست ہوتے تو ہم نے افسانے کے بارے میں ایڈیٹر کو لکھا اور ساتھ جوابی لفافہ بھی ارسال کر دیا اس کا جواب ہم کو پانچویں روز ملا۔ ہم نے بیتابی سے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔ ایڈیٹر نے لکھا تھا۔
"محترمہ! آپ کے افسانے کو اگر اوٹ پٹانگ کہا جائے تو کچھ مناسب بھی ہے۔ اسے ہم افسانہ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے خوامخواہ افسانہ رجسٹری کرنے میں اتنے پیسے ضائع کئے۔"
اس خط کو پڑھ کر ایک بار پھر ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ بھائی بہنوں نے ہاتھ میں خط دیکھ کر پوچھا "ارے" حالانکہ ہم نے اسے چھپانے کی بہتیری کوشش کی۔ "کس کا خط ہے؟" "ہم جانے کیا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئے۔ اس واقعہ کے بعد بھی دو تین بار ادیب بننے کا دورہ پڑا اور مت پوچھئے اس دورے میں کیا کیا جھیلنا پڑا۔ کیا کچھ برباد کرنا پڑا لیکن ہماری کوئی چیز بھی تو کہیں شائع نہیں ہوئی ادھر علیہ ظہور ہیں کہ ان کے دو مضامین منظر عام پر آ چکے ہیں ہم اکثر ہاتھوں کی کٹوری میں منہ دیئے سوچا کرتے ہیں کہ آخر افسانہ نگاروں میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو ان کی چیزیں شائع ہو جاتی ہیں؟ اے
بسا آرزو کہ خاک شدہ " (ختم شد)
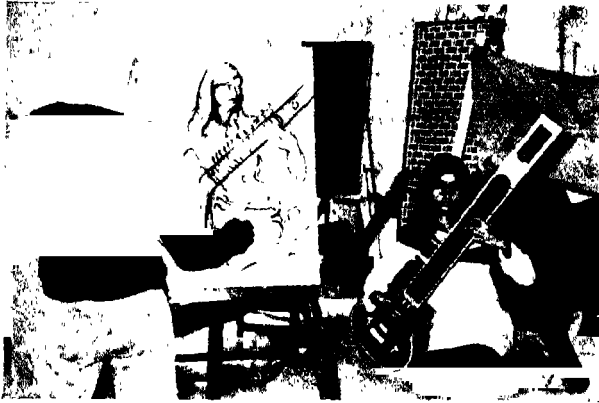
چوتھے سال کے ایک ہونہار طالب علم محمد منصور جن کی تصویر
الشجاع کے موجودہ شمارہ کے سر ورق کی زینت ہے ۔

کمرشل آرٹ کے شعبہ کے سربراہ زیدی
ہیں جنہیں آرٹ کی تعلیم دینے کا غالباً اپنے
ساتھیوں میں سب سے زیادہ تجربہ ہے۔ اس ادارہ کے
دوسرے مبلغ فن نقوی ہیں جو نقاشی (Sculpture)
کی تعلیم دیتے ہیں ۔

اس درسگاہ کو ابھی نہ حکومت سے کوئی
امداد ملی ہے اور نہ کسی نجی ادارے سے ،
اور بقول زیدی " یہ ایک معجزہ ہے کہ یہ سنٹرل
انسٹی ٹیوٹ اس قدر باقاعدگی سے چل رہا ہے " ۔

ہمارے خیال میں ان چار فن کاروں کی لگن
اور اس درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے والے
طلباء کا ذوق و شوق ہی اسے چلا رہا ہے ۔

مگر اس لگن اور ذوق و شوق کے باوجود پیسے کی کمی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے ۔ ہمارے ہاں کچھ اہل ثروت ، فنون کی قدر دانی اگر کرتے بھی ہیں تو صرف اس حد تک کہ چند تصاویر خرید لیں۔ یہ شعور ابھی تک بیدار نہیں ہوا ہے کہ فن کا صنعتی ترقی اور خوش حالی سے کس قدر گہرا تعلق ہے۔ صنعت و حرفت کے ہر شعبہ میں فن کارانہ صلاحیت کی ضرورت ہے ۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز کے ڈیزائن سے لے کر صابن کی ٹکیہ اور اس پر لپٹے ہوئے کاغذ کے ڈیزائن تک میں فنی تخلیق کا عنصر شامل ہے ۔ چھری کانٹوں کا ڈیزائن ہو یا جوتوں کا جب تک آرٹس اور ڈرافٹس کی درس گاہوں میں ایسے ذہنوں کی نشو و نما نہیں ہوگی جو خوبصورت اور کارآمد ڈیزائن تخلیق کر سکیں ، ہم اپنی صنعتی ترقی میں پیچھے رہیں گے ۔ لہذا ایسے اداروں کی سرپرستی جہاں ان تخلیقی صلاحیتوں کی تربیت ہوتی ہے ایک قسم کی سرمایہ کاری ہے جس کا منافع فوری نظر نہ آئے مگر چند در چند ہو کر وقت کے ساتھ ساتھ یقیناً پوری قوم کو ملتا رہے گا ۔

فن مصوری کے شعبہ کی استاد
لبنیٰ لطیف
ایک طالبہ کے ساتھ

Phone

ASH—SHUJA

A TIMES PRESS PUBLICATION

Mansfleid Street Sadar Karachi-3

ایک رسالہ — گھر کے ہر فرد کے لئے
ترقی و اصلاحات نمبر

صابنوں میں ایک سے ایک بہتر سلسلہ
Lily
SOAP
FLAKES
ZULFEQAR
INDUSTRIES LTD.
ملبوسات کے لئے مثالی
Beauty
ZULFEQAR
INDUSTRIES LTD.
SWAN
سوان
کپڑے سفید چمکدار اور جلد دھونے کیلئے
SOAP
جراثیم کش
جلد اور چمکیلا دھونے کے لئے
ہر مقصد کیلئے
موزوں ترین
صابن

دُرِ شہوار
آپ کے دانت سچے
موتیوں سے بھی بیش بہا
ہیں۔ ایک ذراسی جلا ان کے
لئے کافی نہیں۔ ان کو تو انتہائی
احتیاط اور حفاظت کی ضرورت ہے۔
تب ہی اُن کی خوبصورتی اور مضبوطی قائم
رہے گی: ان کی خاطر آپ ہمدرد منجن
استعمال کیجئے جسے سالہا سال کے تجربوں
کے بعد مکمل کیا گیا ہے۔ یہ دانتوں کی اچھی
طرح صفائی کرکے، اُن میں موتیوں کی سی
آب پیدا کرتا ہے۔ اُن کی صحت برقرار رکھتا
ہے۔ انگلی سے ہمدرد منجن ملنے کا ایک
فائدہ یہ ہے کہ اس طرح مسوڑھوں کی مالش
اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں
کے حُسن اور طاقت کے لئے
بڑی ضروری ہے۔
ہمدرد منجن دانتوں کو
صاف اور چمکدار رکھتا
ہے، ان کو مضبوط بناتا ہے
ہمدرد منجن
مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی — لاہور — ڈھاکہ — چٹاگانگ
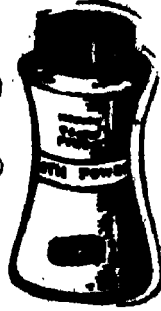
منظورشدہ محکمہ تعلیمات بموجب سرکلر نمبر ڈی۔ای/جی وی ۹۶۶۶-۴-۸۹ - مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

ترقی واصلاحات نمبر

۱۹۶۸ عیسوی

ترتیب

ایس ایم غیاث الدین ——— سلمان الارشد

زیر اهتمام

سلطان کلیم

طابع وناشر

ایس ایم شجاع الدین

قیمت ترقی واصلاحات نمبر ۷۵ پیسے ——— زرِ سالانہ -/۵

مشرقی پاکستان میں ہوائی ڈاک سے ——— قیمت ایک روپیہ

شعبہ نشرواشاعت

ٹائمز پریس

مینسفیلڈ اسٹریٹ صدر کراچی۔ فون ۵۵۲۱۲

ایس ایم شجاع الدین پرنٹر پبلشر نے ٹائمز پریس صدر کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الشجاع صدر کراچی سے شائع کیا

دس سالہ ترقی و اصلاحات نمبر
۱۹۶۸ء

جلد ۱۶ — شمارہ ۱۰، ۱۱

ترتیب

ترقی و اصلاحات

مکاتیب

تحقیق و تنقید

تہذیب و ثقافت

نظمیں و گیت

غزلیں

افسانے

فکر و خیال

عجیب و غریب

ناقابل فراموش

ڈرامے

سائنسی کہانی

حاصل مطالعہ

(۱۰۰۰)
ایک ہزار صفحات پر مشتمل

ایک ادبی دستاویز

کی تاریخی پیشکش

خودنوشت نمبر

- الشجاع کے خودنوشت نمبر میں برصغیر پاک و ہند کے عظیم فنکاروں کے خودنوشت حالات زندگی کے ساتھ
- ان کی پسندیدہ تخلیقات اور ان کی مختلف تصاویر شامل ہوں گی
- الشجاع کے خودنوشت نمبر کو آٹو بایوگرافکل ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوگی۔
- اردو ادب کی تاریخ میں الشجاع کے خودنوشت نمبر کو ایک مستند دستاویز کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا
- ادب کے طالب علموں کے لئے ایک گرانقدر تحفہ
- الشجاع کا خودنوشت نمبر ہر اعتبار سے ایک مثالی شمارہ ہوگا

تفصیلات آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے

قسم اعلیٰ مجلد سفید کاغذ
۲۰ روپے

قسم دوم معمولی کاغذ
۱۲ روپے

اشتہار

التماس

اِس پر مسرت موقع پر جب کہ ملت اسلامیہ پاکستان پورے جوش و خروش سے دس سالہ ترقیات و اصلاحات کا جشن منا رہی ہے۔ ہم بھی عقیدت کے چند پھول الشجاع کے "ترقی و اصلاحات نمبر" کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

کسی ایسے ملک کی ترقی کے لئے جو معاشی و اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہو دس سال کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم صدر ایوب کی حکومت کی دس سالہ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوتی ہے کہ اس مختصر مدت میں پاکستان نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ترقی یافتہ ممالک نے بھی پاکستان کی اس حیرت انگیز ترقی پر صدر ایوب کے تدبر، فراست اور اخلاص عمل کا فراخدلی سے اعتراف کیا ہے۔

صدر ایوب کی حکومت نے جہالت و افلاس کو ختم کرنے اور معاشی و غذائی مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ برمحل اور نتیجہ خیز اقدامات کئے اور یہ ان ہی کا نتیجہ ہے کہ آج پاکستان شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ اور کامرانیاں ہمارا مقدر ہو چکی ہیں۔ معاشی اور اقتصادی ترقی نے عوام میں خود اعتمادی و خود شناسی کا وہ جذبہ پیدا کر دیا ہے جو ترقی یافتہ قوموں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے

زندگی کے دوسرے شعبوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ صدر ایوب کی حکومت نے ادب کے ارتقاء کی اہمیت کو بھی محسوس کیا۔ صدر مملکت نے دانشوروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کر کے ایک ایسا صحت مند ماحول پیدا کیا جس کی وجہ سے تعمیری و تخلیقی کاموں میں تیز رفتاری پیدا ہو چکی ہے۔ گزشتہ دس سال میں جو ادبی ترقی ہوئی ہے وہ صدر مملکت کے اسی اندازِ فکر کی رہین منت ہے۔

گزشتہ دس سال میں پاکستان میں جو ترقیات و اصلاحات ہوئی ہیں محدود صفحات کی وجہ سے ان کا سیر حاصل جائزہ تو ممکن نہیں ہے پھر بھی ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں وہ تمام پہلو اجاگر ہو جائیں جن سے صدر ایوب کی حکومت کی کارکردگی کا احاطہ ہو سکے۔ ترقی و اصلاحات سے متعلق جو مضامین اس شمارے کی زینت ہیں ان میں ان امور کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ہمیں توقع ہے کہ افادیت کی بناء پر یہ مضامین آپ کو پسند آئیں گے۔

اِس نمبر کے سلسلہ میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

آپ کا مخلص

شجاع الدین

ناشر

قیادت

رحمان کیانی

اے اہلِ وطن کیا تم سے کہوں تعمیرِ وطن کیا ہوتی ہے
کس چیز کو گلشن کہتے ہیں تہذیبِ چمن کیا ہوتی ہے
وہ وحشت وہ صحرا یاد کرو پھر سبزہ و گل کی بات کرو
وہ پیاس نہ بھولو بادہ کشو جب بادہ و مُل کی بات کرو
جس پیڑ کے نیچے بیٹھے ہو طوفاں سے بچایا ہے کس نے
پروان چڑھایا ہے کس نے چھتنار بنایا ہے کس نے
کیا اِس نے کیا کیا اُس نے کیا ہر بات سے تم بھی واقف ہو
اس دیس میں تم بھی رہتے ہو حالات سے تم بھی واقف ہو

○

تم کو ہے قسم اے دیدہ ورو ان کھیتوں کی ہریالی کی
خوشوں سے لدی ہر ڈالی کی دانوں سے بھری ہر بالی کی
اس دانہ گندم کی جو خدا مٹی سے اُگا کر دیتا ہے
انسان مگر انسانوں کو جب ہاتھ بڑھا کر دیتا ہے
اس بھیک سے جھولی بھرنے میں انسان پہ کیا بنجاتی ہے
جی جان پہ کیا بن جاتی ہے ایمان پہ کیا بن جاتی ہے
اب تم ہی کہو اے دیدہ ورو یہ بات بھی کتنی سچی ہے
ایمان اسی کا اپنا ہے جس پیٹ میں روٹی اپنی ہے

اے اہلِ نظر کچھ تم بھی کہو کہنے کو بہت سی باتیں ہیں
ان بیتے دنوں سے وابستہ ذہنوں میں بہت سی یادیں ہیں
جب سات سمندر نانگھ کے ہم بازار کو جایا کرتے تھے
اربابِ وطن جب اپنا کفن لندن سے منگایا کرتے تھے
اب اپنے ملوں کے بارے میں اربابِ ہنر کیا کہتے ہیں
جو دل کی طرح ہر بستی میں دن رات دھڑکتے رہتے ہیں
اے نکتہ ورو جس قوم پہ بھی تقدیر کرم فرماتی ہے
انسان کی محنت کوشی کو تنظیمِ عمل مل جاتی ہے

○

اس دیس کی قسمت اچھی تھی جب دشمن چڑھ کر آیا تھا
جب بادل گھر کر اُٹھے تھے جب دریا بڑھ کر آیا تھا
اور اہلِ وطن نے مل جل کر طوفان کے رُخ کو موڑ دیا
پھر امن کے جھنڈے گاڑ دیئے پھر تیغِ ستم کو توڑ دیا
کہنے کو بہت آسان سہی یہ کرکے دکھانا مشکل ہے
ہم شیر ہیں لیکن اہلِ وطن شیروں کو لڑانا مشکل ہے
ایسے میں قیادت جو بھی کرے انسان ہے لیکن عام نہیں
اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں"

○

محمد احمد سبزواری ایم-اے

پاکستان کا دہ سالہ معاشی جائزہ

صدر ایوب کی ولولہ انگیز قیادت میں جس تیزی سے معاشی ترقی ہوئی ہے اسکی نظیر نہیں ملتی!

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء کا سال بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سال پاکستان اور بھارت نے غیر ملکی اقتدار سے آزادی حاصل کی۔ اگرچہ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آیا۔ مگر جون ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے مسئلے نے ایک منظم منصوبے کی آخری شکل اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اس تجویز کو ۹ جون کو آل انڈیا مسلم لیگ نے اور ۱۴ اور ۱۵ جون کو آل انڈیا کانگریس نے منظور کر لیا تھا اور بعد کے تین مہینے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے ابتدائی مراحل میں صرف ہوئے۔

۱۹۴۷ء سے کئی سال پہلے سے پاکستان کے قیام کا سوال بحث و مباحثہ کا ایک اہم موضوع بنا ہوا تھا۔ اکثر ملکی اور غیر ملکی سیاسی اور معاشی مصنفین، صحافیوں اور کالم نویسوں نے اس پر اپنے اپنے خیالات کا بڑی تفصیل سے اظہار کیا تھا۔ انگلستان اور ہندوستان میں اس موضوع پر متعدد کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں، ان میں زیادہ تر جس ایک پہلو پر بڑا زور دیا گیا تھا وہ تقریباً ایک ہی تھا۔ یعنی کیا پاکستان کی نئی مملکت ایک آزاد ملک کی حیثیت سے برقرار رہ سکتی ہے۔ اور کیا اس مجوزہ ملک کے معاشی وسائل اس قدر کافی ہوں گے کہ وہ اس کو اپنے پیروں پر کھڑا کر سکیں۔ اکثریت کا اس پر اتفاق تھا کہ یہ بات ناممکن ہے۔ اور ان کے دلائل کچھ اس قدر مدلل اور مضبوط معلوم ہوتے تھے کہ پاکستان کے حامی بھی کچھ دیر کے لئے شش و پنج میں پڑ جاتے تھے۔

اس زمانے میں سرکاری اور نجی محفلوں میں بس یہی ایک موضوع ہوا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اوائل ۱۹۴۷ء میں

۱۹۵۸ء کا انقلاب دراصل سیاسی انقلاب سے زیادہ معاشی انقلاب تھا جس نے

زراعت، صنعت و حرفت، بنکاری، مالیات

غرضکہ زندگی کے سارے شعبوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔

مجھے ایک انٹرویو میں جانا پڑا۔ انٹرویو بورڈ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ایک نیم کانگریسی مسلمان ممبر نے سوال کیا کہ جس علاقہ میں پاکستان قائم کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہاں کوئلہ اور لوہا نہیں ہے، لہٰذا پاکستان اپنی ریلیں اور کارخانے کیسے چلائے گا۔ میں نے جواب دیا کہ کچھ متبادل طریقے سوچے جائیں گے انہوں نے کہا کہ اس میں کچھ وقت لگے گا، اس وقفہ میں کیا ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ عبوری دور میں کوئلہ اور لوہا باہر سے درآمد کیا جائے گا۔ فوراً سوال ہوا کہ درآمد کے لئے رقم کہاں سے آئے گی۔ عرض کیا کہ یہ رقم گیہوں (اس زمانے میں پنجاب کو گندم کا گودام کہا جاتا تھا اور برصغیر کی زیادہ تر ضرورت اسی علاقہ سے پوری ہوتی تھی) کپاس اور پٹ سن کی برآمد سے حاصل کی جائے گی۔ دوسری جانب سے کہا گیا کہ کیا اس کا اثر دوسری اہم ضروریات پر نہیں پڑے گا، اور مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ یقیناً اس کا اثر دوسری اہم اور ضروری درآمدات پر پڑے گا۔ اتفاق دیکھئے کہ جب پاکستان بنا تو یہی سب کچھ ہوا۔ اول تو پنجاب کی تقسیم ہی کچھ اس طرح عمل میں آئی کہ گندم کی یہ سرزمین ہی دو حصوں میں بٹ گئی۔ پھر زرعی آبادی کی نقل مکانی سے زراعت کافی متاثر ہوئی۔ ادھر بھارت نے اس نوزائیدہ مملکت کی بنیادیں ہلا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مثلاً سب سے پہلے تو اسے وہ نقصان کا ... پاکستان کو ... طور پر ملنا تھی اور جس سے حکومت کے روزمرہ کے اخراجات پورے کئے جاتے۔ واضح رہنا چاہیئے کہ اس کا ایک معقول حصہ اب تک بھارت پر واجب الادا ہے۔ ادھر آبادی کی عام نقل مکانی سے زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت، بنک کاری، ذرائع آمد و رفت، تجارت غرضیکہ سب ہی شعبوں کو نقصان پہنچا۔ اس کی تلافی یوں نہ ہو سکی کہ جو آبادی ہندوستان سے آئی تھی وہ زیادہ تر لٹے لٹائے آئی اور ان کو یہاں قدم جمانے کے لئے وقت اور پیسہ درکار تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان نے اپنے آغاز ہی سے اپنی بقاء کے لئے جدوجہد شروع کر دی، مگر ابتدا میں یہ رفتار بہت سست رہی

> "ہم اپنے عوام کا معیار زندگی
> بلند کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے
> یہاں سے غربت، بیماری اور
> جہالت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ
> ہو جائے۔" (صدر ایوب)

معاشی ترقی کے لئے سیاسی سکون کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے اس دور میں وہ ناپید رہا۔ پاکستان کی معاشی ترقی کے متعلق قائداعظم کا نظریہ بہت صاف اور واضح تھا۔ آپ نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنے ایک پیغام میں اس کی وضاحت یوں فرمائی تھی۔

> "قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں۔ آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ اب یہ کام آپ کا ہے کہ آپ اسے تعمیر کریں اور جتنی جلد ممکن ہو تعمیر کریں۔ بس آگے بڑھئے۔ خدا آپ کو ہمت دے اور کامیابی عطا فرمائے"

صدر ایوب نے ۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو تاربیلا ڈیم کا افتتاح کیا
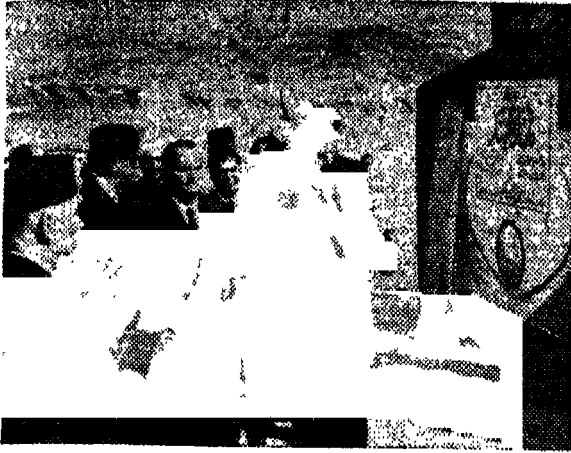
[illegible] ایک خاص کے اس کی قائد اعظم ملت [illegible] نئی مملکت کی تعمیر کا کام نئی نسل کے سپرد کر گئے۔ مرحوم لیاقت علی خان کی شہادت تک بھی کچھ کام ہوا مگر اس کے بعد ۱۹۵۸ء تک متعدد حکومتیں برسر اقتدار آئیں۔ ہر ایک نے اقتصادی مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی مگر بعض کی مدت تو اس قدر قلیل تھی کہ قبل اس کے کہ وہ معاملات کو سمجھ سکیں وہ اقتدار ہی سے محروم ہو جاتی تھیں۔ وہ حکومتیں جنہوں نے کچھ زیادہ عرصہ کام کیا ان کے یہاں بھی استقلال اور ہدایات جاری کرنے کے جذبے کا فقدان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اقتصادی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو سکی۔ ۱۹۵۸ء کا انقلاب در اصل سیاسی انقلاب سے زیادہ معاشی انقلاب تھا جس نے زراعت، صنعت و حرفت، بنکاری، مالیات، غرضیکہ زندگی کے سارے شعبوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ولولہ انگیز قیادت میں جس تیزی سے معاشی ترقی ہوئی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ترقی پذیر ملکوں میں پاکستان کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ گزشتہ عشرہ کو ہم بجا طور پر معاشی ترقی کا ایک سنہری دور کہہ سکتے ہیں۔ زراعت میں نہ صرف خود کفالت کا دور قریب آ گیا ہے۔ صنعتی شعبے میں پیداوار بڑھ رہی ہے۔ صنعتی اور زرعی پالیسیوں کو مربوط کر دیا گیا ہے اور ان کی بدولت ترقی کی نئی نئی راہیں کھلتی جا رہی ہیں۔

زراعت میں خود کفالت، صنعتی شعبے میں زائد پیداوار، عوام کو ضروریات زندگی فراہم ہو سکیں۔ آبادی پر قابو پانے کی کوشش، موجودہ حکومت کی معاشی پالیسی کا لب لباب ہے۔ صدر ایوب نے اس سال اپنی پہلی ماہانہ تقریر میں صاف صاف الفاظ میں واضح کیا تھا کہ:-

"ہم اپنے عوام کا معیار زندگی بلند کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمارے یہاں سے غربت، بیماری اور جہالت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔"

> دس سال میں ہماری قومی آمدنی دوگنی ہو گی۔ اندازہ ہے کہ اس سال ہماری قومی آمدنی کا فی کس اوسط ۶۰۰ روپے کے قریب رہے گا۔ یہ اس صورت میں ہوا جبکہ ہماری آبادی بھی برابر بڑھ رہی ہے

مندرجہ بالا مقصد گزشتہ دس سال میں کس قدر حاصل ہوا۔ اس کا اندازہ ذیل کے چند اہم اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔

مرکزی حکومت کا بجٹ (روپوں میں)

عام بجٹ	آمدنی	خرچ	بچت
۱۹۴۸-۴۹ء	۶۶ کروڑ ۷۶ لاکھ	۶۴ کروڑ ۷۴ لاکھ	۲ کروڑ ۲ لاکھ
۱۹۵۸-۵۹ء	۱۹۵ کروڑ ۸۰ لاکھ	۱۹۵ کروڑ ۴۶ لاکھ	۳۴ لاکھ
۱۹۶۸-۶۹ء	۵۷۱ کروڑ ۲۲ لاکھ	۳۳۴ کروڑ ۱۰ لاکھ	۲۳۵ کروڑ ۳ لاکھ

ترقی کے صفحات نمبر

ترقیاتی بجٹ

	آمدنی	خرچ
۴۹-۱۹۴۸ء	۷۹ کروڑ ۵۸ لاکھ	۹۴ کروڑ ۸۵ لاکھ
۵۹-۱۹۵۸ء	۱۶۲ کروڑ ۴۶ لاکھ	۱۶۲ کروڑ ۴۶ لاکھ
۶۹-۱۹۶۸ء	۵۴۴ کروڑ ۸۴ لاکھ	۵۴۶ کروڑ ۸۴ لاکھ

گویا گزشتہ دس سال میں عام بجٹ میں حکومت کی آمدنی تین گنی بڑھ گئی۔ ترقیاتی بجٹ میں کوئی چار گنا اضافہ ہوا۔
۱۹۴۹ء میں ہماری آبادی تقریباً ۷½ کروڑ تھی جو انقلاب

اضافہ ہوا۔ یا ہماری قومی آمدنی ۳½ روپے سالانہ کے حساب سے بڑھتی رہی۔ اندازہ یہ ہے کہ اس سال ہماری قومی آمدنی کا فی کس اوسط ۴۰۰ روپے کے قریب رہے گا۔ یعنی گزشتہ دس سال میں ہماری قومی آمدنی دوگنی ہوگئی یا ہر سال ۳۰ روپے کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہ اضافہ ایسے وقت میں ہوا جب کہ ہماری آبادی بھی برابر بڑھ رہی ہے۔

چند اہم زرعی پیداواروں کے متقابل اعداد سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جائے گی کہ ہماری زرعی پیداوار کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

صدر ایوب منگلا بند کی یادگاری تختی کی نقاب کشائی فرما رہے ہیں۔

کے سال میں دس کروڑ کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت ہماری آبادی کا اندازہ بارہ کروڑ کے قریب ہے۔ یعنی ابتدائی دس سال میں ہماری آبادی میں ۲½ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ جب کہ دوسرے دس سال میں آبادی صرف ۲ کروڑ کے قریب بڑھی۔ یعنی آبادی میں اضافے کی رفتار میں قدرے کمی ہو گئی۔ ۵۰-۱۹۴۹ء میں پاکستان کے ہر باشندے کی قومی آمدنی کا اوسط ۳۵۳ روپے تھا — اور ۵۹-۱۹۵۸ء تک یعنی دس سال میں اس میں صرف ۳۷ روپے کا اضافہ ہوا۔

پیداوار	۴۹-۱۹۴۸ء	۵۹-۱۹۵۸ء	۶۸-۱۹۶۷ء
چاول	۸۴ لاکھ ٹن	۹۷ لاکھ ٹن	۲۷۹ لاکھ ٹن
گیہوں	۴۰ لاکھ ٹن	۳۹ لاکھ ٹن	۶۲½ لاکھ ٹن
نیشکر	ایک کروڑ ۱۲ لاکھ ٹن	ایک کروڑ ۱۱ لاکھ ٹن	۲ کروڑ [illegible] لاکھ ٹن
پٹ سن	۱۰ لاکھ ٹن	۱۰½ لاکھ ٹن	۱۲½ لاکھ ٹن
کپاس	ایک لاکھ ۴۶ ہزار ٹن	۲ لاکھ ۸ ہزار ٹن	۵ لاکھ ٹن
چائے	۱۵ ہزار ٹن	۲۴ ہزار ٹن	۲۹ ہزار ٹن
تمباکو	۴۳ ہزار ٹن	۹۹ ہزار ٹن	ایک لاکھ [illegible]

ان اعداد کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دس سال میں چاول اور گیہوں کی پیداوار میں ترقی معکوس نظر آتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ملکی غذائی ضروریات کے واسطے بھاری مقدار میں غلہ باہر سے درآمد کرنا پڑتا رہا۔ جس کا اثر ہماری دوسری درآمدات پر پڑتا رہا۔ کیونکہ ہمارے مبادلات خارجہ ہمیشہ محدود رہے ہیں۔ مگر دوسرے دس سال میں پیداوار میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی۔

صنعتی میدان میں ترقی کی رفتار کافی تیز اور بعض شعبوں میں حیرت انگیز رہی۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ جس وقت پاکستان بنا تھا

صدر ایوب مشینوں کے ذریعہ فصل کاٹنے کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ ایوب پارک راولپنڈی۔ مئی ۱۹۶۸ء

اس وقت ہمارے یہاں صنعت و حرفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور بعض شعبوں میں تو کسی کارخانے کا وجود ہی نہ تھا۔ مثلاً پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہ تھا۔ حتیٰ کہ برآمد کے لئے ان کی گانٹھیں بنانے تک کا معقول انتظام موجود نہ تھا۔ اور کئی سال تک معمولی گھاس کے گٹھوں کی شکل میں یہ سنہری ریشہ برآمد ہوتا رہا۔ آج اس شعبے میں نہ صرف ہم اپنی ضروریات پوری کر رہے ہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملکوں کو پٹ سن کی مصنوعات برآمد کی جا رہی ہیں۔ یہی شعبہ

صورت حال دوسری صنعتوں میں [illegible] رہی۔ ذیل کے اعداد سے ملک کی چند اہم صنعتوں کی ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پیداوار	۱۹۴۸-۴۹ء	۱۹۵۸-۵۹ء	۱۹۶۷-۶۸ء
کارخانوں میں تیار کردہ سوتی کپڑا (گز)	۹ کروڑ	۶۰ کروڑ	۷۸ کروڑ
پٹ سن کی مصنوعات (ٹن)	صفر	۲ لاکھ	۴ لاکھ ۷۸ ہزار
گتہ (ٹن)	صفر	۱۲ ہزار	۲۳ ہزار
کاغذ بشمول اخباری کاغذ (ٹن)	صفر	۲۶ ہزار	۷۷ ہزار
سگرٹ (عدد)	۳ کروڑ	۷۸ کروڑ	۳۳۸ کروڑ
دیاسلائی (ڈبیاں گروس میں)	بہت کم	۸۰ لاکھ	۱۰۵ لاکھ
بناسپتی گھی (ٹن)	۲½ ہزار	۲۲ ہزار	۹۴ ہزار
شکر (ٹن)	۳۵ ہزار	ایک لاکھ ۹۰ ہزار	۴ لاکھ ۱۹ ہزار
سیمنٹ (ٹن)	۴ لاکھ	۱۱ لاکھ	۲۰½ لاکھ
کیمیاوی کھاد (ٹن)	صفر	۳۷ ہزار	۸۰۱ ہزار

معاشی اور صنعتی ترقی کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے۔ مثلاً ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں ۳۸ جدولی بینک تھے اور ان کی

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

تعمیر و تعبیر

ممتاز حسن

زرعی اصلاحات

زرعی اصلاحات سے ملک کی اقتصادی ترقی، معاشی منصوبہ بندی اور سیاسی توازن کو تقویت ہوئی ہے

زراعت نوعِ انسان کا بہت پرانا پیشہ ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت خوراک، تجارت اور صنعت کے لئے مسلّم ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں جہاں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے خوراک کا مسئلہ بعض اوقات ایک نازک صورت اختیار کر لیتا ہے اور ملکی حکومت کے لئے لازم ہوتا ہے کہ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے خاص طور پر کوشش کرے۔ پاکستان میں اس قسم کے حالات ۱۹۵۲ء میں رونما ہوئے تھے۔ اس وقت ملک میں گندم بطور امداد باہر سے منگوائی گئی اور ملک میں زراعتی پیداوار بڑھانے کی اہمیت اور بھی نمایاں ہو گئی۔

زراعتی پیداوار کے اضافے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ رہی ہے کہ کاشتکاروں کے پاس اکثر زمین بھی کم ہوتی اور وہ بھی ان کی ملکیت نہیں ہوتی اور زمیندار طبقے کے پاس زمین اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ نہ تو وہ اس کو خود کاشت کر سکتے ہیں اور نہ بڑے پیمانے پر اس کی کاشت کا خاطر خواہ انتظام۔

مزید برآں زمینداروں کا کاشتکاروں کا تعلق اکثر غیر منصفانہ

لا ہے اور زمیندار جو اپنی زمینوں کے لئے کچھ بھی محنت نہیں کرتے اکثر
ے اس کی کمائی کا اتنا بڑا حصہ اپنے لئے وصول کر لیتے ہیں کہ بیچارے
کاشتکار کو کھیتی باڑی میں دلچسپی نہیں رہتی اور زرعی زمین اور
آمدنی کی اس غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے چھوٹے کاشتکار زراعت کے
پیشے سے بددل اور بڑے زمیندار بے پروا نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ زمینداری اور جاگیرداری کا نظام زمینداروں
اور جاگیرداروں کو ملک کی سیاست پر مسلط کر دیتا ہے یہی وجہ ہے
کہ زمینداری اور جاگیرداری صدیوں سے ایک رجعت پسند عنصر بنکر
سماجی اور اقتصادی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوئی ہے اور

کر دیا گیا تھا۔ مگر اقتصادی نقطۂ نگاہ سے صوبائی حکومت کا یہ اقدام
کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ مغربی پاکستان میں بھی کچھ اصلاحات
کی گئیں مگر ان کا مقصد زمینداروں کے طبقاتی مفاد کا تحفظ کرنا تھا
نہ کہ مزارعین کے حقوق کا۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب میں جو معمولی قسم کی زرعی
اصلاحات نافذ کی گئی تھیں انھیں ۱۹۵۳ء میں ختم کر دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں انقلاب کے بعد صدر ایوب نے سب سے
پہلے جس کام کا بیڑا اٹھایا وہ زرعی اصلاحات تھیں۔ ان اصلاحات
کی اہمیت ان پر اس سے بہت پہلے سے واضح تھی۔ انقلاب کے
فوراً ہی بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو انھوں نے ایک زرعی اصلاحات

انقلاب فرانس سے لے کر آج تک جتنے انقلاب آئے ہیں ان میں
سے اکثر کے سامنے زمینداری اور جاگیرداری کو ختم کرنے کا مسئلہ رہا ہے

برصغیر ہند و پاکستان میں زرعی اصلاحات کی ضرورت
آزادی سے قبل بھی زیر بحث آتی رہی ہے آج سے تقریباً چالیس سال
پہلے ایک زرعی کمیشن نے ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا
کہ اس مسئلے پر آزادی کے بعد زیادہ توجہ دی گئی۔ جہاں تک پاکستان
کا تعلق ہے ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان میں جاگیرداری نظام کو ختم

کا کمیشن مقرر کیا جس نے تین مہینے کے اندر اپنی رپورٹ پیش کی
اس رپورٹ کی سفارشات پر ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو انقلابی حکومت
نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

یہ اصلاحات مغربی پاکستان کے لئے خصوصاً اہم تھیں
صورت حال یہ تھی کہ پنجاب کے علاقے میں پچاس فیصد زمین سے
کچھ زیادہ سرحد کے علاقے میں پچاس فیصد سے کچھ کم اور سندھ کے علاقے
میں اسی فیصد سے کچھ اوپر زمین چند ہزار زمینداروں کے قبضے میں

تھی جو یہی زمینوں سے غیر حاضر رہتے تھے مغربی پاکستان کے صوبے میں مجموعی طور پر ۱۰ء۔ فیصد زمین داروں کے قبضے ساری زمین کا ۱۵ فیصد رقبہ تھا۔ دوسری طرف پینسٹھ فیصد چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی تھے جن کے پاس مجموعی طور پر تقریباً اتنی ہی زمین پانچ ایکڑ سے بھی کم فی کس کے حساب سے تھی۔ صوبے کے کل جغرافیائی رقبے میں سے جو انیس کروڑ چھیاسی لاکھ ایک سو ہے صرف باسٹھ لاکھ ایکڑ زمین قابل کاشت سمجھی گئی تھی۔ اس میں تقریباً ۲۳ لاکھ ایکڑ زمین جو قابل کاشت تھی وہ شامل نہیں کی گئی تھی۔

صدر مملکت نے زرعی اصلاحات کے کمیشن کو جو ہدایات دیں ان کا مقصد کسی کو سزا دینا نہیں تھا بلکہ معاشرتی عدم توازن کو دُور کرنا تھا۔ صدر یہ چاہتے تھے کہ ایک طرف تو لوگوں کو ترقی کے یکساں موقعے ملیں اور دوسری طرف زراعتی پیداوار بڑھانے معیار زندگی باند کرنے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کی جائے۔ حکومت نے زرعی کمیشن کی سفارشات پر جو فیصلے کئے ان میں سے زیادہ اہم یہ ہیں

۱۔ کسی شخص کو پانچسو ایکڑ سے زیادہ نہری اور ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ بارانی زمین کی ملکیت کی اجازت نہ دی جائے۔ اور جو زمین اس طرح زمینداروں کے قبضے سے واگزار ہو اسے مزارعین اور دوسرے مستحقین میں تقسیم کیا جائے۔

۲۔ زمینداروں سے جو زمین اصلاحات کے نتیجے کے طور پر حاصل ہو اس کے لئے انھیں چار فیصد کے تمسکات کی صورت میں معاوضہ دیا جائے۔ یہ تمسکات پچیس سال کی مدت میں ادا ہوں گے۔

۳۔ جو مزارعین واگزار شدہ زمین پر پہلے سے کاشت کر رہے ہوں انھیں موقعہ دیا جائے کہ وہ اس زمین کو ۲۵ سال کی مدت میں بالاقساط خرید لیں۔

۴۔ گنجان آبادی کے رقبوں میں مزارعین کو خاص مراعات دی جائیں۔

۵۔ سارے مزارعین کے ان حقوق کا جو اراضی سے متعلق ہیں تحفظ کیا جائے۔

۶۔ اگر مزارعین کو قانونی طور پر زمین سے بے دخل کیا جائے تو معاوضہ دیا جائے۔

۷۔ لگان میں اضافہ، بیگار اور مختلف قسم کے نذرانوں پر پابندی لگا دی جائے۔

۸۔ ایک خاص معیار سے کم کی ملکیت اراضی ممنوع ہو اور منتشر زمینوں کو اشتمال کے ذریعہ یکجا کیا جائے۔

ان اصلاحات میں صدر ایوب کے قول کے مطابق سب سے اہم اصلاح زمین کی ذاتی ملکیت کو مقابلتہً کم زمین پر محدود کر دینا تھا اس کا اثر ان تقریباً چھ ہزار زمینداروں پر ہوا۔ جو مغربی پاکستان میں زمین کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے ہاتھوں میں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین ان سے واپس لی گئی اس سے زمین کی تقسیم زیادہ منصفانہ ہوگئی۔ اور کاشتکاروں کے لئے اپنی زمین پر زیادہ توجہ دینا اور اس پر زیادہ روپیہ لگانا ممکن ہو گیا۔

اسی طرح مشرقی پاکستان کی سابقہ زرعی اصلاحات میں ترمیم کی گئی۔ خاص یعنی خود کاشت اراضی کی حد ۳۳ ایکڑ سے بڑھا کر ۱۲۰ ایکڑ کر دی گئی۔ مشرقی پاکستان میں زمین کی غیر معمولی زرخیزی کی وجہ سے ۱۲۰ ایکڑ رقبے سے کافی پیداوار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں کم سے کم ملکیت تین ایکڑ مقرر کی گئی۔ اور عام ملکیت جو ایک معقول آمدنی کا موجب بن سکے۔ آٹھ ایکڑ مقرر ہوئی۔

ان اصلاحات کے نتائج دور رس ثابت ہوئے ہیں۔ زمینداروں کی سماجی اور سیاسی قوت میں کمی ہو گئی ہے کاشتکاروں کو زمین کی ملکیت حاصل ہونے کے بعد اپنی زمین کو ترقی دینے میں پہلے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور وہ غلہ اگانے اور زرعی پیداوار بڑھانے میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اس سے پاکستان کو غذا کی حیثیت سے خودکفیل بنانے کے منصوبے میں بہت بڑی مدد ملے گی۔

صدر ایوب کے الفاظ میں انھیں ایک نئی مضبوط جماعت کو پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی ہے یہ جماعت اگرچہ فی الحال منظم نہیں ہے لیکن اسے اپنے مفاد کا پورا احساس ہے آج پاکستان میں لاکھوں مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو زمین کی کاشت میں مصروف ہیں اور جنہیں زرعی اصلاحات سے مستقل اور نمایاں فائدہ حاصل ہوا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زرعی اصلاحات نہایت ضروری تھیں اور ان کی وجہ سے ملک کی اقتصادی ترقی اور معاشی منصوبہ بندی اور سیاسی توازن کو تقویت ہوئی ہے۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

معاشی جائزہ - صفحہ ۱۴ کا بقیہ

شاخوں کی تعداد ۱۹۵ تھی ان میں سے صرف چار بنک پاکستانی تھے اور جن کی صرف ۲۳ شاخیں تھیں۔ اب جدولی بنکوں کی تعداد ۳۶ ہے۔ مگر ان میں سے ۱۶ بنک پاکستانی ہیں اور ان کی دو ہزار سے زائد شاخیں ملک میں موجود ہیں ۲۰ غیر ملکی بنکوں کی صرف ۷۵ شاخیں کام کر رہی ہیں۔

۱۹۴۸-۴۹ء میں پاکستان کی درآمد اور برآمد کی مالیت علی الترتیب ایک ارب ۹۴ کروڑ اور ایک ارب ۷۸ کروڑ روپے تھی۔ ۱۹۵۸-۵۹ء میں اس کی مالیت علی الترتیب ایک ارب ۵۸ کروڑ اور ایک ارب ۳۲ کروڑ روپے رہی جب کہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ان کی مالیت ۵ ارب ۷۶ کروڑ اور ۲ ارب ۹۱ کروڑ روپے رہی۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں پاکستان میں رجسٹرڈ موٹروں کی تعداد صرف ۲۵ ہزار تھی جب کہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ان کی تعداد تین لاکھ ۲۰ ہزار ہو گئی ہے۔ ۱۹۴۸-۴۹ء میں جن لوگوں نے اندرون ملک ہوائی جہازوں سے سفر کیا ان کی تعداد برائے نام تھی۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں مسافروں نے جن فضائی فاصلے کی مسافت طے کی اس کی طوالت ۷۰ کروڑ کلومیٹر سے زائد تھی۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں ریلوں سے سفر کرنے والے افراد کی تعداد ۲۰ کروڑ مسافروں سے زائد رہی۔

منصوبہ بندی کا کام تیزی سے جاری ہے۔ پہلا پنج سالہ منصوبہ جو ۱۹۵۵-۶۰ء کی مدت کے لئے تھا اس کی مالیت دس ارب روپے سے کچھ زائد تھی۔ دوسرے منصوبے (۱۹۶۰-۶۵ء) کی مالیت ۲۳ ارب روپے تھی۔ تیسرے منصوبے (۱۹۶۵-۷۰ء) کی مالیت ۵۲ ارب روپے ہے۔

اگر ترقی کی یہ رفتار قائم رہی تو پاکستان بہت جلد ترقی پذیر ملکوں میں سے آگے نکل جائے گا۔ لیکن یہ راستہ کافی دشوار ہے اور اس کے لئے ہم کو نہ صرف محنت اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔ بلکہ اپنے تمام محدود وسائل کو حرکت میں لا کر انہیں دانشمندانہ طور پر استعمال کرنا ہوگا۔ اور ہماری ان آرزوؤں اور امنگوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چوتھا پنجسالہ منصوبہ (۱۹۷۰-۷۵ء) زیر ترتیب ہے اس کو کامیاب بنانے کے لئے ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق جدوجہد کرنا ہوگی۔ جدوجہد جس قدر تیز ہوگی اسی قدر ہم کو آگے بڑھنے میں آسانی ہوگی اور کامیابی بہت جلد ہمارے قدم چومے گی۔

جوابِ طلب امور

کے لئے جوابی کارڈ، لفافہ یا ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ تاکہ آپکے مکتوب کا جواب دیا جا سکے۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جاتے ہیں جب کہ ان کے ہمراہ لفافہ ہو۔

(منیجر)

اجمالی جائزہ

صابر جعفری

ترقی اور اصلاحات کے دس سال

زراعت ـــ صنعت ـــ مواصلات

قوموں کی زندگی میں دس بیس سال کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو فرد کی زندگی میں دس بیس منٹ کی۔ قومی سطح کی کارگزاریوں کو ناپنے کے پیمانے صدیوں کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ مہینوں یا برسوں کے حساب سے ان کی جانچ پڑتال نہیں کی جاتی۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ منزل کتنی دور ہے یہ علم ہونا ضروری ہے کہ کس رفتار سے سفر ہوتا رہا ہے اور کتنا فاصلہ طے کیا جا چکا ہے اور پچھلے دس برس میں الحمد للہ ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن چونکہ ہمیں ابھی اور بھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس عرصہ میں ہماری ترقی کی رفتار کیا رہی ہے، اور ہمارے جملہ وسائل اور ساری صلاحیتیں بروئے کار آنے کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے ہیں انہیں اطمینان بخش کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔؟

پاکستان کو عالم وجود میں آئے ہوئے اکیس سال ہوئے ہیں جن میں سے پہلے گیارہ سال (ابتدائی چند سالوں کو چھوڑ کر) افراتفری اور سیاسی عدم استحکام کی نذر ہو گئے۔ بعد کے دس سالوں میں سیاسی استحکام ہوا تو دوسرے شعبوں میں بھی ترقی کی صورتیں پیدا ہوئیں۔

انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد ان دس سالوں میں یوں تو زندگی کے ہر شعبہ کو فروغ حاصل ہوا ہے لیکن ان صفحات میں ہم چند شعبوں میں ہونے والی ترقی کا مختصر جائزہ لینے پر اکتفا کریں گے۔ زراعت۔ صنعت اور مواصلات و ذرائع نقل و حمل قومی زندگی کے اہم ترین شعبے ہیں آیئے دیکھیں کہ پچھلے دس سال میں ہم نے ان شعبوں میں کیا کچھ حاصل کیا ہے۔

زراعت

دوسری جنگ عظیم سے قبل پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک نہ صرف زرعی پیداوار میں خود کفیل تھے بلکہ اجناس خوردنی کی معتدبہ مقدار برآمد بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جو نت نئی ایجادات کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی ترقی یافتہ ممالک کو کم سے کم وقت میں کم سے کم وسائل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا گر سکھا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ممالک نہ صرف اپنی غذائی ضروریات میں خود کفیل ہو گئے بلکہ اجناس خوردنی برآمد بھی کرنے لگے اس کے برعکس ترقی پذیر ممالک جو ایک طرف تو جدید ایجادات سے محروم تھے اور دوسری طرف ان کی اپنی سیل بے کراں کی طرح بڑھتی ہوئی آبادی ان کے غذائی ذخائر کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی خود اپنی غذائی ضرورت پوری کرنے کے اہل نہیں تھے اب ان کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ابتدائی دس سال:۔ پاکستان بھی ایک پس ماندہ ملک تھا لہٰذا اس کا حشر بھی دوسرے پسماندہ ملکوں سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔ بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہونے کے باوجود اور زرعی اعتبار سے ایک خود کفیل ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر نمودار ہونے کے باوصف پاکستان بھی اپنی غذائی ضروریات کے لئے دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ گیا تھا۔ پٹ سن اور کپاس کی برآمد سے جو اسٹک شوئی

ہو جایا کرتی تھی اب وہ بھی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک نے بھی پٹ سن کی کاشت شروع کر دی تھی اور اس کا بدل بھی دریافت کر لیا تھا۔ رہی کپاس تو اس کی اندرون ملک ہی بڑی مانگ تھی نتیجۃً ملک کے زرمبادلہ کے ذخائر پہ دباؤ روز بروز شدت اختیار کرتا گیا۔ سیاسی عدم استحکام نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ ان نامساعد حالات میں انقلابی حکومت نے نظام کار اپنے ہاتھ میں لی۔

زرعی اصلاحات ۱۹۵۹ء انقلابی حکومت نے اختیارات سنبھالنے کے تین مہینے بعد ہی مشہور زمانہ زرعی اصلاحات نافذ کر دیں۔ ان اصلاحات کے تحت زمین کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم حدیں مقرر کر دی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ نہ تو زمین اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جائے کہ کاشت کرنا سرے سے منفعت بخش ہی نہ رہے اور نہ زراعتی زمین کا بیشتر حصہ سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجائے۔

املاک کی تقسیم ۔ زیادہ سے زیادہ مقررہ حد سے زیادہ جو زمینیں زمینداروں کی ملکیت تھیں انہیں ان کے مالکان سے واپس لے کر آسان قسطوں میں چھوٹے کاشت کاروں اور کسانوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ اس طرح ۲۱,۹۵,۳۰۴ ایکڑ زمین داروں سے لے کر تقریباً دو لاکھ کاشت کاروں میں تقسیم کر دی گئی اور اس کی مجموعی قیمت نو کروڑ پچیس لاکھ پینتالیس ہزار سات سو چورانوے روپے سرکاری بونڈز کی صورت میں زمینداروں کو ادا کر دی گئی۔

دوسری طرف کم سے کم مقررہ رقبے سے کم رقبے کی املاک کے ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت اس طرح گروپ بنا دیئے گئے کہ کوئی گروپ کم سے کم مقررہ حد سے کم رقبہ کا نہ ہو۔ اب تک ۳۲,۵۱,۴۲۵ چھوٹے چھوٹے غیر منفعت بخش قطعات اراضی کو جن کا مجموعی رقبہ ۱,۵۶,۷۱,۸۴۶ ایکڑ تھا ملا کر ۱۳,۶۲,۴۱۱ منفعت بخش قطعات بنائے جا چکے ہیں۔

مراعات و ترغیبات حکومت نے زمین کی اس منصفانہ تقسیم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ کسانوں کے حوصلے بڑھانے لئے ان میں کیمیائی کھاد، بہتر قسم کے بیج، کیڑے مارنے کی دوائیں اور تقاوی قرضے بہت بڑے پیمانہ پر تقسیم کئے۔ صدر مملکت نے خود پورے ملک کا دورہ کیا اور کاشت کاروں سے بالمشافہ ملاقات کر کے انہیں یہ احساس دلایا کہ اب زمین خود ان کی اپنی ہے، اب اس پر وہ جتنی محنت کریں گے اس کا پھل خود ان کو ہی ملے گا اور انہیں چاہیئے کہ حکومت کی دی ہوئی مراعات کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس کے علاوہ دیہات میں جابجا اسکول، شفاخانے اور سماجی بہبود کے ادارے قائم کئے گئے اور سڑکوں کا جال بچھا کر دیہات کو قریبی شہروں اور منڈیوں سے ملا دیا گیا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے دیہات کی صورت بدل گئی۔ ان سب باتوں کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کا شمار بھی منفعت بخش پیشوں میں ہونے لگا اور کاشت کاروں کو وہ خوش حالی اور آسودگی میسر آگئی جس سے محرومی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ صدر مملکت نے حال ہی میں دیہی بنکاری کے سلسلہ میں جو ہدایات دی ہیں۔ ان کا پس منظر یہی ہے کہ زرعی اصلاحات کی وجہ سے کاشت کار طبقے کے پاس جو وافر دولت جمع ہو گئی ہے اسے بنکاری کے نظام کے ذریعہ قومی ترقی کے کاموں میں لگایا جائے۔

پانی کی قلت اور سیم اور تھور کا عذاب پانی وہ اہم ترین چیز ہے جس پر زرعی پیداوار کا دارومدار ہے۔ بدقسمتی سے مغربی پاکستان میں پانی کی فراہمی کا نظام قطعی غیر اطمینان بخش رہا ہے۔ قابل کاشت زمین کا ایک چوتھائی حصہ بارانی ہے۔ بارش کے وقت اور مقدار میں تبدیلی کے مطابق اس حصہ زمین کی کارکردگی متاثر ہوتی رہتی ہے۔ بقیہ تین چوتھائی زمین نہری پانی سے سیراب ہوتی ہے جس کی مقدار قطعی ناکافی ہے۔ ساری دنیا کی نہری زمینوں کا بارہ فیصد حصہ مغربی پاکستان میں واقع ہے۔ اس صوبہ میں نہروں کا جال بھی بچھا ہوا ہے اس کے باوجود کل زمین کا ساڑھے تیرہ فیصد حصہ بمشکل سیراب ہو پاتا ہے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے کاشت کار فصلوں کو مطلوبہ مقدار میں پانی دینے کے بجائے صرف پودوں کی جڑوں میں پانی چھڑکنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یوں پانی پودوں کی جڑوں تک پہنچ کر رک جاتا ہے اور جڑوں کے آس پاس نمک اور تیزابیت پیدا کر دیتا ہے

یہ تیزابیت نہروں سے رستے ہوئے پانی کے ساتھ مل کر سیم اور تھور کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو زمین کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح زنگ لوہے کو۔ تقسیم ملک سے اب تک ستر ہزار سے لے کر ایک لاکھ ایکڑ تک زمین سیم اور تھور کی وجہ سے ناقابل کاشت ہو جاتی تھی۔ آزادی کے وقت بائیس لاکھ ایکڑ زمین سیم اور تھور سے متاثر تھی۔ ۱۹۵۸ء تک متاثرہ زمین کا رقبہ تیس لاکھ ایکڑ تک پہنچ چکا تھا۔ اس مسئلہ کی نزاکت کا سابقہ حکومتوں کو بھی احساس تو ہوا تھا مگر کسی نے اس کا حل تلاش کرنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ موجودہ حکومت نے صورت حال سے نمٹنے کے لئے غیر ملکی ماہرین کے تعاون سے پندرہ کروڑ روپے کی مالیت کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا جس میں جدید ترین سائنٹفک طریقوں پر پانی کے نکاس کے راستے نکالنا شامل ہے۔ اس منصوبہ پر عمل کے نتیجہ میں تھور زدہ زمین کا معقول حصہ دوبارہ قابل کاشت بنا لیا گیا ہے۔

پانی کی قلت دور کرنے کے لئے بڑی تعداد میں ٹیوب ویلز نصب کئے گئے ہیں۔ کاشت کاروں کو خود اپنے ٹیوب ویلز لگانے کی ترغیب دینے کے لئے حکومت نے قرض اور "سب سی ڈی" کی مراعات بھی دے رکھی ہیں۔

سندھ طاس کا قضیہ سندھ طاس کا جھگڑا زرعی ترقی کی راہ میں ایک اور بڑی رکاوٹ تھا۔ ہندوستان نے راوی، بیاس اور ستلج پر اپنا حق جتاتے ہوئے ہماری نہروں کا پانی قطعی بند کر دیا تھا۔ ہماری حکومت کے بروقت اور جرأت مندانہ اقدام نے ورلڈ بینک کو مداخلت پر مجبور کیا اور اس طرح فریقین میں باہمی مفادات کے تحفظ کے لئے معاہدہ ہو سکا۔

دریاؤں کا پانی ذخیرہ کرنے اور حسب ضرورت استعمال کرنے کے لئے ان پر بند بھی باندھے گئے ہیں جن میں منگلا اور تربیلا کے بند قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر مکمل ہو چکا ہے اور موخر الذکر تکمیل کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

سیلاب اور طوفان باد و باراں پاق پورے پاکستان کا بھی ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ اس صوبہ کی قابل کاشت زمین کا باسٹھ فیصد حصہ بارانی ہے۔ بارش یہاں سال میں گرمیوں کے چار مہینوں میں ہوتی ہے۔ جو عام طور سے زرعی ضروریات کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن جس سال بارش کم ہوتی ہے قحط پڑ جاتا ہے اور جب ذرا زیادہ ہو جاتی ہے تو سیلاب آ جاتا ہے۔ دونوں ہی صورتیں غیر یقینی ہوتی ہیں اور پیداوار کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان کے سیلابوں کی تباہ کاریوں پر قابو پانے اور سمندر کے شور پانی کو روکنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت تھی تاکہ فاضل پانی کے اخراج کا مناسب بندوبست ہو سکے۔ حکومت نے اس کے لئے Low Lift pump scheme نافذ کی۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی مدت کے خاتمہ کے وقت ان پمپوں کا دائرہ کار بہت بڑے رقبۂ زمین تک پھیل جانے کی توقع ہے۔

قرض کی سہولتیں پیسے کی کمی زرعی پس ماندگی کی ایک اور بڑی وجہ تھی۔ کاشت کاری کے جدید ترین طریقے اختیار کرنا اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک کاشت کار کو مناسب شرح سود پر روپیہ بطور قرض فراہم نہ کیا جائے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان نے اس مقصد کے لئے امداد باہمی کے بینکوں اور زرعی ترقیاتی بینک کو رعایتی شرح سود پر خطیر رقمیں فراہم کیں۔ زرعی ترقیاتی بینک مختلف زرعی ضروریات کے لئے چھوٹی مدت (اٹھارہ مہینے)، درمیانی مدت (اٹھارہ مہینے سے پانچ برس تک)، اور لمبی مدت (پانچ برس سے زیادہ) کے قرضے دیتا ہے۔ ان قرضوں کی وجہ سے زراعت میں جدید ترین تکنیک اور مشینوں کا استعمال ممکن ہو سکا جن سے پیداوار میں اضافہ ہوا اور وقت اور لاگت میں کمی واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ حکومت کاشت کاروں کو تقاوی قرضے بھی دیتی ہے اب تک ایک کروڑ دس لاکھ روپے کے تقاوی قرضے دیئے جا چکے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ پیسے کی کمی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔

تعلیم اور تحقیق:۔ تعلیم اور تحقیق کے اس دور میں یہ بھی ضروری تھا کہ کاشت کے طریقوں پر باقاعدہ تحقیق کی جائے تاکہ کم سے کم لاگت سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فی ایکڑ پیداوار حاصل کی جا سکے۔ یہ کام ہمارے ملک میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے

FARM MECHANISATIAN TRAININ G

INSTITUTE, DACCA AGRICULTURAL SCHOOL, AGRICULTURAL INSTITUTES, MYMENSINGH & LYALLPUR - AGRICULTURAL COLLEGES, TANDOJAM & PESHAWAR

اس سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں اب تک جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ گیہوں کی مختلف قسموں کی کاشت پر زرعی کالج ٹنڈو جام میں تجربہ ہو رہا ہے۔ یہ خبر خوش کن ہے کہ اس علاقہ میں میکسی پاک گیہوں کی کاشت کی شرح ایک ایکڑ پر ۸۰ من تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ گیہوں کی ایک اور قسم "نارٹینو" پر تجربہ ہو رہا ہے جو کئی اعتبار سے میکسی پاک سے بھی بہتر ہے ایک اور قسم "مکو رانی" ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر پودوں کی عام بیماریاں بہت کم اثر انداز ہوتی ہیں اور اس میں غذائیت بھی دوسری اقسام کے گیہوں سے زیادہ ہے۔

گیہوں کی کاشت کے سلسلے میں ہم نے تین سے پانچ سال کی مدت میں جو کامیابی حاصل کی ہے وہ میکسیکو نے بیس سال میں حاصل کی تھی کچھ عرصہ قبل گورنر مغربی پاکستان نے راک فیلر سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہماری گیہوں کی کاشت کرنے کی تکنیک بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی جانے والی ہے اور غالباً ہم اسے جلدی ہی برآمد بھی کرنے لگیں گے

حال ہی میں حکومت نے سورج مکھی کے پھول کی کاشت کی طرف توجہ دی ہے اس پھول کا روغن صنعتی استعمال اور انسانی ضروریات کی دیگر اشیا کی تیاری کے لئے یکساں مفید ہے۔ اسے "سویا بین آئل" کا بدل قرار دیا گیا ہے اور جب یہ کافی مقدار میں پیدا ہونے لگے گا تو سویا بین آئل کی درآمد پر جو زر مبادلہ خرچ ہوتا ہے وہ بچایا جا سکیگا۔

خرید و فروخت کی سہولتیں مارکیٹنگ کی صحیح سہولت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے زرعی پیداوار کا بڑا حصہ اونے پونے داموں بکتا تھا اور کاشتکاروں کی سال بھر کی محنت خاک میں مل جاتی تھی۔ حکومت نے اس سلسلہ میں بھی موثر اقدام کئے اجناس کا سروے کرایا۔ ان کو اسٹور کرنے کے معقول انتظامات کئے اور ان کے نکاس کے لئے منڈیاں قائم کیں۔ اس قسم کی چودہ اہم منڈیاں

مشرقی پاکستان میں اور پانچ ضلع لاہور میں سرگرم عمل ہیں۔

مویشی :- مویشی ملک کی بڑی دولت ہیں اور کثیر تعداد میں صحتمند مویشیوں کے بغیر زرعی پیداوار میں خاطر خواہ ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ حکومت نے بڑی تعداد میں صحت مند اور بہتر نسل کے مویشی پیدا کرنے کے لئے کئی موثر تدابیر اختیار کیں جن میں کئی تحقیقاتی ادارے۔ پولٹری فارم۔ جانوروں کے اسپتالوں اور پاؤں اور منہ کے امراض کے تحقیقاتی مراکز کا قیام قابل ذکر ہے۔ میلہ مویشیاں جو اندرون پنجاب اور سندھ میں باقاعدہ وقفوں سے منعقد ہوتا ہے اعلیٰ قسم کے مویشیوں کی نسل کی افزائش میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جنگلات :- جنگلات کی ترقی بھی زرعی ترقی کا ایک حصہ ہے انقلابی حکومت اس طرف سے بھی غافل نہیں رہی ہے صرف مغربی پاکستان میں ۶۷-۱۹۶۶ء تک ۵٫۵۲ لاکھ ایکڑ رقبہ زمین پر نئے درخت لگائے جا چکے ہیں۔

صنعت

تقسیم ملک کے وقت جو صنعتیں یہاں قائم تھیں وہ گویا نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ابتدائی دس گیارہ سال میں سیاسی عدم استحکام اور حکمران وقت کی آپا دھاپی کی وجہ سے صنعت کاری کی تنظیم و ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ انقلابی حکومت نے ۱۹۵۹ء میں ایک جامع صنعتی پالیسی وضع کی جسے صنعتی معیشت کے استحکام کی جانب پہلا موثر قدم کہا جا سکتا ہے۔

اس پالیسی کی اساس چند واضح اصولوں پر تھی جن کو وضع کرتے وقت دور اندیشی سے کام لے کر وقتی یا فوری منفعت پر دائمی معاشی استحکام کو ترجیح دی گئی یہ اصول حسب ذیل ہیں:-

(۱) ایسی صنعتوں کے قیام کو ترجیح دی جائے جن کے لئے خام مال اندرون ملک ہی میں موجود ہو۔

(۲) زیادہ سے زیادہ افراد کے لئے روزگار کے بہتر مواقع پیدا کئے جائیں۔

(۳) برآمدات میں اضافہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ درآمدی اشیاء کا بدل اندرون ملک تیار کیا جائے۔ لہٰذا ان صنعتوں کو فروغ دیا جائے جو یا تو وہ مال پیدا کریں جس کی بین الاقوامی منڈیوں میں کھپت ہو یا پھر وہ اشیاء صرف پیدا کریں جو پہلے برآمد کی جاتی تھیں۔

(۴) ایسی صنعتوں کے قیام پر بھی توجہ دی جائے جو دوسرے شعبوں کو استحکام و فروغ بخشیں۔

(۵) اندرون ملک صنعتوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ علاقے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کی سطح پر آسکیں لہٰذا سرکاری ترقیاتی پروگراموں میں پس ماندہ علاقوں کے لیے زیادہ رقم مختص کی گئی اور بھاری مشینوں پر کسٹم ڈیوٹی اور ٹیکسوں میں چھوٹ دے کر ان علاقوں کے سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔

(۶) نجی شعبہ کو پوری طرح بروئے کار لایا جائے لہٰذا نجی شعبہ میں سرمایہ کاری کے لیے متعدد مراعات دی گئیں جن میں ٹیکسوں میں چھوٹ، قیمتیں گرنے کی صورت میں الاؤنس۔ پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کے غیر منقسم منافع پر انکم ٹیکس کی چھوٹ شامل ہیں۔ صنعتوں کے قیام کی منظوری کے طریقۂ کار کو بھی آسان بنایا گیا اور کارخانے لگانے والوں کو قرض کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے مالیاتی ادارے قائم کیے گئے۔

(۷) غیر ملکی سرمایہ کاروں کو پاکستان میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دی جائے لہٰذا یہ کیا گیا۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو اپنا سرمایہ اور منافع اپنے ملک لے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ غیر ملکی ماہرین کو انکم ٹیکس کی چھوٹ دی گئی۔

اس صنعتی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران جو ترقی اور کامیابی حاصل ہوئی اس سے متاثر ہو کر تیسرے منصوبہ میں ایک بار اور صنعتی ترقی پر توجہ مرکوز کی گئی۔ تیسرے منصوبے کے ابتدائی دو سالوں میں ترقی کی رفتار سست پڑ گئی جس کی وجہ غیر ملکی امداد میں کمی اور پاک بھارت جنگ تھی مگر ۶۷-۱۹۶۶ء میں تیرہ فیصد ترقی کر کے اس کمی کو پورا کر لیا گیا۔

صنعتی ترقی کی وجہ سے اشیائے صرف کی برآمد میں بھی قابل ذکر کمی واقع ہو گئی ہے اور اب بیشتر اشیائے صرف اندرون ملک ہی تیار کی جاتی ہیں۔

مواصلات اور نقل و حمل

ذرائع مواصلات:۔ ذرائع مواصلات و نقل و حمل کسی ملک کی ترقی کی راہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کسی بھی شعبۂ زندگی میں اس وقت تک خاطر خواہ ترقی نہیں ہو سکتی جب تک مواصلات اور نقل و حمل کا موثر اور ترقی یافتہ نظام موجود نہ ہو۔ آزادی کے وقت مواصلات کا جو نظام ہمیں ملا تھا وہ ہماری ضروریات کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ خصوصاً مشرقی پاکستان کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، لہٰذا پاکستان کو اپنا نظام مواصلات از سر نو مرتب کرنا تھا۔

ٹیلیفون:۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں ۳۸۰۰۰ (اڑتیس ہزار) نئے ٹیلیفون لگانے کی گنجائش رکھی گئی مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۸ء کے بعد ہی نظام مواصلات کو جدید ترین طریقوں پر تشکیل دینے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔

تقسیم ملک کے وقت پاکستان میں ۱۵,۲۰۰ ٹیلیفون تھے جن میں ۵۵ء تک ۴۷,۸۰۰ ٹیلیفون کا اضافہ ہوا تھا لیکن ۵۸ء سے اب تک ایک لاکھ نو ہزار نئے ٹیلیفون لگائے جا چکے ہیں ابتدائی گیارہ سالوں میں ۱۲۳ ٹیلیفون ایکس چینج لگے تھے اس کے مقابلے میں بعد کے دس سالوں میں ۲۴۰ ایکس چینج قائم کئے گئے۔

لمبے فاصلے کے مواصلات کے سلسلہ میں بھی انقلابی حکومت نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ہمارے پاس دس ہزار چینل میل کی ٹرنک لائن تھی جس میں ابتدائی گیارہ برس میں صرف ۲۵,۰۰۰ چینل میل کا اضافہ ہوا تھا لیکن انقلاب ۵۸ء کے بعد اس میں پانچ لاکھ چینل میل کا اضافہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک اور اہم قدم ۱۹۶۲ء میں اٹھایا گیا جبکہ براہ راست ڈائلنگ اسکیم

آغاز ہوا اور اب تقریباً سارے ہی بڑے شہروں کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ کی سہولت موجود ہے ۔

تار گھر :- ۱۹۴۷ء میں ملک میں ۱۲۰۱ تار گھر تھے جن میں بعد کی مدت میں ۶۶۵ کا اضافہ ہوا ۔ ۱۹۵۸ء تک محض ایکیس ڈاک خانوں میں ٹیلی پرنٹر نصب تھے لیکن اب ۹۹ ڈاک خانوں میں ٹیلی پرنٹر لگ چکے ہیں ۔ انقلاب ۱۹۵۸ء سے پہلے غیر ممالک سے صرف نو براہ راست ہائی فریکوینسی ریڈیو ٹیلیفون سرکٹ قائم تھے اور زیر زمین لائن صرف ہندوستان تک تھی لیکن اب چوبیس غیر ملکی سرکٹ قائم ہو چکے ہیں ، اور ہندوستان کے علاوہ افغانستان سے بھی زیر زمین سرکٹ قائم ہو چکا ہے ۔

ٹیلکس :- ٹیلکس کا آغاز پاکستان میں ۱۹۵۹ء میں ہوا جب ہاتھ سے چلنے والا ایک ایک ایکس چینج کراچی ، لاہور اور ڈھاکہ میں قائم کیا گیا اب تک ۱۰۰ لائنوں کا ایک ایک خودکار ایکس چینج لاہور ، راولپنڈی اور کراچی میں قائم ہو چکا ہے اور ڈھاکہ ، چاٹگام اور کھلنا میں زیر تکمیل ہے ۔

ریڈیو فوٹو سروس :- ۱۹۵۸ء سے قبل ہمارے ملک میں فوٹو سروس کا نظام نہیں تھا لیکن اب لندن ، نیویارک ، پیکنگ ، ماسکو اور ٹوکیو سے براہ راست فوٹو سروس موجود ہے ۔

ڈاک خانے :- ۱۹۴۷ء تک پاکستان میں ۹۰۷۴ ڈاک خانے تھے جن کی تعداد اب ۱۳،۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے ، حکومت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ اندرون ملک چھوٹے چھوٹے دیہات میں بھی ڈاک خانہ ہونا چاہئے خواہ مالی اعتبار سے اس میں شروع میں نقصان ہی کیوں نہ ہو ۔ ڈاک خانوں کی تعداد بڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ ترسیل ڈاک میں کم سے کم وقت لگے ۔ لہٰذا دونوں صوبوں کے درمیان تمام تر اے میل اسکیم کا آغاز کیا گیا ۔ جس کے تحت تمام خطوط ، پوسٹ کارڈ اور منی آرڈر ہوائی جہاز سے ہی بھیجے جاتے ہیں ۔

ڈاک خانوں میں برقی مشینیں :- ڈاک خانوں میں برقی مشینیں بھی نصب کی گئی ہیں ۔ خط چھانٹنے کی ایک برقی مشین ڈھاکہ ، کراچی اور لاہور میں نصب ہے اور بھی متعدد قسم کی مشینیں بیشتر ڈاک خانوں کے کاؤنٹر پر متفرق خدمات انجام دیتی ہیں ۔

ملازمین کی فلاح و بہبود :- محکمہ ڈاک میں تقریباً ۵۰،۰۰۰ پچاس ہزار ملازمین ہیں جن کی فلاح و بہبود کے لئے فلاحی فنڈ ، کالونیاں ، اسکول اور اسپتال حکومت نے قائم کر رکھے ہیں ۔

ڈاک کی عالمی یونین :- ڈاک کی عالمی یونین کے اول درجہ کے رکن کی حیثیت سے پاکستان بین الاقوامی ڈاک کے نظام میں اہم کردار ادا کر رہا ہے ۔ اس وقت پاکستان اس عالمی یونین کے آپریشنل کمیشن کا چیئرمین ہے اور اس مینجمنٹ کونسل کا ایک نائب صدر ۔

بیمہ اور بچت کے کھاتے :- پوسٹ آفس سیونگز بینک اور پوسٹل لائف انشورنس اپنے اپنے حلقہ کار میں بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ ایک اندازے کے مطابق ملک میں اڑتیس کروڑ روپے کی مالیت کی ایک لاکھ بیس ہزار بیمہ پالیسیاں بیچی جا چکی ہیں ۔

ڈاک کے ٹکٹ :- پاکستانی ڈاک کے ٹکٹ دنیا بھر کے ٹکٹ جمع کرنے والوں کی دلچسپی کا مرکز رہے ہیں ۔ یہ ڈاک ٹکٹ ہماری قومی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی خاموش نمائندگی کرتے رہے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ٹکٹ ملک کے اندر ہی پاکستان سیکورٹی پرنٹنگ کارپوریشن میں چھپتے ہیں ۔

ذرائع نقل و حمل

سڑکیں :- تقسیم ملک کے وقت مغربی پاکستان میں ۵۰،۵۰۰ میل پکی اور ۹۰۰۰ میل کچی اور مشرقی پاکستان میں ڈیڑھ سو میل پکی اور نوے میل کچی سڑکیں تھیں ۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو اس وقت ہمارے مقابلہ میں انگلینڈ میں بر ۹۰۰ اور امریکہ بر ۵۰۰ زیادہ لمبی سڑکیں تھیں ۔ انقلاب ۱۹۵۸ء سے پہلے سڑکوں کی توسیع کے سلسلہ میں کوئی باقاعدہ قدم نہیں اٹھایا گیا ۔ زیادہ تر موجود سڑکوں کی مرمت ہی پر اکتفا کیا گیا البتہ دوسرے منصوبے کے دوران مشرقی پاکستان میں چھ ہزار چھپن میل لمبی پکی اور چھہتر ہزار آٹھ سو تراسی (۷۶,۸۸۳) میل کچی سڑکیں اور بڑی تعداد میں پل تعمیر ہوئے اور مغربی پاکستان میں ۲۳۳ میل پکی اور چھ ہزار ایک سو دس میل کچی

سڑکیں، پندرہ سو میل لمبی دیہی پگڈنڈیاں اور دو ہزار پلیا تیں اور پُل تعمیر ہوئے اور اس کامیابی سے متاثر ہو کر تیسرے پنجسالہ منصوبے میں بڑی خطیر رقم سڑکوں کی وسعت اور تعمیر کے لئے مختص کی گئی اور امید ہے اس کے بڑے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔

ریلوے:- ریلیں صرف شہریوں کی آمد و رفت کی ضروریات ہی پوری نہیں کرتیں بلکہ معاشی اور دفاعی استحکام میں بھی بڑا موثر کردار ادا کرتی ہیں، تقسیم ملک کے وقت ہماری ریلوے لائن کی حالت قطعی ناقابل اطمینان تھی، انقلاب ۱۹۵۸ء کے بعد ریلوے تعمیر اور ترقی پر بھی سنجیدگی سے توجہ کی گئی، اور دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبوں میں اس کام کے لئے معقول رقمیں وقف کی گئیں۔ ۱۹۶۲ء میں ریلوں کو صوبائی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا اور آج دونوں صوبوں کی ریلوے جدید قسم کے انجن اور مسافر اور مال گاڑی کے ڈبوں سے مالا مال ہیں۔ باربرداری کے مال کی مقدار اور مسافروں کی تعداد میں سال بہ سال غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔

پچھلے دس سال کی مدت میں ریلوے نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں درج ذیل نمایاں اور قابل توجہ ہیں:-

(۱) ایوب پل تعمیر کیا گیا۔ (۲) اسپرنگ شاپ قائم کی گئی (۳) فائر برک فیکٹری کا قیام عمل میں آیا۔ (۴) کراچی سرکلر ریلوے تعمیر کی گئی، (۵) دس ہزار تین سو تہتر نئے ویگن بنائے گئے (۶) لاہور اور خانیوال کے درمیان بجلی کی ٹرین چلانے کا انتظام کیا گیا (۷) حیدرآباد سے میرپور خاص تک کی چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں تبدیل کیا گیا (۸) کوٹ ادو سے ڈیرہ غازی خان تک لائن ڈالی گئی (۹) CENTRAL DIESEL LOCO MOTIVE WORKSHOP کا قیام عمل میں آیا۔ (۱۰) PRESTRESSED CONCRETE SLEERER FACTORY قائم کی گئی

ہوائی نقل وحمل:- ہوائی ٹرانسپورٹ کی اہمیت اور افادیت بھی کسی تفصیل کی محتاج نہیں ہے۔ پاکستان میں ہوائی سروس کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ ملک ایسے دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے جن کے درمیان زمینی ذرائع آمد و رفت موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بھی ایک نہایت موثر اور منظم ہوائی سروس کا ہونا ناگزیر تھی۔ انقلابی حکومت نے اس طرف بھی توجہ کی اور آج پی آئی اے کی اندرون ملک اور بین الاقوامی سروس کی دنیا میں دھوم ہے۔ تحفظ اور پابندی وقت کے اعتبار سے پی آئی اے کا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین ہوائی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ گذشتہ دس سالوں میں مسافروں کی تعداد میں ۴۰٪ اور مال کی باربرداری میں ۱۵۰٪ اضافہ ہوا ہے۔

جہاز رانی:- انقلابی حکومت کے دس سالہ عہد میں جہاز رانی نے بھی قابل فخر ترقی کی ہے۔ اس وقت پاکستان کے تجارتی بحری بیڑے میں چھپن[۵۶] مال برداری کے جہاز، چھ مسافر بردار یا مسافر اور مال بردار جہاز اور ایک آئل ٹینکر شامل ہیں۔ ترسیٹھ جہازوں کے اس فلیٹ میں سینتیس[۳۷] جہاز پچھلے دس سال کی مدت ہی میں شامل ہوئے ہیں۔

کراچی شپ یارڈ کا قیام ملک کی دس سالہ ترقی میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہاں بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے جہاز بنتے ہیں "العباس" اس شپ یارڈ کی کارگزاری کا چلتا پھرتا نمونہ ہے۔

اس وقت ملک میں سرکاری شعبہ میں ایک اور نجی شعبہ کے تحت بارہ جہاز راں کمپنیاں سرگرم عمل ہیں۔

دریائی ذرائع نقل وحمل دنیا کے کسی ملک میں دریائی راستوں کا ایسا جال بچھا ہوا نہیں ہے جیسا مشرقی پاکستان میں ہے۔ صوبے کے بیشتر حصے چار ہزار آٹھ سو میل کی لمبائی میں پھیلے ہوئے دریائی راستوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جس سے کشتی رانی کی صنعت کو بڑا فروغ ملا ہے۔ ان دریائی راستوں کے کنارے کنارے جا بجا بندرگاہ نمودار ہو گئے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ تجارتی مرکز بنتے جا رہے ہیں۔ ان دریائی راستوں سے ستر[۷۰] لاکھ ٹن مال اور تیس[۳۰] لاکھ مسافر ہر ماہ سفر کرتے ہیں۔

اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد کے دس سالوں میں صدر ایوب کی فعال قیادت میں پاکستان نے قابل رشک ترقی کی ہے اور اس جائزے سے حاصل شدہ نتائج ہمارے وسائل اور مدت کار کے تناسب سے انتہائی حوصلہ افزا ہیں اور کوئی بھی ترقی پذیر ملک اسے اپنے لئے معیار قرار دے سکتا ہے۔

اردو ادب کی ترقی کے دس سال

قیام پاکستان کے بعد اردو ادب کے گیارہ سال بڑے افراتفری کے ہیں۔ ہنگامی حالات کی وجہ سے ادیبوں کو یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ۱۹۴۷ء کے خونین انقلاب کے اثرات اس قدر تلخ اور اذیت کوش تھے کہ ہمارے ادبا و شعرا کے ذہن اس سے عرصہ تک متاثر رہے۔ اور ہمارے ناول افسانے' ڈرامے اور شاعری پر اس کا براہ راست اثر پڑا۔ پاکستانی ادبا و شعرا نے اس دور میں اپنی ادبی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور پابندی سے لکھتے رہے لیکن لاشعوری طور پر انھوں نے اپنی تخلیقات کے تانے بانے فسادات اور اس کے اثرات سے تیار کئے۔ اس دور میں لکھے جانے والی تخلیقات پر خواہ "فسادی ادب" کا لیبل لگایا جائے لیکن ان کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تخلیقات نہ صرف اس دور کی آئینہ دار ہیں بلکہ ان میں خوش آئند مستقبل کی نوید بھی ملتی ہے اور آگے بڑھنے کا جذبہ بھی۔ فسادات کا موضوع جب پرانا ہوا تو اردو کے جیالے فنکاروں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور نئے ملک کے الجھے ہوئے مسائل کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا۔ قائد اعظم اور قائد ملت کی حیات تک ادبا اور شعرا مایوس نہیں تھے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلسل عزم و عمل کے چراغ فروزاں کئے ہوئے تھے لیکن ان دونوں عظیم رہبروں کی دائمی جدائی کے بعد حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوئے پہلے سیاستدانوں نے اقتدار حاصل کرنے کی ہوس میں اخلاقی اقدار کو بری طرح پائمال کیا انھوں نے نہ تو ادیبوں کی سرپرستی کی اور نہ ادب پر نظر التفات ان ناسازگار حالات میں بھی
الشجاع

پاکستانی فنکار انفرادی طور پر قوم کا حوصلہ بحال کرنے کی سعی کرتے رہے۔ حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے تھے۔ ایک عجیب سی گھٹن اور اندھیرا تھا۔ پاکستان اقتصادی طور پر تباہی کے دہانہ تک پہنچ گیا۔ لیکن انتہائی تاریکی صبح کا پیام دیتی ہے چنانچہ ۱۹۵۸ء کا انقلاب ان ہی ناسازگار حالات کا ردعمل تھا پاکستان کا انقلاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا کے تمام سیاسی انقلابات سے مختلف تھا۔ یہ اقتدار کی جنگ نہیں تھی بلکہ اس انقلاب کا مقصد دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا تحفظ تھا۔ یہی وہ مقدس جذبہ تھا جس کے پیش نظر انقلابی حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی معاشرہ کی تطہیر کا فریضہ بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ معاشرے میں خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں جس کے نتیجہ میں وہ اندھیرا چھٹ گیا جو عوام کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔ ادیب بھی معاشرے کا ایک فرد ہے اور دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ ذہین اور حساس۔ اسی لئے اس نے اس انقلاب کا خیر مقدم کیا اور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ اپنی بہترین صلاحیتوں کو ملک کی تعمیر نو کے لئے وقف کر دیا۔ چنانچہ آج جب ہم قیام پاکستان کے بعد سے ۵۸ء تک کے ادب کی رفتار کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا موازنہ انقلاب ۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کی ادبی کارکردگی سے کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر بے پایاں مسرت ہوتی ہے کہ انقلاب کے بعد گذشتہ دس سال میں ہمارے ہاں تقریباً تگنا کام ہوا ہے اور اردو ادب کی ترقی کی رفتار ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کی ترقی سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہے۔ انقلاب ۵۸ء کے پہلے تو اور

بھی بہت سے پہلو ہیں۔ جن پر تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے لیکن اس مختصر مضمون میں صرف اردو ادب کی ترقی کے دس سال کا اجمالی جائزہ پیش ہے۔

انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد جب ملک میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تو ہمارے دانشوروں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور ایسے وسائل پیدا کئے جائیں کہ تخلیقی کاموں میں تیز رفتاری پیدا ہو۔ اور اعلیٰ ادب تخلیق ہو سکے۔ کتابوں کے چھپنے کا باقاعدہ انتظام ہو اور ملک کی قومی زبانوں کو ان کا جائز حق دلایا جائے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ۲۹ جنوری ۱۹۵۹ء کو ایک سہ روزہ کنونشن منعقد کیا گیا۔ پاکستان کے مصنفین کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کنونشن میں تمام زبانوں کے ۲۱۲ ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی شریک ہوئے اور رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کنونشن کی آخری نشست کی صدارت صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے کی۔ اور دس ہزار روپے کا ذاتی عطیہ بھی دیا۔

رائٹرز گلڈ کو ہم دانشوروں کی ٹریڈ یونین بھی کہہ سکتے ہیں اس انجمن کا مقصد اظہار خیال کی آزادی اور ادیبوں کے حقوق کا تحفظ ہے۔ انجمن کی مرکزی مجلس عاملہ کے ۱۲ منتخب اراکین ہیں اس کے علاوہ چار نامزد اراکین ہیں ان میں گیارہ گیارہ اراکین مشرقی اور مغربی پاکستان سے ہیں اس کے علاوہ علاقائی زبانوں (پنجابی، سندھی اور پشتو) کا ایک ایک رکن بھی ہے۔

لاہور، کراچی اور ڈھاکہ تین جگہ علاقائی مجالس عاملہ ہیں اور ہر علاقائی مجلس کے گیارہ گیارہ ممبر ہیں۔ اس انجمن کا ایک اشاعت گھر ہے جہاں سے کتابیں شائع ہوتی ہیں اس کے علاوہ ایک کتاب گھر بھی ہے اس میں لگا ہے لگا ہے مصنفین کی آٹوگراف کی ہوئی کتابیں بھی فروخت کی جاتی ہیں۔ شروع میں چند سال دو رسالے بھی "ہم قلم" اور قلمکار کے نام سے شائع ہوتے رہے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ آدم جی اور داؤد ادبی انعامات کا حصول ہے۔ اس ادارے کی وساطت سے آدم جی انعام

[illegible]

ناول، افسانہ، ڈرامہ، شاعری، سفرنامہ، سوانح نگاری پر دیا جاتا ہے۔ بیس ہزار روپے کی یہ پیش کش آدم جی کے گھر والوں کی طرف سے ہے سن ۱۹۶۰ء سے یہ انعامات دیئے جا رہے ہیں۔ دس ہزار اردو کی کتاب پر اور دس ہزار بنگالی کی کتاب پر اس ادارے کے مقرر کردہ جج انعام کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پاکستان کے ممتاز فنکار یہ انعام حاصل کر چکے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی چل رہا ہے۔ اور ہر سال دو کتابوں کو انعام دیا جا رہا ہے کتابیں بھیجنے کی آخری تاریخ ہر سال کی تیس ستمبر ہے اور انعام کا فیصلہ ۳۱ جنوری کو ہوتا ہے۔

داؤد انعام

یہ انعام بھی رائٹرز گلڈ کی وساطت سے دیا جاتا ہے کل رقم پچیس ہزار روپے ہے۔ اس میں سے پانچ پانچ ہزار روپے کے دو انعام اردو اور بنگالی زبان کی کتابوں کے لئے ہیں جن کا موضوع ادبی تحقیق، تاریخ ادب اور ادبی تنقید ہے۔ پانچ پانچ ہزار روپے اردو اور بنگالی کی ان نثری کتابوں کے لئے ہیں جو غیر منقسم ہندوستان یا پاکستان کے قیام کے بعد تحریک پاکستان کے تخیل، تاریخ، ثقافت اور سماجی اہمیت سے متعلق ہو۔ اور باقی پانچ ہزار روپے انعام یافتہ کتب کے بین اللسانی تراجم کے لئے مخصوص ہیں۔ سب سے پہلے یہ انعام ۱۹۶۳ء میں دیا گیا اس انعام کے لئے کتابوں کی ترسیل کی تاریخ ۳۱ مئی ہے اور انعام کا اعلان ۱۴ اگست کو ہوتا ہے اس کا فیصلہ بھی انجمن مصنفین پاکستان کے مقرر کردہ جج صاحبان کرتے ہیں۔ ان دونوں انعامات کے علاوہ رائٹرز گلڈ کی وساطت سے یونائیٹڈ بنک انعام اور چھ ستمبر انعام بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ رائٹرز گلڈ علاقائی ادب پاروں پر بھی انعام دیتا ہے۔

رائٹرز گلڈ کے علاوہ اس وقت ملک میں اور کئی ادارے ہیں جو اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں سے چند ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے پہلے وجود میں آئے تھے۔ لیکن ان کی ترقی کی رفتار بے حد سست تھی اور ان کو حکومت

کی طرف سے مالی امداد بھی اتنی نہیں ملتی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد مندرجہ ذیل اداروں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں
بزم اقبال لاہور۔ اقبال اکیڈیمی کراچی۔ اکادمی پنجاب لاہور کل پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی۔ اردو اکیڈیمی بہاولپور شعبۂ تحقیق و تصنیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب لاہور، ادارۂ تحقیق و تصنیف کراچی۔ آفیشل لنگویج کمیٹی لاہور۔ ادارہ مطبوعات پاکستان نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کراچی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، بزم ثقافت کوئٹہ۔ بزم ثقافت ملتان۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ پشتو اکیڈیمی (پشتو سے اردو میں اور اردو سے پشتو میں تراجم کئے جا رہے ہیں) سندھ ادبی بورڈ (اردو سے سندھی میں ترجمے ہو رہے ہیں) پنجابی اکیڈیمی (اردو سے پنجابی میں اور پنجابی سے اردو میں ترجمے کئے جا رہے ہیں)۔

۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد انعامات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس سے ادیبوں کی معاشی حالت پر خوشگوار اثر پڑا ہے۔

انقلاب ۱۹۵۸ء سے پہلے مصنفین کے ساتھ ناشرین کا رویہ بہت ہی افسوسناک تھا لیکن اب پہلے کے مقابلہ میں حالات بہتر ہیں نئے کاپی رائٹ ایکٹ سے بھی مصنفین کو خاصا فائدہ پہنچا ہے۔

ادیبوں کے جو مسائل ہیں صدر ایوب کی حکومت کو ان مسائل کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور وہ اپنے وسائل کے مطابق بڑی حد تک ادیبوں کی سرپرستی کر رہی ہے۔ وزارت تعلیم کی مقرر کردہ ایک کمیٹی اس کا جائزہ لیتی ہے کہ کس ادیب نے ادب کی کیا خدمت انجام دی ہے؟۔ اس کا ادب میں کیا مقام ہے۔ یہ کمیٹی ادیب سے اس بات کا مطالبہ نہیں کرتی ہے کہ ادیب اپنی کوئی تخلیق یا تحقیق مقابلے کے لئے پیش کرے۔ یہ کمیٹی اپنی سفارشات صدر پاکستان کو پیش کر دیتی ہے نمایاں ادبی خدمات انجام دینے والے فنکاروں کو صدر مملکت اعزاز و انعام سے نوازتے ہیں جو پانچ ہزار سے کم نہیں ہوتا۔ یہ اعزاز و انعام ادیب کی موت کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس ذیل میں جن ادبا و شعرا کو ادبی اعزاز ملا ہے ان میں چند کے نام درج ہیں

۱۹۵۸ء	ابوالاثر حفیظ جالندھری	دس ہزار روپے
۱۹۵۹ء	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	دس ہزار روپے
۱۹۶۰ء	ڈاکٹر سید عبداللہ	پانچ ہزار روپے
۱۹۶۲ء	صوفی غلام مصطفٰے تبسم	پانچ ہزار روپے
۱۹۶۳ء	شاہد احمد دہلوی	پانچ ہزار روپے
۱۹۶۴ء	مولانا صلاح الدین احمد مرحوم	دس ہزار روپے

پنجاب ایڈوائزری بورڈ

دو ہزار کا یہ انعام ادبی اور تعلیمی کتابوں پر پنجاب ایڈوائزری بورڈ کی طرف سے دیا جاتا ہے تعلیمی نوعیت کی کتابوں میں سائنس، تاریخ۔ سوانح اور سفرنامے شریک ہوتے ہیں اور ادبی کتابوں میں تنقید۔ تاریخ، شاعری، افسانہ، مضمون اور ادب کی دوسری اصناف شامل ہیں۔ تعلیمی کتابوں پر بارہ سو روپیہ اور ادبی کتابوں پر آٹھ سو روپیہ دیا جاتا ہے ۱۹۵۸ء میں یہ انعام مولانا غلام رسول مہر کو "جماعت مجاہدین" لکھنے پر چھ سو روپے کیپٹن سید ضمیر جعفری کو "لہو ترنگ" لکھنے پر دو سو روپے اور ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو "فکر اقبال" لکھنے پر پانچ سو روپے دیا گیا۔

مجلس ترقی ادب لاہور

یہ ادارہ مئی ۱۹۵۰ء میں ایک لاکھ روپے کی ابتدائی امداد کے ساتھ اردو زبان کی بقا اور ارتقا کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے کو "مجلس ترجمہ" کا نام دیا گیا تھا اور بلند پایہ علمی کتابوں کے ترجمے ہوتے تھے لیکن ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد اس ادارے کی از سر نو تشکیل ہوئی اور اس کا نام مجلس ترقی ادب رکھا گیا اور دو لاکھ روپے سالانہ امداد منظور ہوئی، اور ایسی سالے

رحمٰن صاحب کو اس کی صدارت سونپی گئی۔ اس ادارے نے علمی تصنیفات پر ایک معقول انعام دینے کی پیش کش کی۔ انعامی رقم کا اعلان نہیں کیا گیا بلکہ جس اہمیت کی کتاب ہوتی ہے اسی کے لحاظ سے انعام دیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ بورڈ کے ڈائرکٹر کرتے ہیں۔ اب تک یہ ادارہ مندرجہ ذیل کتابوں پر انعام دے چکا ہے۔

کتاب و مصنف	انعام
نظر نامہ (سفرنامہ) محمود نظامی مرحوم	ایک ہزار روپیہ
اقبال اور تصوف (ادبی تنقید) عبدالغنی نیازی	پانچ سو روپیہ
نقد میر (ادبی تنقید) ڈاکٹر سید عبداللہ	پانچ سو روپیہ
تار پیراہن (مجموعہ نظم) شان الحق حقی	پانچ سو روپے
بیریم کا بونیٹ (افسانہ) انتظار حسین	ڈھائی سو روپے
جبلت مرگ (نفسیاتی مضمون) شہزاد احمد	ڈھائی سو روپے
جدید فارسی کا تاریخی اور لسانی پس منظر (تحقیق) عبدالشکور احسن	دو سو روپے
سرسید احمد خان، حالات و افکار (ادبی جائزہ) مولوی عبدالحق	ایک ہزار روپے
تذکرہ صوفیائے سندھ (تحقیق) اعجاز الحق قدوسی۔	پانچسو روپے
اسلامی تصوف اور اقبال (ادبی تنقید) ڈاکٹر ابو سعید نور الدین	پانچسو روپے
مقدمہ جدید اردو لغت۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق	پانچ سو روپے
داستان زبان اردو (لسانیات) ڈاکٹر شوکت سبزواری	ایک ہزار روپے
تاریخ تعلیم۔ خالد یار خان	ایک ہزار روپے
داستان سے افسانہ تک (ادبی جائزہ) وقار عظیم	پانچ سو روپے
ثقافتی اردو (تحقیق) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں	ایک ہزار روپے
اردو میں سوانح نگاری۔ ڈاکٹر سید شاہ علی	دو ہزار روپے
الشجاع	

- وادیٔ سندھ میں دراوڑی باقیات

عین الحق فرید کوٹی	ایک ہزار روپے
وہ لوگ (ڈراما) ہاجرہ مسرور	ایک ہزار روپے

یونیسکو انعام

یہ انعام بھی ۱۹۵۸ء سے شروع ہوا ہے۔ پاکستان کی قومی زبانوں میں پڑھی لکھی آبادی کی ضروریات اور ذوق کی کتابوں پر یونیسکو کی طرف سے یہ انعام دیا جاتا ہے۔ ہر دو سال کے بعد یہ تقسیم ہوتا ہے اور جن موضوعات پر غور کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) آسان سائنس (۲) بین الاقوامی افہام و تفہیم اور سماجی ارتقا (۳) مفید فنون کی تعلیم۔

انعام تین کتابوں پر ملتا ہے اور اس کی مالیت چار سو ڈالر فی کتاب ہوتی ہے۔ یہ ادارہ اب تک ان حضرات کو انعامات سے نواز چکا ہے۔ میجر آفتاب حسن۔ علاؤ الدین خالد۔ عبدالمجید سالک۔ ایم۔ ایچ۔ مسعود بٹ۔ ڈاکٹر ایم عبدالسمیع غلام رسول مہر۔ شاہدہ حلیم۔ علی ناصر زیدی۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔

نیشنل بنک آف پاکستان کا انعام

پچیس ہزار روپے کا یہ انعام اردو، بنگالی اور انگریزی کی ایسی کتابوں پر دیا جا رہا ہے جو پاکستان کی معاشی ترقی کے بارے میں مستند سائنٹیفک، فنی اور پیشہ ورانہ ہیں۔ یہ تین انعامات ہیں۔ ان میں پانچ ہزار روپے کا ایک انعام اردو کی اس بہترین کتاب کو دیا جاتا ہے جو پاکستان میں معاشیات کے کسی پہلو پر لکھی جاتی ہے۔ دوسرا پانچ ہزار روپے کا انعام سائنس کے موضوع پر اس بہترین کتاب کو دیا جاتا ہے جو کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر لکھی گئی ہو۔

اباسین آرٹ سوسائٹی پشاور کے اردو تخلیقات پر انعام

اباسین آرٹ سوسائٹی پشتو زبان کی بقا اور ارتقا کے لئے کوشاں ہے۔ لیکن ۱۹۵۸ء سے اس ادارے نے اردو کے افسانوی

شعری، تنقیدی، تاریخی، ثقافتی، سوانحی، نثری اور ڈرامائی تحریروں پر بھی انعامات دینے شروع کئے ہیں ہر انعام کی رقم جو ان دو کتابوں کو دی جاتی ہے پانچ سو روپے ہے۔ ڈھائی سو روپے کی رقم ڈراموں کو الگ دی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل کتب پر یہ سوسائٹی انعام دے چکی ہے۔

سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء انغرے (ڈراما) ۵۰۰ روپے

سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء خوشحال و اقبال (تنقید)
میر عبدالصمد ۳۰۰ روپے

سنہ ۱۹۶۱ء یوسف زئی افغان (تاریخ)
اللہ بخش یوسفی ۲۰۰ روپے

سنہ ۱۹۶۲-۶۳ء اپنے دیس میں (افسانے)
فہمیدہ اختر ۱۰۰ روپے

سنہ ۱۹۶۲-۶۳ء پٹھان اور ذوق سلیم (ثقافت)
خاطر غزنوی ۲۵۰ روپے

سنہ ۱۹۶۲-۶۳ء سرحد کے مشائخ اور علماء (سوانح)
مولانا سید محمد امیر شاہ ۲۵۰ روپے

سنہ ۱۹۶۳-۶۴ء شاعر انسانیت (تنقید) میر عبدالصمد ۵۰۰ روپے

بچوں کے ادب پر انعامات

اردو ترقی بورڈ اور ادارہ مصنفین پاکستان کے اشتراک سے یہ انعام سنہ ۱۹۶۳ء سے دیا جا رہا ہے بچوں کے ادب پر جو کتابیں چھپتی ہیں ان پر لاگت زیادہ آتی ہے اور قیمت کم رکھنی پڑتی ہے لہذا ناشرین ایسی کتابیں چھاپنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ انعام بچوں کے ادب کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کسی حد تک مفید ثابت ہو رہا ہے۔ انعام ڈھائی ہزار روپے کا ہے، چھ انعامات دیئے جاتے ہیں۔ یہ انعامات حاصل کرنے والوں میں مسلم ضیائی۔ انور عنایت اللہ۔ عصمت جعفری۔ رحمٰن مذنب۔ رضیہ فصیح احمد اور نکہت سلطانہ کے نام نمایاں ہیں۔

بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن (مغربی پاکستان) کے انعام

یہ انعام سنہ ۱۹۶۱ء سے شروع کیا گیا اس سے ایک ایک ہزار روپے کے انعامات مقرر کئے گئے ہیں۔ بہترین مختصر افسانہ، ایکانکی ڈراموں اور تمثیلوں پر یہ انعام دیا جاتا ہے سنہ ۱۹۶۳ء میں جو انعامات دیئے گئے وہ یہ ہیں —

افسانے۔ نیا دور۔ شریف احمد ۵۰۰ روپے
کھیت جاگ اٹھے۔ خالد مسعود ۳۰۰ روپے
میاں اندازہ۔ عبدالحق شہباز ۲۰۰ روپے
ایکانکی ڈرامے۔ گھر کی رونق۔ آغا ناصر ۵۰۰ روپے
صبح کا بھولا۔ انور عنایت اللہ ۳۰۰ روپے
خونی چٹان۔ رحیم گل ۲۰۰ روپے

دیدہ زیب کتابوں پر انعامات

نیشنل بک سینٹر کی طرف سے آٹھ ہزار روپے کا انعام ایسی کتابوں کو دیا جاتا ہے جن کا صوری حسن، ترتیب، ڈیزائن، طباعت اور تصاویر بہتر ہوں۔ ان کتابوں کا تعلق ان کے مواد سے نہیں ہوتا اردو زبان کے مقابلے میں اوّل آنے والی دو کتابوں پر ایک ایک ہزار روپے کے انعامات مقرر کئے گئے ہیں ان میں ایک انعام بچوں کی کتاب کے لئے مخصوص ہے پانچ پانچ سو روپے کے دو انعامات دوسرے نمبر پر آنے والی کتابوں کے لئے ہیں ان میں بھی ایک انعام بچوں کی کتاب کے لئے ہے۔ یہ چاروں انعامات ناشرین کے لئے ہیں۔ پانچ پانچ سو روپے کے دو انعامات اردو کی کتابوں کے مصوروں کو بھی دیئے جاتے ہیں سنہ ۱۹۶۲ء میں یہ انعام مندرجہ ذیل ناشرین نے حاصل کئے۔

نیا ادارہ لاہور ۱۰۰۰ روپے
اردو اکیڈیمی سندھ ۵۰۰ روپے
(بچوں کے لئے) الائیڈ بک کارپوریشن کراچی ۵۰۰ روپے

تزئین کے انعام

سنہ ۱۹۶۳ء میں ان حضرات کو دیئے گئے۔

بشیر مرزا۔ فیروز سنز کی کتاب کشمیر کی بیٹی کے سرورق کے لئے۔ ۵۰۰ روپے

تریٹی۔ اے۔ تمنائی (ماہر طباعت) مجھے اعتراف ہے
کی تمام تر پبلی کیشن پر۔ ۵۰۰ روپے
محسن اعظم اور محسنین۔ فقیر سید وحید الدین (مصنف و پبلشر) ۱۰۰۰ روپے
معیار نیا ادارہ۔ لاہور ۵۰۰ روپے
گگو میاں (بچوں کے لئے) فیروز سنز لاہور ۱۰۰۰ روپے
جیتی جاگتی کہانیاں (بچوں کے لئے)
کتاب نما۔ لاہور۔ ۵۰۰ روپے

مصوری کے انعام

آذر زوبی کو اردو اکیڈمی سندھ کی کتاب "نیم روز" کے سرورق پر۔ ۵۰۰ روپے
اور ردیا احمد۔ ارم احمد۔ عروج اور جمیل کو عکراش پریس کی کتاب "دیہہ کی دنیا" کی تصاویر کے لئے ۵۰۰ روپے دیا گیا۔

پاکستان میں آج جو علمی ادبی ادارے مصروف عمل ہیں اور اردو ادب کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں حکومت نے ان اداروں کی مالی اعانت بھی کی گئی ہے اور تخلیقات کی اشاعت کا انتظام بھی کیا ہے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کتنی کتابیں چھپی ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے۔

ترجموں پر ہمارے ہاں زیادہ توجہ نہیں کی جاتی۔ ترجمہ میں ان کتابوں کا خیال رکھا جاتا ہے جو پروپیگنڈے کی خاطر آتی ہیں لیکن ایسی کتابوں کی نوعیت زیادہ تر سیاسی اور مذہبی ہوتی ہے۔ پھر بھی گذشتہ دس سال میں طالسطائی، دوستوفسکی ترجنیف۔ شولوخوف۔ ہارڈی۔ گورکی، ہنری جیمز۔ بلزاک۔ موپاساں۔ سارتر۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ وغیرہ کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس سلسلے میں فیروز سنز۔ مکتبہ فرینکلن۔ مکتبہ جدید۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز زیادہ اہم ہیں

بچوں کے مصنفین بچوں کے لئے لکھنے والے کم ہیں اسی لئے بچوں کے ادب پر کتابیں لکھنے کی طرف توجہ بہت کم ہوئی ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں کی کمی ہے یا یہ کہ اعلیٰ پائے کے ادیب بچوں کے لئے نہیں لکھ سکتے۔ مگر تا قدر ایسی کتابوں کو چھاپنے کی نہ جانے کیوں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی تک علمی ادبی اداروں نے بھی بچوں کے ادب کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد بچوں کی نفسیات پر تھوڑی سی بہت کتابیں شائع ضرور ہوئی ہیں۔ مگر آج بھی بچوں کے لئے بہترین کتابوں کا کال ہے۔

بچوں کے لئے نثر میں لکھنے والے انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں اور جو اچھے لکھنے والے تھے یا ہیں ان کو ابھی تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مرزا ادیب، مسلم ضیائی، حسن عابدی، کمال احمد رضوی، رحمٰن مذنب لطیف فاروقی، عشرت رحمانی، ایم اسلم، وقار بن الٰہی، انور عنایت اللہ انتظار حسین۔ الطاف فاطمہ، علی ناصر زیدی، اشرف صبوحی، یکتا امروہوی اور عشرت رحمانی بچوں کے لئے گاہے گاہے لکھتے ہیں لیکن بالالتزام نہیں لکھتے۔ بچوں کے لئے اردو میں مولانا ارشد تھانوی مرحوم نے سب سے زیادہ لکھا۔ انہوں نے بچوں کے مشہور مغربی مصنف "ہینس اینڈرسن" کو بھی بچوں کی کہانیوں کے سلسلہ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ مولانا مرحوم تقریباً پانچ سال تک ریڈیو پاکستان سے متعلق رہے اور ملازمت ترک کرنے کے بعد بھی انتقال سے ایک سال قبل تک بچوں کے لئے مسلسل لکھتے رہے۔ ان کی کہانیاں ریڈیو پاکستان سے باقاعدگی سے نشر ہوتی رہیں اور اب بھی گاہے گاہے نشر ہوتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مولانا ارشد تھانوی نے ایک ہزار سے زائد کہانیاں بچوں کے لئے لکھی ہیں جو ریڈیو پاکستان سے نشر ہو چکی ہیں لیکن یہ اردو ادب کا المیہ ہے کہ ابھی تک کسی علمی ادبی ادارے نے ان کہانیوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جبکہ یہ کہانیاں بچوں کے ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر اب بھی علمی ادبی ادارے کوشش کریں تو یہ کہانیاں ریڈیو پاکستان کراچی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ورنہ پھر ان کا حصول ممکن نہ ہوگا

نثر کے علاوہ بچوں کے لئے اچھی نظمیں لکھی ضرور گئی ہیں مگر ان کی تعداد ضرورت کے اعتبار سے کم ہے۔ بچوں کے لئے صوفی تبسم، عبدالمجید

بھی۔ مولانا ارشد تھانوی۔ ابن انشا۔ قیوم نظر۔ سراج الدین ظفر اور محشر بدایونی نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ معیاری کہی جا سکتی ہیں اور بچوں کی نفسیات کے مطابق بھی۔ نظموں کے کئی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں جن میں بیشتر بچوں میں مقبول ہوئے۔ بچوں کے لئے کچھ رسائل بھی نکل رہے ہیں ان میں تعلیم و تربیت۔ ہدایت۔ ہمدرد نونہال۔ ستارہ وغیرہ خاص ہیں اس کے علاوہ بھی رسائل ہیں لیکن ان میں سے اکثر غیر معیاری ہیں اور ان میں جو مواد شائع ہوتا ہے وہ بچوں کے ذہن پر ناخوشگوار تاثرات مرتب کرتا ہے دینی کتابوں میں بھی ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں اردو میں موجود ہیں ۱۹۵۸ء کے بعد ان اداروں کو امداد دی گئی ہے جو عربی یا دوسری زبانوں سے اردو میں دینی کتابوں کے ترجمے کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں تاریخ اسلام سے متعلق ہیں مفتی انتظام اللہ شہابی نے دینی ادبیات کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ رسائل کے سلسلے میں بھی گزشتہ دس سال بہت اہم ہیں لیکن اردو رسائل کے لئے اشتہار حاصل کرنے کا مسئلہ بڑا اہم رہا ہے۔ بہت سے رسالے بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ شروع ہوئے۔ ان پر کافی روپیہ صرف کیا گیا لیکن وہ زیادہ عرصہ نہ چل سکے۔ اردو کے وہ رسائل جو نکلے اور دو چار نمبروں کے بعد بند ہو گئے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن ان میں سے چند ایسے بھی تھے کہ اگر وہ زندہ رہ جاتے تو اردو ادب کی بہت خدمت کرتے۔ گزشتہ دس سالوں میں جن لوگوں نے اردو ادب میں تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ ڈاکٹر عبدالحق (مرحوم) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ علامہ نیاز فتح پوری (مرحوم) ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور ڈاکٹر سہیل بخاری بہت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بڑے پائے کے مقالے لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں ان لکھنے والوں میں جمیل جالبی۔ نظیر صدیقی۔ ممتاز حسین ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اسلم فرخی۔ ڈاکٹر خان رشید۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ وقار عظیم سلیم احمد۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ ڈاکٹر صفدر حسین۔ انتظار حسین۔ شمیم احمد اہم ہیں۔ ہمارے ہاں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اس سے خوشگوار امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ گزشتہ دس سال میں اردو افسانے نے غیر معمولی ترقی کی ہے پاکستانی فنکاروں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں جن کو ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، شعراء نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اسکے لئے بڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔

گزشتہ دس سالوں میں جن نئے شاعروں نے اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کی ہے ان میں ناصر کاظمی۔ مصطفیٰ زیدی۔ محسن بھوپالی۔ عبدالعزیز خالد۔ عبیداللہ علیم۔ فرید جاوید۔ احمد فراز۔ ادا جعفری۔ تاب اسلم خاص ہیں۔ اسکے علاوہ نئے اور پرانے شاعروں نے اردو غزل اور نظم میں اہم اضافے کئے ہیں۔ ناول کے میدان میں گزشتہ دس سال اس لئے اہم ہیں کہ ان دس سالوں میں چند اچھے ناول لکھے گئے ہیں یہ ناول اردو ناول لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ ان ناولوں کے نام یہ ہیں۔ آگ کا دریا۔ قرۃ العین حیدر۔ خون جگر ہونے تک۔ فضل احمد کریم فضلی۔ آنگن خدیجہ مستور۔ دستک نہ دو۔ الطاف فاطمہ۔ علی پور کا ایلی۔ ممتاز مفتی۔ اداس نسلیں۔ عبداللہ حسین۔ تلاش بہاراں۔ جمیلہ ہاشمی۔ سنگم۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ شہر بے مثال۔ بانو قدسیہ۔ خدا کی بستی۔ شوکت صدیقی۔ آبلہ پا۔ رضیہ فصیح احمد۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شروع ہونے والی بھارت اور پاکستان کی سترہ روزہ جنگ نے ہمارے ادیبوں شاعروں اور ڈراما نگاروں کو نئے موضوعات دیئے اس دور میں بڑی تیزی کے ساتھ لکھا گیا ہر رسالے نے خصوصی نمبر نکالے اور ہر سال ستمبر کے مہینے میں خصوصی نمبر نکالے جاتے ہیں۔ ان نمبروں میں نقوش کا جنگ نمبر اور نقوش کا جنگ نمبر بے حد اہم ہیں۔ اس جنگ کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔ چھ ستمبر۔ شکست در شکست۔ آزمائش کی گھڑی۔ پاکستان میدان جنگ میں۔ ہماری جانباز افواج کو دنیا بھر کا خراج عقیدت۔ رن کچھ سے چونڈہ تک۔ سیالکوٹ زندہ رہے گا۔ جنگ آمد۔ جنگ ترنگ۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء۔ تگ و تاز جاودانہ (پاک فوج کی کہانی) قومی ترانے اور نظمیں۔ رزمیہ گیت۔ نوائے پاک۔ بارود اور ایمان۔ واپسی (افسانوں کا مجموعہ۔ یہ سترہ افسانے ہیں اور ہر افسانے کا پس منظر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے)

گزشتہ دس سال میں اردو ادب نے جو ترقی کی ہے اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اجمالی جائزہ ادب کے تمام پہلوؤں کو اجاگر نہیں کر سکتا۔ بحیثیت مجموعی ادب کے لئے یہ دس سال سازگار ثابت ہوئے اور تخلیقی کاموں میں تیز رفتاری پیدا ہو چکی ہے اور اس دور کا ادب خود اعتمادی۔ عزم۔ جوش۔ ولولے اور یقین محکم کا مظہر ہے۔

ہمارے نام

ڈاکٹر ابو محمد سحر

سالنامہ موصول ہوا، شکریہ۔ معیار کی بلندی اور مواد کی رنگا رنگی کا پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا۔ تصاویر کے ذریعہ سے ایک ساتھ اتنے اہل قلم سے پڑھنے والوں کو شاید اس سے پہلے کسی پرچے نے روشناس نہیں کرایا۔ کتابت و طباعت بھی شروع سے آخر تک اعلیٰ درجے کی ہے۔ ایسا اچھا سالنامہ نکالنے کے لئے آپ کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ (بھوپال)

ایوب جوہر

الشجاع کا سالنامہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مضامین۔ نظمیں غزلیں افسانے تراجم ڈرامے۔ نکاہیہ مضامین سب معیار کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ اتنی اچھی غیر مطبوعہ تخلیقات کو یکجا کر دینا آپ ہی کا کام تھا بلکہ یہ کہوں کہ یہ ادبی معجزہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ کو اس عظیم کارنامہ پر جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ مضامین میں فرمان فتحپوری۔ سلیم احمد۔ ڈاکٹر سحر، محمود ہاشمی ڈاکٹر احسن فاروقی، افضل صدیقی اور تمیم احمد کے مضامین موضوع کے اعتبار سے انفرادی نوعیت کے حامل ہیں۔ البتہ ڈاکٹر اسلم فرخی اور جمیل جالبی کے مضامین ان کے دوسرے مضامین کے مقابلہ میں بہت ہلکے پھلکے ہیں۔ افسانوں میں کوثر چاند پوری۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ اقبال متین۔ شہلا تزئین۔ عفت ․․ نہانی حسن اجمل مسرت۔ مالک ٹالہ۔ علی احمد شاہدی انیسہ ملال۔ م م راجندر اور زکی الور کی تخلیقات نے خاصا متاثر کیا۔ تینوں ڈرامے اچھے ہیں لیکن فرمن کا جواب نہیں۔ ایسے کامیاب ڈرامے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ رخشندہ بہار کے ڈرامے کا موضوع لاجواب ہے لیکن اختصار نے اس کے حسن کو پوری طرح اجاگر نہیں ہونے دیا اور تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ (ڈھاکہ)

سید حرمت الاکرام

الشجاع کا سالنامہ دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اگر رسائل خصوصی شمارے شائع کریں تو الشجاع کے سالنامے کی طرح ان کا باوزن و

الشجاع

باوقار ہونا لازمی ہے۔ سالنامے میں مقالات کا حصہ خاص طور پر معیاری ہے ورنہ بیشتر جرائد میں مرعوب کن ناموں اور عنوانوں کے ساتھ چھپنے والے مضامین عموماً کھوکھلے ہوتے ہیں۔ افسانوں نظموں اور غزلوں کے انتخاب میں بھی بڑی حد تک خوش مذاقی کی کار فرمائی ہے جس کی قدر بلند خیال ادبی حلقوں میں یقیناً کی جائے گی۔ سلمان الارشد اور رخشندہ بہار کے ڈرامے خصوصیت کے ساتھ لائق توجہ ہیں۔ ان میں انفرادیت کے پہلو بہ پہلو بڑی دلپذیری بھی ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے۔ (مرزا پور)

محسن بھوپالی

سالنامہ "الشجاع" نظر نواز ہوا۔ یہ آپ کا ہی دل گردہ تھا کہ آپ نے برصغیر ہند و پاک کے تمام ممتاز لکھنے والوں اور ان کے دوش بدوش چند نئے لیکن مستقبل کے بڑے ناموں کو یکجا کر دکھایا۔ آپ کی کاوش بلکہ عرق ریزی کی داد نہ دینا بددیانتی ہوگی اسقدر عظیم و ضخیم نمبر کی اشاعت پر ادارہ بجا طور پر مبارکباد کا مستحق ہے۔ مجھے سرشار صدیقی۔ رضی اختر شوق۔ زبیر رضوی۔ سحر انصاری اور انجم اعظمی کی نظمیں بطور خاص پسند آئیں۔ اچھی غزلیں تو مل ہی جاتی ہیں لیکن نظموں کا حاصل کرنا دردِ سر سے کم نہیں۔

حصۂ مضامین سیر حاصل اور وقیع ہے۔ ادبی تنقید کے کم و بیش ہر گوشے پر کوئی نہ کوئی مضمون زینتِ الشجاع ہے۔ فرمان فتحپوری اور سلیم احمد کے مضامین خاصے کی چیز ہیں۔ اشتیاق طالب کا مضمون عنوان کی مناسبت سے زیادہ محنت کا طالب تھا لیکن انھوں نے سہل پسندی سے کام لیتے ہوئے بندھے ٹکے ناموں اور چند کراچی والوں کے نام شامل کر کے مضمون ختم کر دیا۔

(حیدر آباد۔ مغربی پاکستان)

پروفیسر شعیب راہی

آپ نے بہت خوبصورت سالنامہ نکالا ہے مبارکباد

ترقی دا صلاحات نمبر

قبول فرمائیے۔ سالنامہ میں آپ نے پاک و ہند کے تقریباً تمام ممتاز فنکاروں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس خصوصی شمارے کے ذریعے نئے اور پرانے فنکاروں کی فکر اور ذہن کا آسانی سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ (ڈالٹن گنج)

تاج سعید مدیر ارژنگ

سالنامہ الشجاع نظر نواز ہوا۔ اس نمبر پر آپ نے خاصی محنت کی ہے۔ کہانیوں کا حصہ بہت جاندار ہے۔ رشیدہ رضویہ اور انور عنایت اللہ کے افسانے معنی خیز ہیں۔ سلمان الارشد کے ڈرامے "خرمن" نے بہت لطف دیا۔ (پشاور)

عادل رشید

الشجاع کا سالنامہ ملا۔ سرورق ہی دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ابھی سرسری مطالعہ کیا ہے اور اسی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ یہ نمبر خاصا کامیاب ہے۔ تنقیدی و تہذیبی مضامین بلند پایہ ہیں۔ کہانیاں خوبصورت، نظمیں معیاری۔ ڈرامے اثر انگیز۔ تراجم معیاری اور غزلیں گوارا ہیں۔ اگر حصہ غزل پر مزید توجہ دی جاتی تو یہ حصہ کمزور نہ رہتا۔ بہرنوع اس ادبی کساد بازاری کے دور میں ایسا شاندار نمبر شائع کرنا بھی بہت بڑی بات ہے۔ تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (لکھنؤ)

رقیہ فاروقی۔ ایم اے

الشجاع کا یوں تو ہر نمبر اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہوتا ہے لیکن سالنامہ دیکھ کر میں ادارہ الشجاع کی کارکردگی کی قائل ہو گئی۔ اس زمانہ میں جبکہ عظیم شعرا اور نقاد و افسانہ نگار بھی اچھی چیزیں نہیں لکھ رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایسی پیاری اور اچھی تخلیقات کیسے حاصل کر لیں۔ ایک ہی نشست میں سارے افسانے پڑھ ڈالے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس شمارے میں افسانہ نگار خواتین کا پلہ بھاری ہے۔ رشیدہ رضویہ، عفت موہانی، انیسہ جلال، نکہت اقبال اور شہلا تزئین کی کہانیاں سب سے اچھی ہیں۔ بیگم تاج فرخی کے تنقیدی مضمون رخشندہ بہار کے ڈرامے اور سرور جمال کے مزاحیہ مضمون نے یہ ثابت کر دیا کہ ہماری فنکار خواتین اصناف ادب میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ نے سالنامہ کا میک اپ صرف بڑے ناموں سے نہیں کیا ہے بلکہ نئی نسل کے ذہین فنکاروں اور خواتین کو بھی سالنامہ میں مناسب نمائندگی دی گئی ہے۔ صرف اعتراض اس پہ ہے کہ آپ نے خواتین کی تصاویر الگ شائع کر کے ریل کے زنانہ درجہ کی طرح ان کی صلاحیتوں کو محدود کرنے کی کوشش کیوں کی ہے۔ بہرنوع اس سالنامہ کے لئے آپ لائق ستائش ہیں۔ نہ جانے کیوں شعری حصہ میں آپ نے خواتین کو نظرانداز کیا ہے جبکہ پاک و ہند میں اچھی شاعرات کی کمی نہیں ہے۔ (لاہور)

اوشا سیٹھ

سالنامہ الشجاع کے بارے میں میرا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اتنا ہی لکھ سکتی ہوں کہ صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے لاجواب ہے۔ بے نظیر ہے اور آپ کی کاوش اور ژرف نگاہی کا آئینہ دار۔ خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ (پنڈری)

شفقت کاظمی

سالنامہ کی ترتیب و تدوین بہت پسند آئی۔ مقالات خاصے فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی ستھرا اور آپ کی سلیم المذاقی کا آئینہ دار ہے اپنی اس کامیاب پیشکش پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ (ڈیرہ غازی خاں)

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ آپ نے انتہائی کامیاب نمبر شائع کر دیا۔ جی خوش ہوا۔ ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر ہے۔ مضامین کا حصہ منتخب ہے اور تنوع بھی ہے منظوم حصہ اور کہانیاں بھی خوب ہیں۔ غیر ملکی اور علاقائی زبانوں کے تراجم نے اسے اور زیادہ وقیع بنا دیا ہے۔ (بھوپال)

فرید انصاری

الشجاع کا سالنامہ دیکھ کر ہدیہ تبریک پیش کرنے کے

لئے جو الفاظ مستعمل ہیں ان کی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شاندار کارنامہ پر کن الفاظ میں مبارکباد دوں۔ سالنامہ میں جو کہانیاں شامل ہیں ان کے بارے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ گزشتہ دو تین سال میں اتنی اچھی کہانیاں پڑھنے کو نہیں ملی تھیں۔ نظمیں بلند پایہ ہیں یہ دوسری بات ہے کہ غزلوں پر "نام بڑے اور درشن چھوٹے" کا مقولہ صادق آتا ہے ڈرامہ "نومن" کو تو میں شاید برسوں نہیں بھلا سکوں گا۔

(ملتان)

علی احمد شاہدی

سالنامہ کافی حد تک پڑھ چکا ہوں۔ علمی ادبی و جمالیاتی حظ و مسرت جو سالنامے کے مطالعہ سے ہوتی وہ بیان سے باہر ہے۔ سالنامہ صوری حیثیت سے جس قدر دلکش ہے معنوی اعتبار سے اسی درجہ دلآویز۔ جانے آپ نے اس تمام معیاری و بلند پایہ مواد کے حصول ترتیب و تدوین اور انتخاب میں کتنے دن کا چین اور کتنی راتوں کی نیند اور آرام قربان کیا ہوگا۔ میں تبصرے کا حق تو نہیں ادا کر سکتا صرف اپنی رائے لکھ رہا ہوں شمیم احمد اور افضل صدیقی کے مضامین وقت کے اہم تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ ہمارے کلچر سے متعلق ان دنوں پاکستان کے ادبی حلقوں میں بہت ہی گرما گرم بحث جاری ہے۔ شعیب سبحانی نے بڑے ہی باشعور اور دانشمند سیاسی مبصر کی طرح عرب ملکوں کے سیاسی و قومی حالات پر تجزیاتی تبصرہ کیا ہے۔ عرب ملکوں کا انتشار و نفاق اس دور کا بہت بڑا "اسلامی" المیہ ہے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب کا مضمون اعلیٰ عالمانہ فکری سوجھ بوجھ کا نادر نمونہ ہے "توبۃ النصوح" پڑھ کر تشنگی کا احساس بڑھ گیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مضمون افادی نوعیت کا حامل ہے سلیم احمد کی تنقید کا بے لاگ اور تیکھا انداز ہی ہے جس نے انھیں دنیائے ادب میں باوقار اور دانشورانہ مقام دیا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد اور بیگم تاج فرخی نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جس پر ماضی میں بہت کچھ لکھا جانا چاہئے تھا لیکن توجہ نہیں دی گئی کیا اچھا ہوتا کہ اشتیاق طالب صاحب الشجاع

دوسری اصناف سخن کا احاطہ بھی اپنے مضمون میں کرتے جیسا کہ عنوان سے بھی شک گزرتا ہے۔ آخر افسانہ نگاروں کی آوازیں کیوں صدا بصحرا کا مصداق بن رہی ہیں۔ ڈاکٹر فرخی سے سیر حاصل مضمون کی توقع تھی درسی انداز نے مایوس کیا۔

نظموں کے اور غزلوں کے بارے میں کیا لکھوں۔ میرا میدان نہیں ہے۔ بہر حال سب جانے پہچانے نام ہیں اور ان کا جانا پہچانا رنگ۔ افسانوں کا حصہ اتنا ہی متنوع ہے جتنا کہ تنقید کا باب۔ ڈاکٹر فاروقی کا افسانہ اتنا مکمل اور اتنا حسین ہے جیسا کہ کسی سیم تن دوشیزہ کی دھانی بانکوں سے مزین کلائی۔ کوثر چاندپوری صاحب نصف صدی سے لکھ رہے ہیں اور برصغیر ہندو پاکستان کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ "جنون کی موت" کا موضوع اچھوتا بھی ہے اور فکر انگیز بھی افسانہ کی اٹھان بھی خوب ہے۔ پر ایسا لگتا ہے کہ کلائمکس میں چوک گئے ہیں۔ انیسہ جلال کے افسانے کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ دیویندر اسر صاحب نے اپنی بات مصوری کے سمبل کے انداز میں کہی ہے۔ سڑک بڑا پیارا افسانہ ہے گہرا تاثر چھوڑ گیا دل پر۔ انور عنایت اللہ صاحب کی کہانی موضوع کے لحاظ سے پرانی لیکن فارم کے اعتبار سے جدید ہے اس لئے بات بن گئی۔ جوگندر پال صاحب نے کتنی ہی انٹلکچول باتیں کی ہوں۔ لیکن کہانی نہیں کہہ سکے۔ آپ نے اس انشائیہ کو افسانہ کے عنوان کے تحت کیوں دیا۔ تجریدی افسانہ نگاری کا یہ انداز رواج پا گیا تو لوگ افسانے پڑھنا چھوڑ دیں گے۔ عفت موہانی کا افسانہ حسن بیان کی اچھی مثال ہے۔ پلاٹ میں جھول نہ ہونے کے باوجود کافی حد تک نباہ لیا گیا۔ بڑی بہن سے سلمیٰ کے للّہی بغض کا معقول جواز افسانے میں موجود نہیں جبکہ سیما کا عمل کبھی اس کے ساتھ جابرانہ نہیں رہا۔ زکی انور صاحب کو کہانی کہنے کا خوبصورت انداز آتا ہے ورنہ وہ اس پرانے موضوع کو لے کر ایسی مکمل کہانی نہ لکھ پاتے۔ حسن اجمل صاحب نے اس اس دور کے انسان کی سب سے بڑی اور عام فطری و اخلاقی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ افسانہ کے اختتام پر دجلان تلملا ترقی و اصلاحات نمبر

افشاں "پت جھڑ" کا پلاٹ بڑا دلچسپ ہے لیکن ٹریٹ منٹ کچھ کمزور ہے۔ بات جو کہنی تھی وہ اتنی طوالت طلب نہ تھی، غیر ضروری جزئیات کی وجہ سے افسانہ طویل ہو گیا۔ تینوں ڈرامے اچھے ہیں اگر آپ کے ڈرامے "خرمن" کی ستائش کروں تو شاید اسے جانبداری پر محمول کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں جو کامیاب ڈرامے لکھے گئے ہیں "خرمن" ان میں سے ایک ہے۔ نقطہ عروج، مکالموں کی برجستگی اور ایک فنکارہ کے حسین ذہن کے نفسیاتی تجزیے نے اس ڈرامے کو قدر اول کی تخلیق بنا دیا ہے۔ تراجم میں ایوب جوہر کی پنجابی کہانی "دوسری موت" پڑھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایسی خوبصورت کہانی ہے جس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ (کراچی)

قیصر اقبال

سالنامہ نظر نواز ہوا۔ اس قدر معیاری و جامع سالنامہ پیش کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں الشجاع کا یہ سالنامہ ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ (دیپالپور)

غلام مرتضیٰ راہی

پاک وہند کے ممتاز قلمکاروں کی تخلیقات سے مزین الشجاع کا سالنامہ اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور یہ اردو ادب کی تاریخ میں محفوظ رہے گا۔ اس جگر کاوی کے لئے آپ بجا طور پر داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ (فتح پور)

اسلم نعمانی

سالنامہ الشجاع کی فہرست دیکھ کر ہی دنگ رہ گیا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ جولائی کے شمارے کے بعد اگست میں اتنا ضخیم اور معیاری سالنامہ آپ نے کیسے شائع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کہیں سے الہ دین کا چراغ مل گیا ہے۔ ورنہ اتنی جلدی اتنے اچھے معیاری مضامین نظم و نثر آپ نے کیسے حاصل کر لئے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین اثر انگیز اور مضمون نگاروں کی بالغ نظری کے آئینہ دار ہیں، اگر آپ برا نہ مانیں تو ضرور عرض کروں گا کہ "حالی" اور "توبۃ النصوح" یہ دونوں مضمون الشجاع سالنامہ کے لئے موزوں نہیں تھے گو لکھنے والوں کے نام ضرور بڑے ہیں مگر کام؟ یہ سوچنا آپ کا فرض تھا۔ اسی طرح غزلیں چند کے سوا بے کیف اور روایتی انداز کی ہیں ان ممتاز اور مشہور شعرا کی غزلوں کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ "اونچی دکان پھیکا پکوان"۔ سلیم احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی۔ بیگم تاج فرخی، ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، محمود ہاشمی، شمیم احمد اور افضل صدیقی کے مضامین خاصے کی چیز ہیں افسانوں میں۔ دلیپ ندرا سر، انیسہ جلال، کوثر چاند پوری اقبال متین۔ عفت موہانی۔ زکی انور، حسن اجمل مسرت۔ انور عنایت اللہ جوگندر پال، ڈاکٹر احسن فاروقی اور رشیدہ تزئین کی کہانیاں جاندار ہیں۔ علاقائی زبانوں کی کہانیوں میں ایوب جوہر کی کہانی "دوسری موت" لاجواب ہے۔ آتش کہانی بھی خوبصورت ہے اور شاہدہ برنی نے اس کو اس خوبصورتی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ اس پر طبعزاد کا گمان ہوتا ہے۔ ڈرامہ "خرمن" بے انتہا اثر انگیز خوبصورت اور ڈرامائیت سے بھرپور ہے خاص طور پر اس کا آخری منظر چونکا دینے والا ہے۔ بادلوں کا سایہ مکمل نہیں ہے ویسے اس کی اٹھان اچھی ہے۔ درخشندہ بہار نے "منزل" میں جس موضوع کو چھیڑا ہے وہ وقت کی آواز ہے لیکن جس عجلت سے یہ ختم ہوا ہے اس کی بنا پر اس کی اثر انگیزی برقرار نہیں رہ سکی۔ سرور جمال کا "انشائیہ" خوب ہے۔ احمد جمال پاشا کا طنزیہ اچھا ہے مگر ان سے اس سے بہتر تخلیق کی توقع تھی۔ بشر نواز، ملراج کومل۔ پروفیسر شور، زبیر رضوی انجم اعظمی شاذ تمکنت۔ سرشار صدیقی سحر انصاری بمصحف اقبال توصیفی، منصور سعیدی، حرمت الاکرام سلیمان اریب اور فضا ابن فیضی کی نظموں کو اس سال کی بہترین نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سالنامہ کا سرورق اتنا دلکش اور خوبصورت ہے کہ دیر تک اس سے نظر نہیں ہٹتی ہے۔ اس کاوش پر آپ کو داد نہ دینا بیداد سے کم نہیں۔ خدا آپ کے عزائم کو مزید توانائی عطا فرمائے۔

(راولپنڈی)

ناز مصطفیٰ آبادی

سالنامہ الشجاع کے متعلق میری ناچیز رائے یہ ہے کہ الشجاع کا سالنامہ اردو جرائد کے ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والے تمام نمبروں پر بھاری ہے جس مضامین اور نظم تو جاندار ہے ہی لیکن افسانوں کا انتخاب لاجواب ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، کوثر چاندپوری، دیویندر اسر، اقبال متین جوگندر پال اور انور عنایت اللہ کے افسانے بیش بہا ہیں۔ (رامپور)

سید محمد اسلم وفا

الشجاع کا سالنامہ اپنی سابقہ روایات سے بہت آگے پہنچ گیا۔ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے بہت خوب اور بے حد کامیاب ہے۔ سالنامہ کا ہر صفحہ آپ کی جدت طرازی و انفرادیت پسندی کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے سالنامہ کو ادب کا حسین شاہکار بنادیا ہے۔ انتخاب معیاری اور ترتیب میں سلیقگی پیدا کرنا شاید آپ کا فن ہے۔ سالنامہ اس کا ثبوت ہے پرچے کی خوبصورتی کو دیکھ کر آپ کے سلیقہ اور نفاست کی داد دینی پڑتی ہے۔ واقعی بڑی جان ہے آپ کے عزائم میں۔ (کراچی)

ڈاکٹر عائشہ نازلی

خصوصی شماروں کے سلسلے میں مدیران جرائد بالعموم دعوے تو لمبے چوڑے کرتے ہیں مگر جب نمبر شائع ہوتے ہیں تو "ایک قطرہ خون نہ نکلا" والا مصرعہ یاد آجاتا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے سالنامہ کے سلسلہ میں کوئی دعوے نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود ایسا شاندار بلند پایہ اور خوبصورت نمبر شائع کرکے یہ ثابت کردیا کہ ادب کے خاموش خدمت گذار کس طرح ادب کی خدمت کرتے ہیں۔ پرانے اور ممتاز نئے لکھنے والوں کی شمولیت نے اس شمارے کو گویا نقارہ بنا دیا ہے۔ کوئی تخلیق درجہ دوم کی اس میں شامل نہیں ہے۔ ابھی پوری طرح یہ پرچہ پڑھ نہیں پائی ہوں۔ میری طالبات اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

(بڑودہ)

علی عباس امید

اتنا ضخیم اور معیاری سالنامہ نکالنے کے لئے بلاشبہ آپ داد کے مستحق ہیں۔ مضامین نظم و نثر کا انتخاب آپ کی ادارتی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ بیشتر تخلیقات نے بے پناہ متاثر کیا۔ (بھوپال)

تمکین نیازی

جمیل صاحب کے توسط سے سالنامہ الشجاع کے مطالعہ کا موقع ملا۔ مختلف پرچوں کے نمبر میری نظر سے گزرتے رہے ہیں مگر خدا لگتی کہوں گا کہ الشجاع کے سالنامے کا رنگ روپ سب سے مختلف ہے۔ کتابت طباعت دلکش، سرورق جاذب نظر اور مضامین لاجواب ہیں۔ مجھ جیسے ادب کے طالب علم کے لئے تنقیدی مضامین گوہر نایاب ثابت ہوئے۔ جدید نظموں سے قطع نظر مابقی نظمیں ہر جہت سے کامیاب ہیں۔ غزلوں میں نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش ہے۔ افسانے اتنے دلچسپ ہیں کہ کھانے پینے کا ہوش نہ رہے۔ ساتھ ہی بیک وقت تین ڈرامے اور وہ بھی انتہائی خوبصورت سائنسی کہانی دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ اس سالنامہ کی سب سے بڑی خوبی جس نے مجھے متاثر کیا یہ ہے کہ اس میں کوئی جنسی یا عریاں کہانی نہیں ہے اور نہ ہی غیر ملکی زبانوں کے سنسنی خیز اور ذہنوں میں تاریکی پھیلانے والے مضامین اور کہانیوں سے اس کے صفحات آلودہ ہیں۔ واقعی یہ رسالہ گھر کے ہر فرد کے مطالعہ کے لائق ہے۔ میں پوری دیانت داری سے کہہ سکتا ہوں کہ الشجاع کا سالنامہ مطالعہ کا شستہ و پاکیزہ ذوق پیدا کرسکتا ہے۔ رسمی طور پر مبارکباد پیش نہیں کروں گا بس یہ دعا ہے کہ ادب کا یہ چراغ روشن رہے اور ذہنوں کی تاریکی دور کرتا رہے۔ (کوئٹہ)

اختر ملیح آبادی

سالنامہ ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر دل کا ہر گوشہ کھل اٹھا انتہائی حسین اور شان ندرت لئے ہوتے اور ساتھ ہی

روح کو مسرور کرنے والا۔ مضامین کی معنویت کا پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا۔ معنویت کے لحاظ سے بھی سالنامہ بلند مقام حاصل کرے گا۔ قلمکاروں کی تصاویر نے جان ڈال دی ہے۔ یہ بتایئے کہ خون کی کوئی بوند اپنے لئے بھی چھوڑی ہے یا سارا خون سالنامہ کو "ہبہ" کر دیا کیونکہ آپ ہیں بڑے سخی۔ مجھے یقین ہے کہ الشجاع کا سالنامہ پاک و ہند کے علمی ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا اور آپ کی خدمات کو سراہا جائے گا۔ (لکھنؤ)

پروفیسر سہیل اختر

آداب و نیاز۔ اپنے دامن پر درخشندہ تحریروں کی کہکشاں سجائے "الشجاع" کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ ہند و پاک کے معروف اور ذہین ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر اور نگارشات سے مزین۔ اپنی صوری اور معنوی خوبیوں اور اعلیٰ معیار کی بنا پر یہ سالنامہ ایک ایسا صحیفہ ثابت ہوا جس کی مثال ادبی رسائل کے سالنامے کم ہی پیش کر سکتے ہیں۔ میں نے اس گراں قدر سالنامے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور مجھے ڈھونڈنے سے بھی اس میں دوسرے درجے کی کوئی تخلیق نہ مل سکی۔ "الشجاع" اور خاص طور پر زیر نظر شمارہ اس لحاظ سے بھی ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں ہند و پاک کے ان ہی ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شائع کی گئی ہیں جو خود اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت علم و ادب کی شاہراہوں پر رواں دواں ہیں، اور جو کسی "انجمن ستائش باہمی" کے رکن نہیں۔ ورنہ آجکل تو بہت سے "چوٹی" کے رسائل اپنے خاص خاص حلقوں کے بس ڈھنڈورچی ہی بن کر رہ گئے ہیں اور ان کے مدیران عظام نئے اور ذہین فنکاروں کو اپنے لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کرنا ایک گناہ عظیم سمجھتے ہیں۔ اس قدر عظیم تحریروں کے حصول، حسن ترتیب اور علم و فن کی کساد بازاری کے اس دور میں اپنی بے لوث کوششوں پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ (بہاولپور)

عفت موہانی

الشجاع کا سالنامہ ملا۔ نہایت خوب صورت، دلچسپ، دیدہ زیب اور معلومات آفریں سالنامہ شائع کیا ہے آپ نے۔ صد ہزار آفریں آپ کی ہمت پر۔ سالنامہ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ افسانوں، نظموں، غزلوں اور مضامین کا معیار یک لخت اپنی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ میری طرف سے اسقدر دلکش اور حسین معیاری سالنامہ نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے! میری تعریف کے الفاظ سیدھے سادے اور روزمرہ کے ہیں مگر ان الفاظ میں عقیدت محبت اور پسندیدگی کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ خدا کرے کہ الشجاع کو ایسے سینکڑوں سالنامے نکالنے مبارک ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرتا جائے۔ (حیدر آباد دکن)

اقبال متین

پیارے بھائی۔ محبتیں۔ جب سے الشجاع کا سالنامہ ملا ہے جب سے خط لکھنا چاہ رہا تھا۔ پھر یہ سوچا کہ پڑھوں تو پھر لکھ کر رائے دوں لیکن آج تک ممکن نہ ہوا۔ نجی حالات ہی نے سارے وقت کو دبا رکھا تھا۔ اب ادھر پڑھنا شروع کیا ہے سب سے پہلی بات یہ کہ میری دلی مبارکباد اس عمدہ سالنامے کے لئے قبول کرو کتنی محنت تم نے کی ہوگی جو اتنا سارا رنگا رنگ مواد تم نے فراہم کیا اب تک جتنی پڑھ سکا ہوں۔ ان میں سلیم احمد اور محمود ہاشمی کے مضامین عوض سعید، جوگندر پال ہانو سرتاج، رفعت نواز اور عفت موہانی کی کہانیاں اچھی لگیں نظموں میں سلیمان اریب، شاذ تمکنت، براج کومل، زبیر رضوی، بشر نواز حمید الماس، اقبال توصیفی، مخمور سعیدی کی تخلیقات نے کچھ دیر اپنے ساتھ رکھا۔ رخشندہ بہار کے افسانے تو میں نے پڑھے تھے مگر "منزل" کے مطالعے سے پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنا عمدہ ڈرامہ بھی لکھتی ہیں۔ اور یہ سلمان الارشد کون ہے "خرمن" کے لئے مبارکباد دو اور اس شخص سے کہو کہ الشجاع کا مدیر ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی دوسری صلاحیتوں کو مار کر رکھ دے غزلیں ابھی نہیں پڑھیں۔ طنز و مزاح بھی نہ پڑھ سکا۔ پھر علاقائی زبانوں کی کہانیاں بھی ہیں۔ کیا کیا تم نے اس دستر خوان پر چن دیا ہے

چاہتیں تب پڑھیں بھی۔ تمہیں کان میں ایک بات بتاؤں۔
جوگندر پال کی کہانی کی تعریف میں نے اس لئے کردی کہ اگر نہ کرتا تو یہ شخص مجھے انٹلی جنٹ نہ مانتا۔ ورنہ ہم اس بات پہ کیوں اڑے رہیں کہ ہر اس چیز کو کہانی ہی کہا جائے جو ایک افسانہ نگار کے قلم سے نکلی ہو۔ اگر فارمولا یہی ہے تو میں اپنی غزل کو کہانی کہہ کر چھاپنے کا حق کیوں نہیں رکھتا۔ یا تم اس خط کو کہانی کہہ کر کیوں نہ چھاپو۔ یا پھر الشجاع کا اداریہ ڈرامہ کیوں نہ سمجھا جائے۔ دیکھو بھائی سلمان یہ انٹلی جنٹ لوگ بڑی دھاندلی پہ اتر آئے ہیں۔ میں کہتا ہوں بھائی جو چاہو کرو۔ کہانی میں ذہنی ورزش کرو۔ پھر پٹے سے کام لو۔ داؤں پیچ بتاؤ۔ ہاتھا پائی کرو۔ اور کشتی کھیلو۔ سب کچھ گوارہ لیکن کہانی کو کہانی تو رہنے دو۔
اورنگ آباد سے فضیل جعفری اور جوگندر پال نے اردو سمینار میں شرکت کی دعوت دی ہے تڑپ رہا ہوں کہ کسی طرح اس محفل میں پہنچ جاؤں۔ رخصت کا بالکل حق نہیں ہے اور پھر تبدیلیٔ مکان کا مسئلہ ہے۔ جا سکوں تو افسانہ نگاروں کی بزم میں یہ سوال اٹھاؤں گا۔ سب یار دوست ہیں کہوں گا۔ چاہو تو مجھے یہیں اڑنگا دو۔ لیکن کہانی کو بچاؤ۔

(حیدرآباد دکن)

پروفیسر اختر جعفری

ایک ایسا شخص جس کا اوڑھنا بچھونا ملازمت کی ذمہ داریوں کی بنا پر انگریزی ہو۔ اردو جرائد پر رائے زنی کرنے کا اصولاً مجاز نہیں ہے۔ مگر سالنامہ الشجاع کے مطالعہ کے بعد لب کشائی پہ مجبور ہو گیا۔ گزشتہ چند سال میں اچھے اردو جرائد ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں "ڈائجسٹ" لیتے جا رہے ہیں۔ ایک دو تک تو اس قسم کے رسالے گوارا کئے جا سکتے ہیں مگر جب ڈائجسٹوں کی وبا پھوٹ پڑے تو بتایئے قاری کیا کرے۔ یہ رسائل شائع اردو میں ہوتے ہیں اور مواد سارا انگریزی سے لیا جاتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والے یا تو انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں یا اردو سے کیونکہ ترجمہ انتہائی پھسپھسا ہوتا ہے۔ موضوعات وہ منتخب کئے جاتے ہیں جو سنسنی خیز ہوں اور پڑھنے والوں پر نشہ طاری ہو جائے۔ اس وبا کی بنا پر اردو رسائل کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ سالنامہ الشجاع جب ملا تو اسی خوف کی وجہ سے کئی دن اسے نہیں پڑھا۔ آخر ایک اتوار کو جب کوئی مصروفیت نہیں تھی وقت گزاری کے لئے سالنامہ اٹھا کر مندرجات پر نظر ڈالی۔ لکھنے والوں کے نام دیکھ کر پھر اس کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ مضامین۔ افسانے، نظمیں۔ ڈرامے۔ مزاحیہ مضامین اور علاقائی زبانوں کی کہانیاں غرضکہ ہر تخلیق نے متاثر کیا۔ خوشی اس بات پر ہوئی کہ ہر تخلیق معیاری اور نمائندہ تھی۔ سطحی جذبات جنسی تلذذ۔ اور سنسنی خیزی پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ کئی سال بعد یہ احساس ہوا کہ اردو میں آج بھی اچھی تحریریں لکھی جا رہی ہیں۔ "ادب میں جمود" کے جو نعرے ایک زمانے میں گونج رہے تھے وہ دم توڑ چکے ہیں۔ آپ نے اس سالنامہ کی ترتیب میں جس سلیقہ اور نفاست کا ثبوت دیا ہے اس پر اگر آپ کو مبارکباد نہ دی جائے تو یہ ناقابل معافی "ادبی لغزش" ہوگی۔ سالنامہ الشجاع پڑھنے کے بعد ڈائجسٹ رسائل کے مدیران سے یہ ضرور پوچھنے کو دل چاہتا ہے کہ "بھائی جب اردو میں اتنی اچھی چیزیں لکھی جا رہی ہیں تو کیا کسی حکیم ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ مغربی زبانوں کی عامیانہ تخلیقات کے کمزور تراجم سے اپنے ڈائجسٹوں کو سجاؤ" لیکن جانتا ہوں کہ جن کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے وہ میرے اس سوال کا جواب کیوں دیں گے؟

(کانپور)

پرکاش فکری

سالنامہ ملا۔ ابھی مقالات کا حصہ پڑھ پایا ہوں خوب ہے۔ ڈراموں میں سلمان الارشد کا ڈرامہ خرمن بے حد کامیاب ہے۔ شعری حصہ کم ہے مگر بہت اچھا ہے۔

(رانچی)

منشی سجاد حسین کے ناولوں پر تنقیدی نظر

منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ اردو کے ایک اہم ناول نگار ہیں۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ لیکن اب تک ان کو بری طرح نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اسی لئے اردو ناول نگاری میں ان کو وہ مقام آج بھی حاصل نہیں ہو سکا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ناول نگاری پر آج تک اس قدر اوٹ پٹانگ قسم کی تنقید کی گئی ہے جس کا جواب ملنا دشوار ہے

حاصل ہے۔ یہاں اس بات کے ذکر سے صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ ایک ایسی کتاب کو سامنے رکھ کر جس کے مصنف سجاد حسین نہیں ہیں اور جو سرے سے ناول ہی نہیں ہے اگر تنقید کی جائے تو وہ کس درجہ مضحکہ خیز ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی تنقید کرکے سجاد حسین کے مقام کو متعین کرنا حد درجہ بے معنی بات ہوگی۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ آج تک منشی سجاد حسین کی ناول نگاری پر ایسی تنقید ہوئی

منشی سجاد حسین کے ناولوں کو پڑھنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بیسویں صدی کی ناول نگاری کا شعور رکھتے تھے۔ ان کی ناول نگاری اپنے عہد سے بہت آگے تھی۔ سجاد حسین اپنے زمانے میں بیسویں صدی کے نقادوں کے مطالبوں اور ان کی توقعات کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں شاید سب سے زیادہ مضحکہ خیز کارنامہ ڈاکٹر میمونہ بیگم کا ہے انہوں نے اپنی دانست میں سجاد حسین کا ایک ناول مرتب کرکے اسے دوبارہ پاکستان میں چھپوا بھی دیا ہے۔ حالانکہ جس کتاب کو وہ سجاد حسین کا لکھا ہوا تصور کر رہی ہیں، وہ سرے سے سجاد حسین کی لکھی ہوئی ہی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ناول ہے (اس موضوع پر راقم الحروف کا ایک مقالہ نگار پاکستان میں چھپ چکا ہے جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کون سے ناول ان کے ہیں اور کون سے ناول خواہ مخواہ ان سے منسوب ہیں) میری مراد "طرحدار لونڈی" سے ہے "طرحدار لونڈی یا آستین کا سانپ" مرزا احمد بیگ طرار لکھنوی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل میں جانا قطعی تحصیل الشماع

ہے جس سے نہ تو ان کے ناولوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مقام کو متعین کیا جا سکتا ہے۔

سجاد حسین اردو کے ان ناول نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اردو ناول نگاری کو ایک نیا موڑ دیا۔ بیسویں صدی کی ناول نگاری کی وہ خصوصیات جو سیاسی مسائل، معاشی پریشانیوں اور نفسیاتی الجھنوں سے عبارت ہیں سب سے پہلے سجاد حسین کے ناولوں میں ملتی ہیں۔ سجاد حسین کے ناولوں میں "حاجی بغلول"، "احمق الذین"، "کایا پلٹ" اور "میٹھی چھری" شامل ہیں۔ یہ تمام ناول اپنے مختلف موضوعات، نئے تصورات اور رجحانات کے لحاظ سے بیسویں صدی کی ناول نگاری کی اہم خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں

لیکن اس کے باوجود سجاد حسین کے ناول اب تک صرف مزاحیہ سمجھے جاتے رہے ہیں، علی عباس حسینی جب سجاد حسین کے ناولوں پر تنقید کرتے ہیں تو انہیں سجاد حسین کی صرف "ظرافت نگاری" ہی نظر آتی ہے اور وہ سجاد حسین کے ناولوں کو صرف "آلہ تفریح و تفنن" ہی سمجھتے ہیں ڈاکٹر احسن فاروقی بھی علی عباس حسینی کا اتباع کرتے ہیں اور سجاد حسین کے ناولوں کو صرف اس لئے اہم سمجھتے ہیں کہ انکے کردار "ہمیشہ ہنساتے رہیں گے"، سہیل بخاری نہ صرف ان دونوں کی تقلید کرتے ہیں بلکہ ان سے ایک بات آگے بڑھ کر یہ کہہ جاتے ہیں کہ "سجاد حسین کا مقصد ہنسنے ہنسانے کے سوا کبھی کچھ اور ہوتا ہی نہیں، ان اصحاب کے علاوہ دوسروں نے یا تو سجاد حسین کا ذکر انتہائی سرسری کیا ہے اور اگر کیا بھی ہے تو صرف ان کی مزاح نگاری ہی ان کے سامنے رہی ہے۔

ایسی تنقید یں "حاجی بغلول" کے تعلق سے تو کسی حد تک صحیح ہیں۔ اس لئے کہ "حاجی بغلول" بالکل مزاحیہ ناول ہے، لیکن اس میں بھی اس زمانے کی عام زندگی جیسے لباس، وضع قطع، بولی ٹھولی اور عقاید کے ساتھ ساتھ نئی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات، انگریزی تعلیم اور مختلف علوم کے پھیلنے کا ذکر ملتا ہے۔ ہندستانی زندگی میں جس طرح جلسہ اور تقاریر یعنی سیاسی گہما گہمی جس طرح اور جس انداز میں داخل ہو رہی تھی اور صحافت جس انداز سے عوام پر اثرانداز ہو رہی تھی، اس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ تمام باتیں اس ناول کو اردو کے مزاحیہ ناولوں میں ایک خاص مرتبہ عطا کرتی ہیں اس کے علاوہ اس ناول کا مرکزی کردار "حاجی بغلول" اردو ناول کے ناقابل فراموش کرداروں میں سے ایک بن گیا ہے۔ حالانکہ اس کردار پر ڈان کوئیک زاٹ اور خوجی کا گہرا اثر ہے۔ لیکن چونکہ اس میں ان دونوں کرداروں کی کچھ کچھ خصوصیات اکٹھی ہوگئی ہیں۔ اس لئے اس میں ایک انفرادی رنگ بھی ابھر آیا ہے۔ اس کردار کی وجہ سے لکھنؤ کی معاشرت کے بہت سے رخ سامنے آجاتے ہیں اور اسی پس منظر میں حاجی بغلول کے کردار کا بانکپن ابھرتا ہے۔ یہ ناول اپنے اسی حقیقی پس منظر کی وجہ سے اردو کا ایک ایسا مزاحیہ ناول بن گیا ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ناول لکھ کر سجاد حسین نے مزاحیہ ناول نگاری کی بنا ڈالی، جس کو عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی وغیرہ نے بعد میں فروغ دیا۔ اُردو کا پہلا "مزاحیہ ناول" "حاجی بغلول" ہی ہے کیونکہ سرشار کے ہاں مزاحیہ کردار ملتے ہیں، لیکن پورے کا پورا مزاحیہ ناول سجاد حسین نے لکھا ہے۔

"حاجی بغلول" اور "احمق الذین" کا عموماً ایک ساتھ نام لیا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسی مشترک خصوصیات ایسی ہیں جن کی بنا پر بعض نقاد ان دونوں پر بالکل ایک انداز سے تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی سجاد حسین کی ناول نگاری پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حاجی بغلول اپنی عجیب شکل اور احمق الذین اپنی عجیب قطع کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہنساتے رہیں گے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان خاکوں کے مجموعوں کو ناول کہا جا سکتا ہے، یا ناول سے ان کا کوئی رشتہ ملایا جا سکتا ہے؟"

حیرت ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی "حاجی بغلول" اور "احمق الذین" کو مضامین کا مجموعہ کہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ "حاجی بغلول" کا پلاٹ گٹھا ہوا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس کا کوئی بھی حصہ اپنے اگلے اور پچھلے حصوں سے بالکلیہ علیحدہ نہیں ہے اس کو قطعی طور پر خاکوں کا مجموعہ نہیں کہا جا سکتا، اگر بالفرض محال "حاجی بغلول" پر ڈاکٹر فاروقی کی اس تنقید سے تھوڑی دیر کے لئے اتفاق کر بھی لیا جائے تو "احمق الذین" پر ڈاکٹر صاحب کی تنقید اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ انہوں نے اس ناول کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ناول کی ساخت اچھی ہے اور اس میں ایک واضح آغاز درمیان اور انجام موجود ہے دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی "احمق الذین" پر اس طرح تنقید کرتے ہیں جیسے اس ناول کا مرکزی کردار حاجی بغلول کی طرح "احمق الذین" ہے، حالانکہ "احمق الذین" نامی کوئی کردار ناول میں نہیں ہے۔ یہ صرف ناول کا نام ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھولے نواب ہے۔ اسی کردار کی وجہ سے ناول میں ایک واضح پلاٹ ابھرتا ہے اور مختلف

واقعات کے رد عمل سے اس کردار کا ارتقا سامنے آتا ہے۔ مختلف
واقعات اور حالات کے رد عمل سے بھولے نواب کا کردار جس طرح
ابھرتا ہے۔ اس سے حاجی بغلول کے کردار کو کوئی تعلق نہیں ہے
حاجی بغلول کی طرح احمق الذین کا کردار (Flat) یک رخہ
نہیں ہے بلکہ یہ پہلو دار (Round) ہے۔ بھولے نواب حاجی
بغلول کی طرح یکسر بیوقوف اور احمق نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذہین
اور موقع شناس ہے۔ رفاہی کاموں کے سلسلے میں اس کے مناظرے
اس کی ہوشیاری اور سوجھ بوجھ کا محکم ثبوت ہیں۔ اگرچہ کہ ایک
آدھ وقت وہ انگریزوں کی تقلید میں مضحکہ خیز بن گیا ہے۔ لیکن
بحیثیت مجموعی اس کی ذہانت اور صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا
جا سکتا۔ اس کا بڑی بڑی ریاستوں میں اہم ملازمتیں حاصل
کرلینا اس کی ہوشیاری اور ذہانت کو ظاہر کرتا ہے۔ بھولے نواب
بذات خود احمق نہیں ہے بلکہ حالات اسے مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں
سجاد حسین نے اپنے دیباچہ ہی میں اس بات کی صراحت کر دی ہے
وہ لکھتے ہیں۔

"دنیا میں کسی کو حماقت اور عقل مندی کا سارٹیفکیٹ
دینا واقعات کا کام ہے۔ یہی جو چاہیں بنائیں، جہاں چاہیں لے
جائیں۔ نام کوئی چیز نہیں۔ اس کتاب کے رستم داستاں کوئی غیر معمولی
آدمی نہ تھے۔ نتائج کا عالم امکان میں کوئی ذمہ دار نہیں۔ کامیابی
اور ناکامی دھوپ چھاؤں کے رنگ ہیں۔ اس کا لطف دیکھئے جی
بہلایئے اپنا کام کیجئے۔" (دیباچہ احمق الذین ص ۱)

بھولے نواب کو اس کی ناکامی کی بنا پر بیوقوف اور احمق
سمجھنا خود مصنف کے منشا کے خلاف ہے۔ بھولے نواب کی عجیب
قطع "ناول میں صرف ایک جگہ ہی سامنے آتی ہے۔ اور اس کردار
کا حاجی بغلول کے کردار سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کیونکہ "حاجی
بغلول" خود حاجی بغلول ہے لیکن "احمق الذین" بھولے نواب ہے
بھولے نواب اچھے کاموں کے لئے بھی کوشش کرتا ہے تو اس کے نتائج
اچھے نہیں نکلتے۔ بھولے نواب کو اس کے کاموں کا تنہا ذمہ دار قرار
نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی اصلاحی کوششوں کی ناکامی کا تجزیہ کرتے
ہوئے خود ناول نگار بتاتا ہے:۔

"کابل سوسائٹی میں چہل پہل پیدا کرنے پر پرانے وضع دار
خفا ہوئے، نئی بات پھیلاتے ہیں۔ کچھ فہم غیرت دار خفا ہوئے،
بے غیرتی کرتے ہیں۔ معقول لوگ خفا ہوئے، بے تمیزی سے اچھی بات
کو بگاڑتے ہیں، حاسد خفا ہوئے نام چاہتے ہیں رفاہم خفا
ہوئے سب سے، اہل وطن سے، شہر سے، ہندو سے مسلمان سے عورت
سے، مرد سے، اپنی ذات سے، اس بنا پر کہ ہم سے خفا ہیں۔"
(احمق الذین ص ۶۵)

سجاد حسین نے یہاں بھولے نواب کے کردار کے روپ میں اس
زمانے کے رفاہم کو جو مشکلات پیش آتی تھیں۔ اس کا خاکہ اڑایا ہے،
یہاں انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ بھولے نواب کی بحیثیت رفاہم
ناکامی حالات کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح دیسی ریاست میں بھولے نواب کی
ملازمت کے سلسلے میں سجاد حسین نے بڑی عمدگی سے انگریزوں کے احساس
برتری، ان کی مطلق العنانی، ریاستوں میں ان کے اثر و رسوخ، رعایا
کی بے دست و پائی غرض انگریزی حکومت کے استبداد کو مختلف
پہلوؤں سے نمایاں کر دیا ہے۔ اس زمانے میں ایک معمولی انگریز بھی
بڑے سے بڑے ہندوستانی عہدہ دار کے خلاف صرف اپنے انگریز
ہونے کی وجہ سے من مانی چلا سکتا تھا۔ خواہ حق بجانب ہو یا نہ ہو، پھر
اس جھوٹے دعوے کی کہیں شنوائی نہیں ہو سکتی تھی۔ بھولے نواب پر
یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ایک انگریز لیڈی سے عشق کرتا ہے اور
جب وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے تو اس پر حملہ کرتا ہے۔ اگرچہ کہ
اس الزام کا کوئی ثبوت تھا نہ کوئی گواہ لیکن اس کے باوجود بھولے
نواب مجرم قرار دیا جاتا ہے اور اس کو ملازمت سے استعفےٰ دے کر
ریاست چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کیونکہ:۔

"والیٔ ریاست سے پولیٹیکل ایجنٹ نے شکایت کی سب پہلو
سمجھائے۔ ایسا بدکار آدمی لائق دربار نہیں۔ اس دورے میں وائسرائے
تشریف لانے والے ہیں۔ اگر یہ خبر پہنچی تو ہم سمجھتے ہیں ریاست میں
آنے سے انکار فرمائیں گے۔ اتنی سی حرکت پر سخت سزا دل سے تو نہ
چاہتے نہ تھے مگر مصلحت یہی تھی۔ جبراً قہراً حکم صادر فرمایا "تین

دن کے اندر ریاست سے باہر چلے جائیں۔ احکام مناسب تاقب صادر ہوں گے۔" (احمق الذین صفحہ ۹۳)

اردو ناول میں سب سے پہلے سجاد حسین نے ہی برطانوی حکومت کے استبداد کو اس کو اس کے صحیح رنگوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ ناول صرف انگریزی حکومت کے استبداد و ظلم ہی کی جھلک نہیں پیش کرتا بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کی تکذیب بھی کرتا ہے۔ بھولے نواب کا انگریزی وضع قطع اختیار کرنے میں مضحکہ خیز بن جانا، چھری کانٹے سے کھانے وقت مصیبت میں پھنس جانا اور پھر ایک میم سے شادی کرکے دولت و عزت سے ہاتھ دھو بیٹھنا اور آخر کو پاگل خانے جانا، مغرب زدگی اور مغرب کی اندھی تقلید کے بڑے ہی عبرت ناک مرقع ہیں۔

« احمق الذین » میں مجموعی طور پر اس وقت کے سماجی مسائل پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن کایا پلٹ » میں سماجی مسائل کے ساتھ اس دور کے سیاسی اور معاشی مسائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے «کایا پلٹ» منشی سجاد حسین کا بڑا ہی اہم ناول ہے گو پلاٹ کے لحاظ سے یہ بہت کمزور ہے، کیونکہ مختلف واقعات میں جیسا کہ چاہیئے، ربط اور تسلسل نہیں ہے۔ لیکن اس ناول کو اہمیت بخشنے والی سب سے اہم بات سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کی سچی عکاسی ہے۔

اس ناول میں اس عہد کی سیاسی فضا سانس لیتی نظر آتی ہے سجاد حسین نے اپنے پختہ سیاسی شعور کی وجہ سے اس ناول میں ان تمام عناصر کا احاطہ کرلیا ہے جو اس زمانہ کی سیاسی فضا کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ مسٹر جونس کو ہندوستانیوں کا قومی لیڈر بنا کر پیش کیا گیا ہے یہاں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا کا سہرا ایک انگریز کے سر ہے۔ سجاد حسین نے اس بات پر طنز کیا ہے کہ انگریز لیڈر تو بن بیٹھے ہیں اور بیداری بھی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی باتوں میں خلوص ہے نہ سچائی نہ ہی یہ ہندوستانیوں کے مسائل سے واقف ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ گورنمنٹ کو رسن کے وعدے یاد دلانے میں کچھ کام ضرور کر رہے تھے مسٹر جونس کہتے ہیں:۔

« اسکو (حکومت کو) اپنی بات کی پابندی لازم ہے، کوئی مہذب حکومت بدون بدنامی ایسا نہیں کرسکتی۔ اس ترقی اور تہذیب کے زمانے میں حاکمی کا وہ قاعدہ نہیں ہے کہ حاکم جو چاہے کرے، ہم پہلے نہیں سکتے پہلے تو جو کچھ اسے کرنا ہوتا ہے اس کا قانون بنتا ہے ہم کو اس پر اعتراض کا حق ہوتا ہے اس کو سننا ہوتا ہے اور جو قاعدہ بنگیا ہے اُس کے موافق کام کرنا ہوتا ہے، رعیت کا مرضی کے موافق کام کرنا ہوتا ہے۔" (کایا پلٹ صفحہ ۳۶)

مسٹر جونس کی اس گفتگو کے پردے میں اس زمانے کے ہندوستانیوں کے جذبات بھی بول رہے ہیں۔ اس طرح اس سیاسی آگہی کے ساتھ معاشی حالات سے بھی سجاد حسین کی واقفیت اس ناول میں نمایاں ہے۔ اردو ناول نگاروں میں ان کے پاس سب سے پہلے مزدوروں کے حقوق کا احساس ملتا ہے جو ان کی انسان دوستی اور محنت کش طبقہ سے سچی ہمدردی کا بین ثبوت ہے۔ وہ مزدور کے حق اور بیگار کی برخواستگی کا ذکر مسٹر جونس کی زبانی یوں کرتے ہیں:۔

" یہ مزدور کی خوشی کی بات ہے بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ اگر مزدور کا جی چاہے کہ سرکار کی مزدوری نہ کرے تو سرکار بھی اس پر زبردستی نہیں کرسکتا۔ پچھلے زمانہ کا خراب دستور بیگار کا کچھ کچھ باقی ہے۔ ہم لوگ اس کے واسطے کوشش کرتے ہیں، موقوف ہو۔"

(کایا پلٹ صفحہ ۳۷)

لیکن یہ سیاسی ہل چل پیدا کرنے والے ایسے انگریز تھے جو ہندوستانی عوام سے بہت زیادہ خلوص نہ رکھتے تھے۔ اور عام ہندوستانی صرف صاحب کی آواز پر سر دھننا جانتے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی مطلب نہ تھا کہ صاحب کی باتیں کس حد تک پر مغز ہیں۔ چونکہ ان کا سیاسی شعور ابھی ناپختہ تھا۔ سجاد حسین جونس صاحب کی تقریر پر یوں تنقید کرتے ہیں:۔

" تسلسل عبارت و خیالات کی زنجیر سے آزاد جس جملے کو جہاں سے چاہے لے لیجیے، آغاز و انجام دونوں کا لطف اٹھائیے۔ ایک زمین کی ہانک تو دوسری آسمان کی۔ حوالے بڑے بڑے لوگوں کے مگر مناسبت کا کوئی لحاظ نہیں۔ بے تکا کا تو مضمون اور مکالمے کی

تعلیم پر آزادی کی بحث اور بیا تیث کے قانون غلہ والی تقریر کا
خلاصہ۔ چپراسی تحصیل کی شکایت اور بلگر پلے کے مظالم کی داستان
مگر وہاں تو صاحب کی آواز پر تعریف کا دار و مدار تھا۔ مطلب مضمون
تقریر سنتا ہی کون تھا۔"

اس سیاسی شعور کے ساتھ سجاد حسین کو اس بات کا
بھی شدید احساس تھا کہ ہندوستانی زندگی میں سائنس اور نئے
علوم کی وجہ سے پرانی قدریں ختم ہو رہی ہیں۔ مادیت کا زور بڑھتا جاتا
ہے۔ روحانیت ختم ہوتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ مذہبی اور اخلاقی پستی
کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کیونکہ مادی ترقی نے سوسائٹی اس کے
اعتقاد اور مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔

"ایک نہایت ناپائیدار عارضہ ترمیم و تنسیخ میں گرفتار قانون
کے سانچے میں معاملہ ڈھلا جاتا ہے۔ باقی انصاف کا خیال دل میں نہیں
پھٹکنے پاتا۔ سوسائٹی اخلاق اور مذہب کی کڑیاں یکے بعد دیگرے
اعتقاد کے قلاب میں لٹکی ہوئی ہیں۔ ادھر سے ادھر ہونے علم کی
ناپائیداری چھت میں۔ یہ بھی نہایت کمزور رہا ہے۔ اس کی وجہ سے
تمام سلسلہ اخلاق و آداب سوسائٹی کا الجھ گیا ہے۔ جیسے اوپر سے
گرتی ہوئی بہت سی کڑیوں کی زنجیر۔" (کایا پلٹ صفحہ ۱۲۳)

کایا پلٹ کے ساتھ "میٹھی چھری" بھی سجاد حسین کا ایک
اہم ناول ہے۔ اس میں انہوں نے سب سے پہلے جاگیردارانہ نظام کا
کھوکھلا پن اجاگر کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کوئی دوسرا ناول نگار
جاگیردارانہ تہذیب کے کمزور پہلوؤں کو اتنی تکمیل کے ساتھ پیش
نہیں کر سکا ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کیونکہ دوسرے ناول نگار کسانوں
یا دوسرے افراد کی حالت کے ذریعہ جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں کو
نمایاں کرتے ہیں۔ لیکن سجاد حسین راست طور پر جاگیرداروں کی
کمزوریوں کو دکھاتے ہیں۔

"میٹھی چھری" میں سجاد حسین نے نوابوں اور جاگیرداروں
کی غفلت اور بدمستی سے ہونے والی تباہیوں کو پیش کیا ہے۔ اس
ناول میں ایک نواب صاحب اپنے مشاغل میں لگے رہتے ہیں اور ایک
بنئے کو اپنی ساری جائیداد اور جاگیر کا انتظام سونپ دیتے ہیں

لالہ اپنی تاجرانہ فہم اور ساہوکارانہ چالاکی سے نہ صرف نواب کی ساری
جائیداد ہی کا مختار بن بیٹھتا ہے بلکہ نواب کے مزاج میں اتنا دخیل
ہو جاتا ہے کہ نواب لالہ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اس کی عقل سے
سوچنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نواب کا بال بال قرض میں
بندھ جاتا ہے۔ مالی تفکرات سے نواب صاحب کی صحت اور بھی
بیٹھ جاتی ہے۔ ان کی اس دگرگوں حالت کو دیکھ کر تین باتیں نمایاں
ہو کر سامنے آتی ہیں۔

"ایک تو دونوں بیٹوں میں نفسا نفسی بڑھ گئی، دوسرے
خودسری کی ہوا دماغوں میں سما گئی۔ تیسرے بیگم کو رنڈسالے میں
خلعت آزادی کا انتظار رہنے لگا۔ اور اس گھات میں ہوئیں کہ
حکومت ملکیت کی باگ جب ضعیف ہاتھوں سے چھوٹے تو اپنے ہی
قابو میں آئے۔" (میٹھی چھری صفحہ ۲۳)

یہ نفسا نفسی اور خود غرضی بڑھتی ہی جاتی ہے اور اپنی
معراج پر پہنچ کر انتہائی بھیانک اور مکروہ شکل میں یوں سامنے
آتی ہے کہ ماں اقتدار و ملکیت کی اس قدر بھوکی ہو جاتی ہے کہ خود
اپنے ہاتھوں بیٹوں کو زہر دے کر اپنے راستہ سے ہٹا دیتی ہے۔ اس
طرح سجاد حسین نے جاگیردارانہ نظام کی کھوکھلی حقیقتوں اور اس
کے تاریک گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

مالی اور معاشی حالات کے تباہ ہونے سے نفسیاتی زندگی جس
طرح تاراج ہوتی ہے اس کو پیش کرنا سجاد حسین کی بصیرت کی دلیل
ہے۔ اردو ناول میں اس بات کو شعوری طور پر بہت بعد میں پیش کیا
گیا ہے۔ لیکن سجاد حسین نے اس حقیقت کا احساس اسی زمانہ میں
کر لیا تھا۔

سجاد حسین کی انسانی زندگی سے یہی آگہی اور دلچسپی کا
نتیجہ ہے کہ ان کی نگاہیں حقیقت تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ انسانی
جذبات ہی کو نہیں بلکہ اس دور کے معاشی حالات کو بھی پوری طرح
سمجھ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو اس نظام سے قطعی دلچسپی نہیں ہے
جو محنت کش طبقہ کا استحصال کرتا ہے۔ وہ فنکارانہ مہارت سے
اس استبداد کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس ناول میں

جاگیرداروں اور زمینداروں کی اخلاقی پستی ہی کو نہیں بلکہ ان کی جھوٹی شان و شوکت کے نتیجہ میں ہونے والے بھیانک نتائج کو بھی دیکھ لیا ہے۔ خود انہی کا نہیں بلکہ کسانوں کی تباہی کا بھی موجب بنتے ہیں۔

جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام میں بیچ کے لوگ جو تباہی مچاتے تھے اور جس کی وجہ سے یہ نظام ایک بد سے بدتر صورت میں اپنا کام چلاتا تھا، سجاد حسین کی نظر اس پر بھی ہے۔

جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کی خرابیاں معاشی ابتری کے نفسیاتی اثرات ایسے موضوعات ہیں جو سجاد حسین سے پہلے کبھی بھی چھوئے نہ گئے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے ناولوں کو بڑی اہمیت ہو جاتی ہے لیکن ہمارے ناقدین اور مورخین کو ان کی ناول نگاری میں سوائے مزاح کے کوئی اور خوبی نظر ہی نہیں آتی۔ حالانکہ سجاد حسین کے ناولوں کو پڑھنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بیسویں صدی کی ناول نگاری کا شعور رکھتے تھے۔ اگرچہ کہ ان کے تمام ناول ۱۹۰۲ء سے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی ناول نگاری اپنے عہد سے بہت آگے تھی۔ کیونکہ سیاسی اور معاشی زندگی کو پیش کرنے کا اور اس کو اہمیت دینے کا رجحان اردو ادب میں بہت بعد میں فروغ پایا۔ لیکن سجاد حسین اسی زمانہ میں بیسویں صدی کے نقادوں کے مطالبوں اور ان کی توقعات کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ آج بیسویں صدی کا نقاد ناول نگار سے متوقع ہے کہ وہ سیاسی تبدیلی کو اپنا مقصد بنائیں۔ سجاد حسین اس توقع کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک دوسرا نقاد بیسویں صدی کے ناول نگار سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے تخلیق کردہ کردار پر نظر رکھے بلکہ اس کی نظر اپنے اطراف کی دنیا پر بھی ہونی چاہیے۔ اس مطالبہ کو بھی سجاد حسین پورا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سجاد حسین کی یہ سیاسی اور معاشی حالات سے دلچسپی کسی بیرونی اثر کا نتیجہ نہیں تھی۔ آج کے ماحول میں یہ دلچسپی ناگزیر ہے لیکن جس زمانے میں سجاد حسین نے ناول نگاری شروع کی ہے۔ اس وقت ان حالات سے عموماً گریز کیا جاتا تھا اور ادب صرف تفنن طبع کا ذریعہ تھا۔ آج سیاسی تحریکوں کی جو شورا شوری اور گہما گہمی ہے اس کا دور تک اس زمانے میں پتہ نہ تھا۔ کیونکہ سجاد حسین کانگرس کے آغاز سے بھی بہت پہلے سے قومی جذبات کو ابھارنے اور سیاسی بیداری پھیلانے کے لئے کام کر رہے تھے ان کی ناول نگاری اور ان کی ساری ادبی کاوش کسی بیرونی تحریک یا کسی بیرونی اثر کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ صرف ان کا خلوص اور نیک نیتی انھیں فن کا وہ راستہ سمجھا رہی تھی اور ان کے زمانے سے انہیں آگے کر رہی تھی، ان کے پورے ناولوں میں یہی خلوص جاری اور ساری نظر آتا ہے، جو ان کی ناول نگاری کو بڑی اہمیت بخشتا ہے۔ بقول آڈن خلوص ہی ادیب کی بات کو مستند بناتا ہے۔ اس طرح کئی اعتبار سے سجاد حسین کی ناول نگاری اور ناول کی تاریخ میں ایک امتیازی اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ ان کے ناولوں کو نظر انداز کر کے یا ان پر اوٹ پٹانگ تنقید کر کے کوئی اردو ناول پر تنقید کر سکتا ہے اور نہ اردو ناول کی تاریخ کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اردو ناول نگاری میں سجاد حسین کی ناول نگاری ایک بہت اہم موڑ ہے اردو ناول کے تدریجی ارتقا کو پیش کرنے کے لئے ان کے ناولوں کا سنجیدگی سے مطالعہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ قطعی ناگزیر ہے۔

سلیم احمد

پاکستانی کلچر کا مسئلہ

"سوچ بچار کے پھل ٹپکے کے آم نہیں ہیں کہ جھولی پھیلاتے ہی گود میں آ گریں"

جب سے پاکستان میں مشینوں کے پرزے جوڑنے کا مفید کام شروع ہوا ہے اس وقت سے کچھ لوگوں کو خیال آیا ہے کہ پاکستان کے لئے ایک کلچر بھی بنانا چاہیئے۔ لیکن بعض معقول علمی لوگ کہتے ہیں کہ اس میں زرمبادلہ تو خرچ نہیں ہوتا کیوں نہ پاکستان کے لئے کوئی بنا بنایا کلچر باہر سے درآمد کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بعض دیسی قسم کا نقطۂ نظر رکھنے والے کہتے ہیں کہ کلچر بنانے یا باہر سے درآمد کرنے کی کیا ضرورت ہے بہتر تو یہ ہوگا کہ ہمارے پاس جو ٹوٹا پھوٹا کلچر موجود ہے اسی کی مرمت کر کے اپنے کام میں لایا جائے۔ تجویزیں سب اپنی اپنی جگہ قابلِ غور ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کیا برا ہے اگر اس پر بھی تھوڑا بہت غور ہو جائے کہ ہمارے یہاں کلچر کے مسئلہ کی نوعیت کیا ہے؟

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کے دو بڑے حصے ہیں پوربو پاکستان اور پچھمی پاکستان اس میں پاکستان تو مشترک ہے مگر پوربو پچھمی پر دانشوروں کے درمیان جھگڑا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں مشرقی مغربی کہیئے تو سمجھیں بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سمجھنے کے لئے ہی تو پوربو پچھمی کہا جا رہا ہے۔ اور جیسا کہ دانشوروں کے جھگڑے میں ہوتا ہے بات وہاں پہنچتی ہے جہاں کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی بہرحال نام کچھ بھی رکھئے یہ دو بڑے حصے تو اپنی جگہ ہیں۔ اور دونوں کے درمیان مشرقی اور مغربی اور پوربو پچھمی کا اختلاف ہے۔ دوسری طرف مغربی پاکستان ایک ایسی وحدت ہے جسمیں بہت سے سابق "حصے شامل ہیں جو مغربی پاکستان کو حاضر و موجود جان کر تو غائب رہتے ہیں۔ لیکن ذرا نظر چوکے تو آموجود ہوتے ہیں۔ ان سب سابق حصوں کی اپنی اپنی زبانیں اپنے اپنے لباس۔ اپنے اپنے کھانے اپنے اپنے ناچ رنگ اپنے اپنے میلے ٹھیلے اور اپنی اپنی رسوم و روایات ہیں یا یوں کہیئے کہ سب کے اپنے اپنے کلچر ہیں۔ پھر یہ ایک کم بیش تیس لاکھ کی آبادی کا شہر ہے جسے کراچی کہتے ہیں۔ اور جس میں بھانت بھانت کے لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ وہ بھی جو مغربی پاکستان کے سابق حصوں کے رہنے والے ہیں اور وہ بھی جو سابق ہندوستان سے آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک ملا جلا یا آزاد رو کلچر پروان چڑھ رہا ہے۔

خیر یہ تو مقامی تھیلی کے چٹے بٹے ہوئے لیکن اس تھیلی میں ایک بدرنگ پتھر بھی ہے یا یوں کہیئے کہ اتنا خوش رنگ ہے کہ اس تھیلی کا نہیں معلوم ہوتا میرا اشارہ مغربی کلچر کی طرف ہے جس کا پیوند سو سال سے ہمارے مقامی کلچروں میں لگ رہا ہے۔ اور جس کی خالص روئیں دم بدم مغرب سے ہمارے یہاں پہنچتی رہتی ہیں۔

اچھا اب ایک کلچر تو پوربو پاکستان کا ہوا اور تین چار کلچر مغربی پاکستان کے ہوئے اور پھر اس میں کراچی کو بھی شامل کریں تو ایک کلچر ان سب کا مجموعہ ہوا۔ اور ایک وہ کلچر ہوا جو بیک وقت ان سب پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یعنی مغربی کلچر۔ سوال یہ ہے کہ ان میں سے پورے پاکستان کا کلچر کس کلچر کو بنایا جائے دوسرے لفظوں میں یوں پوچھئے کہ پورے پاکستان کی زبان کیا ہو، لباس کیا ہو، رسوم و روایات کیا ہوں۔ وغیرہ۔

پہلے بعض لوگوں کا خیال تھا جس میں قائدِ اعظم بھی شامل تھے کہ زبان تو اردو ہونی چاہیئے اور کلچر کے دوسرے عناصر میں اینگلو مغل روایت کی پیروی ہونی چاہیئے لیکن خدا محمد علی بوگرہ کا بھلا کرے کہ انہوں نے ہمیں تاریخی تقاضوں کا شعور دیا۔ اور ہمیں معلوم ہوگیا کہ زندگی کی حقیقتوں میں خوش فہمیوں سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ بہرحال اب زبان اور کلچر کا سوال اسی طرح ہمارے ذہنوں پر آویزاں ہے۔

(۱) پاکستان کے تمام کلچروں میں وحدت کیسے پیدا کی جائے ؟
(۲) مغربی کلچر کے بارے میں ہمارا رویّہ کیا ہو؟
(۳) مغربی کلچر کی زد سے مقامی کلچروں کو کیسے بچایا جائے۔ یا تبدیل ہونے دیا جائے تو کس حد تک۔ یعنی دونوں میں ردّ و قبول کی کیا نسبت ہو ؟
(۴) مقامی کلچروں میں وحدت اپنے آپ پیدا ہوگی یا ہمیں اسے پیدا کرنا چاہیئے

یہ اور اس وقت کے بے شمار سوالات کلچر کا ذکر چھڑتے ہی ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ عموماً ہم ان کا جواب سوچتے ہوئے بار بار اصولِ وحدت کی طرف لوٹتے ہیں جس کا کھویا ہوا سرا ہمیں نہیں ملتا۔ پھر بھی ہم اس قسم کی باتیں ضرور کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اصولی وحدت کی اہمیت کا احساس ضرور ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ جو صلح کل ذہن رکھتے ہیں ہر چیز کا جواب وقت پر چھوڑنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم طے نہیں کر پا رہے ہیں اسے وقت خود بخود طے کر دے گا وہ صاف صاف کہیں یا نہ کہیں ان کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ فی الحال سب کچھ ایسا ہی چلنے دو اور اس وقت کی آس لگاؤ جب یہ سب عناصر مل ملا کر خود ہی ایک پاکستانی کلچر بنا دیں گے مثلاً پاکستان کی سب زبانیں مل کر ایک زبان بن جائے گی پاکستان کے سب لباس مل کر ایک لباس بن جائے گا اس رویّہ میں ایک فائدہ تو ضرور ہے کہ اس سے سوچنے کی تکلیف سے نجات مل جاتی ہے۔ اور دل خوش کن تصورات قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرا رویّہ ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم وقت کی مشکل کشائی پر بھروسہ نہیں کر سکتے آج کا کام کل پہ نہ ڈالو جو زبان کل بنتی ہے آج ہی بنا ڈالو۔ جو لباس کل بننا ہے آج ہی تیار کر لو۔ یہ پوربو پچھمی والی زبان انھیں بزرگوں کی نیک خواہشات سے بن رہی ہے لیکن ان دونوں رویّوں کے درمیان جھگڑے کے بہت سے گوشے ہیں۔

ایک تیسرا رویّہ خاموش معاہدہ کا ہے یعنی عوام کی سطح پر ہم بحث مباحثہ کئے بغیر آہستہ آہستہ مغرب کی طرف کھسکتے جاتے ہیں۔ زبان سے کہا تو نہیں جاتا لیکن عمل میں یہ ہوتا ہے کہ کسان اور مزدور ہو تو اپنے علاقہ کا لباس پہنے۔ اور کلرک یا افسر ہو تو کوٹ پتلون پہنے جاہل اور غریب ہو تو اپنی مقامی زبان بولے اور چار جماعتیں پڑھ جائے یا چار پیسے کمالے تو فوراً ٹوٹی پھوٹی انگریزی اختیار کرے۔ آمدنی دو چار سو کے درمیان ہو تو چولہے کے پاس بیٹھ کر روٹی کھائے ہزار بارہ سو کمانے لگے تو ڈائننگ ٹیبل لگائے۔ اس عمل میں ہم آپ وہ سب لوگ شریک ہیں جن کا جذباتی ردِ عمل کچھ اور ہے۔ جذباتی طور پر تو ہم سب انگریزی زبان پر دیسی زبانوں کو ترجیح اور انگریزی لباس پر دیسی لباسوں کو فوقیت دیتے ہیں۔ اور جب مغربی کلچر کا ذکر آتا ہے تو اس کا طوطا مینا نمونہ ہونے کے باوجود خالص دیسی بن جاتے ہیں۔ اب تک صورتِ حال یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں مثال کے طور پر زبان کا مسئلہ چھڑتا تو ہمارے جذباتی تقاضے اردو کا نام لے کر پورے کئے جاتے تھے اب سنا ہے بعض علاقوں میں دوسرے جذباتی تقاضے بھی پیدا ہو رہے ہیں اور اردو کی جگہ دوسرے نام بھی لئے جا رہے ہیں یہ صورتِ حال کچھ لوگوں کے لئے تکلیف دہ سی ہے لیکن خلافِ توقع بہر حال نہیں قوم کے پاس جب وحدت کا تصور نہیں ہوگا تو ایسا ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ لازمی بھی۔ تو پھر اس صورت میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر بڑی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ ان مسائل کا حل ہم وقت یا اتفاق پر نہیں چھوڑ سکتے ان کے بارے میں تو ہمیں پوری طرح سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔

لیکن سوچ بچار کے پھل ٹپکے کے آم نہیں ہیں کہ جھولی پھیلاتے ہی گود میں آگریں۔ انہیں تو ذرا فکر و تامل کی پال ڈال کر پکانا پڑتا ہے ہمیں صحیح جواب پر پہونچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم کسی ایک جواب کو پکڑ کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ ہر جواب کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہیں۔ دوسری چیز جس پر ہمیں قابو پانا ہے وہ فکر کا خوف ہے سوچنے میں خوف زدہ ہو کر تو ہم کچھ بھی نہیں سوچ سکیں گے۔

پچھلے دنوں جب میرے محترم دوست اور مشہور ادیب جمیل جالبی اپنی اہم کتاب "پاکستانی کلچر" لکھ رہے تھے اور ایک کل پاکستانی کلچر کی تلاش میں تھے تو میں نے ان کے سامنے مسئلہ کا ایک ممکنہ حل پیش کیا تھا جس کو بوجوہ قبول نہیں کر سکے لیکن بہر حال میں اسے ایک امکانی جواب ضرور تصور کرتا ہوں اور کیا حرج ہے کہ الٹ پلٹ کے فارمولے پر اسے بھی پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔

وہ جواب یہ ہے ۔

پاکستان کو اپنے انتشار و اختلاف کو دور کرنے اور جدید دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جو ایک مشترک کلچر کی طرف بڑھ رہی ہے انگریزی یا مغربی کلچر قبول کر لینا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں چاہیئے کہ ہم نے جو چیزیں ماضی میں مجبوری یا ذہنی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اختیار کیں انہیں اب شعوری اور منظم طور پر اختیار کر لینا چاہیئے مثلاً انگریزی زبان اور انگریزی لباس کا اختیار کرنا متعدد لحاظ سے ہمارے حق میں مفید ثابت ہوگا۔ یہ جواب ذرا تکلیف دہ تو معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تائید میں ہمارے پاس کئی دلائل ہیں۔ انگریزی زبان زندگی کے ہر شعبہ

میں ہمارا [illegible] ہے۔ اس میں ہم نہ صرف اپنی دفتری اور کاروباری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ بلکہ یہ عام بول چال میں بھی ہمارے کام آتی ہے ملک میں ایک ایسا ہوشمند، باخبر اور باطاقت ور طبقہ موجود ہے جو ملک کے پورے نظام کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور اپنی اعلیٰ حیثیت کے باعث دوسرے طبقوں کی رہنمائی اور ان کے لئے نمونہ کا کام دیتا ہے۔ انگریزی اس طبقہ کے لئے بالکل مادری زبان کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی ترقی یافتہ دنیا سے ہمارا رابطہ اور جدید ترین علوم و فنون سائنس، فلسفہ اور حکمت کا ذخیرہ ہے جو انگریزی زبان کو اختیار کرتے ہی ہمارے ہاتھ لگتا ہے اسی طرح انگریزی لباس بھی قریب قریب تمام شہروں میں ہمارا اپنا لباس بن چکا ہے۔ اور جوں جوں تعلیم اور ترقی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے بنتا جارہا ہے یہ صحیح ہے کہ کلچر انہی دو چیزوں کا نام نہیں ہے لیکن ان دو بڑی چیزوں کے بارے میں فیصلہ ہو جائے تو دوسری چیزیں بھی اس روشنی میں طے کی جاسکتی ہیں کہا جاسکتا ہے کہ جس استدلال پر ہم زور دے رہے ہیں۔ وہ ملک کی کثیر آبادی کے بارے میں پوری طرح صحیح نہیں ہے ٹھیک ہے ہم اس بات سے واقف ہیں کہ ہمارے عوام کی اکثریت اب بھی انگریزی زبان اور انگریزی لباس اختیار نہیں کرسکی ہے لیکن کیا اس کے ساتھ ہی یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ تعلیم و ترقی کی رفتار جتنی تیزی سے بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی تیزی سے انگریزی کلچر بھی عوام تک پہونچتا جاتا ہے۔ پھر کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ترقی کے اس رخ کو متعین کر کے اس کی رفتار تیز تر کر دی جائے۔

رہ گیا جذباتی تکلیف کا معاملہ تو ایک نسل کے جذبات دوسری نسل میں نہیں رہتے ممکن ہے ایک بات جو ہمیں آج تکلیف پہونچائے کل ہماری آئندہ نسلوں کو بالکل فطری معلوم ہو۔ مثلاً ہماری ایک نسل کے لئے ملک میں دو قومی زبانیں ہونا بہت دنوں تک ایک جذباتی مسئلہ بنا رہا ہے مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نئی نسل کے لئے بھی یہ مسئلہ ایسا ہی ہے۔ بلکہ اب تو خود پرانی نسل کے لئے بھی اس کی جذباتی نوعیت بدل چکی ہے۔

ہمارے فیصلے جذبات پر نہیں فکرِ صحیح پر قائم ہونے چاہئیں۔

جدیدیت

خیالات کی آفاقی میں ہے نہ کہ غلامی میں۔ جدید شاعر کو چونکہ موجودہ زندگی کے مختلف اور متضاد عناصر میں ایک ذہنی تنظیم پیدا کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس تنظیم کے لئے اسے مجرد خیال سے مخصوص اور ٹھوس تجربے تک اور پھر مجرد خیال تک جست لگانی ہوتی ہے۔ اسے ذہن اور جذبے دونوں میں ایک نئی وحدت قائم کرنی ہوتی ہے اور ذہن کو اس صحت اور سادگی تک لانا پڑتا ہے۔ جس میں مانگے کے یا دوسروں کے لادے ہوئے خیالات نہیں بلکہ فرد کے تجربے کی صداقت ہو۔ یہ صداقت سائنس کے نئے نئے انکشافات سے کم اہم نہیں ہے آج فرد میں خلوص اور دیانت کی جو کمی ہے۔ جدید شاعری اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جدید شاعری کچھ کہتی نہیں۔ کچھ کرتی ہے جو لوگ روایتی شاعری کے عادی ہیں۔ وہ اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ جدید شاعری سے ایک مرتب سلسلۂ خیالات اور ایک مرکزی تصور انہیں نہیں ملتا۔ جدید شاعری ایک شخصی اور نجی اسرار بن گئی ہے۔ یہ فرد کی تنہائی کا عکس ہے۔ آج انسان اپنی کائنات میں کوئی اطمینان کا گوشہ نہیں بنا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نظام سے الگ ہے۔ وہ چپ دیکھتا ہے۔ کہ اس کے حلقے میں وہ پورا خیال نہیں ہے۔ جو پہلے اس کے پاس تھا اور اس کے باطن میں ایسی پیچیدگیاں ہیں جن سے وہ بے خبر تھا تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ سماج میں گروہ بندی، مذہب کی بندشوں اور روایت سے رشتہ کا ڈھیلا ہونا، تبدیلیوں کی تیز رفتاری، یہ سب باتیں شاعر کو اپنی دنیا اور گرد و پیش کی دنیا میں تعلق پیدا کرنے سے روکتی ہیں وہ اپنے آپ سے اپنا رشتہ قائم نہیں کر پاتا۔ تنہائی سے گھبرا کر وہ اور زیادہ تنہائی کی منزلیں طے کرتا ہے وہ تعلیم سے گھبراتا ہے۔ نظریات اسے خوف زدہ کرتے ہیں، افادی، اخلاقی اور سیاسی شاعری اسے زہر لگتی ہے یہ خیالات سے بغاوت نہیں، دوسروں کے خیالات کا غلام ہونے سے بیزاری ہے لیکن ان سب باتوں کے پیچھے ایک نئے عقیدے کی جستجو بھی ہے یہ ہے ایک شخصی عقیدہ، خیال کی رد ہے، زندہ، مانوس، محسوس کیا ہوا خیال، جس نے نظم کو ایک تنظیم عطا کی ہے۔ (آل احمد سرور)

شاذ تمکنت

مسیحا کے نام

تم سے کیا بھول ہوئی تم نے مجھے کیوں چاہا
ہیں گنہ گارِ وفا تھا تو سزا دینا تھا

شوقِ وارفتہ کی پرپیچ گزرگاہوں میں
کوئی دیوار سی دیوار اٹھا دینا تھا

میں تو دو بوند کا پیاسا تھا سمندر کا نہیں
تم کو سرابوں سے مری پیاس بجھا دینا تھا

تم نے مارا ہے تمنا کے دوراہے پہ مجھے
ہوش میں رکھا ہے دیوانہ بنا دینا تھا

میں نے دیکھا تھا تمہیں حسرتِ بیدار لئے
میری آنکھوں کے چراغوں کو بجھا دینا تھا

تم کو جیسے مرے ہر کام سے دلچسپی تھی
کام ادھورے ہیں مرا ہاتھ بٹا دینا تھا

روٹھنا تھا تو فقط میرے منانے کے لئے
دل دکھانا تھا مگر یوں نہ دکھا دینا تھا

سیدھی سادی سی وہ باتیں وہ گھریلو انداز
یہ اگر خواب تھا تعبیر سنا دینا تھا

میرے گھر کے درو دیوار سجانے کی لگن
میرے گھر کے درو دیوار کو ڈھا دینا تھا

کون ہو تم سانجھا سے مرے دکھ سکھ کا شریک
جاتے جاتے مجھے مٹی میں ملا دینا تھا

انتظار اور تھا لازم تو غدا سے کہکر

اور تھوڑی سی مری عمر بڑھا دینا تھا

قمر اقبال

تین نظمیں

تنہائی

یہ تو سچ ہے
ہر معمہ
مسئلہ
الجھن
سوال
لوگ تنہائی میں کر لیتے ہیں حل
کچھ دیر تنہا بیٹھ کر
لیکن کرے وہ شخص کیا
جس کے لئے
تنہائی بھی اک مسئلہ ہو
اک سوال ؟

ان کہی

لبوں تک آکے
میرے دل کی بات لوٹ گئی
مرے ہی دل کی طرف
کہ جیسے پانی سمندر کا
حباب بن کے اٹھے۔
پھر اس کے بعد
سمندر پہ ہی برس جائے۔

نجات

ایک دن جب نیند لگ جائے گی گہری
رات کے پچھلے پہر
بستر سے اٹھ کر
میں کہیں چل دوں گا بے نام چادر اوڑھ کر
جسم کو اپنے اکیلا چھوڑ کر
اشماع

علیم افسر

"نیند"

میں اپنے بستر سے دیکھتا ہوں اکثر
کہ آسماں سے نزول ہوتا ہے اک پری کا
پری وہ جس کے بدن پہ گہرے سکوت کا صاف پیرہن ہے
ہے گرد اسکے نوائے شوریدہ، شور و غل آہٹوں کا ہجوم رقصاں
مگر جبیں اس کی بے شکن ہے
یہ تیز ریلوں کی گھڑ گھڑاہٹ
یہ کالی بھوری سفید کاروں کے تیز پہیوں کی سرسراہٹ
یہ جگمگاتی دکانوں میں زندگی کے قدموں کی تیز آہٹ
یہ سب لپٹتے ہیں اس کے دامن سے
روکتے ہیں اس کو
کبھی ٹھٹھکتی ہے رک بھی جاتی ہے
تیز رو ہو کے پھر نکلتی ہے درمیاں سے
وہ اس قدر تیز رو ہے جیسے
کوئی عقاب اپنے پر سمیٹے زمیں کی جانب اتر رہا ہو
خرام آہستہ بھی ہے اس کا
کہ آ کے بستر پہ محوِ طواف مژگاں جو ہوتی ہے تو
بہت ہی ہلکے قدم اٹھا کر
طواف کے بعد میری آنکھوں کے گھر میں آتی ہے اور
پلکوں کی چٹخنی چڑھا کر
وداع کرتی ہے شور و غل کو نوائے شوریدہ کو آہٹوں کو
میں اپنے بستر سے دیکھتا ہوں
وہ سب دھوئیں کی لکیر بن کر بکھرتے ہوئے آسماں پر

حرمت الاکرام

مسافراں گئے بڑی طرفگی کے ساتھ چلے
کسی کے ساتھ نہ تھے اور سبھی کے ساتھ چلے

نہ ہمسفر کوئی پایا نہ راہبر چاہا
وہ راہرو ہیں کہ ہم زندگی کے ساتھ چلے

ہیں مہر و ماہ بھی اپنے ہی دائرے کے اسیر
رہ حیات میں کون آدمی کے ساتھ چلے

فریب خود کو دیئے اور خود ہی پچھتائے
کسی کا جو نہ ہوا ہم اسی کے ساتھ چلے

کہو کہ ہوتی ہے اک چیز سربلندی بھی
کہا یہ کس نے کہ ہم سرکشی کے ساتھ چلے

رہے شریکِ سفر اعتمادِ ہم قدمی
یہ کیا ضرور رہے کوئی کسی کے ساتھ چلے

شکستہ پا ہی سہی لیکن اے غمِ منزل
یہ کم نہیں کہ سلامت روی کے ساتھ چلے

خود اپنا سوزِ طلب دے سکے نہ جس کا ساتھ
دیارِ غم میں وہ کس روشنی کے ساتھ چلے

یہ کہہ کے ہو گئے خود سے بھی ہم جدا حرمت
سفر میں کون کسی اجنبی کے ساتھ چلے

شفقت کاظمی

میرے حالات کی ترجماں بن گئی ہے
اب مری داستاں داستاں بن گئی ہے

یوں بھی گزرا ہے اک دورِ تنہائیوں کا
جب تری یاد آرامِ جاں بن گئی ہے

ایسے آمادہ ہے میری بربادیوں پر
جیسے وہ سرزمیں آسماں بن گئی ہے

سنتے سنتے مرے دردِ دل کا فسانہ
ایک دنیا مری رازداں بن گئی ہے

ہم فقیروں کو تیری ادائے ستم بھی
تیرے حسنِ کرم کا نشاں بن گئی ہے

یوں بھی اکثر ہوا ہے کہ ہر سانس اپنی
تا بہ لب آتے آتے فغاں بن گئی ہے

کس نے اشکوں کے موتی لٹائے ہیں شفقت
رہگزارِ وفا کہکشاں بن گئی ہے

فضا ابن فیضی

○

کیسے چھپے گا درد جو یوں بات چل پڑے
ہیں چُپ رہا نظر میں فسانے مچل پڑے

منزل کہاں کی، سمتِ سفر کیسی، ہم نفس
کانوں میں آئی جب کوئی آواز چل پڑے

اہلِ جنوں کو فکر کہاں حادثات کی
ایسے تو کتنے آپ کے گیسو میں بل پڑے

بس لے اڑیں گے اس کو فسانہ بنا کے لوگ
دیکھو نہ دل کی بات زباں سے نکل پڑے

یہ منتہائے فکرِ بشر ہے کہ آدمی
اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھل پڑے

پیراہنِ جمال سے شعلہ بھڑک اٹھا
وہ آنچ تھی نظر میں کہ جلوے پگھل پڑے

ہے دل کی دھڑکنوں سے توازن میں کائنات
سو جائے یہ تو نظمِ جہاں میں خلل پڑے

مشکل بہت ہے راہِ وفا روک لو قدم
تم کو یہ کیا ہوا کہ مرے ساتھ چل پڑے

اس انتظار میں ہے فضاؔ انجمن تمام
وہ چشمِ ناز اُٹھے تو بنائے غزل پڑے

وشوا ناتھ دردؔ

○

اب ہم چراغ بن کے سرِ راہ جل اُٹھے
دیکھیں تو کس طرح سے بھٹکتے ہیں قافلے

جو منتظر تھے بات کے منہ دیکھتے رہے
خاموش رہ کے ہم تو بڑی بات کہہ گئے

کب منزلوں نے چومے قدم اس کے ہمدمو
ہر راہ رو کے ساتھ جو رہ گیر چل پڑے

جانے زباں کی بات تھی یا رنگ روپ کی
ہم آپ اپنے شہر میں جو اجنبی رہے

وہ لوگ خوش نصیب تھے اپنی نگاہ میں
جو ہر کسی کے شوق کی خود داستاں بنے

معلوم جن کا نام و نشاں بھی نہیں ہمیں
ہم اُن کا شہر شہر پتہ پوچھتے رہے

رفعت سروش

○

نہ کوئی دوست نہ دشمن عجیب دنیا ہے
یہ زندگی ہے کہ تنہائیوں کا صحرا ہے

بدلتے رہتے ہیں ہر موڑ پہ سفر کے رفیق
غمِ حیات مگر ساتھ ساتھ چلتا ہے

دل و دماغ ہیں مصروفِ بحثِ ذات و صفات
جبینِ شوق مگر بیقرارِ سجدہ ہے

شعورِ ذات، شعورِ فنا، شعورِ بقا
شعورِ حسن نے کیا کیا مجھے سکھایا ہے

بنائے گا یہ نیا آسمانِ فکر و نظر
غبارِ راہ جو پامال ہو کے اٹھا ہے

جو دیکھئے تو بگولہ ہے ریگِ آوارہ
جو سوچیئے تو یہی آبروئے صحرا ہے

کچھ آج رنگ ہے میلا فضا کے آنچل کا
ضرور آدمِ خاکی ادھر سے گذرا ہے

سروشؔ وادیٔ غربت سے بے خطر گذرو
تمہارے ساتھ محبت کا نرم سایہ ہے

پرکاش فکری

○

زرد پانی میں گھلا چہرۂ مہتاب کا رنگ
سبز کچھ اور ہوا ہجر کے زہراب کا رنگ

کچھ تو کہنا تھا مگر بات نہ آئی لب پہ
مرگ آسا تھا بہت حلقۂ احباب کا رنگ

شبنمی پھول جلے روح کی ویرانی سے
خون آنکھوں کو لگا غنچۂ شاداب کا رنگ

اک مسافر کی طرح یاد کسی کی آئی
راکھ جس دم کہ ہوا مہرِ جہاں تاب کا رنگ

لہر دریا کی رہی بیچ میں حائل فکری
کشتیاں تہہ میں چھپیں دیکھ کے گرداب کا رنگ

خورشید احمد جامی

جب پکارا ہے خیالات کی رعنائی نے
ہاتھ پھیلا دیئے جلتی ہوئی تنہائی نے

ہُو بہُو نقل اُتاری ہے ترے لہجے کی
در و دیوار کی خاموش سی گویائی نے

جگمگاتے ہوئے خوابوں کا صحیفہ کھولا
پھر کسی یاد کی مخمور سی انگڑائی نے

بیٹھ کر رات کی سنگین فصیلوں کے تلے
درد کے چاند تراشے مری تنہائی نے

موسمِ گل کی نگاہیں بھی وہیں ٹھہری ہیں
نقش چھوڑے تھے جہاں بادیہ پیمائی نے

سنگ انداز اندھیروں کو دعائیں دی ہیں
روشنی بن کے مرے پیار کی رُسوائی نے

یاد صحرائے حوادث کی دلادی مجھکو
شہرِ امید کے اندازِ پذیرائی نے

زندگی بھر مجھے دوزخ میں جلایا جامیؔ
زندگی سے مری دیرینہ شناسائی نے

نسیم جمالی

آنچ سے دُور ہو گئے حال سے قال بن گئے
میرے تمام ہم نفس خواب و خیال بن گئے

عجزِ بیاں سے بات میں گتھیاں اور پڑ گئیں
جتنے مرے جواب تھے سارے سوال بن گئے

وقت نے یُوں اجاڑ دیں دیدہ و دل کی بستیاں
جتنے تعلقات تھے گردِ ملال بن گئے

ہم کہ سرِ غرور تھے تیشۂ جور کے لئے
دولتِ درد دیکھ کر دستِ سوال بن گئے

میری نظر میں چند روز آپ رہے پھر اس کے بعد
صبح بہار ہو گئے، شامِ وصال بن گئے

خوار ہوئے تو کیا گلہ، وہ نہ ملا تو کیا گیا
یہ تو ہوا کہ قابلِ پرسشِ حال بن گئے

آپ جنوں کی راہ میں ننگِ جنوں رہے نسیمؔ
لوگ رہِ ہوس میں بھی اہلِ کمال بن گئے

عروج زیدی

کیوں بزمِ دل ہے زیر و زبر کچھ نہ پوچھیے
کیا کہہ گئی نظر سے نظر کچھ نہ پوچھیے

کہتے ہیں "وجہِ دامنِ تر۔ کچھ نہ پوچھیے"
اس کچھ نہ پوچھیے کا اثر کچھ نہ پوچھیے

راہِ طلب میں اُن کا تصور ہے میرے ساتھ
خود وہ بھی ہیں شریکِ سفر کچھ نہ پوچھیے

پہنچے گی بات ذوقِ نمودِ جمال تک
کیوں ہل رہا ہے پردۂ در کچھ نہ پوچھیے

اک بے وفا کو "جانِ وفا" کہہ رہا تھا میں
اس مبتدا کے بعد خبر، کچھ نہ پوچھیے

میں جلوہ گاہِ ناز میں جب باریاب تھا
کتنے حسیں تھے شام و سحر کچھ نہ پوچھیے

اب ضبطِ عرضِ شوق کی ہمت نہیں رہی
جو میں کہوں وہ سنئے مگر، کچھ نہ پوچھیے

اِک "پیکرِ جمیل" ہے آنکھوں کے سامنے
اب عالمِ غرورِ نظر کچھ نہ پوچھیے

شبنم رومانی

تمام عُمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ اِک گھڑی جو تری یاد میں گزاری ہے

خفا نہ ہو تو دکھا دیں ہم آئینہ تم کو
ہمیں قبول کہ ساری خطا ہماری ہے

اس انجمن میں سُنائے ہیں میں نے پیار کے گیت
جس انجمن میں عبادت بھی کاروباری ہے

مجھے یہ زعم، کہ "میں حُسن کا مصور ہوں"
اُنھیں یہ ناز کہ "تصویر تو ہماری ہے"

جہاں پناہِ محبت جنابِ شبنم ہیں
زبانِ شعر میں "فرمانِ شوق" جاری ہے

بدر جعفری

اہلِ قفس میں ایکا سا ہے
خیر تو ہے؟ اندیشہ سا ہے

لوٹ نہ جائے سازِ ہستی
تارِ نفس میں لرزہ سا ہے

غم بھی ہم کو راس نہ آیا
ان کی مژہ پر تارہ سا ہے

ذہن کے در سب بند ہوئے ہیں
سوچ پہ جیسے پہرہ سا ہے

پاؤں کی آہٹ سانس کی خوشبو
ایک مسلسل دھوکا سا ہے

روگ لگا بیٹھے ہو کوئی
منہ کیوں اترا اترا سا ہے

اپنے ہی گھر میں غیر ہوئے ہم
خیر مگر اک صدمہ سا ہے

بدر کو دیکھو بدر کو سمجھو
آدمی سیدھا سچا سا ہے

حزیں لدھیانوی

روشن دنوں کی یاد میں آنکھوں سے چل پڑا
کب سے رکا ہوا تھا ستاروں کا قافلہ

رنگِ ہوا پہ دھیان رہے اہلِ گلستاں
پھر موجِ شاخ پر ہے سفینہ گلاب کا

تاریکیوں میں شعلۂ فانوس کی طرح
چمکی مرے بدن کے صدف میں مری انا

شبنم، کبھی شرر، کبھی تارا کبھی گہر
آنسو ہزار بھیس بدلتا چلا گیا

گھر میں رہے تو ڈستی رہی غم کی خامشی
بازار میں گئے تو قیامت کا شور تھا

جنگل میں جا کے کون ہواؤں کے تیر کھائے
شہروں میں چل پڑی ہے سنکتی ہوئی ہوا

جمشید ہوں نہ شاہِ جہاں ہوں میں دوستو
پھر بھی مرا ضمیر ہے جامِ جہاں نما

سکھ کی چھلکتی نہر بہانے کی آس میں
میں دکھ کا ہر پہاڑ حزیں کاٹتا رہا

اختر نظمی

آدمی گھر سے جب نکلتا ہے
الجھنیں ساتھ لے کے چلتا ہے
غم کے سائے کبھی نہیں ڈھلتے
رات ڈھلتی ہے دن بھی ڈھلتا ہے
ہمسفر ہی ہو کیا ضروری ہے
جو مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
تیرگی میں ہے گم مری منزل
راستے میں چراغ جلتا ہے
نقش روشن ہے یاد ماضی کا
دور کوئی چراغ جلتا ہے
لاکھ پھولوں کے درمیاں رہیے
دل کا کانٹا کہیں نکلتا ہے

اشتیاق طالب

خورشید رُخاں آئے، شمشاد قداں آئے
تجھ سادہ صفت لیکن محفل میں کہاں آئے

اک تجھ سے بچھڑتے ہی راہوں میں تری خاطر
ابرو بہ کماں آئے کچھ دشمن جاں آئے

دعوٰئے زلیخائی ہے سب کو یہاں لیکن
وہ بات کہاں آئی، وہ طور کہاں آئے

کچھ ابر بھی چھایا ہو، کچھ پھوار بھی پڑتی ہو
پھر جام بکف کوئی اور رقص کناں آئے

پریمی رامپوری
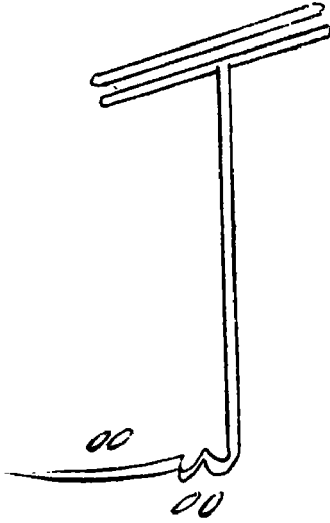
نہ آئینہ سے نہ آئینہ گر سے ملتی ہے
جو آب و تاب کسی دیدہ ور سے ملتی ہے
ادھر سے بھی کوئی مست خرام گزرا ہے
یہ کہکشاں تو کسی رہگذر سے ملتی ہے
اگر سُرور ہے محدود جام و مینا تک
وہ چیز کیا ہے جو تیری نظر سے ملتی ہے
مری طرح انھیں خود بھی ہے اسکا اندازہ
پتہ کی بات کہاں نامہ بر سے ملتی ہے
گلوں کے شبنمی دامن کو دیکھتے کیا ہو
یہ کیفیت تو مری چشمِ تر سے ملتی ہے
سمجھ سے کام لے عزم و عمل کے دیوانے
ہمیشہ روشنی فکر و نظر سے ملتی ہے

عنبر چغتائی

جلتی ہے تو جلنے بھی دے من میں پریت کی آگ
جوت نہ جب تک جیون کی اے ساتھی جائے جاگ
گاتے گاتے جلا ہی دے گی مجھ کو من کی آگ
میں کیوں چاہوں تو جل جائے سُن سُن دیپک راگ
کیسا گھور اندھیرا چھایا آشاؤں کی کٹیا میں
رین سے پہلے ڈسنے آئے کالے کالے ناگ
تیرے آتے آتے سجنی ، تارا ہم بن جائیں گے
اوس تو اُڑ ہی جاتی ہے جب کرنیں جائیں جاگ
تیرے دوارے لے آئی ہے پریم پھول کی باس
ہم ہیں دیوی پریم پجاری جاگ سکے تو جاگ

سعادت نظیر

○

کھلے تھے پھول جھڑی لگ رہی تھی ساون تھا
ترے بغیر مگر کچھ اداس گلشن تھا
ترا کرم ہی سہارا تھا زندگانی کا
وگرنہ ایک زمانہ ہمارا دشمن تھا
نہ شوقِ حلقۂ کاکل نہ خوفِ دار و رسن
ہر ایک قید سے آزاد میرا بچپن تھا
پتا بتا نہیں سکتا بقیدِ شاخ و چمن
بس اتنا یاد ہے میرا کہیں نشیمن تھا
یہ اور بات ہے دنیا اسے بھلا بیٹھی
وگرنہ تیرا سعادت بھی صاحبِ فن تھا

غلام مرتضےٰ راہی

○

انھیں تو چاہیئے بس اک اشارۂ پرواز
ہر ایک ذرۂ پستی لئے ہے ذوقِ فراز
تمام حسن حقیقت، تمام عشق مجاز
تو اپنی بے خبری کو اس آگہی سے نواز
میں یہ نہیں ہوں جو آتا ہوں آئینے میں نظر
مرا وجود ہے دراصل میرا پردۂ راز
اڑوں تو چوم لوں پیشانیٔ زمان و مکاں
ہو مجھ میں کم سے کم اتنی تو جرأتِ پرواز
نہ پوچھ مجھ سے مری شرحِ زندگی ابدیت
یہ مختصر ہے مگر اس کا سلسلہ ہے دراز

رؤف خیر

○

یہ سچ سہی کہ مجھکو اندھیروں نے پالا ہے
میں جس طرف چلا ہوں ادھر تو اجالا ہے
میں یہ سمجھ رہا تھا کہ جھوٹا ہے آئینہ
تیزاب آپ نے مرے چہرے پہ ڈالا ہے
انسانیت کے ناطے ہیں کچھ مجھ میں بھی عیوب
یاروں نے خواہ مخواہ کچھ ان کو اچھالا ہے
تم اپنے بعد وارثِ فن چھوڑتے نہیں
کیا خوب خودکشی کا یہ رستہ نکالا ہے
یوں زندگی سے اپنا تعارف کرائیے
خود زندگی کہے یہ مرا دیکھا بھالا ہے

زکی انور

ایک دیوی ایک دیوتا

یشپال کے ہوش گم ہو گئے۔ ایک پل کے لئے یشپال نے سوچا کہ والنیٹروں یا پولیس سے مدد لی جائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنا خیال انتہائی ذلیل سا لگا یہ لوگ میرے پرستار ہیں۔ میرے فن کی عظمت ہیں۔ کتنی ذلیل حرکت ہوگی اگر میں انھیں ڈنڈوں کی مدد سے الگ کروں۔ چھی!

چھٹی غزل گانے کے بعد یشپال ڈائس سے کود کر بھاگنا چاہ رہا تھا کہ یک لخت سارا ہال گونج اٹھا۔

"اک جام کھنکتا جام۔"... کوئی زور سے چیخا۔

"ہاں ہاں۔ رات گزرنے والی ہے" کوئی اور چیخا۔

"پلیز یشپال جی" نہایت ہی مترنم آواز آئی۔

صرف ایک... صرف ایک اور" بہت سے لوگ مل کر چیخے اور یشپال نے سنگیت آشرم کے سکریٹری کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا۔

سنگیت آشرم کے سکریٹری۔ استاد کرامت علی خاں اس سنگیت سمیلن کے خاص منتظم تھے۔ جو سنگیت سمیلن تین دنوں سے شہر کے ٹاؤن ہال میں چل رہا تھا۔ یہ سمیلن سنگیت آشرم کی توسیع اور ترقی کے لئے منعقد کیا گیا تھا چنانچہ ٹکٹ کی کم سے کم قیمت سات روپے تھی اور ہال میں تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک سے ایک موسیقار اور گلوکار بلائے گئے تھے لیکن پرسوں اور کل کی نشست گلوکار یشپال نے جیت لی تھی اور آج کا بھی کچھ وہی عالم تھا۔

سنگیت آشرم کے سکریٹری۔ استاد کرامت علی خاں نے یشپال کی بے بسی بھانپ لی اور وہ مائک کے پاس آگئے اور انھوں نے سامعین کو سمجھایا کہ "یشپال جی کوئی ریکارڈ تو نہیں وہ بھی آدمی ہیں اور تھک گئے ہیں۔ لگاتار چھ غزلیں گانا کوئی کھیل نہیں" اور دوسری بات انھوں نے یہ سمجھائی کہ "سمیلن میں بڑے عظیم موسیقار اور گلوکار بلائے گئے ہیں۔ لہٰذا اگر سامعین صرف یشپال جی کو ہی سنتے رہیں گے تو کچھ بہت اچھے کلاکاروں کو سننے کا موقع کھو دیں گے۔"

"ہیں اور بھی دنیا میں گوئیے بہت اچھے" ڈائس کے بالکل قریب کی سیٹوں میں سے ایک سیٹ پر سے نہایت ہی نرم و نازک سی آواز آئی۔

"یشپال کے گانے کی مگر بات ہے کچھ اور"

یشپال ہنس پڑا۔ اس نے استاد کرامت علی خاں کو مائک سے ہٹنے کا اشارہ کیا اور پھر خود کہنے لگا۔

"ایک کلاکار کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سنا جائے اور پسند کیا جائے۔ اور میں اس وقت خوشی سے پاگل ہوا اٹھا ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے اس قدر پسند کیا ہے۔ یہ آپ لوگوں کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ابھی سنگیت کی الف بے بھی نہیں سیکھی ہے۔ میرے لئے یہ کس قدر فخر کی بات ہے کہ ابھی ابھی میرے بارے میں ایک شعر کہا گیا ہے۔ آپ بھی سنئے اور مزہ لیجئے۔

"ہیں اور بھی دنیا میں گوئیے بہت اچھے
یشپال کے گانے کی مگر بات ہے کچھ اور"

اور سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور جب تالیوں کی گونج

الشماع

سا طوفان تھا تو یشپال کہنے لگا۔

اور اب میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں اپنے قدر دانوں اور پرستاروں کا حکم ٹال دوں۔ لیجئے ایک مشہور شاعر کی مشہور غزل پیش خدمت ہے۔ لیکن ایک درخواست کے ساتھ کہ پلیز اسے آخری سمجھئے۔ ورنہ جیسا کہ ابھی سنگیت آشرم کے سکریٹری صاحب نے فرمایا۔ آپ لوگ بہت ہی اونچے اونچے کلاکاروں کو سننے کا موقع کھو دیں گے۔

اور پھر وہ بیٹھ گیا اور گانے لگا۔

" اک جام کھنکتا جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
اک ہوش ربا انعام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے "

لیکن اس ساتویں غزل کو بھی بہر حال ختم ہونا تھا ختم ہوئی۔

غزل ختم ہوئی اور شور مچ گیا۔

اور اب کے ایک دبلی پتلی سانولی سلونی سی لڑکی والنیٹروں کو دھکے دیتی ہوئی۔ کود پھاند کر ڈائس پر آ گئی اور یک لخت مائیک کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"سنگیت کے پریمیو!" وہ کہنے لگی "نغمے کے شیدائیو!... میں بھی آپ ہی میں سے ہوں۔ آپ ہی کی طرح سنگیت کی پریمی اور نغمے کی شیدائی لیکن اب میں ایک انصاف چاہتی ہوں۔ دیکھئے یشپال جی ایک عظیم دولت ہیں، ہم سب کی دولت۔ میرا خیال ہے ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ ہماری یہ بے مثال دولت ضائع ہو جائے۔ کل یشپال جی کو روٹری کلب کے انعامی مقابلے میں حصہ لینا ہے۔ ہم میں سے کس کی یہ تمنا نہیں ہے کہ ہمارے محبوب ترین موسیقار یشپال جی سب سے بڑا انعام حاصل کریں۔ ہمیں چاہئے کہ اب ہم یشپال جی کو آرام کرنے کا موقع دیں تاکہ کل وہ تازہ دم ہو کر مقابلے میں شامل ہوں اور انعام حاصل کر کے ہم سب کو سربلند کریں۔ اب آپ مہربانی کر کے یشپال جی کو آرام کرنے کا موقع دیں۔"

ہال میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔

یشپال نے اس سانولی سلونی اور ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کی اور ڈائس کے بیک ڈور

اشجاع

سے باہر نکل گیا۔

باہر اس کی ہلکے نیلے رنگ کی کار کھڑی تھی جس کے چاروں طرف اس وقت عورتوں لڑکیوں، مردوں اور نوجوان لڑکوں کا مجمع سا لگا ہوا تھا۔

یشپال کے ہوش گم ہو گئے۔

ایک پل کے لئے یشپال نے سوچا کہ والنیٹروں یا پولیس سے مدد لی جائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنا خیال انتہائی ذلیل سا لگا۔

"یہ لوگ میرے پرستار ہیں، میرے شیدائی ہیں" وہ سوچنے لگا "میری شہرت انھیں کی بدولت ہے۔ یہ میرے فن کی عظمت ہیں، یہ میرا وقار ہیں... کتنی ذلیل حرکت ہوگی اگر میں انھیں غنڈوں کی مدد سے الگ کروں... چھی"۔

اور وہ بڑے پروقار انداز میں آگے بڑھا لیکن جیسے ہی وہ کار کے قریب پہنچا۔ آٹوگراف بک لئے ہوئے لڑکیاں اس کی طرف لپکیں، اور آن واحد میں یشپال رنگ برنگ کی لڑکیوں کے نرغے میں آ چکا تھا۔

اس نے ایک دل آویز تبسم کے ساتھ چاروں طرف نظر دوڑائی پھر اور بھی غضب ناک مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

" میں آپ میں سے ہر ایک سے باتیں کروں گا۔ آپ میں سے ہر ایک کو آٹوگراف دوں گا۔ یہی نہیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے گا آپ کی خاص فرمایش بھی پوری کروں گا"

" گروپ فوٹو گراف" ایک آواز آئی۔

" بڑے فخر کے ساتھ" یشپال پھر مسکرایا "مجھے فخر ہوگا کہ میں آپ جیسی قدر دانوں کی جھرمٹ میں تصویر اترواؤں گا"

" ٹیپ... ٹیپ" دوسری آواز آئی۔

" ہاں ہاں" اس میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔؟ جو گانے میں گراموفون والوں کو دے چکا ہوں اس کے ٹیپ کرانے میں تو مجبوری ہے۔ ویسے آپ مجھ سے جو گوانا چاہیں"

" گانے نہیں میں آپ کی باتیں ٹیپ کروں گی" پھر وہی آواز آئی اور ساری عورتیں اور لڑکیاں ہنس پڑیں۔

" اور میں آپ کی مووی فلم لینا چاہتی ہوں۔" یہ جانی پہچانی آواز تھی۔ یہ وہی سانولی سلونی آواز تھی جس نے یشپال کو نجات دلائی تھی۔ اور یہ وہی آواز تھی جس نے سارے مجمع کو ساکت کر دیا۔

لیکن یشپال جلدی سے بولا۔

"آپ چاہیں تو میری فل سنگتھ فلم لے سکتی ہیں۔ لیکن ایک درخواست ہے۔ آپ سب سے میری ایک التجا ہے۔ ایک پرارتھنا ہے دیکھئے اس وقت ایک بج چکا ہے۔ یہ سارے پروگرام کل صبح پر رکھئے میں کسی وقت بھی سوؤں چار بجے جاگ جاتا ہوں اور پانچ بجے تک تیار ہو جاتا ہوں۔ آپ لوگوں کو زحمت تو ضرور ہوگی۔ لیکن میری خوشی کی انتہا نہیں رہے گی اگر کل صبح کی چائے آپ سب میرے ساتھ پئیں۔"

" یہ بھی ایک فن کار ہے۔" ایک آواز آئی۔

" ہاں یہ ایک عظیم کلاکار ہے۔" دوسری آواز آئی۔" ایک مہان کلاکار"

" یہی انسان دوستی تو یشپال جی کی عظمت ہے۔" سانولی سلونی آواز آئی۔ جب ہی تو ہم ان کی پوجا کرتے ہیں۔"

اور پھر یشپال نے سنا وہ کئی فلم اسٹاروں، شاعروں، کہانی کاروں اور موسیقاروں کو نام لے لے کر گالیاں دینے لگے تھے۔

یشپال کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ چنانچہ اس نے پھر مجمع کو اپنی طرف مخاطب کر لیا۔

"اگر آپ سب صبح کی چائے اکٹھے میرے ساتھ پینے کی خوشی مجھے بخشتے ہیں تو میں ابھی جا کر کل صبح کے لئے "دی روز" کا ڈائننگ ہال بک کرالوں... میں وہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

" لیکن وہاں اتنی جگہ نہیں ہے۔" سانولی سلونی لڑکی نے کہا۔

" اجی صاحب" یشپال پھر اسی غضب ناک انداز میں مسکرایا۔
"جگہ دل میں ہونی چاہئے۔"

" لیکن میں ایک درخواست کروں گی۔" سانولی سلونی لڑکی بولی۔ اگر یشپال جی کے یہ سارے پجاری اعتراض نہ کریں تو وہ سب کے سب اور خود یشپال جی کل صبح کی چائے میرے غریب خانے پر..."

کسی اور کو اعتراض نہیں ہوا۔ لیکن یشپال اس سانولی سلونی لڑکی سے بولا۔

" لیکن مجھے افسوس ہوگا کہ آپ نے میری درخواست نامنظور کر دی اور اصولاً بھی یہ بات اچھی نہیں لگتی کیوں کہ پہلے میں نے چائے کی تجویز رکھی ہے۔"

ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو غالباً اچھا نہیں لگا کہ یشپال اس لڑکی کے بارے میں شاید کچھ نہیں جانتا ہے اسی لئے اس نے اس کی بات کاٹ دی ہے اور وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس لڑکی کا تعارف کرانے لگی۔

یشپال جی آپ سے ملئے۔ آپ کارپوریشن کے میئر اور شہر کے سب سے بڑے تاجر مکھن ناتھ جی کی اکلوتی بیٹی کماری دیپالی ناتھ ہیں۔ اسی عمر میں آپ نے ہندی میں ایم اے کیا ہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا ہے اور اب کماری دیپالی جی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ گانے، ستار بجانے اور رقص میں آپ کو کمال حاصل ہے۔"

" پھر تو مجھے سخت افسوس ہے۔" یشپال کہنے لگا۔" کہ میں نے ایک اتنی بڑی شخصیت کی دعوت میں رخنہ اندازی کی۔ مجھے معاف کیجئے دیپالی جی۔"

" ارے واہ۔" دیپالی ہنسی اور جل ترنگ بج اٹھے۔"آپ کے لئے تو ہم سب برابر ہیں۔ ساکی نے تو بے کار میرا تعارف کرا دیا۔ بھلا آپ کے نزدیک میرا مقام ہی کیا ہے۔ آپ کچھ خیال نہ کریں یشپال جی۔ میں ضرور آؤں گی۔ سچ مچ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے کہ آپ کی دی ہوئی دعوت کو میں اچک لوں۔"

پھر بات ختم ہوگئی۔

لوگ راستے سے ہٹ گئے اور یشپال ایک بار پھر حد سے زیادہ دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ، ہاتھ جوڑ کر سب کو نمستے کرتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی چلی گئی۔

اور کچھ اور دیر تک وہ لوگ وہیں کھڑے یشپال کی انسان دوستی اور عظمت کی باتیں کرتے رہے۔

اور چلتے چلتے ایک لڑکی نے اپنی رازدار سہیلی سے کہا۔

کیا عجب ہے دیپالی بازی جیت لے.... اف کس قدر خوش نصیب ہوگی وہ لڑکی یشپال جس کا ہو جائے !"

" اگر تیرا ہو جائے ؟ " اس کی سہیلی نے شرارت سے چٹکی لی۔

" تو کیا کرے گی ؟ "

" میں دن رات سنگیت۔ انسانیت اور عظمت کے اس مہان دیوتا کی پوجا کرتی رہوں گی " وہ بولی۔

" بس ؟ " وہ حقارت سے بولی " آدمی بہرحال آدمی ہے کون جانے کب بھگوان کی شان میں کوئی گستاخی ہو جائے۔ یشپال جی اگر میرے ہو جائیں تو میں ان کے چرنوں میں سر رکھ کر ایک ابدی سکون حاصل کر لوں۔ نہ آتما ہو گی۔ نہ کوئی غلطی ہو گی "

اور لڑکیوں کی ایک اور ٹولی بھی بڑی بے باکی کے ساتھ ایسی ہی کچھ باتیں کر رہی تھی۔ اور پھر اسی ٹولی میں سے غضب ناک طور پہ ایک حسین لڑکی نے کہا۔

ایک طرف اگر ساری دنیا کی دولت۔ سکھ چین۔ آرام و آسائش سب کچھ رکھ دیا جائے اور دوسری طرف زمانے بھر کی تکلیف۔ پریشانی۔ دکھ درد کے ساتھ ساتھ یشپال ہو۔ تو کون بدنصیب لڑکی ہو گی جو ہنستے ہنستے زمانے بھر کی اذیت کو گلے نہ لگا لے۔

اور دیپالی سنگیت سمیلن کے ہال میں واپس نہیں گئی۔ وہ اپنی کار پہ بیٹھی اور کار رخصت ہو گئی۔

دیپالی کی کار ہوٹل دی روز پہنچی۔ اور جیسے ہی اس نے پورٹیکو میں گاڑی کھڑی کی۔ جیسے کسی نے اس کے کان میں کہا۔

" لیکن انھیں آرام کرنا چاہیئے "

اور جب وہ اپنی گاڑی سے اتری تب بھی اس کے دل میں وہی غیبی آواز گونجی۔

" لیکن انھیں آرام کرنا چاہیئے "

اور پھر دیپالی اوپر کی منزل پہ جانے کے لئے سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ اس وقت بھی اس کا دل بار بار کہتا رہا۔

" انھیں آرام کرنا چاہیئے "

لیکن وہ اوپر پہنچ گئی۔ مسافروں کے پتے کے بورڈ میں اس نے دیکھا۔ یشپال ۱۲ نمبر کے کمرے میں تھا۔ اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ ۱۲ نمبر کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔

اور اس وقت اس کے دل نے کہا۔

" لیکن وہ تو آرام نہیں کر رہے ہیں !"

وائلن حد سے زیادہ دردناک آواز میں کراہ رہا تھا۔

کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ لیکن اس پر خوبصورت ریشمی پردا گرا ہوا تھا۔ دیپالی نے بہت ہی آہستہ سے پردا ذرا سا سرکایا۔ اور یک لخت اسے ایسا لگا جیسے وہ شعبدہ بازی کا کوئی کرشمہ دیکھ رہی ہو۔

اندر کمرے کے فرش پر ایک معمولی سا بستر ڈالے ایک خوبصورت سی عورت آنکھیں بند کئے پڑی تھی اور یشپال اس کے قدموں میں بیٹھا وائلن بجا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

پھر اس نے بڑی بے دلی سے وائلن پلنگ پر پھینک دیا۔ اور اٹھ کر اس عورت کے سرہانے پہنچ گیا۔ پھر وہ بہت ہی سہمے سہمے انداز میں اس کا سر سہلانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

" میں اور کچھ نہیں چاہتا میری رتی.... میں اور کچھ نہیں چاہتا بھگوان کے لئے صرف اتنا بتا دو کہ مجھ سے کون سا قصور سرزد ہو گیا۔ تاکہ میں تم سے معافی تو مانگ سکوں۔ تم نے بالکل ہی بولنا بند کر دیا۔ خیر کوئی بات نہیں تھی ایسا تو دس برسوں سے ہوتا رہا ہے لیکن اب کے تو دو ماہ ہو گئے اور تم نے اب تک معاف نہیں کیا۔ رتی مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو رتی "

یشپال اس عورت کے چہرے پر جھک گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بجلی کی سی سرعت سے اٹھ بیٹھی اور یشپال پھر کہنے لگا۔

اسی لئے میں تمہیں ساتھ لے کر آیا کہ شاید گھر سے دور تمہیں کچھ سکون ملے اور تم مجھے بتا دو کہ آخر مجھ سے کیا دوش ہو گیا ہے لیکن یہاں بھی تو تمہارا وہی حال ہے۔ نہ تم کہیں گھومنے گئیں۔ نہ ایک دن بھی تم نے سنگیت سمیلن میں شرکت کی۔ کاش تم ایک دن

کبھی کبھی ہوتیں رتی تو تم دیکھتیں کہ تمہارا یہ حقیر اور ہمیشہ کا ٹھکرایا ہوا یشپال کون ہے۔ کیا ہے اور کہاں ہے؟۔۔۔ رتی۔۔۔ میری رتی کم سے کم یہ تو بتا دو کہ اس بار مجھ سے کھنی سی اتنی بڑھی۔۔۔"

"یقیناً تم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مجھ سے باتیں نہیں کروگے۔"

اب وہ عورت بڑے روکھے پن سے بولی۔ "پھر یوں تم نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جس کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اپنا فیصلہ مت بدلو۔"

"میں نے کبھی ایسا کمینہ فیصلہ نہیں کیا۔" یشپال بولا۔ "تم نے باتیں کرنا بند کر دیا تھا تو فطری طور پر میں بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن پھر میں ہی چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرنے لگا۔ البتہ تمہاری خفگی اب تک بدستور ہے اور تم نے کبھی۔۔۔"

وہ اٹھی اور وائلن ایک کنارے کھسکا کر اب کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

اور یشپال مسکرا اٹھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔

خیر رتنا۔ کوئی بات نہیں۔ میں بہرحال تمہارا شکر گزار ہی ہوں کہ تمہارے اس برتاؤ نے میری زندگی کو جو کرب بخشا ہے اس کرب نے۔ اس مبارک کرب نے میرے نغموں میں اور بھی سوز بھر دیا ہے۔ میں بہرحال تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے جو غم دیا ہے اس غم نے میری آواز کو ایک آفاقی درد بخش دیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں یقیناً یہ تم ہی ہو جس کی بدولت میرے نغمے حساس دل والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکائے بغیر نہیں رہتے۔ اور یہی تو ہے ایک نغمے کی معراج۔ ایک موسیقار کی عظمت اور فن کی انتہائی بلندی! بے شک لوگوں نے مجھے ایک عظیم موسیقار گردان لیا ہے۔ لیکن تمہاری بدولت رتنا!۔۔۔ رتو تمہاری بدولت تمہاری اس نفرت کی بدولت جو تمہیں مجھ سے ہے۔۔۔ تمہاری اس بدمزاجی کی بدولت جو میری زندگی ہے۔ میری کائنات ہے۔ مجھے تمہاری پوجا کرنی چاہیئے۔۔۔ تم میری عظمت کی دیوی ہو۔۔۔

یشپال نے اس عورت کے پاؤں چھو لئے اور پھر وائلن اٹھا کر وہ سامنے کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔

اور ادھر کی کھڑکی کے پاس کھڑی دیپالی کے لب کانپنے لگے اور پھر وہ رو پڑی۔

اور پھر وہ واپس ہو گئی۔

اور جب وہ واپس ہونے لگی تھی تو وائلن اور بھی پرسوز اور بھی پر درد آواز میں کراہنے لگا تھا۔

> شاہینہ مجھ سے قریب ہو کر بھی کتنی دور ہے۔ اس کا حسن اور اس کی جوانی میرے صبر و ضبط کا امتحان لے رہی ہے۔ میرے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ میں رات کو چوروں کی طرح بھاگ جاؤں یا پھر اپنے ضمیر کو تھپک کر سلا دوں۔

میں منہ بولے بھائی بہنوں کے رشتہ کا شروع سے قائل نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں خلوص و سنجیدگی کم اور جذباتیت زیادہ ہوتی ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں فراڈ زیادہ ہوتا ہے۔ میری اس رائے کے جواب میں میرے بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی بہن کی محبت سے محروم ہوتا تو مجھے اس رشتے کی اہمیت و عظمت کا احساس ہوتا۔ لیکن میں دوستوں کی اس دلیل کا ہمیشہ یہ جواب دیتا تھا کہ

" اگر ایسا ہوتا تب بھی میں کسی لڑکی کو بہن نہ بناتا۔ اگر کسی کی کوئی بہن نہیں ہے تو اس حقیقت کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے دوسرے منہ بولے رشتے خونی رشتوں کی طرح پائدار نہیں ہو سکتے۔ یہ مصنوعی رشتے بچوں کے گھروندوں کی طرح ڈھہ جاتے ہیں۔"

لیکن گزشتہ تین ماہ سے میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ میں بھی انھیں جذبات کی گرفت میں جکڑا ہوا ہوں۔ میں بھی کسی کو بہن بنانے پر مجبور ہو گیا ہوں ایک ایسی ۳۵ سالہ خاتون کو جو دس سال ہوئے اپنے جوان بھائی کو ایک حادثہ میں کھو چکی ہیں۔ میری کہانی بڑی عجیب و غریب ہے۔ چھ ماہ قبل میری ایک جذباتی کہانی "بہن بھائی" کے عنوان سے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کہانی بے انتہا مقبول ہوئی اور اس کی تعریف میں مجھے بلا مبالغہ سیکڑوں خطوط موصول ہوئے ان ہی خطوط میں سلمٰی خاتون کا خط بھی تھا یہ خط بڑے جذباتی انداز میں لکھا گیا تھا انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اس کہانی کو پڑھ کر کئی دن تک آنسو بہاتی رہی ہیں اور کئی دن کے سوچ بچار کے بعد انھوں نے یہ خط لکھا ہے۔ نہ جانے کیوں وہ کہانی کے مرکزی کردار کو میری ذات سے منسوب کر بیٹھیں اور مجھے اپنا نصب العین بنا لیا۔ پہلے خط میں سے قسم کے جذباتی فقروں سے بھرپور ایک طویل داستان تھی۔ ایک بھائی کی بہن کی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ کوشش کر کے میری کہانیوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے لگیں۔ اور ہر بار لمبے لمبے خط لکھتیں۔ جن میں کہانی کی تعریف کے بعد مجھے بھائی بنانے کی خواہش کا اظہار بڑے دردمندانہ لہجے میں ہوتا تھا۔ مجھ سے بھائی کے پیار کی بھیک مانگی جاتی تھی۔ لیکن میں نے ایسے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ میرا دماغ بغیر جانے پہچانے اس طرح ان دیکھے اجنبی رشتے قائم کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اب ان کا اپنا کوئی بھائی نہیں ہے۔ کوئی خالہ زاد چچا زاد بھائی بھی نہیں ہے۔ بھائی کا پیار پانے کی انھیں کتنی آرزو ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح زبردستی میں کس طرح بھائی بن سکتا ہوں چنانچہ میں نے سلمٰی خاتون کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک دن ان کے خط کے ساتھ لفافہ میں اور بھی کئی خطوط تھے۔ ان میں ان کی بیٹی شاہینہ کا خط بھی تھا اور ساتھ ہی ایک فیملی گروپ بھی تھا جس میں

الشعاع

شاہینہ اپنی ماں کے پیچھے ایک عجیب انداز سے کھڑی مسکرا رہی تھی
میں نے سب سے پہلے شاہینہ کا خط پڑھا۔ اوپر لکھے القاب نے
میرے ضمیر کو جھٹلانا چاہا لیکن میں نے اس القاب کو قلمزد کر دیا اور
خط کو نہ صرف کئی بار پڑھا بلکہ شاہینہ کی تصویر کو بھی بار بار دیکھا۔
اس کی روشن آنکھوں میں بلا کی کشش تھی اور مسکراہٹ میں ایک
عجیب سی شوخی۔ دوسرے بچوں کے اور سلمیٰ خاتون کے خطوط میں
بڑی یگانگت تھی لیکن شاہینہ کا خط بڑا جذباتی تھا ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے میں اس کی خوشبوؤں کا مرکز ہوں۔ وہ دن رات میرے
خواب دیکھتی ہے۔ جب کوئی خوبصورت لڑکی کسی نوجوان کے خواب
دیکھے اور نوجوان کو یہ معلوم ہو جاتے تو پھر وہ اپنے دل پر کیسے
قابو رکھ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود میں اب بھی جواب نہ دیتا
لیکن شاہینہ نے مجھ سے خط کا جواب کچھ اس انداز سے مانگا تھا
کہ میں انکار نہ کر سکا۔ اس نے خط کی آخری سطروں میں زور دے کر
لکھا تھا اور اپنی قسم دی تھی کہ

" آپ شملہ آیئے اور ضرور آیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ آئیں گے
اور ضرور آئیں گے ۔"

میں نے شاہینہ کے خط کا جواب سلمیٰ خاتون کے خط کے ذریعہ
دیا لیکن اس میں شملہ آنے کے سلسلہ میں بالکل خاموش رہا۔ کچھ
دنوں بعد پھر شاہینہ کا خط آیا۔ وہی اصرار تھا اور بے شمار قسمیں
دینے کے بعد لکھا تھا کہ

" اگر آپ اب بھی نہیں آئیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ ہم سے
ناراض ہیں ۔"

نہ جانے کیوں میں اس فقرے کی تاب نہ لا سکا اور شملہ جانے
کے لئے راضی ہو گیا۔

گاڑی اپنی مدھم رفتار سے چل رہی تھی۔ اور میں ایک ناول
پر نگاہیں جمائے پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ایک عجیب
طرح کا خوف میرے ذہن پر سوار تھا جیسے میں کوئی چوری کرنے
جا رہا تھا۔ میں نے خود کو لاکھ سمجھایا۔

" تم اپنی بہن اور بھانجیوں سے ملنے جا رہے ہو "

لیکن اندر ہی اندر کوئی میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ میری ہر دلیل
کو جھٹلا رہا تھا۔ میں شاہینہ اور اس کی امی کے متعلق کچھ بھی نہیں
سوچنا چاہتا تھا۔ وہ متضاد جذبوں میں کشمکش سی چل رہی تھی۔
میرے دماغ میں ایک فلم سی چل رہی تھی۔ اس فلم میں شاہینہ بار
بار آتی۔ کبھی اپنے دونوں بازو میری گردن میں حائل کر کے اپنی
پیشانی کو میری پیشانی سے ٹکرا دیتی۔ شرارت بھرے انداز میں کچھ
کہتی۔ کبھی میں صوفے پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہوں۔ اور شاہینہ اپنی مخروطی
انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ کنگھی کرتے کرتے
اس کا چہرہ خود بخود میری پیشانی کے نزدیک آ جاتا ہے۔ اس کی
سانسوں کے شعلے میری پیشانی کو جھلس دینا چاہتے ہیں۔ شاہینہ
کے ہونٹ میری پیشانی کو چھونے لگتے ہیں تو نہ جانے کون میرے
کان میں کہتا۔

" وہ تیری بہن کی بیٹی ہے۔ تمہاری بیٹی ہے۔ اس کے متعلق
ایسا سوچتے ہو ؟ "

اور میں پریشانی سے سر کو کئی جھٹکے دیتا ہوں۔ تاکہ ذہن صاف
ہو جائے۔ یہ آواز پھر پورے زور سے گونجنے لگتی ہے۔ میں تنگ آ کر
اس فلم کو دماغ سے صاف کرنے کی غرض سے کئی جھٹکے دیتا ہوں لیکن
یہ نقوش مٹتے ہی نہیں۔ آخری گاڑی کی چیخ میری مدد کرتی ہے
گاڑی دھیرے دھیرے سسکتی ہے۔ سواریاں جلدی سے پلیٹ فارم
پر کھڑے لوگوں میں اپنوں کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ میں آرام سے
اپنی سیٹ پر بیٹھا رہتا ہوں۔ سارا ڈبہ خالی ہو جاتا ہے۔ تو میں
بڑے آرام سے اٹیچی کیس اٹھائے نیچے اتر کر خالی پلیٹ فارم پر
اپنے قدموں کی چاپ سے حرکت پیدا کرتا ہوا باہر نکل جاتا ہوں۔ میں جب
بھی کہیں باہر جاتا ہوں بغیر کسی اطلاع کے۔ چنانچہ سلمیٰ خاتون کو بھی
میں نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ ان کا پتہ مجھے معلوم ہے۔ گو
پتہ اتنا مشکل نہیں تھا لیکن مجھے ہمیشہ کی طرح اسی مقام کے ارد گرد
کئی چکر لگانے پڑے۔ آخر ایک شریف آدمی میرے ساتھ ہو لیا۔

مکان کے پاس پہنچے تو شک سا ہوا کہ یہاں کوئی رہتا بھی ہے۔؟
بغیر پردوں کے دروازوں کے شیشوں میں سے کمرے میں ایک لڑکی
پانی پیتی نظر آئی۔ یہ شاہینہ تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو
شاہینہ دروازہ کھولتے ہی بچوں کی مانند چلائی۔ ماموں جان
آگئے۔ ماموں جان آگئے۔ خوشی سے اس کا خوبصورت چہرہ
گلنار ہو گیا وہ میرے قریب کھڑی خوشی سے کانپ رہی تھی، وہ ضرور
میرے گلے میں باہیں ڈال کر بچوں کی طرح جھولنے لگتی اگر میرے ساتھ
وہ آدمی نہ ہوتا۔ اس کی چیخ سن کر گھر کے سب لوگ جمع ہو گئے۔ مجھے
کمرے میں لے جاکر سب نے گھیر لیا۔ طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ
شروع ہو گئی۔ لیکن میں سب سے بے نیاز صرف یہی سوچ رہا تھا
کہ واقعی شاہینہ تو بچوں کی طرح بھولی بھالی ہے۔ اسے یہ احساس
ہی نہیں کہ اس کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال کے قریب ہے۔ وہ
ایک اجنبی سے مل رہی ہے۔

شاہینہ کی امی اور دوسرے بچے بھی مجھ سے بڑی محبت سے
ملے۔ شاہینہ کے والد اور سلمیٰ خاتون کے شوہر نے میرا استقبال
اسی محبت سے کیا جیسے میں ان کی بیوی کا حقیقی بھائی ہوں۔ اس
گھر میں مجھے مہمان یا اجنبی نہیں سمجھا گیا۔ سلمیٰ خاتون نے میرے
آنے پر آس پاس کے کئی لوگوں کو بلا کر ان سے میرا تعارف کرایا۔
اور کہا کہ میں ان کا بھائی ہوں۔ ان سب بچوں کا ماموں۔ گھر کے
سارے افراد مجھ سے بڑی جلدی بے تکلف ہو گئے۔ لیکن یہ بے تکلفی
میری پریشانی کا باعث تھی۔ ٹھیک ہے سلمیٰ خاتون نے مجھے اپنا بھائی
بنالیا ہے اور صدق دل سے اپنا لیا ہے۔ لیکن بات یہیں تو ختم نہیں
ہو جاتی۔ صرف ایک طرف کی سنجیدگی اور خلوص ہی تو کافی نہیں کم از
کم ایک اجنبی کو اپنانے سے پہلے اس کے دل میں بھی تو جھانک کے دیکھ
لیں۔ ضروری تو نہیں کہ اس کا دل بھی ان جذبات سے معمور ہو۔ وہ کوئی
چارسوبیس بھی تو ہو سکتا ہے۔ ایک نئے شخص پر اتنی جلدی اعتماد کرلینا
اس دور میں کچھ عجیب سی بات ہے۔ یہاں یہ عالم تھا کہ اکٹھے کھانا کھا رہے
ہیں سب کے سب ایک ہی کمرے میں رات رات بھر باتیں کر رہے ہیں۔
شاہینہ کی والدہ نے اپنے خاندان کا پورا شجرہ نسب بتا دیا تھا۔ اس میں
بہت سی راز کی باتیں بھی تھیں۔ جو میں سمجھتا ہوں کہ ایک اجنبی کو
جانچے پرکھے بغیر بتانا خطرے سے خالی نہیں۔ گو میرے لئے فضا
سازگار تھی۔ یہ بے تکلفی اور اجنبی پر مکمل اعتماد میرے حق میں مفید
تھا۔ پھر بھی کچھ تو تکلف چاہئے تھا۔ اس دوران کئی بار میں نے شاہینہ
کے چہرے کو عجیب و غریب نظروں سے دیکھا لیکن ہر بار اس کی معصوم
مسکراتی آنکھوں سے بجلی کے کوندے لپکتے اور میری نظروں کو راکھ
کر دیتے تھے۔

دوپہر کو گھر کے سب لوگوں کے ساتھ بیٹھا میں بھی کھانا کھا
رہا تھا کہ یکایک شاہینہ نے کہا۔

"ماموں جان آج ہمیں پکچر دکھایئے۔"

یہ مطالبہ سن کر میں گھبرا گیا اور خوف کے مارے کوئی جواب
نہ دیا۔ مجھے خاموش دیکھ کر شاہینہ ہنستے ہوئے بولی۔" اگر آپ کے
پاس پیسے نہیں ہیں تو امی سے ادھار لے لیجئے۔"

اس پر سب لوگ ہنس دیئے۔ شاہینہ کی امی بولیں۔" اگر واقعی
تمہارے پاس پیسے نہ ہوں ہاشم تو مجھ سے لے لو۔"

یہ سن کر میں نے آہستہ سے کہا۔" جیسا آپ کہیں۔ لیکن۔"

" لیکن ویکن ہم کچھ نہیں سنیں گے ماموں جان۔" شاہینہ نے
شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاہینہ کی دونوں چھوٹی بہنوں
نے پست لہجہ میں کہا۔

" لیکن ہمیں تو آج چھٹی نہیں مل سکتی۔"

یہ سن کر میں نے جواب دیا۔" او وہ کوئی بات نہیں کل دیکھ
لیں گے۔" شاہینہ نے اس پر احتجاج کیا۔

" ان کو چاہئے کل دکھائیے یا اتوار کو لیکن میں تو آج ہی دیکھوں گی
ماموں جان۔"

سلمیٰ خاتون نے بھی شاہینہ کی تائید کی اور بادل نخواستہ
مجھے آمادہ ہونا پڑا۔

گو میرے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن
یہ سن کر میرے سارے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ رہی تھی جیسے
کوئی پیچھے سے دھکیل رہا ہو۔ میں خوف زدہ سا سینما ہال میں پہنچا

پکچر شروع ہو چکی تھی۔ شاہینہ پکچر میں محو تھی۔ اس کی محویت کے پیش نظر میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ شاہینہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ دوں لیکن جب بھی ہاتھ بڑھاتا تو یہ محسوس ہوتا کہ جیسے میرا ہاتھ سن ہو گیا۔ حرکت نہیں کر سکتا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آتیں دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں پر فالج گر گیا ہو۔

پکچر ختم ہو گئی شاہینہ بہت خوش تھی اسے فلم بہت اچھی لگی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

مجھے صرف ایسی ہی پکچریں اچھی لگتی ہیں۔ دوسری پکچریں میں بالکل نہیں دیکھتی۔ میں نے ابو کے ساتھ بھی پکچر دیکھی ہے۔ امی کے ساتھ بھی دیکھی ہے اور چچا جان بھی ایک پکچر دکھانے لے گئے تھے۔ بس ایک تمنا تھی کہ اپنے ماموں جان کے ساتھ بھی پکچر دیکھوں سو یہ تمنا آج پوری ہو گئی۔" شاہینہ سمجھ رہی تھی جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

صبح سے ہی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس لئے میں کہیں باہر جانے کی بجائے کمرہ بند کئے چارپائی پہ دراز سرسبز چوٹیوں پہ گرتی پھوار کے منظر میں کھویا کھویا سوچ رہا تھا۔

میں کہاں آ گیا ہوں۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ ان کے پاس تو وہ شے ہی نہیں جس کی تلاش میں میں نکلا ہوں۔ شاہینہ مجھ سے قریب ہو کر بھی کتنی دور ہے۔ اس کا حسن اس کی جوانی، میرے صبر و ضبط کا امتحان لے رہی ہے۔ میں کیا کروں میرے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ چوروں کی طرح بھاگ جاؤں یا پھر اپنے ضمیر کو تھپک کر سلا دوں۔ بیچ کا راستہ مجھے منظور نہیں تھا۔ جب بھی اپنی ساری ہمت کو سمیٹ کر آگے بڑھنے لگتا تو کمبخت ضمیر کا غیبی ہاتھ پیچھے سے پکڑ لیتا۔ میں نے اسے کچلنے کی لاکھ کوشش کی۔ اکثر یقین ہو جاتا تھا کہ میں نے اسے کچل دیا ہے لیکن پھر نہ جانے کیسے وہ عین وقت پہ بیدار ہو جاتا۔

شاہینہ چاہتی تھی کہ میری کہانیاں ہندی میں بھی شائع ہوں اس کی خواہش تھی کہ میں بولتا جاؤں اور وہ کہانی کو ہندی زبان میں لکھتی جائے۔ ایک رات اسی طرح میں اسے اپنی ایک کہانی لکھوا رہا تھا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ گھر کے سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ شاہینہ میری ہی چارپائی پر بیٹھی دیوار کا سہارا لئے لکھ رہی تھی اور میں آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ تاکہ سونے والوں کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ کبھی کبھی کسی بات پر شاہینہ کے دبے دبے قہقہے پرسکون فضا میں ارتعاش سا پیدا کر دیتے۔ شاہینہ کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ میں بھی تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن شاہینہ کہانی کو مکمل کر کے سونا چاہتی تھی۔ میں نے ایک دو بار ہمت کر کے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھا تو وہ صرف مسکرا دی اس کی ڈھلی ڈھلی مسکراہٹ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔

" بس اب کہانی مکمل کر کے ہی آرام کروں گی "

لیکن میں تو کچھ اور چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ شاہینہ میری نظروں کا پیام پڑھ کر مجھے آگے بڑھنے کی دعوت دے اور اس کہانی کو چھوڑ کر ایک بالکل اچھوتی کہانی کو جنم دے۔ لیکن وہ برف کی سل بنی ہوئی تھی۔ میں کہانی رک رک کر پڑھ رہا تھا۔ بیچ میں ستانے بھی لگتا تھا تاکہ وقت گزرتا جائے اور کہانی ایسے ہی چلتی رہے۔ اچانک میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ شاہینہ ایک دم مچھلی کی مانند تڑپ کر میری گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میری جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مانو ابھی اس کی آنکھوں سے شعلے لپکیں گے۔ بجلی گرے گی اور مجھے راکھ کر دے گی۔ ابھی وہ اپنی امی کو اٹھا کر سب کچھ بتا دے گی پھر گھر کے سب لوگ مجھے قتل کر دیں گے لیکن وہ خاموش کھڑی رہی۔ لیکن میرے کانوں میں بہت سے لوگوں کی آوازیں ایک ساتھ گونج رہی تھیں۔ لعنت و ملامت کر رہی تھیں۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ فقط نیند میں ڈوبے ہوئے ایک معصوم بچے کی طرح ہکلاتے ہوئے کہا۔

" ماموں جان میں تو آپ کی بڑی بہن کی بیٹی ہوں " یہ کہہ کر وہ باوقار طریقے سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے الفاظ

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

شہلا تزئین

پہلی خوشی

> جب اماں بی کے انتقال کی خبر آئی تو وہ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس کا روتے روتے بُرا حال ہوگیا۔ سسکیاں تھیں کہ تھمتی ہی نہ تھیں۔ سبحان صاحب مونڈھے پر بیٹھے بل کھا رہے تھے۔ گھڑی دیکھ کر بولے۔ بس پانچ منٹ اور رو لو۔ پھر ناشتہ پکا دو، دیر ہو رہی ہے مجھے۔

عارفہ بیگم کی لانبی چوٹی بستر سے پھسل کر نیچے جا پڑی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے سبحان صاحب کی طرف دیکھا۔ شام کا تازہ اخبار ان کی گود میں کھلا تھا۔ اور وہ اس میں گم تھے۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ عارفہ کو خود ہی پوچھنا پڑا "پھوپھی اماں کیسی ہیں ؟"

" ہاں ــــ آں ـــ آں ـــ" وہ اخبار کے مطالعے میں محو تھے

"پھوپھی اماں کیسی ہیں۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔ اخبار سے نظریں اٹھا کر ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ خفگی۔ جھلاہٹ اور بے رخی سے جیسے کہہ رہے ہوں۔ چپ بھی رہو۔ کیوں بولے چلی جاتی ہو" اچھی ہیں۔" وہ جواب دے کر پھر خبروں میں کھو گئے

عارفہ سہم کر چپکی ہو گئی۔ زبان سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ مگر دل اندر ہی اندر رو پڑا۔ عارفہ خاموش فریاد کی عادی تھی۔ پھر جلد ہی مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا

پہلی ہی گھنٹی پر سبحان صاحب اخبار لپیٹ کر اٹھ کھڑے ہوئے عارفہ کا بے قرار دل تو جیسے منائے نہ مانتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بازو سے پکڑ کر سرہانے بٹھا لے اور پھر کہے" ابھی تو نہ جائیے" مگر انکی آنکھوں کی جھلاہٹ اور خفگی آڑے آگئی۔ جاتے جاتے مدھم سروں میں بولے

" بھلا گھر کب تک چلو گی ؟"

"کیوں۔ ؟ــ ؟" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے بند پنجرے کا قیدی اڑنے کو پر پھیلانے کو بے قرار ہو۔ سمجھی تھی کوئی میٹھا سا جواب آئے گا۔ تم نہیں ہو تو گھر سونا سونا لگتا ہے۔ مگر وہ سرد مہری سے بولے۔" کچھ نہیں۔ مجھے کھانے پینے کی بہت تکلیف ہے"

" کھانے پینے کی تکلیف"۔ بس یہی ایک دکھ ہے۔ آپ کو کھانا اور پینا۔ ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔ آپ کو بھلا عارفہ کی ذات سے کیا تعلق۔ مگر سنیئے اپنی بھوک اور پیاس کا احساس آپ کو ہے۔ مگر اس ایک جملے نے میرے دل پر جو نشتر لگایا ہے۔ اس کا احساس کیسے ہے

بہت سال پہلے کی بات ہے۔ جب وہ اپنی سہیلیوں سمیت دن دن بھر پیڑوں پہ جھولا کرتی اور اپنی کوئل جیسی آواز میں ساون کے گیت گاتی تھی۔

اب کے برس تو سجن گھر آجا

کتنے ہی ساون بیت گئے۔ مگر ساجن نہ آیا۔ وہ ڈالوں ڈالوں جھولتی رہی بے قرار ہو ہو کر کوکتی رہی

ابکے برس تو سجن ......

اور پھر ایک دن سچ مچ آگئے اور وہ اپنی اوڑھنی سمیٹ کر گود میں جا پڑی۔ سانولے چہرے والی عارفہ سب کو پیاری تھی ہنس مکھ۔ شوخ اور شریر۔ کالی کالی بھونرا جیسی آنکھ گھما کر

بات کرتی تو لوگ سانس روک کر آنکھوں کے کاجل میں کھو جاتے
ہنسنے پر آتی تو منہ پر ہاتھ رکھ کر کھل کھل کرتی چلی جاتی۔ ہنسنے سے
دہانے میں چمکتے ہوئے سفید دانتوں کی لڑی جگمگا اٹھتی۔ تو آج وہ
اماں کی دلاری سکھیوں کی پیاری اپنا گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔۔۔
ساجن ڈولی سجائے باہر کھڑے تھے۔ اور اس کا دل خدا جانے کیوں بیٹھا
جا رہا تھا۔ سکھی سہیلیاں اسے مل جل کر بنا رہی تھیں۔ وہ سب کے
بیچوں بیچ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ سب کی سب مل کر اسے گدگدا رہی
تھیں۔۔ مگر۔ مگر۔ یہ مجھے آج ہو کیا رہا ہے۔ میرے اللہ دل پر یہ
بوجھ سا کیا ہے؟ آنکھوں میں پانی کیوں امڈا چلا آ رہا ہے۔ وہ
سب کی صورتیں دیکھ کر رو پڑی۔ آج وہ سب سے جدا کر دی جائے گی
رخصتی کے وقت جب اماں بی کے سینے میں سر دیا تو جی چاہا کہ پھر عمر بھر
نہ نکالے۔ اپنی غمگسار اور چاہنے والی ماں کو جیتے جی چھوڑ کر جا رہی تھی۔
وہ رو پڑی۔ خدا ہی سمجھے اس کی برات کے جلد باز لوگوں سے۔" دلہن
بھیجو" دلہن بھیجو کا وہ اودھم مچا کہ غارت جل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔۔
" چلو بابا وہ مجبور تھی اس لئے گردن جھکائے جانا پڑا

سسرال پہنچتے پہنچتے شاید کوئی بھی ساتھ نہ رہا تھا۔ وہ تو
سمجھی تھی کہ سجا سجایا مہکتا ہوا گھر ہوگا۔ آنگن میں ڈھیر سارے مہمان
بھرے ہوں گے۔ ہنستے کھلکھلاتے بچے۔ رنگین آنچلوں کا ہجوم۔۔ اس کے
پہنچتے ہی دلہن آ گئی۔ دلہن آ گئی کا وہ شور اٹھے گا کہ اس سے دہلیز
پار کرنا دوبھر ہو جائے گی۔ ساس بڑھ کر سینے سے لگا لیں گی۔
" ہائے کیا چاند سا مکھڑا ہے میری بہو کا" نندیں ہنس ہنس کر
کہیں گی۔" بڑی پیاری سی سانولی سی دلہن ملی ہے میرے بھیا کو"
دیور گلے میں باہیں ڈال کر لاڈ سے کہے گا۔ ذرا گھونگھٹ
ہٹاؤ نا بھابھی۔ ہم تمھیں دیکھیں گے۔ اور اڑوسی پڑوسی کہیں گے۔
خاک کہیں گے۔ سونا آنگن۔۔ اداس گھر۔۔
اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا یہی وہ سسرال ہے
جس کی یاد رہ رہ کر اس کے سینے میں چٹکیاں لیتی تھی۔ وہ حیران پریشان
ہو کر چوکھٹ پکڑے کھڑی رہی۔ محلے کی دو چار مہمان عورتیں تھیں۔ گرمی
کے مارے اس کا دم الٹ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ پریشان ہو کر رہ گئی
ہائے اللہ یہ اماں بی نے کسی کو ساتھ بھی تو نہ کیا میرے۔ اب
کس سے کہوں بھلا۔؟ رفتہ رفتہ سب اٹھ کر گھروں کو چلیں۔ صرف
پھوپھی اماں رہ گئیں۔ وہ اسے ایک چھوٹے سے ٹھنڈے کمرے میں لے گئیں
" دیکھو بھئی یہ ہے تمہارا کمرہ۔ کیا سجایا ہے میں نے" اس نے بل کھاتے
رنگین غباروں اور کاغذ کی لہراتی ہوئی جھالر کو دیکھا۔
اچھا۔؟ وہ گم سم تھی۔
رات آدھی ہونے کو آئی تو پھوپھی اماں کو اس کے سرخ کپڑوں
اور جھکتی چوڑیوں کا خیال آیا
" اچھا۔ تو اب ہم چلیں۔ دلہن۔ کیوں۔ ہے۔" اس نے
جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ اس نے خاموشی سے اپنے پیر لپیٹ لئے اور
پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو صبح ہو چکی تھی۔ ارے۔ اتنی جلدی یہ بھلا
صبح کیسے ہو گئی۔ ابھی ابھی تو وہ دلہن بن کر یہاں آئی تھی۔ پھوپھی اماں
سے باتیں کی تھیں۔ پھر انھیں دروازے سے نکلتے بھی تو دیکھا تھا
پھر۔۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ اسے تو اتنے زور کی نیند آئی
کہ لاکھ آنکھیں پٹپٹانے پر بھی نہ کھلیں۔ تو وہ رات کو یونہی سو گئی تھی
پائنتی پر سر رکھے رکھے۔
سرخ ساٹن کا جوڑا مہک رہا تھا۔ ہاتھوں میں پہنی ہوئی چوڑیوں
کی کھنک بے حد سریلی تھی۔ مہندی میں رچے سانولے ہاتھ۔ پاؤں
ارے تو وہ اتنے مزے سے سو گئی۔۔ اور وہ سبحان صاحب ہائے
کیا سوچتے ہوں گے بھلا۔ عجیب لڑکی ہے۔ آتے ہی سو گئی۔ اونھ
بھئی اپنا ہی تو گھر ہے نا۔ سب سو گئے تھے۔۔ ہاں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
اس انتظار میں کہ اب کوئی آئے۔ منہ ہاتھ دھلائے۔ کپڑے بدلائے
شپل شپل۔ پانی بہہ رہا تھا۔ یہ ابر غسلخانہ تھا۔ پانی گرنے کے
اس بے ترتیب انداز نے اسے بتا دیا کہ غسلخانے میں شاید سبحان صاحب
ہی ہیں۔ ہائے اللہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ آخر ہمارا خیال کب
آئے گا کسی کو۔ وہ بہت دیر تک ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے بیٹھی رہی۔
بہت سی نئی نئی اور اچھی اچھی باتیں سوچتی رہی۔ پھر دروازے پر لگی سی

آہٹ ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا سبحان صاحب تھے۔ سر پر تولیہ لپیٹے۔ صاف رنگ۔ کھڑا کھڑا نقشہ، بالوں سے پانی کے قطرے ٹپا ٹپ گر رہے تھے۔ ہائے کیسے بھلے لگتے ہیں وہ منہ پھاڑے انھیں تک رہی تھی چوڑیاں کھنکیں تو اس نے گھبرا کر اپنا گھونگھٹ گھسیٹ لیا۔ "توبہ میرے اللہ کیا پھاڑ سا منہ کھلا تھا۔ وہ بھی کیا کہتے ہوں گے اپنے دل میں؟"

"عارفہ بیگم"۔ یہ سبحان صاحب تھے۔ اور وہ صبح کی ٹھنڈک میں بھی پسینہ پسینہ ہو گئی۔ شرما کر گٹھری بن گئی۔

"عارفہ بیگم۔۔ وہ پھر بولے" اور وہ پھر ٹھنڈی پھوار میں نہا گئی۔ اس نے بڑے انداز سے آنکھیں گھما کر گھونگھٹ میں سے انکی طرف دیکھا تو انھوں نے ہاتھ میں تھاما ہوا سفید کرتہ اس کی طرف اچھال دیا۔

"عارفہ بیگم! ذرا بٹن ٹانک دینا اس میں" جی۔ وہ پتھر بن گئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سبحان صاحب آنگن پار کر چکے تھے

گھر لوٹی۔ تو سب کی ہنستی مسکراتی صورتوں کو اپنا منتظر پایا ماں کو دیکھ کر تو اس کا دل بری طرح بھر آیا۔ بس جاؤ بھی کہاں دھکیلا ہے تم نے۔ اوپر سے سوالوں کی بوچھار الگ۔ کیسا لگا تمھیں سسرال میں؟ (عارفہ بیگم، بٹن ٹانک دیجئے) اور وہ چھیری ساس کیسی ہیں۔ محبت سے پیش آئیں؟

اور سبحان صاحب (عارفہ بیگم بٹن ٹانکیے) وہ اچھے لگے؟

(عارفہ بیگم۔ بٹن۔)

وہ آنسو بھری آنکھوں سے ایک ایک کو تک رہی تھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کوئی بھی تو جواب نہیں تھا۔ کوئی بھی تو جواب نہیں تھا۔ اس کے پاس۔ بس جاؤ اماں بی۔ دیکھ لیا تمہیں بھی۔ عارفہ اپنی بے بسی پر جی بھر کر روئی۔ وہ پھر گئی۔ پھر آئی۔ پھر گئی۔ پھر آئی۔ ہر بار اس کا دل چاہتا۔ اماں بی سے صاف کہہ دے۔ مجھے وہاں نہ بھیجو اماں بی۔ جہاں میری حیثیت ایک ملازمہ سے بھی کم ہے۔ سبحان صاحب کو تو بس کھانا چاہیئے دھلے دھلائے کپڑے اور پالش کئے ہوئے جوتے چاہئیں۔ انھیں میری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اماں بی تم اپنی عارفہ کو یہیں رکھ لو۔ پیاری اماں۔" مگر وہ تو ایسی بزدل تھی کہ کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی ادا نہ کر سکی۔ جب بھی کچھ کہنا چاہا۔ تو آنسوؤں کے پھندے پڑ گئے۔

پھوپھی اماں۔ سبحان صاحب کے رشتے کی پھوپھی تھیں۔ کبھی کبھی شہر سے عارفہ بیگم کے مزاج پوچھنے آجاتیں۔ انھوں نے شروع ہی میں بتا دیا کہ اس گھر میں آنے والی وہ پہلی نہیں ہے۔ اس کا دل بہت دکھا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ وہ پہلی راجکماری ہے جو پائل چھنکاتی اس آنگن میں اتر آئی ہے۔ مگر اتنی بہت سی اچھائی اس کے نصیب میں بھلا کہاں تھی۔؟ سبحان صاحب نے تو بے حد سرد اور خاموش طبیعت پائی تھی۔ صبح اٹھے۔ منہ دھویا۔ شیو کیا۔ وہ ناشتہ بناتی رہتی۔ اور وہ اخبار لے کر بیٹھ جاتے۔ صفحے پہ صفحے الٹتے جاتے مگر کبھی ایک نظر چولھے میں گھسی عارفہ پر نہ ڈالتے۔ وہ ناشتہ بنا کر آگے رکھ دیتی پیالی کھسکاتے اور ناشتہ شروع کر دیتے۔ کبھی یہ بھی نہ کہا کہ آؤ بیگم تم بھی بیٹھو۔ پھر اٹھ کر دفتر چلے جاتے۔ تو شام ڈھلنے کے بعد صورت نظر آتی۔ وہ پیچھے دن بھر کام کاج میں لگی رہتی۔ مگر یہ خاموشی اور اسے مارے ڈال رہی تھی ان کی تمام بے اعتنائیوں اور تغافل کے باوجود وہ ان پر مٹی جا رہی تھی۔ ان کا صاف رنگ اور کھڑا نقشہ تو اسے پہلے ہی دن بھا گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ انھیں میری سانولی صورت پسند نہیں آئی۔ اس نے ہر ہر انداز سے تلافی کرنا چاہی۔ ہنس کر۔ مسکرا کر۔ پیار سے۔ خدمت سے۔ عقیدت سے مگر سبحان صاحب تو ایسے پتھر تھے کہ جو آنچ پگھلے نہ کل۔

پھر بی اماں سمجھاتیں "اے بی ان کی تو عادت ہی ایسی ہے اب کہاں تھا دوسری شادی کا ارمان۔ وہ تو کہو سب کے کہنے سننے پر کر لی" عارفہ کا دل جیسے سینے سے نکل پڑتا۔ ان کو نہیں تھا شادی کا ارمان۔ مگر مجھے تو تھا۔ پھر میری زندگی کیوں تباہ کر ڈالی آپ نے۔ وہ فریاد کرتی رہ جاتی۔ جب دیکھو تب اپنے ہی کام میں لگے رہتے ہیں

اور اسے تو وہ بس کبھی کبھی آواز دیتے تھے تو بھی اپنے مطلب سے
"عارفہ بیگم یہ بٹن ٹانک دو۔"
"عارفہ بیگم۔ استری کر دی۔ میری قمیض پر ؟"
"یہ جوتوں پر پالش کیوں نہیں ہوئی۔ عارفہ بیگم۔"
"ناشتہ ذرا جلدی تیار کر دو۔۔ دیر ہو جاتی ہے ورنہ"
بٹن ٹانک دو۔ استری کر دو۔ ناشتہ لگا دو۔ کبھی تو
کچھ اور کہا کیجئے۔ کبھی تو کچھ اور بھی کہا کیجئے۔ سبحان صاحب۔ وہ
سر ٹیک کر رہ جاتی

کئی سال گذر گئے۔ وہ ویسے ہی ان کی خدمت کرتی رہی
اور وہ اتنے ہی بے نیاز اور غافل رہے۔ کبھی دو بول پیار کے نہ
بولے۔ وہی سرد مہری۔ وہی رکھائی۔ وہ عادی ہو گئی تھی۔ شروع
شروع میں میکے جانے دیا۔ پھر یہ کہہ کر روک دیا۔ بھئی میں غریب آدمی
ہوں آنا خرچ ناقابل برداشت ہے۔ پھر اسے اماں بی کی علالت
کی خبر ملی۔ وہ گھنٹوں روئی۔ سبحان صاحب نے سنا تو بولے" اگر
جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔۔۔ مگر میری مرضی نہیں۔"
"مرضی نہیں" اس کے آنسو جم گئے۔ اب وہ کیسے چلی جائے
اماں بی کہتی تھیں "شوہر کی رضامندی کے آگے سب کچھ ہیچ ہے
اس نے پتھر دل شوہر کی رضا کے آگے اماں بی کو بھی ہیچ سمجھا۔ پھر جب
ان کے انتقال کی خبر آئی تو وہ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس کا روتے
روتے برا حال تھا۔ سسکیاں تھیں کہ تھمتی ہی نہ تھیں سبحان صاحب
سامنے مونڈھے پر بیٹھے بل کھا رہے تھے۔ گھڑی دیکھ کر بولے
"بس پانچ منٹ اور رو لو اور پھر ناشتہ لگا دو۔ دیر
ہو رہی ہے مجھے۔"
اس نے پھر آنسو پونچھ لئے اور سر جھکا کر ناشتہ
بنانے لگی۔
آپ کے اس جملے کی کسک عمر بھر میرے دل میں رہے گی
سبحان صاحب! آپ نے سن لیا نا۔!

انہوں نے رسماً بھی دلاسہ نہیں دیا۔

بیچ میں کئی دفعہ وہ بیمار بھی پڑے۔ اس نے جی جان سے انکی
خدمت کی۔ ہر وقت پٹی سے لگی رہتی۔ کبھی کبھی ان کی سرد مہری کا
خیال آتا تو جی چاہتا کہ گھر کو ٹھوکر مار کر کہیں نکل جائے مگر پتہ نہیں
عین اسی وقت ان کے نقوش کی پرچھائیں کہاں سے ابھر کر اس کے
آس پاس بھیں جاتی "تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔ کون ساتھ دیگا پھر
کون ناشتہ بنائے گا۔ کون بٹن ٹانکے گا۔ بھلا کون" اور وہ اس
کے بعد کچھ بھی نہ کر پاتی۔ وہ اپنی غفلت اور بے رخی کے باوجود بھی
کتنے عزیز ہیں۔ یہ حقیقت بھی اس پر کھل کر رہی

اتنے سے عرصے میں وہ کیسی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کا زرد چہرہ آنسوؤں
سے تر ہو جاتا۔ وہ تو ایسی شوخ و شریر لڑکی تھی۔ یہ اسے کس قفس میں
لا پھینکا۔ یہ کس نے پر کتر ڈالے اس کے ہائے . . . .
اس نے تو زندگی کا کوئی سکھ نہ دیکھا نہ شادی کا نہ شادی
کے بعد کا۔ اور اس کھانسی اور بخار نے تو اسے ستا مارا تھا۔ تیز تیز
کھانسی بس اٹھے چلے جاتی تھی۔ پریشانیاں اور غم تو اس کی جان کو یوں
بھی بہت تھے۔ پھوپھی اماں کو ترس آیا تو سبحان صاحب سے بولیں
"اے دیکھو تو بیٹا۔ بہو کو کیا ہو گیا ہے۔ دن بھر کھانسی رہتی
ہے۔" وہ اخبار پھینک کر بولے" تو میں کیا کروں۔ پھوپھی اماں
میری بیماری کے بعد اب تو کوئی زیور بھی نہیں رہا گھر میں۔" جیسے
ایک اور تیر اس کے دل پر لگا۔ اگر آپ مجھے کچھ دے نہیں سکتے تو دل
کا یہ رہا سہا سکون تو نہ چھینئے۔ مت ستائیے۔ ہمیں اور مت ستائیے
اللہ سبحان صاحب۔ ہمیں مت ستائیے۔ وہ رات رات بھر روتی
رہی۔ رات بھر کھانستی رہی .

آخر یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی سست اور بیمار تو وہ پہلے

تین برسوں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھنٹوں سوچتی۔ کون تھا۔ جو اس کے درد کو سمجھتا۔ اسے سمجھتا۔ اور پھر انہیں بدترین حالات میں جب اسے اپنی بیماری کی صحیح نوعیت کا علم ہوا تو وہ ایک لمحہ تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اتنے عرصے کی طویل تنہائی کو سہنے کے بعد اب خدا اسے ایک ساتھی بخشنے والا تھا۔ بات تو واقعی خوشی کی تھی۔ مگر — مگر — مگر۔ وہ تو سبحان صاحب کے گھر میں ہے۔ وہ وہیں مرجھا گئی۔ ان پر تو میرا ہی بوجھ بہت ہے۔ وہ بھلا میرے بچے کو کہاں سنبھالیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ اطلاع ملنے پر بولے

"یہ کیا مصیبت ہے عارفہ بیگم۔ یہاں تو اپنا ہی خرچ پورا نہیں ہوتا اور تم ہو کہ۔"

عارفہ کا دل کٹ کر بہنے لگا۔ یہ مصیبت ہے۔ تو پھر خوشی کیا ہے؟ یہ دکھ ہے تو پھر سکھ کیا ہے۔ (بتلایئے سبحان صاحب۔ دکھوں کی تفصیل تو آپ خوب جانتے ہیں مگر خوشی کی تفسیر آپ سے نہیں ہو سکتی۔ آپ بہت برے ہیں۔ آپ پتھر ہیں۔ آپ — آپ پتھر ہیں)

وہ دن بدن کمزور اور زرد ہوتی چلی گئی۔ پھوپھی اماں نے دن رات احساس دلایا تو بڑا احسان کیا کہ جنرل وارڈ میں جا کر ڈال آئے اور اب۔ اب وہ دن بھر یہاں پڑی رہتی ہے۔ آہیں بھرتی ہے۔ آنسو بہاتی ہے۔ اس نے سبحان صاحب کی خاطر کیا نہیں کیا۔ مگر صلہ کیا ملا۔ پیار کے دو بول سننے کے ارمان میں اس نے اپنی چاندسی زندگی میں گھن لگا لیا

تکلیف کی شدت سے اس کا دبلا پتلا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سانولا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اور آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو رہے تھے۔ کیسی جان لیوا تکلیف تھی۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کئی بار آکر پوچھ گئی:-

"آپ کا آدمی کب آئے گا بی بی۔" اس کا جی چاہا زور سے چیخ پڑے۔ "میرا کوئی آدمی نہیں ہے۔ تم مجھے خدا کے لیے اس تکلیف سے نجات دلا دو۔ آخر یہ میرا علاج کیوں نہیں کرتیں۔ کس کا انتظار ہے تمہیں —" وہ دکھ درد میں ڈوبی ہوئی سوچ رہی تھی

شام ڈھلی جا رہی تھی۔ مگر اس کے دکھ کا مداوا کسی کے پاس نہ تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں

"آپ کا آدمی آیا بی بی؟" نرس نے جھنجوڑ ڈالا۔

"میرا آدمی۔ اس نے چلا کر سر اٹھایا

"میرا آدمی۔ اچانک ہری جافری میں اسے سبحان صاحب کا چہرہ نظر آیا۔" وہ رہا میرا آدمی"۔ اس نے انگلی سے ان کی طرف اشارہ کر دیا

ڈاکٹر سبحان صاحب کی طرف لپک گئی۔ "کہاں تھے آپ لوگ۔ آپ کو معلوم ہے آپ کی وائف مرنے کو پڑا ہے۔ دیکھو کتنی کمزور ہے تمہاری بیوی۔ خون بالکل نہیں ہے اس میں" سبحان صاحب سر جھکائے کھڑے تھے اور ڈاکٹر بے حد جلدی میں بے حد گھبرائے ہوئے لہجہ میں بول رہی تھی۔

"تمہاری وائف کی جان خطرے میں ہے سمجھے نا۔ تم کو پریشن ہوگا ایک ہی چیز ملے گی۔ بیوی یا بچہ۔" عارفہ پر غنودگی طاری تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ گردن اٹھا کر سبحان صاحب کو دیکھنا چاہا...... تو اس کی زندگی خطرے میں ہے — اس کا دل دور کہیں گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا

"بولو مسٹر — جلدی بولو — کیا چاہیئے بیوی یا —"

سبحان صاحب۔ اخبار ہاتھ میں تھامے پلنگ کی پٹی پکڑے گم سم کھڑے تھے۔

"جلدی بولو۔ کیا چاہتے ہو تم۔"

"جی" وہ سکتے کے عالم میں ڈاکٹر کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"ارے کیسے آدمی ہو تم۔ آپریشن کے لئے جانا ہے۔ نہیں بتاؤ گے تو تمہاری بیوی کو خطرہ ہے۔ سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ مر جائے گی اب — اب —"

"مر جائے گی" سبحان صاحب نے جیسے اپنے آپ کو سنا۔

"عارفہ بیگم مر جائیں گی — !"

"بولو کیا چاہئے تمہیں — جلدی بولو — ایک چیز — صرف ایک چیز —"

"کیا بولوں میں — کیا بولوں —"

پھر۔ پھر جیسے وہ سوتے سے جاگ پڑے۔ اضطراری طور پر ڈاکٹر کے
قدموں میں جھک گئے

"مجھے عارفہ چاہیئے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر"

"مجھے صرف میری عارفہ چاہیے۔"

"میری عارفہ"۔ عارفہ نے تڑپ کر تکیے سے سر اٹھایا

"میری عارفہ" اس نے پھر دھرایا۔ یہ کون ہے۔؟
یہ کون ہے۔ جو آج مجھے اس انداز میں بلا رہا ہے

سبحان صاحب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

"میری عارفہ بہت اچھی لڑکی ہے ڈاکٹر۔ تم نہیں جانتیں۔ تم نہیں جانتیں۔ میں عارفہ کے بغیر مر جاؤں گا"

"میری عارفہ۔ عارفہ بہت اچھی لڑکی ہے"۔ عارفہ مدہوشی کے عالم میں بڑبڑا رہی تھی۔ یہ آپ ہیں نا۔ سبحان صاحب ۔ یہ آپ ہیں نا۔ میں آپ کی عارفہ ہوں۔

اب میں بالکل نہیں مروں گی۔ اب تو میں۔ اب تو میں ۔ میں آپ کی عارفہ ہوں نا۔ میرے بغیر آپ جی نہ سکیں گے۔ ہائے

کتنا عجیب خیال ہے یہ۔ مگر کتنا حسین۔ کتنا پیارا۔ ہائے۔ اب میں کیا کروں۔ اتنی بڑی خوشی۔ اتنی بہت سی خوشی (میری عارفہ۔ میری عارفہ) کہاں چھپاؤں۔ میں کیسے چھپاؤں۔ یہ خوشی۔ زندگی کی پہلی خوشی۔ زندگی کی آخری خوشی۔ اب میں اسے کیسے چھپاؤں۔

سبحان صاحب آپ نہ روئیے۔ سبحان صاحب میں بالکل اچھی ہوں میری خاطر نہ روئیے۔ کیا کہوں آپ سے۔ یہ۔ یہ سینے کی جلن کیسی ہے سبحان صاحب ذرا دیکھئے تو۔ یہ چبھن سی۔ یہ خلش سی یہ کیا ہے؟ سبحان صاحب۔ سہارا دیجئے نا۔ آئیے۔ آئیے۔ نا۔ نا؟

عارفہ بیگم کا ننھا سا دل اتنی بڑی خوشی پا کر پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ کھلی ہوئی زرد آنکھوں میں آخری لمحوں کی پہلی خوشی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقید ہو گئی۔

سبحان صاحب ابھی تک سسک رہے تھے۔

"میری عارفہ بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر۔ اسے بچاؤ۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے۔"

شعلے —— صفحہ ۶۸ کا بقیہ

زہر میں بجھے نشتر کی طرح میرے جگر میں پیوست ہو گئے۔ شاہینہ شاید سو گئی تھی لیکن میری آنکھوں میں نیند کی بجائے ایک خوف تھا۔ شاہینہ کے الفاظ میرے دماغ میں گونج رہے تھے۔ مانو کوئی میرے ننگے جسم پر کوڑے مار رہا تھا۔

صبح شاہینہ کی امی مجھے اٹھانے آئیں لیکن انھوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ سب اسی طرح پیش آئے۔ شاہینہ بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی لیکن میں آہستہ آہستہ سلگتا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وجود کسی دہکتی ہوئی بھٹی میں جل رہا ہے۔ اس دن میں اصرار کے باوجود کھانا نہیں کھا سکا۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ شاہینہ نے بھی اصرار کیا۔ مگر اس سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ رات کو دس بجے شاہینہ کی امی سلطانہ خاتون میرے پلنگ کے قریب آئیں اور بڑی محبت سے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھیا دودھ پی لو۔ تم نے دو وقت سے کچھ نہیں کھایا ہے"

اور سلطانہ خاتون کا یہ محبت بھرا جملہ سن کر میرا دل چاہا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ مگر زمین نہیں پھٹی البتہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس لمحہ سلطانہ خاتون نے بڑی نرمی سے کہا۔

"بھول تو بڑے بڑوں سے ہوتی ہے بھیا۔ اس کا اتنا غم نہ کرو"

پھر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ اور سلطانہ خاتون نے اس طرح میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا جیسے میں ایک ننھا سا بچہ ہوں اور وہ ماں۔

حامدی کاشمیری

اس رات کمرے میں چاندنی میں نہائے ہوئے دریچہ پر اسے محسوس ہوا کہ چاند دہکتا ہوا آگ کا گولہ ہے جو اس کے پہلو میں اتر آیا ہے اور وہ جل رہی ہے انوار کی جگمگاتی شخصیت کے جلوؤں نے اسکی آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر دی تھی۔

پانچ بج چکے تھے
اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی

وہ کھڑکی پر آئی۔ بہار کی معطر ہوا کے جھونکوں سے ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ باہر خوشگوار دھوپ تھی اور نیچے لان میں شبنم بید کی نرم لچکیلی کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کے ریشمی بالوں کی دو لٹیں شانوں کو ڈھکے ہوئے تھیں۔ اس کی گود میں ہمنگوے کا "اولڈ مین اینڈ دی سی تھا۔ اور وہ ناول میں گم تھی۔ سفید ریشمی فراک اور شلوار میں وہ سنگ مرمر کا کوئی حسین مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے وہ شبنم کو دیکھتی رہی۔ وہ کھو سی گئی۔ جیسے وہ شبنم نہیں۔ جمیلہ ہی ہے۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ وہ شبنم کی طرح کھلتی ہوئی کلی تھی۔ ویسا ہی مرمریں خوبصورت جسم۔ ویسی ہی خواب گوں آنکھیں۔ ویسی ہی نزاکت کالج میں وہ بیوٹی کوئین کہلاتی تھی۔ لیکن آج ...... ؟

اس کی آنکھیں لان سے آگے دور تک سیب کے درختوں پر کھلے ہوئے شگوفوں میں الجھ گئیں۔ ہوا کے جھونکوں سے پتیاں بکھر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی ہوا کے یہ جھونکے کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ کاش یہ پتیاں بکھر نہ جائیں۔ درختوں کی شاخوں پر یہ کتنی بھلی کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ بکھرنا ہی انکی تقدیر ہے

اس کے خیالوں میں اداسی کا کوئی سایہ نہیں لہرایا۔

وہ ہر لمحہ جوانی کے حسین آنچل کو حسن اور محبت کے پھولوں سے بھرتی ہے۔ وہ روح کی خلوتوں کو خوشبو اور کیف سے آباد کرتی ہے خوشبو اور کیف!

لیکن کیا آج اس کی دلکشی اور تازگی اور حسن میں کوئی کمی آگئی ہے؟ نہیں وہ آج بھی بہاروں کی مانند شاداب اور جوان ہے بہاریں ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک جوان دل دھڑکتا ہے۔ اس کی نگاہیں آج بھی حسین لمحوں کی پرستار ہیں۔ وہ حسین لمحوں پر جان دیتی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ زندگی کے حسین لمحوں کے نشے میں ڈوب جاؤ۔ اور کل کی بات کل پر چھوڑ دو۔ یہی زندگی کی مسرتوں کا راز ہے۔

وہ شگوفوں پر ایک بجھی ہوئی نظر ڈال کر کمرے کے اندر آئی کمرے کی خوب صورتی کو آج چار چاند لگ گئے تھے۔ جو چیز جہاں تھی نہایت قرینے سے تھی۔ اور آئینے کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اخروٹ کی لکڑی کی منقش الماری میں خوبصورت اور قیمتی کتابیں دیوار کے ساتھ چھوٹے سے ٹیبل پر سنگ مرمر کے دو یونانی دیوتا۔ اور دیوار میں بنی ہوئی الماری پر فریم کئے ہوئے کئی گروپ فوٹو اور نئے ڈیزائن کے ہلکے صوفہ سیٹ۔ کرسیوں کے ساتھ ٹی پائی پر پھول دار شیشے کے ایش ٹرے سامنے ٹیبل پر انگریزی رسالے۔ ان کے سرورق پر نیم عریاں نسوانی تصویریں۔ فرش پر ایک نرم کشمیری قالین۔ اس نے ایک گہری نظر سے ڈرائنگ روم کو دیکھا۔ اطمینان کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے ایک کونے سے جاگی اور وہ تیزی سے کمرے سے نکلی جب وہ بیڈ روم میں قد آدم آئینے کے سامنے آئی تو اس کے گلابی ہونٹوں

کی مسکراہٹ اور شوخ ہوگئی۔

وہ تو آج بالکل شبنم کی طرح نظر آرہی ہے۔ ایک کالج گرل!

خوب! انوار صاحب پھڑک اٹھیں گے۔ پچھلے ہفتے جب وہ اور مسز گپتا انوار احمد کے ساتھ پہاڑی کے دامن میں پک نک کو گئی تھیں اور اس نے ماڈرن فیشن کی تنگ پائنچے کی سفید شلوار اور چست فراک پہنا تھا تو انوار صاحب اسے دیکھ کر پاگل سے ہوگئے۔

تم تو بالکل ایک کالج گرل معلوم ہوتی ہو!

وہ کہتے رہے۔

اور اس کے قہقہے جھرنوں کے شور میں ڈوب گئے۔ آج وہ پھر اسے اسی لباس میں دیکھیں گے۔ تو..... اسے خود بھی یہ لباس اچھا لگتا تھا۔

"تمہارے سڈول جسم کے خطوط میں جیسے کنول جل اٹھے ہیں۔" خوب یاد آیا۔ مسٹر برکت کا خیال تھا یہ! اس نے مغل باغ میں ایک خوبصورت چاندنی رات میں ایک شگوفہ بار ٹہنی کے نیچے دیکھ کر یہ کہا تھا اور وہ اس کی وحشی نگاہوں سے ڈر گئی تھی۔ "مجھے تمہاری آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔" اور وہ اس کی چوڑی چھاتی سے لگ چکی تھی

وہ دھیرے سے مسکرائی

"برکت کے بعد انوار احمد ہی ہیں جنھیں یہ لباس پسند آیا ہے۔ ستیش اور احمد تو اس لباس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنے اپنے ٹیسٹ کی بات ہے۔ ایک بار جب وہ اس لباس میں پارٹی پر گئی تو احمد نے عنایت اللہ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ یہ جو آپ کو ٹیڈی گرل نظر آرہی ہے یہ .... سلی فیلو' لیکن انوار ابھی خود جوان ہے۔ اس کے سینے میں جوانی کی آگ ہے۔ وہ اسے بھی جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس نے اپنے جسم پہ ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔

ترشے ہوئے معطر بال۔ دو بڑی سرمگیں آنکھیں۔ ستواں ناک۔ ملے ہوئے ابرو۔ چہرے کی صباحت۔ اسے زیادہ پوڈر کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ وہ اب بھی پوڈر استعمال نہ کرتی اگر اس کے گال کے نیچے دو ایک شکنیں نمودار نہ ہوتیں۔ اس کے ہونٹ موٹے ہیں پھر بھی برے نہیں اور دائیں طرف ٹھوڑی کے اوپر ایک سیاہ تل۔ کاش یہ تل ذرا گال کے اوپر ہوتا۔ گڈ گارڈ! پھر تو اس کے چہرے پر کسی کی نظر نہ ٹھہرتی۔ لیکن ستیش کو یہ تل پھر بھی بہت پسند ہے۔ اسے تو اس کے جسم میں قلوپطرہ کا حسن نظر آتا ہے۔ پاگل....

اس کے جسم کے دوسرے خطوط؟...... نہ جانے موٹاپے کی یہ تہہ کہاں سے چڑھ گئی۔ نہیں تو وہ بہت نازک تھی۔ پھولوں کی ایک ٹہنی کی طرح۔

وہ اب بھی جب شبنم کے ساتھ چلتی ہے تو دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ دو بہنیں جا رہی ہیں۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ ماں اور بیٹی ہیں۔ یہ تو محض اتفاق ہی ہے کہ شادی کے بعد ایک ہی سال میں وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ ورنہ وہ آج بھی ایک کنواری لڑکی نظر آتی۔ کرنل اشفاق کے پچھلی جنگ میں لاپتہ ہونے کے بعد اس نے شادی نہ کی۔ بڑے بڑے آدمیوں نے اس سے شادی کی آرزو کی۔ لیکن وہ اب اس زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈالنا نہ چاہتی تھی۔ شادی کے بارے میں ہمیشہ ایک انفرادی نظریہ رہا ہے۔ شادی عہد جاہلیت کی ایک اندھی رسم ہے۔ عورت کی غلامی۔ شخصیت کی موت۔ لیکن جب اس کی شادی ہوئی تو وہ کوئی احتجاج نہ کرسکی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا احتجاج بے سود ہوگا۔ کرنل صاحب کی دور تک پھیلی ہوئی جائداد کے چرچے کہاں کہاں نہ تھے لیکن شادی کے ایک ہی سال میں ان کی خانگی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہ کرنل صاحب کے تحکمانہ رویئے کو برداشت نہ کرسکی۔ کرنل صاحب ہوتے تو وہ گھر میں بھی لفٹ، رائٹ اور اٹینشن کرنے سے باز نہ آتے۔ اور وہ ہونٹ چبا کر رہ جاتی اور جب کرنل صاحب جنگ میں لاپتہ ہوگئے تو اس نے دوسری شادی نہ کی۔ گھر میں شبنم کی تعلیم و تربیت میں گم رہی۔ اور باہر دوستوں کی محبت اور رفاقت میں کھوئی رہی۔ جس طرف اس کی نظریں اٹھیں۔ محبت سے دھڑکتے ہوئے کتنے دل سجدہ ریز ہوگئے۔ اسے اور کیا چاہیئے تھا؟ زندگی کے ہر حسین لمحے کا کیف اور مٹھاس چوس لیتی۔ وہ سرشار ارمانوں کے ہجوم میں جی رہی تھی۔

کرنل صاحب کی ساری جائداد کی وہ تنہا مالک تھی!

اسے اپنی خوش قسمتی پہ ناز تھا۔

اس نے جس چیز کی آرزو کی۔ وہ اسے ملی۔ ناامیدی کا سایہ بھی اس سے دور رہتا!

اور جب روز کمپنی کے مالک مسٹر انوار احمد کو اس نے پہلی بار دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک کر رہ گئیں۔ واپسی پہ اس کے دل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ نیند اس رات دیر تک نہ آئی۔ یہ کیسی بے چینی تھی اس کے خیالوں میں

روح کی گہرائیوں میں ایک اجنبی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں

وہ حیران تھی۔

درد کا یہ کیسا جذبہ اس کے دل میں جاگ اٹھا ہے۔ اس درد نے اس کے اندر کی سوئی ہوئی کتنی حسیات کو بیدار کر دیا تھا۔ کتنی لطیف کیفیتیں اس کے جسم کے روئیں روئیں میں کسمسا رہی تھیں

اس رات کمرے میں چاندنی میں نہائے ہوئے دریچے پر اسے محسوس ہوا چاند دہکتا ہوا آگ کا گولہ ہے جو اس کے پہلو میں اتر آیا ہے اور وہ جل رہی ہے۔

انوار احمد کی جگمگاتی ہوئی شخصیت کے جلوؤں نے اسکی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی تھی۔

وہ گھبرا گئی تھی!

"کیا مرد اس قدر خوب صورت ہو سکتا ہے؟!"

"کیا مرد اتنی تیزی سے روح کی خاموش خلوتوں کو ہنگاموں سے بدل سکتا ہے

اس کی سلگتی ہوئی پلکیں بھیگ گئیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ انوار احمد کے بغیر جی نہیں سکتی اور جب تک وہ اس کے پیار کو حاصل نہ کر سکی اس کی اداسی نہ گئی۔

لمحے زہر پیکار سے تھے۔

انوار احمد کے پیار اور اس کے التفات کو حاصل کرنے میں اسے کتنی صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن وہ کامیاب ہی ہوئی۔ ناکام وہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ شکست اس کی تقدیر نہ تھی۔

اسکے دل نے دھڑک کر کہا۔

"وہ آتے ہی ہوں گے!

اس نے اپنی سڈول کلائی میں سونے کے ریسٹ میں بندھی ہوئی رومر گھڑی دیکھی

ساڑھے پانچ بج چکے تھے!

بیقراری کی ایک تیز لہر اس کے جذبات کو اتھل پتھل کر گئی

ڈرائنگ روم میں واپس جانے کے بجائے وہ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی پھر وہ فوراً ڈرائنگ روم ہی میں واپس آ گئی۔ اور وہیں انتظار کرنے لگی۔ شبنم تو اپنی دنیا میں گم ہے

بے چینی کی تاب نہ لا کر وہ لان میں رنگا رنگ پھولوں کی کیاری کے قریب کرسی میں نیم دراز شبنم کی طرف جانے لگی۔

شبنم کتاب میں کھوئی ہوئی تھی

وہ قدموں کی مترنم آہٹ سے چونکی۔

اس نے انگڑائی لی۔ فضا میں جیسے نشہ بکھر گیا۔ شگوفے مسکرائے دوسرے لمحے وہ ایک دوشیزہ اد کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اور مخمور لہجے میں بولی

"ممی! آ گئے آپ کے گیسٹ؟"

"نہیں ابھی نہیں آئے!"

"آئی سی!" وہ ممی کو گھور رہی تھی۔

"بس آتے ہی ہوں گے! جمیلہ کی نظریں جھک گئیں

"کون صاحب ہیں یہ؟

"پھر وکیلوں کی طرح جرح کرنے لگیں تم۔ میں نے کہا تھا کہ بی اے کے بعد ایل ایل بی کر لو!"

اس کے لہجے کی ترشی چھپ نہ سکی

شبنم خاموش ہو گئی

اتنے میں باہر کا گیٹ کھلا

دونوں کی نظریں اٹھ گئیں

"آیئے انوار صاحب! بہت انتظار دکھایا!!" جمیلہ اپنے آپ پہ قابو نہ پا سکی۔

"آئی ایم ویری ساری مسز جمیلہ؟

وہ ان کے قریب آچکا تھا!"

جمیلہ نے کہا۔

"یہ شبنم ہیں میری بچی۔ جن کا ذکر میں نے کیا تھا۔"

"ارے مس شبنم! ......؟" اچانک انوار احمد دفور مسرت سے بولے۔

"اور آپ مسٹر انوار احمد؟!"

شبنم کی خوابناک آنکھیں پھیل گئیں

اور جمیلہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی شبنم اور کبھی انوار احمد کو دیکھتی رہی اور جب شبنم نے انکشاف کیا کہ مسٹر انوار احمد اس کی نئی سہیلی غزالہ کے چچا زاد بھائی ہیں اور پچھلے مہینے ان کی پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ اور پھر وہ کئی بار غزالہ کے یہاں ملے ہیں تو جمیلہ کی آنکھوں میں ایک تاریک سا سایہ لہرایا۔ اس کے دل کی دھڑکن ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی

وہ تینوں چائے پی رہے تھے۔

مختلف موضوع زیر بحث تھے۔

انوار احمد ہر موضوع پر روانی اور شگفتگی سے بول رہے تھے

دونوں کے چہرے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح شاداب تھے لیکن رہ رہ کے جمیلہ کے دل میں کانٹے کی سی چبھن محسوس ہوتی۔ شبنم کی موجودگی اسے کھٹک رہی تھی۔ اس کے تصور میں انوار احمد سے اس ملاقات میں کسی تیسرے انسان کی پرچھائیوں کا گزر بھی نہ تھا۔ وہ انوار احمد سے مکمل تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج تنہائی کے لمحوں میں اپنا دل کھول کر دکھانا چاہتی تھی۔ آج سارے حجابات کو آگ لگانے پر تلی ہوئی تھی۔

اس نے ہر طرح کا اہتمام کر رکھا تھا... ؟

لیکن شبنم.....؟

چائے کے گھونٹ اسے زہر کے گھونٹ معلوم ہو رہے تھے

کاش یہاں شبنم نہ ہوتی۔

کاش اس نے شبنم کو جنم نہ دیا ہوتا

کاش ــــــ!

اچانک اس نے شبنم کے سراپا پر ایک گہری چوکنی ہوئی خوفزدہ نظر ڈالی۔ ایک عجیب سی نظر جو نفرت اور جلن سے بھرپور تھی۔

وہ گھبرا گئی۔

شبنم اس کی زندگی کی مسرتوں میں زہر پھیلا رہی ہے لیکن...

"مس شبنم!"

"جی!"

"اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کس بارے میں"؟

"مزید تعلیم کے سلسلے میں"

"آنٹی ممی۔ آپ تعلیم کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ممی کہتی ہیں کہ میں وکالت پڑھوں۔ میرا خیال...."

"میں ٹھیک کہتی ہوں۔ جرح کرنا کوئی تم سے سیکھے"

"بھئی ایسا مشورہ نہ دیجئے۔ ڈگری لے کر تو یہ بے چارے وکیلوں کا ناطقہ بند کر دیں گی"

شبنم کا شاداب کنوارا قہقہہ گونج اٹھا اور جمیلہ تلملا رہی تھی کہ انوار احمد کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی شعوری کوشش کے باوجود وہ بار بار شبنم کو والہانہ نظروں سے دیکھ لیتے اور براہ راست اس سے گفتگو کا کوئی نہ کوئی پہلو نکالتے۔

مایوسی اور شکست کے یہ لمحے اس کی برداشت سے باہر تھے۔ لیکن شکست اس کی تقدیر نہیں۔ اسے اپنی انفرادیت کے جادو پر اعتماد تھا۔

شام کے نرم دھندلکے سیب کے درختوں کی پھیلی ہوئی بانہوں سے الجھ رہے تھے۔ وہ کھڑکی پر تھی۔ اداس کھوئی ہوئی۔

اتنے میں باہر کا گیٹ کھلا۔

شبنم اندر آئی۔

اور گیٹ کے باہر انوار احمد تھے۔ وہ اندر نہیں آئے۔ دوسرے لمحے انھوں نے کار اسٹارٹ کی

"تم کہاں گئی تھیں آج شبنم؟"

"غزالہ کے ہاں!"

وہ سانس کو سنبھال نہ سکی

"یہ غزالہ کون ہے؟"

میری فرینڈ ہے؟" اس کی سوالیہ نظریں ممی کے چہرے پر گڑ گئیں
"ہاں ہاں۔ تم نے کہا تھا۔ وہاں مسٹر انوار احمد تو نہیں تھے؟"
"نہیں تو۔ میں نے انھیں کئی روز سے دیکھا نہیں!"
جمیلہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی
شام کے اندھیروں نے درختوں کی باہنوں کو چھپا لیا تھا
جب وہ اتوار کی شام کے بعد گھر آئی تو اس کا سارا وجود بھٹی کی طرح جل رہا تھا۔ وہ ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بپھر اٹھی تھی لیکن جھیل کے کنارے خاموش ریسٹ ہاؤس میں اس نے انوار احمد کو دل کے اندر اٹھتے ہوئے گرجتے ہوئے طوفانوں سے بے خبر رکھا۔ اس نے چہرے کی مسکراہٹ کو بجھنے نہ دیا۔
وہ لمحہ جب اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے پاگل جذبے کے تحت شگوفوں کی مانند بکھرنے لگی۔ تو انوار احمد کتنی بے نیازی سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ یہ اس کی نسائیت کی توہین تھی۔ اور وہ سوچتی رہی۔ کیا یہ وہی انوار احمد تھے۔ جو اس کی ایک نگاہِ غلط انداز کے لئے ترستے تھے۔ وہی انوار احمد جو اس کی ایک مسکراہٹ پر نقد جان لٹانا چاہتے تھے۔
لیکن آج ــــ!؟
کیا اس کے جسم میں پہلی سی کشش نہیں رہی ہے؟
کیا اس کی محبت کی آگ سرد پڑ چکی ہے
نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا
پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟
شبنم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔
اور شبنم تین روز سے بخار میں جل رہی تھی۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اور بستر سے لگ گئی تھی۔ وہ بنگلے کے اندر آئی اور سیدھی اپنے کمرے کے اندر گئی۔ نوکر کو اس نے کمرے کے اندر آنے سے منع کر دیا
وہ دیر تک بستر پر یونہی پڑی رہی
شام کے لپکتے ہوئے اندھیروں میں
اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس کے دماغ کی ایک ایک نس جاگ رہی تھی۔

اس کے دل میں کتنے محشر کروٹیں بدل رہے تھے۔
شکست اس کی تقدیر نہیں!
مایوسی اس کی زندگی نہیں۔
وہ فتح اور کامرانی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ کامراں رہی ہے۔ جس چیز کی اس نے چاہ کی۔ وہ چیز اسے مل کر رہی۔
وہ کامراں رہے گی یا ٹکرا کر فنا ہو جائے گی
وہ زندہ رہے گی۔
اسے زندگی سے پیار ہے۔ بے پناہ پیار! اور اس کی زندگی انوار احمد ہے۔ وہ اب اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اپنی راہ میں حائل ہونے والے ہر پتھر کو وہ پاش پاش کر دے گی۔ اس کی انفرادیت میں طوفانوں کی قوت ہے۔ امڈے ہوئے طوفان کے آگے کون سی چیز ٹھہر سکتی ہے؟
دفعتاً اسے ایک نامعلوم اطمینان کا احساس ہوا
اس نے آنکھیں کھولیں
وہ اٹھی۔ سوئچ آن کیا۔ سارا کمرہ روشنی کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اتنی زیادہ روشنی سے وہ کانپ سی گئی۔
سب سے پہلے اس نے کھڑکیوں کے سارے پردے گرا دیئے پھر اپنا لباس بدل دیا۔ کچھ سوچ کر وہ بیڈ پر بیٹھی۔ وہاں سے اٹھی اور کنجیوں کا گچھا لے کر الماری کی طرف گئی۔ رکی۔ رک کر پلٹی اور دروازے کی طرف گئی اور دہلیز کو پار کر کے شبنم کے کمرے کی طرف آئی۔ وہاں سے نوکر نکلا۔
"کیا حال ہے شبنم کا؟" اس کی اپنی آواز اسے اجنبی محسوس ہوئی۔
"اب ٹھیک ہے بی بی! ابھی ابھی آنکھ لگی ہے
نوکر چلا گیا
وہ اندر آگئی
خاموش کانپتی رہی
شبنم بجلی کی سبز مدھم روشنی میں سو رہی تھی
"شبنم ــ!" اس کے ہونٹ ہلے۔ (باقی صفحہ ۱۰۴)

نعیم اقبال

> **اگر یہ بات سچ نکلی تو میں اس نالائق کو عاق کر دوں گا جائداد سے بے دخل کر دوں گا اور بہو کے نام کر دوں گا۔ ایسی اچھی بہو کے ہوتے ہوئے وہ کیسے کسی اور لڑکی کا خیال بھی اپنے دل میں لا سکتا ہے۔ اپنی پیاری بہو کا دل دکھی ہو اور ہمارا دل نہ روئے۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟**

یوسف!

مجھے مدراس آئے چھ ماہ گزر گئے۔ میری ٹریننگ کی اطلاع تو تمہیں تمہاری بھابی کے خط سے مل گئی ہوگی۔ میں خود تمہیں تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا مگر میں ان دنوں کافی مصروف رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے سخت خفا ہو گئے۔ کیا کروں فیض پیارے میں کچھ اسقدر دلچسپیوں میں گھرا رہا کہ اس سے قبل تمہیں یاد نہ کر سکا۔ میں اپنی زندگی کے ایک نئے موڑ پر آ کھڑا ہوا ہوں زندگی میں ایک نیا رنگ بھرنے لگا ہے۔ دنیا رنگین لگنے لگی ہے جینے کا مزا آ رہا ہے۔ ایک ترنگ ہے ایک ولولہ پیدا ہو گیا ہے میں سوچتا ہوں کہ واقعی وہ لمحے اچھے تھے جب کہ میں حیدرآباد سے دھنش کوڈی چلا آیا۔

پہلے پہل مجھے کھانے کی کافی تکلیف رہی۔ اچھے ہوٹل جو نہیں ہیں۔ اب اپنے پڑوس میں خالہ کے ہاں کھاتا ہوں۔ یہ جگت خالہ ہیں۔ بڑی ہی بڑی اچھی ہیں۔ زندگی کے ساٹھ سال بتا چکی ہیں مگر اللہ کے پھیری کہ جوان لڑکیاں بھی شرما جائیں، زندگی کا بیشتر حصہ عیش و آرام میں گزرا۔ ان کی اپنی دو جوان لڑکیاں تھیں۔ جب دھنش کوڈی سیلاب کی زد میں آیا تو ان کی ساری پونجی لٹ گئی۔ شوہر اور دونوں لڑکیاں انھیں دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چل بسیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خودکشی کر لیتا مگر یہ جانتی تھیں کہ زندگی ایک نعمت ہے جو بزدلی کی نذر ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ انسان کو بعض وقت دوسروں کے لئے جینا پڑتا ہے۔ ان کی ایک منہ بولی لڑکی ہے۔ رفیعہ۔ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ یہ ہر شام میرا بری طرح انتظار کرتی ہے۔ جب دیر سے گھر لوٹتا ہوں تو منہ پھلا لیتی ہے۔ شکایت کا ایک تانتا باندھ دیتی ہے۔ فیض اس کی آنکھوں میں جادو ہے میرے دوست۔ بڑی خوبصورت آنکھیں ہیں۔ وہ میرے بہت قریب آ گئی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اب وہ میرے پاس بیٹھی مجھے ستا رہی ہے۔ پوچھ رہی ہے کہ میں کس کو خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے اس کو تمہارے بارے میں بتایا تو کہنے لگی: "اچھا تو یہ آپ کے گہرے دوست ہیں" ہاں، یہ میرا پیارا دوست ہے رفی۔ میری ٹریننگ ختم ہو لینے دو۔ ہم اس کے ہاں چلیں گے۔

ہاں فیض! تم اس لڑکی کے متعلق اپنی بھابی کو کچھ نہ لکھنا۔ کچھ دنوں تک یہ بات راز میں رکھنا چاہتا ہوں۔ اچھا تو اب چلوں۔ بھابی کو سلام۔ گڈو اور منی کو پیار۔

مدراس۔ یکم جون ۱۹۷۵ء

تمہارا نعیم

ڈیر عشی!

مہینوں بعد نعیم بھیا کا خط ان کے نام آیا۔ دیکھیے تو وہ

اپنا ہر خط پڑھنے کے بعد خود مجھے دے جاتے ہیں مگر عمیم کا خط انھوں نے مجھے نہیں دیا جیب میں ڈال کر دفتر چل دیئے۔ جاتے ہوئے صرف اتنا کہہ گئے "عمیم کا خط آیا ہے۔ وہ اچھا ہے"

مجھے ان کے دوست واحباب کے خطوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر عمیم بھیا کے خط کا میں بے چینی سے انتظار کرتی ہوں کیونکہ تم میری عزیز ترین سہیلی ہو اور عمیم ان کے گہرے دوست ہیں، مجھے یہ بات کھٹکی کہ آخر انھوں نے یہ غیر معمولی حرکت کیوں کی۔ خط میرے ہاتھ میں تھما کیوں نہیں دیا۔

ایک جستجو سی تھی میں نے ان سے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب دوسرے دن انھوں نے دوسری پتلون بدلی اور وہ خط اسی پتلون میں بھول گئے تو میں نے چوری سے خط نکال لیا۔ میرا دل دھک کرکے رہ گیا عشرت۔ میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں فوراً آگاہ کردوں وہ خط اس لفافے میں ملفوف کر رہی ہوں۔

عمیم بھیا سے مجھے قطعی ایسی امید نہیں تھی کہ وہ کسی اور لڑکی میں دلچسپی لیں گے۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ تمہاری شادی ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ تمہاری کوئی اولاد نہیں اور نہ ہونے کی امید ہے۔ کاش وہ بچہ جو تمہاری شادی کے دوسرے سال ہی ہوا تھا زندہ رہ جاتا۔ مجھے ابھی تک اچھی طرح یاد ہے کہ جب تمہارا آپریشن ہونے والا تھا اور جب ڈاکٹر نے عمیم بھیا کو یہ بتایا تھا کہ اگر آئندہ تمہارے بچہ ہوگا تو تم بچ نہ سکو گی۔ تو انھوں نے ڈاکٹر سے استدعا کی تھی کہ حمل نہ ٹھہرنے کے لئے آپریشن کر دیا جائے۔ تم نے لاکھ منع کیا مگر اسپتال میں میں نے خود اپنے کانوں سے عمیم بھیا سے تمہیں یہ کہتے سنا "زندگی میں ہر چیز کا رسک لینا چاہئے۔ انسان کے مرنے کا وقت متعین ہے۔ اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ ڈاکٹروں کی بات کا کیا بھروسہ۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں مر کر آپ کو اپنی نشانی دے جاؤں" جب تم آپریشن پر راضی نہ ہوئیں تو عمیم بھیا نے اپنی قسم دے ڈالی اور کہا۔ "تمہاری زندگی میرے لئے مقدم ہے عشی، مجھے ایسی اولاد نہیں چاہیئے جو تمہیں مجھ سے چھین لے"

میں سوچنے پر مجبور ہو گئی عشرت کیا یہ وہی عمیم ہیں؟ تم بڑی نادان ہو کہ دور دراز مقام پر اکیلا بھجوا دیا اور خود سسرال میں بیٹھ گئیں۔ تم نے سوچا ہوگا کہ دو سال ہی کی بات ہے۔ ٹریننگ ختم ہوتی کہ وہ آگئے مگر دو سال میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس بابت تم نے کبھی سوچا؟ تمہارا حد سے بڑا بھروسہ تمہیں لے ڈوبا۔ اب بھی شاید پانی سر سے اونچا نہیں ہوا فوراً مدراس پہنچو شاید حالات سدھر جائیں۔

بچے اپنی آنٹی کی خدمت میں تسلیمات عرض کر رہے ہیں۔ تم کب تک میکے میں رہو گی۔ کب سسرال لوٹ جاؤ گی۔

کانپور ۶ جون ۱۹۶۸ء

تمہاری پریشان سہیلی طیبہ شاہین

امّی جان!

تسلیمات۔ ابا کی طبیعت کا حال سن کر پریشانی ہوئی سردی کے دن ہیں۔ صبح سرد پانی ہی سے وضو کرتے ہوں گے لہذا سخت زکام ہو گیا۔ میں اس ہفتہ آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤں گی۔ میں صرف اس لئے رکی ہوئی ہوں کہ سیمی آجائے تو وہ ممی کی دیکھ بھال کرے گی۔ ممی رو بصحت ہیں۔

دو دن قبل کانپور سے شاہین کا خط آیا۔ وہ بڑی وہمی قسم کی لڑکی ہے۔ وہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہے۔ اس نے اُن سے متعلق عجیب خدشات کا ذکر کیا ہے۔ ویسے تو مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آتا اور نہ مجھے ان سے ایسی امید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مذاق کیا ہو۔ مگر ان کے خط سے مذاق کا کوئی پہلو بھی نہیں نکلتا پھر ان جیسے سنجیدہ انسان سے مذاق کی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ شاہین کا خط اور اُن کا خط بنام فیض بھیا ملفوف کر رہی ہوں۔

ابا کی خدمت میں قدم بوسی۔

میسور ۱۱ جون ۱۹۶۸ء

آپ کی بیٹی عشرت۔

عائشہ بہن!

کل میسور سے بہو کا خط آیا۔ ایک عجیب الجھن میں ڈال دیا۔

عیم سے متعلق جو اطلاعات موصول ہوئیں اس سے آپ کے بھائی آگ بگولہ ہیں۔ کہہ رہے تھے "اگر یہ بات سچ نکلی تو اس نالائق کو عاق کر دوں گا۔ جائیداد سے بے دخل کر دوں گا اور بہو کے نام کر دوں گا۔ ایسی اچھی بہو کے ہوتے ہوئے وہ کیسے کسی اور لڑکی کا خیال بھی اپنے دل میں لا سکتا ہے"۔ بہو کے خط کے ساتھ جو خط آئے ہیں وہ بھی آپ کو بھجوا رہی ہوں۔ آپ پڑھ لیں گی تو معاملے کی تہہ کو پہنچ جائیں گی۔

میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو مطلع کر کے شجیع کو خط لکھوایا جائے۔ شجیع مدراس میں ایم۔ ڈی کر رہا ہے اور وہ باآسانی دھنش کوڈی جا کر حالات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ صحیح حالات سے آگاہی دے سکتا ہے۔ یہ بات راز ہی میں رہے تو بہتر ہے ورنہ بدنامی ہوگی۔ ایسی پیاری بہو جو سچ مچ ہماری بیٹی ہے اس کا دل دکھی ہو اور ہمارا دل نہ روتے یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر یہ سارا معاملہ سچ نکلا تو میں بھی اس پاجی کی عمر بھر شکل نہیں دیکھوں گی۔ اللہ کرے ایسی کوئی بات نہ ہو ورنہ مسبب الاسباب اس کا دل پھیر دے کیا کروں آخر اولاد ہے۔

آپ کے بھیا دعا لکھوا رہے ہیں۔

حیدرآباد ۱۳ ؍جون ۱۹۶۸ء

آپ کی بہن رابعہ

———★———

شجو بیٹے۔ جیتے رہو۔

ابھی ابھی حیدرآباد سے تمہاری آنٹی کا خط ملا۔ تم وقت نکال کر ایک دن کے لئے دھنش کوڈی ہو آؤ۔ عیم کو اس کی اطلاع نہ ہو۔ دیکھو وہ کس حال میں ہے۔ تفصیل سے لکھ بھیجنا۔ تمہاری آنٹی کا خط اور دوسرے خط بھجوا رہی ہوں۔ پڑھ لو۔ ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔

سیلم ۵ ؍جون ۱۹۶۸ء

تمہاری ممی

———★———

ماموں جان!

تسلیمات۔ امید کہ مزاج ہمایوں بخیر ہوں گے۔

میں دھنش کوڈی گیا تھا۔ دو دن قیام رہا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا عیم بھیا گھر پہ نہیں تھے۔ بڑی بی اور ان کی لڑکی سے پہلے ملاقات ہوئی۔ میں نے جب انھیں بتایا کہ میں عیم کا ممیرا بھائی ہوں تو انھوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ بڑی محبت سے پیش آئیں۔ دونوں خلوص اور محبت کی دیویاں ہیں۔ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ چند گھنٹوں میں ان سے اس قدر گھل مل گیا جیسے برسوں سے انھیں جانتا ہوں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں مدراس میں پڑھتا ہوں تو رفیعہ شکایت کرنے لگی کہ آپ کیسے بھائی ہیں کہ اتنا قریب رہ کر اپنے بھائی سے ملنے اتنی مدت بعد آئے ہیں۔

ماموں جان۔ رفیعہ واقعی بڑی پیاری ہے۔ آخر کون ہوگا جو اس کی معصومیت میں ڈوب نہ جائے گا۔ وہ آپ سب کے متعلق پوچھ رہی تھی اور خاص کر عشرت بھابی کے متعلق سنتے سنتے گویا اس کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ بڑے شوق سے عشرت بھابی کے خد و خال اور ان کی عادات و اخلاق سے متعلق سنتی رہی۔ لگتا تھا کہ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ بار بار بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی "کیا وہ مجھے گلے لگا لیں گی"۔ میں نے بتایا عشرت بھابی کا دل بڑا وسیع ہے وہ تمہیں اپنے سینے سے ضرور لگا لیں گی۔

پھر عیم بھیا آگئے۔ انھیں دیکھ کر مجھے بے تحاشہ ہنسی آئی وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ رفیعہ سے متعلق کچھ بھی آپ لوگوں کو نہ بتاؤں۔ عیم بھیا نے رفیعہ کو خالہ سے مانگ لیا ہے۔ رفعی کو اپنے ساتھ لا کر عشرت بھابی کے لئے ایک Pleasant Surprise دینا چاہتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ عیم بھیا کو بچے پسند ہیں مگر قسمت نے عجیب کھیل کھیلا ہے۔ بھابی جیسی وسیع النظر اور مجسم محبت خاتون اپنے عزیز شوہر کی خواہش کا احترام ضرور کریں گی۔ آپ کو اس میں شک و شبہ کی ضرورت نہیں۔ پھر عیم بھیا کسی مالدار لڑکی کو اپنا نہیں رہے ایک یتیم کو اپنا رہے ہیں یہ کار خیر بھی ہے اس میں آپ سب کو ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ خوبصورت معصوم رفیعہ عیم بھیا سے بہت محبت کرنے لگی ہے اسے ان سے الگ کرنا مچھلی کو پانی سے الگ کرنے کے مترادف ہوگا اور عیم بھیا بھی اسے اسی طرح چاہنے لگے ہیں جیسے دھوپ کی شعاعیں(؟) ہو!

اخلاق حسین عارف

چھکن چاچا گم سم کھڑکی کے پاس کھڑا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ افسردگی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر اس کا دل مرجھاتے ہوئے پتے کی طرح لرز رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اف اس بددماغ کنجوس اور ضدی چھوکرے سے اس کا پالا پڑے گا۔

رات کے دس بج چکے تھے ــــ!

اس نے کھانا کھا کر چلم بھری اور حقے پر رکھ کر الاؤ کے پاس تنہا بیٹھ گیا۔

وہ موضع سریاواں کا ایک چھوٹا سا کاشتکار تھا۔ اس کی کاشتکاری پانچ بیگھے زمین پر مشتمل تھی وہ بھی اس کی اپنی زمین نہ تھی بلکہ اس میں سے دو بیگھے زمین کا مالک کوئی اور تھا۔ وہ بٹائی پر بوتے ہوتے تھا۔

حقہ کا کش کھینچ کر دھواں بکھیرتے ہوتے اس نے سوچا ــــ

پوس میں بارش کے یہ مسلسل چھینٹے فصل کے لئے اچھا شگون ہیں ـ گیہوں، مٹر، چنا اور تلہن کے لئے یہ بہت مفید ہیں۔ ارہر میں تو اب پھول بھی آ گئے ـ اس بار فصل امید ہے اچھی ہو گی۔ پھر بائیں ہاتھ سے قریب ہی پڑی ہوئی بانس کی قمچی اٹھا کر الاؤ کریدتے ہوئے اس کے خیالات نے کروٹ لی۔

اونھ! فصل اچھی ہوئی بھی تو کیا۔ وہ تو بٹائی کی کاشت میں جتنے دانوں کا حقدار ہے۔ اسے اتنے ہی ملیں گے۔ کاش وہ زمین بھی اس کی اپنی ہوتی۔ کاش!

مکان کی کچی دیوار کے اس پار اندھیری غبار آلود گلی میں گاؤں کے آوارہ کتے اک بارگی بھونکنے لگے اور اسی وقت کھڑکی سے ایک سرگوشی ابھری اور آہستہ سے آواز آئی۔

چھکن چاچا ــــ!

" کون ــ؟ "

" میں ہوں کلیم ـ ذرا قریب آؤ "

" کیوں ــ! خیر تو ہے، چھوٹے میاں۔" گھبرا کر اس نے سوال کیا۔

" ہاں ــ ادھر تو آؤ ـ کھڑکی کے قریب "

" اچھا ـ اچھا ــ چودھری صاحب تو ٹھیک ہیں نا " ایک بھیانک تصور اس کے دماغ کے گوشہ میں ابھرا۔

" سب ٹھیک ہے " کلیم نے ڈھارس بندھائی۔

" خدا انھیں سلامت رکھے "...

کلیم نے قطع کلام کرتے ہوتے سوال کیا " چچا ـ اس وقت تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں، کر دو گے نا۔"

" آپ کے لئے تو میری جان حاضر ہے چھوٹے میاں "

جلدی سے کلیم بولا " وہ کام صرف تم ہی کر سکتے ہو ـ لو ـ یہ روپے رکھو "

" ارے! یہ کیا " یہ تو جا لو دس دس کے...

" ہاں، دس دس کے دس نوٹ ہیں۔ انھیں سنبھالو ـ اور ذرا آہستہ آہستہ بولو، کوئی اور نہ سن لے "

" ایسا بھی کیا کام ہے! " چھکن نے نوٹوں کو جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

" چچا! " کلیم بولا " میرے باپ سے تمہاری آواز ملتی جلتی

ہے نا...؟ "

" ہاں۔ ہاں۔ بالکل ! "

" اور تمہارے بات کرنے کا لہجہ بھی ان ہی جیسا ہے ؟ "

" ہاں۔ ہاں ! آگے کہیئے۔ چھوٹے میاں "

" صرف آدھے گھنٹے کی تکلیف تمہیں دوں گا۔ تم چل کر بس ان کے بستر پر لیٹ جاؤ۔ اور جس طرح میں بتاؤں سرپنچ اور پنچوں کی موجودگی میں وصیت نامہ لکھوا دو "

" اور اگر چودھری صاحب ـــ ! "

" وہ کچھ نہیں سمجھ سکیں گے "

" میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا "

" وہ اب بول نہیں سکتے "

" کیوں ـــ ! "

" ان کا انتقال ہو چکا ہے "

" کب ـــ ؟ اور حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

" ابھی آدھا گھنٹہ ہوا "

ذرا دیر سکوت رہا اور ہلکی روشنی میں خاموش وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ آخر کلیم بولا۔

میں نے سب انتظام کر دیا ہے ـ انھیں برابر والے کمرہ میں رکھ کر باہر سے قفل لگا دیا ہے۔ بس تم چل کر ان کے بستر پر اوڑھ لپیٹ کر لیٹ رہو۔ میں پنچوں کو لے کر آتا ہوں تاکہ ابامیاں وصیت نامہ اپنی زندگی میں لکھوا دیں۔ ... سمجھ گئے میری بات ؟ "۔ اور وہ گلی کے اندھیرے میں غڑاپ سے گھس گیا۔

جھکن تھوڑی دیر گم سم اسی جگہ کھڑکی کے پاس کھڑا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ افسردگی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر اس کا دل مرجھاتے ہوئے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

چودھری کا نیک برتاؤ۔ ان کی محبت اور غریب نوازی ایک ایک کر کے اسے یاد آنے لگی۔ اب اس بددماغ، کنجوس اور ضدی چھوکرے سے اس کا پالا پڑے گا جو چودھری کی جائیداد کا تنہا وارث بننا چاہتا ہے۔ ایک طرف اس کا ضمیر اس قضیئے میں پڑنے سے منع کرتا رہا تو دوسری طرف مستقبل میں کلیم سے بیر رکھ کر کس طرح کام چل سکے گا۔ اس گتھی کو سلجھانے کی ترکیبوں پر وہ غور کرنے لگا۔ دیر تک وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر بالکل ہی غیر ارادی طور پر دھوتی میں لپٹے ہوئے لڈوؤں کی گڈی پر اس کا ہاتھ جا پڑا۔ برقی رو کی طرح ایک خیال اس کے دماغ کے گوشہ میں کلبلایا۔ وہ جلدی سے انگوچھے کو کانوں اور سر کے گرد لپیٹ کر "فرض" کی تکمیل کے لئے گھر سے نکل پڑا۔

گھراؤ، موضع سریاواں کے قدیمی باشندے تھے۔ ان کے باپ پھیرو۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اوائل عمری میں جاڑوں کے چار مہینے شہر چلے جاتے اور وہاں اپنا پیشہ ندّافی کرتے روپیہ کماتے اور سال کے بقیہ ایام گاؤں میں رہ کر اپنے کھیتوں کو دیکھتے اور اپنے بھرے پرے کنبے میں گذارتے۔ گھراؤ جب چودہ پندرہ برس کے ہوئے اور ان کی مسیں بھیگنے لگیں تو وہ اپنے ایک رشتہ کے ماموں کے ساتھ رنگون چلے گئے۔ برما۔ ان دنوں برطانوی اقتدار میں تھا جہاں ان کے ضلع اور گاؤں کے بہت سے لوگ بسلسلۂ ملازمت و تجارت آباد تھے۔ گھراؤ نے رنگون میں بیس سال رہ کر کافی دولت کمائی اور کھٹا کھٹ گھر بھیجتے رہے اور ان کے باپ نے کھیت اور باغات خرید لئے۔

برما کے آزاد ہونے سے کچھ پہلے ہی گھراؤ وطن لوٹ آئے، باپ کچھ دنوں بعد اللہ کو پیارے ہو گئے تو ساری ذمہ داری ان کے سر آن پڑی۔ برادری والوں میں مال و دولت کی وجہ سے وہ سمجھدار قسم کے آدمی مانے جانے لگے۔ چنانچہ گاؤں والوں نے ان کو اپنا چودھری چن لیا۔ چودھری گھراؤ کے دو بیٹے تھے، بڑا حلیم، چھوٹا کلیم۔ دونوں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئے تو حلیم نے تحصیل علم کا جذبہ لئے ہوئے شہر کا رخ کیا۔ خدا نے وہ روز سعید دکھایا کہ اس نے ایم ایس سی کی ڈگری لے کر انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ میاں کلیم ابتدائی تعلیم ختم کر کے زمینداری کے داؤں پیچ میں سرگرمی دکھلانے لگے جو ان کا پسندیدہ شغل تھا۔ دونوں کے مزاج میں بڑا تضاد تھا۔ حلیم، خوش اخلاق، ملنسار، مخیّر۔ اس کے برعکس کلیم تلوّن مزاج

فضدی۔ کنجوس تھا۔

چودھری کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ لڑکوں میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی کہ وہ خود بیمار پڑ گئے اور ایسے پڑے کہ اچھے ہونے کی نوبت نہ آئی اور آخرکار زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس وقت کلیم کو اپنا مستقبل تابناک بنانے کی فکر دامن گیر ہوئی تاکہ حلیم کو وہ باپ کی جائیداد سے ایک حبہ دیتے بغیر تمام املاک پر اپنا قانونی حق جما لے۔

جب چھکن چچا پہنچے تو انھیں رضائی اڑھا کر کلیم نے کمرے میں اندھیرے رخ لٹا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد بڑے کمرے میں جہاں قالین کا فرش بچھا دیا گیا تھا اس پر گاؤں کے سرپنچ اور پنچوں کو بٹھا کر چائے پان سگریٹ سے ان کی خاطر مدارات کی گئی کاغذ، قلم جو پہلے سے موجود تھا پیش کر کے کلیم نے باپ کے بستر کے پاس جا کر سب کی آمد کی اطلاع دی۔ کلیم کے باپ نے لحاف سے ناک کا تھوڑا حصہ اور ہونٹ باہر نکال کر نحیف آواز میں پنچوں کو مخاطب کر کے کہا۔

" آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میری حالت بہت دنوں سے خراب چلی آ رہی ہے۔ اب میرا وقت قریب ہے نہ معلوم کب آنکھ بند ہو جائے۔"

مریض پر ایک لمحہ کے لئے سکوت طاری ہوا تو حاضرین میں سے کئی کی ملی جلی آوازیں سنی گئیں۔

" اللہ آپ کو جلد صحت عطا کرے ۔!"

" ہم سبھوں پر آپ کا سایہ برقرار رہے۔"

ذرا دیر بعد مریض پھر گویا ہوا۔

" جو آیا ہے۔ وہ جائے گا۔ کسی کا کوئی ٹھکانا نہیں لہٰذا بہتر ہے مرنے سے پہلے حساب کتاب چکتا کر دیا جاتے تاکہ بعد میں کوئی فتنہ نہ کھڑا ہونے پائے۔" اس کے بعد چودھری نے وصیت نامہ کا خلاصہ مختصر الفاظ میں واضح کر دیا چنانچہ کچھ لوگوں کے مشورے سے۔ جو عدالتی موشگافیوں اور قانونی نزاکتوں سے واقف تھے۔ مسودہ مرتب کیا جانے لگا۔

الشجاع

منکہ گھرا کو ولد پھیرو مرحوم ساکن موضع سرپاواں تحصیل و پرگنہ صدر ضلع جھن جھاواں کا ہوں، جو کہ منقولہ و غیر منقولہ حسب تفصیل ذیل کا بلا شرکت غیرے مالک و قابض و دخیل ہوں۔ جائیداد متعلقہ ہر طرح کے بار سے پاک و صاف ہے اور میری ذاتی عرق ریزی و جاں فشانی سے کمائے ہوئے سکہ رائج الوقت سے وقتاً فوقتاً خرید کی گئی ہے جس کا میں تا حیات خود مالک رہوں گا۔ بعد میرے وصیت نامہ ہٰذا پر کلیتہً عمل در آمد ہو۔ دفعہ ۱۔ ایک یہ کہ میں اپنے بعد دو اولاد ذکور چھوڑ رہا ہوں، بڑا لڑکا حلیم، چھوٹا کلیم۔ حلیم پر میں نے اب تک بسلسلۂ تعلیم بیس بائیس ہزار روپے سے زیادہ خرچ کیا ہے وہ بہت جلد انجینیر بن کر اپنی زندگی تابناک بنانے کے قابل ہو جائے گا۔ وہ کسی کا محتاج و دست نگر نہ رہا ہے نہ رہے گا لہٰذا اسے میری دولت و املاک کی کچھ ضرورت نہیں۔

دفعہ ۲ یہ کہ میرا مکان مسکونہ جس میں اس وقت میں موجود ہوں معہ آلاضی و عملہ و ظروف و زر نقد و پارچہ جات و زیورات و فرنیچر وغیرہ۔ نیز آراضیات مواری بیس بگیھا واقع چمرو پور دو قطعہ باغات انبہ قلمی واقع موضع بختیار نگر و تالاب پختہ معہ مکانات و دوکانات واقع ریداس نگر ونیس بگیھے زمین واقع جھن جھٹ پورہ، و بارہ بگیھے واقع پچھپوند نگر۔ یہ سب اپنے پسر خورد کلیم کو دیتا ہوں۔ چوں کہ پسر مذکور نے ابتداء علالت سے تا حال میری بہت خدمت کی ہے اور میں اس سے بے حد خوش ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ روٹی اور تن کے کپڑوں کے علاوہ میں نے اس پر اور کچھ صرف نہیں کیا۔ علم کے معاملہ میں بھی یہ الف کے نام لٹھ ہے اس لئے ساری جائداد کلیم کے نام لکھتا ہوں۔

اسقدر ضبط تحریر میں آ جانے کے بعد مریض نے جیسے چند لمحوں کے لئے جیسے اپنی نقاہت کو توانائی اور گویائی میں منتقل کرنے کا موقع مل گیا ہو۔ آہستہ آہستہ پھر بولنا شروع کر دیا اور نحیف آواز میں کہا۔

عرائض نویس صاحب دفعہ ۳ پر بڑھا دیجئے کہ وہ دو بگیھے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

رعنا اختر

> عائشہ نے کلام پاک کو سینے سے لگا لیا اور غور کرتی رہی۔ اس نے محسوس کیا دل میں جلنے والی شمع کی روشنی صاف ہو گئی ہے نکھر گئی ہے۔ اور اندھیرے میں اجالا کرنے والی روشنی پھیل رہی ہے۔

گلی میں کچھ آہٹ ہوئی اور پھر سناٹے میں کسی شے کے **باھر** گرنے سے آواز پیدا ہوئی ۔۔ اور پھر سناٹا ابھر آیا! دوسرے لمحے سناٹا پھر لہریں لینے لگا۔ ملی جلی حیرت زدہ آوازوں کا دھیما دھیما شور سنائی دیا۔!

پھر کراہنے کی گھٹی گھٹی آواز واضح ہوئی اور سناٹے میں تیر بن کر چبھتی چلی گئی ۔۔!

عائشہ کے دعا کے لئے اٹھے ہاتھوں میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا ۔۔ اس کے بعد وہ باہر اپنے اس مصری گاؤں میں آ گئی جو اسرائیلی ہوائی حملوں کے امکانی خدشے کے تحت بے رونق تاریک اور دہشت زدہ تھا۔!

انجانے خطرے کے احساس نے عائشہ کی آواز میں رقت دل میں دھڑکنیں اور مناجات میں گہرائی پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے مولا سے گڑگڑا کر اسلام کی فتح اور مصر کی فتح کے لئے دعا مانگنے لگی۔ اس وقت کسی نے دروازے پر دستک دی اور ایک نسوانی آواز نے پکارا "عائشہ ۔۔!"

عائشہ نے درود شریف پڑھتے ہوئے اور منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا ختم کی اور جلدی سے چٹائی موڑنے لگی۔ اتنی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ باہر گاؤں کی تاریک گلی میں کوئی اچنبھے والی بات ضرور ہے۔ چٹائی کونے میں رکھ کر وہ کلمہ پڑھتی باہر دروازے کی طرف ہو لی۔ اس وقت پہلی نسوانی آواز پھر ابھری: "عائشہ! کیا سو گئیں؟"

عائشہ نے بڑھ کر کنڈی کھولی اور قدرے گھبرا کر پوچھا "کیا

ہے فوزیہ"؟ فوزیہ نے بغیر تمہید کے کہا "دیکھو عائشہ! تم ہاتھ نہ لگانا۔ مرنے دو اسے! ۔۔ یہودن کو مرجانے دو! ۔۔ یہ ہماری دشمن ہے خبردار اس کی مدد نہ کرنا۔ . . . دوسری عورتوں نے اسی جوش و جذبہ اور غصہ کا اظہار کیا۔ اور فوزیہ کی تائید کی۔ فوزیہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ نہ صرف عربی بولتی تھی بلکہ فرانسیسی بھی جانتی تھی اور بول لیتی تھی۔ وہ گاؤں کی پیشانی کی افشاں تھی۔ فوزیہ کی آواز گاؤں کی آواز تھی۔ اس لئے کہ وہ سب کچھ ہونے کے باوجود مصری تھی۔ وطن سے اسے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اور وطن کی محبت میں سرشار تھی۔

اس نے سب سے پہلے یہ دلخراش خبر سنی تھی کہ آج صبح دس بجے اسرائیلی طیاروں نے اچانک حملہ کیا۔ اور مصری فضائی مستقروں کو برباد کر دیا۔ جس پر فوزیہ کا دل ہی نہیں ٹوٹ گیا تھا۔ بلکہ وہ جذبہ انتقام سے جھوم اٹھی تھی ۔۔ یہ اسی کا جھاگ تھا کہ اس نے عائشہ کو خبردار کر دیا تھا کہ دردِ زہ میں مبتلا یہودن کے وہ ہاتھ نہ لگائے اور اسے مرجانے دے۔ مصر کا دشمن۔ ہر مصری انسان کا دشمن تھا

عائشہ ایک لمحہ کے لئے خاموش کھڑی رہی۔ پھر وہ عورتوں کی اس بھیڑ کی طرف ہو لی جہاں یہودن ریت پر پڑی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اور مصری عورتیں دل سنبھالے اس دردناک منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ اور دل کی دھڑکنوں کو دبا رہی تھیں۔ اس لئے کہ سب ہی شادی شدہ تھیں یہودن کا درد و کرب ان کو اپنے اپنے بیتے ہوئے درد و کرب کو ابھار رہا تھا۔ ہر عورت شاید محسوس کر رہی تھی کہ جان لیوا لمحات اس پر بیت رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی چپ تھیں۔ اس لئے کہ یہودن کے ہم وطنوں نے وطن کی رگِ جد

کی ہڈی توڑ دی تھی۔ عورتوں نے عائشہ کو آتے دیکھا تو کچھ عورتوں نے سسکیاں لیں۔ اور ایک عورت نے آہستہ سے کہا کاش یہ یہود ن نہ ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔!

لالٹین کی مدھم روشنی میں عائشہ نے یہودن کو دیکھا۔ اس کے کپڑے رگڑ سے شکستہ ہو گئے تھے۔ بال منتشر ہو کر ریت سے سفید ہو چکے تھے۔ چہرہ دھواں دھواں اور پسینے سے شرابور تھا۔ مٹھیاں کسی ہوئی تھیں۔ اور وہ زمین پر لیٹی ہوئی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ ایک عورت ایک ماں!۔

"بچہ الٹا ہے"! عائشہ نے پیٹ دیکھا اور کہا۔ ایک مصری عورت نے جلدی سے کہا۔" جب ہی اسے تکلیف زیادہ ہے۔۔!" لیکن فوزیہ انگارہ بنی ہوئی آ گئی۔ جانتی تھی مصری عورتوں کی اسلامی ہمدردی کو۔ آتے ہی اس نے کہا" آپ لوگ سب اپنے اپنے گھر جائیں۔ اور عائشہ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔" کیا نماز پڑھ رہی تھیں ؟"

"ہاں!" عائشہ نے کھڑے ہو کر کہا" قریب والے گاؤں میں زچگی تھی۔ وہاں گئی تھی۔ عشاء کی نماز میں اسی لئے دیر ہو گئی۔"

"تم نے اپنا فرض پورا کر دیا!" فوزیہ نے اپنے کٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"فوزیہ! عائشہ نے نیم بے ہوش یہودن کی چیخ سن کر اس کی طرف دیکھا اور کہا:" فرض تو یہ بھی ہے۔ اللہ کی رضا اس میں بھی ہے۔۔۔

یکم جون کو بھول گئیں عائشہ ؟" فوزیہ کا چہرہ تمتما اٹھا اس نے کہا" اتنی جلدی ؟ جانتی ہو کہ ہماری زندگی اور عزت اب خطرے میں ہے ؟ ہمارا فضائی بیڑہ تباہ ہو چکا ہے اور ہمارا وطن خطرے میں ہے۔!؟"

عائشہ چپ ہو گئی۔ وہ کہتی بھی تو کیا کہتی ؟ فوزیہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔ اسرائیلیوں نے اچانک دھوکے سے بھرپور وار کیا تھا اس وقت جب کہ سفارتی ذرائع سے گفت و شنید جاری تھی۔ اس کے بعد یہودی اخلاق و اصول سے کیا امید باقی رہ جاتی تھی ؟

عورتیں لمبی سانسیں لیتی اور کانوں کو بند کرتی ہوئی گھروں کی طرف ہو لیں یہودن اب بے ہوش ہو چکی تھی۔ فوزیہ نے عائشہ کا ہاتھ پکڑا اور دروازے تک پہنچا گئی اور کہا:" قسم کھاؤ عائشہ! اب تم دروازہ نہیں کھولو گی ؟" عائشہ ہنس دی۔ اس نے قسم تو نہیں کھائی لیکن فوزیہ کو زبان دیدی۔ فوزیہ اس لئے عائشہ کی عزت کرتی تھی کیونکہ وہ بھی پڑھی لکھی تھی اور گاؤں کے اسکول کو سنبھالے ہوئے تھی۔ باہمت اور با حوصلہ تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس کی طرح عائشہ بھی وطن کی بیٹی ہے۔ اسرائیل سے اسے بھی نفرت ہے۔ کیونکہ اس کے شوہر کو اسی گاؤں کے قریب بارہ سال قبل اسرائیلی بمبار نے سینائی کی طرف بڑھتے ہوئے مشین گن سے ہلاک کر دیا تھا اور عائشہ قاہرہ کی آرام دہ زندگی چھوڑ کر اسی گاؤں میں آ گئی تھی تاکہ اس جگہ رہے جہاں اس کے شوہر نے آخری بار اسے پکارا تھا۔ عائشہ نے اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں اسکول کھولا تھا اور نازک لمحوں میں اپنی ہم جنسوں کی بھی مدد کیا کرتی تھی اس نے مڈ وائف کا کورس پاس کیا تھا۔

عائشہ کے زبان دے دینے پر فوزیہ چلی گئی اور عائشہ نے دروازہ بند کر لیا۔ اور اپنے پلنگ کی طرف ہو لی بستر پر بیٹھ کر عائشہ نے دعاؤں کا سلسلہ شروع کیا جو روزانہ سونے سے قبل اس کا معمول تھا۔ دعاؤں کے دوران بار بار باہر گلی میں خاک پر پڑی ہوئی یہودن اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپنے لگتی دعائیں ختم کر کے عائشہ اللہ کا نام لے کر جب لیٹی تو اس کا ذہن پراگندہ تھا۔ پہلے غبار سا تھا۔ پھر غبار چھٹنے لگا۔ اور جلد ہی ذہنی انتشار کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ عائشہ بار بار کروٹ لینے لگی۔ رات کا سناٹا اور زیادہ بھیانک ہونے لگا!۔

اسے وہ رات یاد آنے لگی جب اس کی بھی یہی حالت تھی۔ اگرچہ وہ رات کب کی بیت چکی تھی لیکن اس کا احساس آج تک زندہ تھا۔ وہ کتنی پریشان خائف اور دہشت زدہ تھی۔ اسے بے ہوش ہونا بھی یاد تھا۔ وہ قاہرہ کے اسپتال میں تھی جہاں فرانسیسی نرسیں اس کی مدد اور خدمت میں مصروف تھیں۔ زچگی کے بعد عائشہ نے ایک دن نرسوں سے سوال کیا تھا کہ وہ کیوں اس خلوص سے مریضوں کی خدمت کرتی ہیں۔ اس کی بات سن کر ایک خوبصورت نو عمر فرانسیسی نرس نے جو مسیح کے نام پر کنواری تھی۔ بڑی محبت سے کہا تھا۔ یہی انسانیت کی خدمت ہے۔ اور اسی خدمت میں ہماری خوشی اور زندگی مضمر ہے۔ اچانک عائشہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک عجیب غریب ہیجان تھا۔ اور اس کا لاشعور بیدار ہوتا جاتا تھا۔!

اسے اپنے پیارے رسول کی مقدس زندگی یاد آنے لگی۔۔۔

اس کے دل میں نورانی شمع کی روشنی پھیلنے لگی۔ فوزیہ کا انتقامی جذبہ غیر فطری نہیں تھا۔۔۔ اسرائیل نے مصر پر کاری ضرب لگائی تھی۔ مصر کا دشمن سب کا دشمن تھا۔ لیکن باہر گلی میں خاک پر ایک بے کس و مظلوم یہودی عورت پڑی تھی۔ وہ اسرائیل کی بیٹی ضرور تھی۔ لیکن سپاہی نہیں تھی۔ یقیناً اسرائیلی سپاہی کی مدد ملک سے غداری تھی۔ لیکن ایک یہودی عورت کی ایسے نازک وقت میں مدد کرنا ملک سے غداری نہیں ہوسکتی۔ اور پھر سیرت پاک عائشہ کی نگاہوں میں سماتی چلی گئی۔ کیا اللہ کے رسول کا فرمان یہی تھا؟

جب اضطراب حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ تو عائشہ اٹھی۔۔ کلام ربانی اٹھایا اور پڑھنے لگی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ہر الجھن مصیبت و فکر کا مداوا اسی میں تھا۔۔ جو انتشار تھا وہ چھٹنے لگا اور عائشہ نے محسوس کیا کہ دل میں جلنے والی شمع کی روشنی صاف ہوگئی ہے۔ اور نکھر گئی ہے پھر عائشہ نے کلام پاک سینہ سے لگا لیا۔ سوچتی اور غور کرتی رہی۔ اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اندھیرے میں اجالا کرنے والی اور رہنمائی کرنے والی روشنی پھیل رہی ہے۔ اس وقت باہر سے پھر چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ عائشہ نے کلام پاک کو بوسہ دیا۔ اور دیوارگیری پر رکھ دیا اور عزم راسخ کے ساتھ دروازے کی طرف ہولی۔۔۔!

"عائشہ!" کسی نے سرگوشانہ لہجہ میں کہا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ لیکن وہ کانپ رہی تھی۔ اچانک عائشہ کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کے شوہر کی آواز آئی ہو۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا؟ عائشہ سوچنے لگی۔ کیا گمشدہ آواز نے اسے قدم نہ بڑھانے کا اشارہ کیا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا اس کا قدم دائرہ انسانیت میں نہیں آتا تھا؟۔ عائشہ سوچنے لگی۔۔۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی انسانیت کل وطن کے لئے مصیبت بن جائے؟ یہودن کے اگر لڑکا ہوا اور وہ بڑا ہوکر اس کے وطن کے لئے خطرہ بن جائے تب کیا ہوگا۔ کیا اس کی ہزاروں اور لاکھوں بہنیں بیوہ نہ بن جائیں گی!؟ عائشہ کا ہاتھ دروازے کی کنڈی پر تھا۔ اور وہ خیالات کے دھاروں میں بہہ رہی تھی۔

لیکن یہودن کی چیخ نے اس کے وجود کو ہلا دیا۔ معلوم ہوا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ساری خیالی قلعے بندیاں ٹوٹ پھوٹ کر ڈھیر ہوگئیں صرف اسلامی انسانیت محبت اور وفا کا قلعہ اپنی جگہ موجود رہا۔ عائشہ

نے دروازہ کھولا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ گاؤں میں گہرا سناٹا تھا۔ اور وہ اس طرف لپک رہی تھی۔ جدھر ایک عورت انسانی سرد مہری کا شکار ہوکر تڑپ رہی تھی۔۔۔!

ہمت کرو۔۔ اٹھو! عائشہ یہودن کو سہارا دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ گھر چلو میرے! پھر تمھاری مصیبت ختم ہوجائے گی۔ خدا تم پر رحم کرے گا!

کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے ہوا۔۔۔ عائشہ نے یہودن کو پلنگ پر لٹا دیا۔ فوراً ہی دوا گلاس میں انڈیلی اور پلادی اور جلدی جلدی ضروری انتظامات میں مصروف ہوگئی۔۔۔ اب یہودن کی چیخیں کراہ میں تبدیل ہوگئی تھیں۔

بچی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ عائشہ نہا کر نکلی تو مسکراتے ہوئے پلنگ کے پاس گئی اور ماں کو جگایا۔ اور کہا "بچی کو دودھ پلادو۔" یہودن پہلی بار مسکرائی۔ عائشہ کو دیکھا اور بچی کی طرف کروٹ لے لی۔ عائشہ کا دل باغ باغ ہوگیا۔ لیکن فوزیہ باغ باغ نہیں تھی۔ وہ عائشہ سے ناراض تھی البتہ گاؤں کی عورتوں نے عائشہ کے اقدام کو ناپسند نہیں کیا تھا۔ خود عائشہ کا ضمیر بھی مطمئن تھا۔ عورتوں کے سوالات کے جواب میں یہودن نے بتایا کہ وہ ایک چھوٹے سے قافلہ کے ہمراہ جا رہی تھی۔ اسرائیلی حملے کے بعد پھیلنے والے خوف نے منتشر یہودیوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ انھیں ڈر پیدا ہوا کہ اسرائیلی حملہ کے ردعمل میں کہیں وہ ہلاک نہ کر دیئے جائیں۔ لہذا ایک قافلہ رات کی تاریکی میں پورٹ فواد کے مغرب میں رواں دواں تھا۔ یہودن چونکہ پیدل نہیں چل سکتی تھی۔ لہذا اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ گاؤں چلی جائے۔ وہاں مصری دائی ہوگی۔ اس کی مدد حاصل کرے۔ اس لئے یہودن گاؤں میں آئی تھی۔ لیکن یہاں آکر وہ انتہائی مایوس ہوئی تھی۔ لیکن اب اتنی ہی مسرور بھی تھی۔!

فوزیہ روزانہ عائشہ کو لعنت ملامت کرنے آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ عائشہ کو سخت و سست کہہ کر گئی تھی۔ عائشہ نے بار بار آہستہ بولنے

کے لئے کہا تھا۔ تاکہ یہودن کی دل شکنی نہ ہو۔ جس پر فوزیہ نے تلخ لہجے میں کہا تھا: "تمھیں یہودن کی دل شکنی عزیز ہے۔ وطن کی شکست کا غم نہیں؟"

عائشہ سمجھاتی رہی کہ ایک مبتلائے مصیبت ومظلوم یہودی عورت کے مرجانے سے وطن سرخرو نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اس نے جو کچھ کیا وہ اللہ اور رسول کے حکم پر عمل کیا۔ فوزیہ کو اسلام کی نورانی روشنی میں اس کے عمل کا تجزیہ کرنا چاہیئے۔ لیکن فوزیہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ چلی گئی تو یہودن نے عائشہ کو بلایا اور پوچھا! "بہن تمہارا نام کیا ہے؟" عائشہ ہنس دی اس لئے نام نہیں بتایا۔ یہودن اصرار کرنے لگی تب عائشہ نے کہا: "نام نہ پوچھو! اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ احسان کرنے والے اپنے نام کی تشہیر بھی کریں!" یہودن خاموش ہو گئی۔ لیکن پھر بولی!" میں نام اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ میں اپنی لڑکی کا نام بھی تمھارے نام پر رکھنا چاہتی ہوں۔" عائشہ نے گھبرا کر اسے دیکھا اور پوچھا: "تم اسلامی نام کیسے پسند کروگی؟" لیکن یہودن نے بتایا کہ وہ اپنی لڑکی کا نام اسلامی رکھے گی! عائشہ کے استفسار پر اس لئے بتایا" بہن! تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ تم مدد نہ کرتیں تو میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری لڑکی بھی تمھاری جیسی ہمدرد، مونس وغمخوار نکلے۔" عائشہ نے تب اپنا نام بتادیا یہودی عورت نے بچی کو گود میں اٹھالیا اور عقیدت سے کہا!" آج سے تو عائشہ ہے! یاد رکھنا کہ تو عائشہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس نام کی لاج رکھنا۔ اور یہ نہ بھولنا کہ عائشہ اگر یہودی گاؤں میں ہوتی تو اس کی لاش چیل اور کوے کھاتے ہوتے۔ لیکن تو عائشہ کے گھر میں نہ صرف پیدا ہوئی ہے بلکہ تیری ماں بھی زندہ وسلامت ہے۔ تو عائشہ ہی جیسی نکلنا۔ اچھا؟ یہ نام بڑا مبارک ہے۔ بڑی رحمت والا اور برکت والا ہے۔ تجھے بھی ثابت کرنا ہوگا کہ یہ نام اعلیٰ وارفع ہے! تجھے بھی عالمگیر محبت، خلوص اور وفا کے چراغ جلانے ہوں گے اس کی روشنی کو پھیلانا ہوگا اس لئے کہ تو عائشہ ہے۔ عائشہ؟

عائشہ مسکرا رہی تھی اور فوزیہ مورت بنی کھڑی تھی اس کے گالوں کا رنگ گلابی ہوتا جا رہا تھا۔!!

چھکن چاچا — صفحہ ۸۵ کا بقیہ

صفحہ ۸۵ کا بقیہ

زمین جو چھکن کی کاشت میں عرصے سے چلی آرہی ہے۔ اسے میں اس کی ایمانداری اور نمک خواری کے عوض بلا کسی معاوضہ کے دیتا ہوں۔ بعد میرے اس سے کوئی معاوضہ نہ لیا جاوے اور نہ اسے بے دخل کیا جاوے۔"

وثائق نویس، سرپنچ اور پنچوں نے سوالیہ نشان بن کر ایک دوسرے کو دیکھا مگر وصیت نامہ کی اس دفعہ کو ضابطۂ تحریر میں لانے کے سوا ان کے لئے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کلیم کے چہرہ پر ایک رنگ آیا۔ ایک گیا — غصے سے اس کا چہرہ تمتما گیا کبھی مایوسی

دفعہ ۳ لکھ جانے کے بعد وصیت نامہ کی آخری اختتامی عبارت لکھی گئی۔ وصیت نامہ خوشخط لکھنے کے بعد پڑھ کر سنایا گیا۔ کلیم نے لپک کر برابر والے کمرہ کا قفل کھول کر اسٹامپ پیڈ نکالا اس پر چودھری صاحب کا نشان انگوٹھا ثبت کرانے کے بعد وصیت نامہ ان لوگوں کے سامنے دوبارہ رکھ دیا۔ راقم وصیت نامہ نے اس پر اپنے دستخط کئے اور تاریخ ڈال کر گواہان سے دستخط لئے۔ پھر نوشتہ کلیم کے حوالے کر کے سب لوگ رخصت ہو گئے۔

اب وسیع کمرہ میں بستر پر چھکن اور اس کے پاس کلیم کھڑا تھا۔ بستر سے اٹھ کر دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے چھکن چچا بولے "لو چھوٹے میاں۔ جو فرض تم نے میرے ذمہ عائد کیا تھا اسے میں نے بہ خیر وخوبی انجام دے دیا!"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" کلیم غصہ سے بولا۔" اور تو سب ٹھیک ہے مگر وہ دو بیگھے زمین والا لطیفہ خوب رہا۔" چھکن نے روانگی سے پہلے موقع کی نزاکت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر بھرپور وار کیا۔ "اچھا اگر تمہاری مرضی نہیں تو وصیت نامہ کی دفعہ ۳ پر عمل درآمد نہ کرنا میں اسکے لئے تیار ہوں لیکن جب کل صبح گاؤں والوں پنچوں اور وثائق نویس پر اصل حقیقت کا راز کھلے گا تو وہ اس لطیفے سے خوب تر ہوگا۔ اور چھکن چاچا کا یہ جملہ سکر کڑ اکے کی سردی میں کلیم کو پسینہ آگیا اور وہ اسکے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ چھکن چاچا میں تو مذاق کر رہا تھا!

ضیا حسنی

زیرِ آسماں

> اسلم کی بات سن کر وہ لہرا کر چلی گئی۔ چند منٹ بعد ریحانہ! چائے، نمک پارے اور بسکٹ لے کر آئی اور ٹرے پر رکھ کر اس طرح سے اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ جیسے پھولوں میں بسی ہوئی نسیم سحر گزر جاتی ہے۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

دوائیں استعمال کیجئے لیکن انھیں غذا بنانا کسی طرح مناسب نہیں۔ صحیح ہے آپ کو خالص غذائیں نہیں ملتیں، سبزیاں اور پھل استعمال کیجئے۔ مارننگ واک مفید ہوگی آپ کے لئے۔

کبھی ایک طبیب نے مجھ سے کہا تھا۔

اب میں تاروں کی چھاؤں میں گھر سے نکل جاتا ہوں اور شہر کی شاہراہوں سے گذرتا ہوا جب محمد علی پارک پہنچتا ہوں تو صبح مسکراتی ہوئی میرا استقبال کرتی ہے۔ پرندے چہچہاتے رہتے ہیں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوتی ہے۔ میں دیر تک سبزے پر ٹہلتا رہتا ہوں اور جب سورج کی سنہری کرنیں حوض کے متلاطم پانی کو چھونے لگتی ہیں تو میں تھوڑی دیر کے لئے فوارے کے قریب بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ برسوں سے یہی میرا معمول ہے یہ سحر خیزی مجھے ہشاش بشاش رکھتی ہے۔

چھ ماہ اُدھر کی بات ہے۔ گرمی رخصتِ سفر باندھ رہی تھی صبح کو خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ حسب معمول میں ٹہل کر پارک سے باہر جانے لگا تو چبوترے پر اسلم بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ویسے ہی سو کر اٹھا تھا۔ اور جماہی لے رہا تھا۔

" یار! تم کہاں ؟ "

" میرپور سے تبدیل ہو کر یہاں آگیا ہوں۔ گھر والے وہیں ہیں ایک دوست کے یہاں سامان رکھ دیا ہے۔ کھانا ہوٹل میں کھاتا ہوں اور راتیں یہاں گزارتا ہوں "

" لیکن جاڑے کیسے گزریں گے ؟ "

اشتہاع

" اللہ مالک ہے "

پھر وہ میرے ساتھ باتیں کرتا ہوا پارک سے باہر آگیا۔ دری، تکیہ اور چادر مجھے دے کر منہ دھونے لگا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بولا۔

" چائے پی کر جانا۔ "

" گھر مل جائے پھر تمہارے ساتھ چائے پیوں گا "

" بیٹھ جاؤ کون جانے کب مکان ملے ؟ "

ہم جا کر ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

" یہاں سب کچھ مل جاتا ہے مگر مکان نہیں ملتا "

یہ عظیم شہر دن بدن پھیلتا جا رہا ہے۔ نئے نئے محلے آباد ہو رہے ہیں کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل ہی جائے گا۔"

دفتر جاتے ہوئے میں ان نو آباد محلوں سے گزرتا ہوں۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کھلی فضا اور صحت بخش آب و ہوا میں رہوں لیکن وہاں کم کرایہ پر جگہ نہیں مل سکتی۔"

" مل جائے گی۔ مایوس نہ ہو "

" میں مایوس نہیں ہوں اگر مایوس ہوتا تو مکان کی تلاش جاری نہ رہتی "

" کوشش جاری رکھو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن تم کو مکان مل ہی جائے گا "

میرا رسمی جملہ سن کر اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے بھائی مکان نہیں ملتا نہ سہی۔ دو وقت کھانا تو مل جاتا ہے"

پھر ٹہلتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

"اسلم! میں تم کو اپنے تنگ کمرے میں جگہ دے دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا مالک مکان مجھے اس کی اجازت نہیں دے گا"

"مالک مکان اگر اجازت دے بھی دے تو تمہاری پردہ نشین بیوی کے ساتھ میں کیسے رہ سکوں گا"

"بھائی اس طرح نہ جانے کتنے لوگ رہتے ہیں۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی علیحدہ مکان دلوا دیجئے۔"

"خیال رکھوں گا" دفتر کا وقت ہو رہا تھا اس لئے میں گھر کی طرف چل دیا۔ کئی دن تک خوددار اور غیور اسلم گھنٹوں میرے ذہن پر چھایا رہا۔ میں اپنے ذہن کو دیر تک بوجھل بنانے کا عادی نہیں ہوں اس لئے میں نے اسے جلد ہی بھلا دیا۔

ایک دن اچانک وہ سر راہ مل گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر مسرت کی جھلک دیکھی تو پوچھا

"مکان مل گیا؟"

"ہاں"

"کہاں؟"

"بہادر آباد میں"

"کیسے۔؟"

"بالکل ایسے جیسے علی بابا کو چالیس چوروں کا خزانہ مل گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں سوئٹر اور موزے لینے کے لئے نئی مارکیٹ جا رہا تھا۔ سول اسپتال کے چوراہے کے قریب نہال مل گیا۔ وہ میرا ہم وطن ہے اور بندر روڈ پر اس کی جوتے کی دکان ہے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کہو بھئی کیسے ہو۔ شادی ہوگئی کیا کر رہے ہو۔ یہاں کب سے ہو؟

علیک سلیک کے بعد اچانک یہ سوالات مجھے کچھ اچھے نہیں لگے۔ میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا لیکن اس دن فوراً میں نے کہہ دیا۔

"ابھی میری زندگی سنسان ہی ہے نہال صاحب!"

یہ سن کر مجھ سے بولا۔

"آؤ چائے پئیں اور تمہاری زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کوئی منصوبہ بنائیں۔"

"جب اپنے ہی رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے تو کسی دوسری ہستی کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔"

ایک سستے سے ہوٹل میں چائے پیتے ہوئے اس نے کہا۔ "کہاں رہتے ہو؟"

"زیر آسمان" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔ "مکان کی پرابلم میں سالو کر دوں گا"

"کیسے؟"

"مکان دوں گا"

"کرایہ کتنا ہوگا؟"

"تم میرے ہم وطن ہو۔ زیادہ کرایہ نہ لوں گا"

"میں اپر ڈویژن کلرک ہوں۔ دو سو روپے تنخواہ ملتی ہے کرایہ پہلے بتا دیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری حیثیت سے زیادہ ہو۔"

"پچیس روپے تو تم آسانی سے دے سکو گے"

"مجھے منظور ہے"

دوسرے دن میں اپنا سامان لے کر نہال کے یہاں جیسے ہی پہنچا تو اس نے نوکر کو حکم دیا۔

"ان کا سامان دوسرے حصے میں رکھ دو"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جس حصے میں تم رہو گے وہ بالکل علیحدہ ہے۔ ایک ہوادار کمرہ، برآمدہ، صحن، کچن، باتھ روم اور اس سے زیادہ تمہیں کیا چاہئے۔؟"

"اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ ایسے ہی مکان کی مجھے تلاش تھی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "شکریہ کی کوئی بات نہیں انسان

انسانوں کے کام آتا ہے۔ ذرا میں ایک فکر سے یکسو ہو جاؤں تو سامنے والے پلاٹ پر بھی تعمیر کا کام شروع کرا دوں۔ وہ چار انسانوں کی مشکلات تو ختم ہو جائیں گی۔ لوگ مکانوں کی تلاش میں آتے ہیں اور مایوس چلے جاتے ہیں۔"

ہم بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نہال کے پاس مکان تھا وہاں بھی بقول اس کے اچھی چل رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔

" آپ کچھ فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ کیا پریشانی ہے ؟ "

" یوں تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر سب سے بڑی پریشانی یہ ہے بیٹی بھی سیانی ہے اس کے لئے بر کی تلاش ہے۔"

" انشاء اللہ کوئی راہ نکل آئے گی ۔" میں نے روایتی طور پر یہ جملہ ادا کیا۔

" تم ہی خضر راہ بن جاؤ ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

" جی میں ؟ " گھبرا کر میں نے کہا۔

" میری تجویز پر غور کرنا ۔" یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی۔

میں فطری طور پر جلد بے تکلف ہونے کا عادی نہیں ہوں لیکن نہال نے اتنی جلد تکلف کے سارے پردے اٹھا دیئے کہ میں دیکھتا رہ گیا۔

اس کے بعد میں اس کے گھر آ گیا اور اب اس کے کنبے میں کافی گھل مل گیا ہوں ۔"

پھر ایک دن اسلم مجھے اپنے گھر لے گیا۔ ہم جیسے ہی زینہ سے گزر کر کمرے کے قریب پہنچے۔ ایک سریلی آواز سنائی دی۔ آواز سنتے ہی اسلم نے کہا۔

" آجاؤ ریحانہ ان سے کیا پردہ۔ یہ میرے دوست ہیں ۔"

اسلم کے کہنے پر وہ شرماتی ہوئی میرے سامنے آ گئی اور مجھے سلام کیا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ اسلم نے کہا" چائے طلب کرو جلدی کسے ریحانہ ہم لوگوں کو "

اسلم کی بات سن کر وہ لہرا کر کمرے سے چلی گئی۔

" یہ کون ہے ؟ " میں نے اسلم سے پوچھا۔

" نہال کی بیٹی جس کے ہاتھ پیلے کرنے کا خیال اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا ۔"

اسی دوران میں ریحانہ چائے نمک پارے اور بسکٹ لے کر آئی۔ اس نے گول میز ہمارے سامنے رکھی اور اس پر ٹرے رکھ کر اس طرح اٹھلاتی ہوئی چلی گئی جیسے پھولوں میں بسی ہوئی نسیم سحر گزر جاتی ہے۔

پھر دوسرے کمرے میں کسی نے ریڈیو آن کر دیا۔ کوئی مغنیہ غالب کی غزل گا رہی تھی جیسے ہی اس نے مقطع پڑھ کے غزل ختم کی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گیسوؤں کے سائے میں بیٹھے ہوئے غزلیں اور گیت سنا کرتے ہو۔ اب تو فٹ پاتھ کی ساری تھکن اتر گئی ہوگی۔"

" اس دلکش ماحول میں بھی مجھے الجھن محسوس ہوتی ہے ۔"

" بھابی یاد آتی ہوں گی۔ بچوں کا دھیان آتا ہوگا ؟"

اس نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا۔" اچھا بھئی اب میں ذرا بندر روڈ جاؤں گا۔ چلو میرے ساتھ "

" نہیں۔ میں تو اب گھر جاؤں گا۔" پھر میں اٹھ آیا۔ پھر مہینوں اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ایک دن وہ اچانک پبلک لائبریری میں مل گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ زرد تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے اخبار سے نگاہیں ہٹا لیتا اور کچھ سوچنے لگتا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔

" بڑے بے مروت ہو۔ کبھی تو مل لیا کرو "

میری آواز سن کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اور شکایتی لہجہ میں بولا۔

" بے مروت تم ہو۔ ایک تو مجھے بے گھر کر دیا اور پھر پلٹ کر میری خبر بھی نہیں لی "

" کیا مطلب ؟ " میں نے تعجب سے سوال کیا۔

"مطلب یہی ہے کہ تم نے مجھے بے گھر کر دیا۔"

"کیسے۔؟"

"یاد ہے تم نے مجھ سے کہا تھا۔ بھابی یاد آتی ہوں گی۔"

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ "ہاں! یہ جملہ میں نے کہا تو تھا۔"

ریحانہ نے یہ بات برابر والے کمرے سے سن لی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد وہ بپھری ہوئی میرے قریب آئی اور لڑنے لگی۔ پھر رونے لگی اور آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "تم فریبی ہو اسلم! تم مجھے اب تک دھوکا دیتے رہے۔ میں نے تمہارا سہارا لے کر خیالوں میں ایک خوبصورت سی دنیا بسائی مگر بہار آنے سے پہلے ہی خزاں آ گئی۔ ابا کو جب اس بات کی خبر ہو گی تو انھیں بہت صدمہ ہوگا۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے سختی سے مجھ سے سوال کیا۔

"اسلم جبکہ تم شادی شدہ ہو اور دو بچوں کے باپ بھی ہو تو تم نے مجھے فریب کیوں دیا؟"

"ریحانہ! میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ تم گھنٹوں اندھیرے میں مجھ سے اتنی قریب ہو جاتی تھیں کہ میں تمہارے دل کی دھڑکنوں کو صاف سنتا تھا۔ لیکن میں نے تمہاری کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ تم نے بار بار کہا کہ۔"

"اسلم! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا تمہارے پہلو میں دل کے بجائے پتھر ہے؟"

"یہ سن کر بھی میں ہمیشہ خاموش رہا۔ تم ہی بتاؤ ریحانہ میرا کیا قصور ہے؟"

میرا جواب سن کر وہ مجھے لعنت ملامت کرتی رہی۔ جب اس کا دل ہلکا ہو گیا تو میں نے نرمی سے کہا۔

"ریحانہ! میں اپنی بیوی کو بے حد چاہتا ہوں۔"

"وہ ایسی چہیتی تھی تو یہ ڈرامہ کیوں کھیلا تھا؟"

"میں نے تمہارے لئے ایک شکیل اور صحت مند لڑکا تلاش کر لیا ہے۔ مجھے صالحہ کے ساتھ اس گھر میں رہنے کی اجازت دے دو تاکہ تمہاری ہنستی کھلکھلاتی زندگی کو قریب سے دیکھ سکوں۔ اب میں پندرہ روپے زیادہ کرایہ دوں گا۔"

"تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں۔ تمہیں اس فریب کی پوری سزا ملے گی۔" یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹکتی چلی گئی۔

شام کو جب میں دفتر سے واپس ہوا تو نہال مجھے کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم آج ہی میرا مکان خالی کر دو۔ اگر دیر کرو گے تو تمہارا سامان باہر پھینک دوں گا۔"

چنانچہ اب میں سامان لے کر پھر اپنے دوست کے یہاں آ گیا ہوں۔ کھانا ہوٹل میں کھاتا ہوں اور راتیں آسمان کے نیچے گزرتی ہیں۔"

اسلم کی یہ کہانی سن کر میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کے علاوہ اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ کیوں کہ میں خود ایک چپراسی کے سرونٹ کوارٹر کے کمرے میں گزشتہ دو سال سے رہتا ہوں۔

الشہاب

عابد سورتی

(گجراتی کہانی)

سہارا

> ممدو نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر شبانہ اپنے ارادہ پر اٹل رہی۔ ممدو جب اس کی عمر کی بات کرتا تو وہ ہنس کر جواب دیتی۔ ابھی مجھے بڑھاپا نہیں آیا بیٹا! دیکھ میرے ہاتھ جوانوں سے بھی زیادہ تیزی سے کام کرتے ہیں۔

لاٹھی کے سہارے شبانہ خالہ کمرے کے باہر آئی۔ اس وقت برف سے پہاڑ چھپ گئے تھے۔ موٹر اسٹینڈ کے پاس بیٹھے ہوئے نیپالی قلیوں کی آنکھیں کبھی کبھی دور تک چلی جاتیں۔ اونچی تار کول کی ٹیڑھی میڑھی سڑک پر چھائی ہوئی تاریکی میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن قریب کے درختوں۔ مکان کی چھتوں اور راستہ پر جمی ہوئی برف کے سوا کچھ دیکھ پانا بس سے باہر تھا۔ تمام قلی بیڑی کے کش لیتے ہوئے الموڑہ سے آنے والی بس کا انتظار کر رہے تھے۔

دھیرے دھیرے شبانہ خالہ پکی سڑک پر آئی اور اسٹینڈ سے آگے نکل گئی۔

ان راستوں سے اس کا برسوں کا تعلق تھا۔ چپہ چپہ پر پڑے ہوئے چھوٹے بڑے نشانات اسی برس کی عمر میں بھی اس کے ذہن میں زندہ تھے۔ کون سی سڑک کہاں جاتی ہے اور کس سڑک سے وہ دلہن بن کر کوسانی آئی تھی۔ یہ بتانا اس کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔

وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ برف سے ڈھکے راستہ پر جوتی اور لاٹھی سے لمبے نشان ابھر گئے تھے۔ اس کے جی میں آیا کہ آج بھی وہ اپنے قدموں کو گنے۔ تاکہ سو قدم چل کر اپنے شوہر کی قبر کے پاس پہنچنے کا علم ہو جائے۔ مگر دل کی دھڑکن میں قدم گننا اس کے لئے مشکل تھا۔ اس نے دعاؤں کا سہارا لیا۔ ایک ایک قدم سرکتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔ اندھیری رات میں آواز ہی اس کی ساتھی تھی۔ اس کی اپنی آواز۔

اسے وہ دن یاد آیا جب وہ شوہر کی موت کے بعد پہلی دفعہ قبرستان آئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ گیلی دھلی گھاس پر بیٹھی تھی۔ اس کے دکھ میں شریک ہونے والا کوئی نہ تھا۔ صرف بوڑھا شرافت علی اپنی بیوی کے مرنے کے غم میں تھوڑی دوری پر ایک قبر کے پاس خاموش بیٹھا تھا۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھا۔ چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔

" خالہ! انسان دنیا میں دو راز نہیں جان سکتا۔ ایک زندگی کا دوسرے موت کا۔ یہ دونوں راز خدا جانتا ہے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وقت آنے پر اسے واپس لینے کا حق بھی اسی کو ہے"

شبانہ خالہ نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں، مرنے والی کا پیار اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ شرافت علی نے آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے قرآن پاک کی آیت کے لفظوں کو الگ الگ کر کے ترجمہ کیا تو شبانہ خالہ کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ شرافت علی انسان کی روح کی پاکیزگی اور انسان کے اعمال کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

اس رات شبانہ سو نہ سکی۔ کمرے کے وسط میں بیٹھی ٹکٹکی

رکھ کر بدن کو گرمی پہنچا رہی تھی۔ اس کا دل پرسکون تھا۔ اس کی
آنکھوں میں سرخ انگاروں کی چمک ناچ رہی تھی۔ شرافت علی
کے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

سویرے ممدو چائے کا کپ لے آیا۔ یکایک چونک کر اس
نے آنکھیں اٹھائیں۔ اسے بیتے ہوئے وقت کا خیال آیا۔ اور وہ
ہنس پڑی۔

"اماں تم۔" ممدو نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر
کہا "چائے لایا ہوں۔"

"بیٹا! میرے لئے کچھ کام بھی لے آ۔" اس نے چائے کا کپ
پکڑ کر نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔ اس نے پھر کہا۔ ایک سلائی کی مشین لا دے نا مجھے۔
جمن چاچا کے یہاں تھیلیاں سلنے کا خوب کام آتا ہے۔ میرا وقت
بھی آسانی سے کٹ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ گھر کے کام میں بھی
مدد ملے گی ..."

"کیا میری تنخواہ کے دوسو روپے پورے نہیں ہوتے جو
اس بڑھاپے میں .... ؟"

"کس نے کہا کہ میں بوڑھی ہوں ؟" شبانہ ممدو کی بات کاٹ کر
بولی۔ اس کا بدن کانپنے لگا۔ پھر سنبھل کر بات آگے بڑھائی۔

"آج بھی کام کرنے کی قوت مجھ میں ہے۔ میں کام کروں گی۔
کوئی بھی کام ....." ممدو خاموش دیکھتا رہا شبانہ میں اچانک
یہ تغیر کیسے آیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔

دوسرے دن شبانہ کے کمرے میں سلائی کی مشین آگئی چھوٹی سی
بہت خوبصورت۔ وہ چٹائی بچھا کر فوراً کام میں لگ گئی۔ اس کے لمبے لمبے
ہاتھ پہیئے پر گھومنے لگے اور انگلیاں اونچی نیچی ہوتی ہوئی سوئی سے
کھیلنے لگیں۔ مشین کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز اس کے کمرے کی خاموش
فضا میں گونج اٹھی۔

ممدو نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر شبانہ اپنے
ارادے پر اٹل تھی۔ ممدو جب اس کی عمر کا خیال دلا کر کچھ کہنے کی ہمت
کرتا تو وہ غصہ ہو جاتی اور پھر ہنس کر ایک ہی جواب دیتی۔ "ابھی
مجھے بڑھاپا نہیں آیا بیٹا۔ دیکھ میرے ہاتھ جوانوں سے بھی زیادہ
تیزی سے کام کرتے ہیں۔"

صبح وہ کام شروع کرتی اور غروب آفتاب تک تھیلیوں
کے کئی بنڈل بنا کر جمن چاچا کی دوکان پر پہنچا آتی۔

"بہت کام کرتی ہو خالہ!" جمن چاچا تھیلیاں گنتے ہوئے مذاقاً
کہتا۔ خالہ ہنس کر نئی تھیلیوں کا آرڈر لیتی اور دھیرے دھیرے
شوہر کی قبر کی طرف چلی جاتی۔

شرافت علی اسے راستہ ہی میں ملتا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے
قبروں پر پہنچتے اور فاتحہ پڑھ کر تھوڑی دیر تک ہری گھاس پر بیٹھ جاتے
شرافت علی اپنی جاکیٹ کی جیب سے الائچی دانے نکال کر شبانہ کے
سامنے رکھ دیتا۔ وہ رومال سے ایک دانہ اٹھاتی اور منہ میں رکھ کر
چوسنے لگتی۔

"اچھے ہیں نا ... ؟" شرافت علی دریافت کرتا۔

شبانہ سر کو ہلا کر ہاں کہہ دیتی۔ وہ پھر ایک دانہ اٹھاتی اور
اس کا مزہ لیتی ہوئی چولی سے گتا ہوا کاغذ نکال کر گھاس پر رکھ دیتی۔

"تم یہ چکھ کر دیکھو" شبانہ کہتی۔

شرافت علی کاغذ کھول کر آنکھوں تک اٹھاتا۔

"گڑ پاپڑ کا ٹکڑا ہے ؟" سونگھ کر اس سے پوچھتا۔

"تم کہتے تھے نا کہ تمہاری بیوی سردی کے موسم میں تم کو گڑ پاپڑ
کھلاتی تھی۔ آج میں بنا کر لائی ہوں"

شرافت علی ٹکڑے کے دو تین حصوں میں بانٹ کر منہ میں رکھتا
اور دھیرے دھیرے پگھلا کر گلے کے نیچے اتارتا۔ شبانہ خالہ کی
آنکھیں اس کے چہرہ پر ٹک جاتیں۔ شرافت علی کے جبڑوں کو اوپر
نیچے ہوتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی۔

بجلی کا پہلا کھمبا آنے پر وہ رکی۔ ایک گہری سانس لی۔ اس کا
چہرہ اپنے آپ اوپر اٹھا۔ برف میں گھسی ہوئی لاٹھی کو باہر کھینچ کر
آگے بڑھی۔ برف پر چھوٹے چھوٹے نشان ابھر گئے۔ وہ پیروں
کے نیچے برف کو کچلتی ہوئی کچے راستہ پر کائی اور نیچے کی طرف اتر گئی۔

ہر جمعہ کو اس کا یہ قاعدہ تھا۔ پندرہ برسوں سے اس کا کام

باقاعدہ چلا آرہا تھا۔ صرف ان ہی دنوں وہ کمرے کے اندر بدن کو سمیٹی ہوئی بیٹھی رہتی جب برسات کا پانی اس کے جانے پہچانے راستوں کو دھوتا رہتا تھا یا طوفانی بارشوں میں درختوں کی ڈالیاں جھک پڑتیں۔ ان موسموں کے گزر جانے کے بعد وہ شوہر کی قبر پر جانے کے لئے نکل پڑتی۔

شبانہ خالہ اس دن کو بھی نہ بھول سکی جب شرافت علی نے اس کے ہاتھ میں لاٹھی نہ دیکھ کر پوچھا تھا۔

"آج ـــ تم لاٹھی ساتھ نہیں لائیں؟"

"نہ جانے کہاں رکھ دی ہے۔ ملتی ہی نہیں" کہتے کہتے اس نے بھی جواب میں ایک اور سوال کر ڈالا" تمہاری لاٹھی بھی میں نہیں دیکھ رہی ہوں۔ کیا وہ بھی کھو گئی ــ؟"

"ٹوٹ گئی" شرافت علی نے اپنے چہرے کو گمبھیر تا بناتے ہوئے کہا" بہت پرانی تھی نا"

اس کا جواب سن کر شبانہ خالہ چپکے سے ہنس پڑی تھی اور شرافت علی کا چہرہ بھی خوشی سے چمک اٹھا تھا۔

بجلی کے دوسرے کھمبے کے قریب اس نے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی جو اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے لاٹھی پر زور ڈالا۔ اور دوسرے ہاتھ سے کھمبا پکڑ کر جھک گئی۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے قبرستان کی طرف دیکھا۔ چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ کچھ سنبھل کر اس نے پھر لاٹھی سنبھالی۔ اب اس کے لئے ایک ہی کھمبا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد قبرستان میں داخل ہونا تھا۔ اس کے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ اسے ایسا لگا کہ شوہر کی قبر آج اس سے دور چلی گئی ہے۔ بہت دور۔۔۔۔ یہی فاصلہ شرافت علی کی رفاقت میں آسانی سے طے ہو جاتا تھا۔ لیکن آج شبانہ خالہ کا ساتھ دینے کو وہ زندہ نہیں تھا۔ اچانک اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

پگڈنڈی سے اتر کر وہ قبرستان میں داخل ہوئی آج اس کی آنکھوں کے سامنے دو قبریں تھیں۔ ایک شوہر کی۔ دوسری بالکل نئی ابھری ہوئی شرافت علی کی۔ دونوں قبریں برف کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی انھیں دیکھتی رہی۔ آج اسے دلاسہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا بدن ٹوٹنے لگا۔

لمحہ بھر کے لئے اسے محسوس ہوا جیسے خون کی دھار اس کے منہ اور ناک سے بہہ کر برف کی سپیدی پر جم جائے گی۔ یکایک وہ کھڑی ہو گئی۔ دوپٹہ سے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی۔

ممدو اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

"اماں ـــ" شبانہ کو کمرے میں اندر آتے دیکھ کر اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"جمن چاچا تم کو ملے ــ؟"

وہ بغیر جواب دیئے انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئی۔ ممدو اس کے پاس آیا اور بولا۔ تین دن سے کام ویسا ہی پڑا ہے۔ جمن چاچا کہتے تھے۔۔۔۔۔؟

شبانہ خالہ نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی کہا" بیٹا! اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ اب تو مجھ پر بھی بڑھاپا آگیا۔"

الشجاع

جان عالم انصاری

داغ کی شاعری

داغ کے کلام میں تغافل کوشی کا جو رنگ غالب
نظر آتا ہے وہ تغافل کے شیوہ خاص کی ایک کڑی ہے

شعورِ غزل بہت سی روایات کا حسین امتزاج ہے اس کے مطالعے سے ہمارا ستائشِ حُسن کا جذبہ دوبالا ہو جاتا ہے یہ ستائشِ حسن کبھی میرؔ کو عشق کی علامات بنا دیتا ہے تو کبھی داغؔ کو اپنے وقت کی فکر و نظر کا ترجمان بنا دیتا ہے۔ داغؔ کی بابت یہ خیال کہ وہ آدابِ عشق کا ایک بدنما داغ ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک صحت مند نظریہ نہیں کیونکہ داغؔ ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری انحطاط پذیر معاشرہ کی ایک علامت ہے داغؔ کا زمانہ تاریخی تسلسل کی ایک کڑی ہے جو اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ایک قوم نے اپنے مستقبل کا فیصلہ اس انداز میں کیا کہ اس کی حیات کا قیمتی سرمایہ اس کا نہ رہا جس طرح ایک غریب کو اچانک دولت مل جانے سے سرمایہ دارانہ کرختگی نہیں مل پاتی اسی طرح ایک دولت مند کی دولت چھن جانے سے وہ پاس غربت نہیں کر پاتا اس کی وجہ ماضی کا وہ رشتہ ہے جسے بنی نوعِ انسان کسی وقت توڑ نہیں سکتا۔ اس سے نجات حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ شاعر ایک ایسی تنہائی میں ڈوب جائے جس میں تمام انسانیت پنہاں ہو یہ تنہائی ماضی کی حسین یادوں کے رشتے سے حال میں تبدیلیوں کی خواہاں ہوگی یہ تبدیلیاں معیاری اور غیر معیاری دونوں ہو سکتی ہیں ان تبدیلیوں میں فنکار کا اپنا نظریہ بھی نمایاں حصہ لیتا ہے اگر فنکار کا ماضی معیاری تھا تو اس کا نظریہ بھی معیاری ہوگا اگر ماضی معیاری نہیں تو نظریہ بھی معیاری نہیں ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ فنکار اپنے وقت کے سماجی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی پہلوؤں سے متاثر ہو کر ہی اپنے نظریہ کا انتخاب کرتا ہے۔ مگر افسوس داغؔ کا ماضی بھی معیاری نہ تھا اور حال بھی ماضی کا پرتو تھا جس میں تہذیب کی روح مردہ ہو گئی تھی۔

ایسے عالم میں فنکار نے جس تجربہ کو حاصل کیا وہ تہذیب کی شعوری نزاع و مایوسی تھی جس کا عکس داغؔ کی شاعری ہے یہاں شوخی میں شوخی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں آنسوؤں کی نمی کی چاشنی بھی شامل ہے جس کا ایک پہلو داغؔ کا شہر آشوب دہلی ہے جس میں غم بھی مضمر ہے یہی غم تھا جس سے فرار کی کوشش میں داغؔ صداقت تجربات جذبہ، ندرت تخیل اور ہنرمندانہ توازن کے بجائے غمزدگی، شوخی، زندہ دلی، چلبلاپن، لاگ ڈانٹ اور چھیڑ چھاڑ کو طرزِ خاص بنا لیتا ہے سطحی نظر اس کی سوقیانہ قرار دے سکتی ہے یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم غم کے اظہار کے مختلف پہلوؤں سے ناواقف ہوں غم اپنے اظہار کے لئے تین مختلف انداز اختیار کرتا ہے ایک میں وہ غم سے نباہ کرتا ہے دوسرے میں وہ غم سے پناہ حاصل کرنے کے لئے کسی عقیدہ کا سہارا لیتا ہے تیسرے انداز میں وہ اپنے حال کا مذاق اڑاتا ہے یا قہقہوں اور ہنسی میں غم کو چھپا دینا چاہتا ہے۔ غم سے نباہ کرنا میرؔ کا شیوہ خاص ہے غم سے پناہ حاصل کرنے کی خاطر کسی عقیدہ کا سہارا لینا صوفی شعراء کا خاص رویہ ہے حال کا مذاق اڑا کر ہنسی جیسی ہلکی چیز کو جنم دینا سودا کے یہاں نمایاں ہے مگر داغؔ نے خصوصاً اس انداز سے انحراف کرتے ہوئے غالب و مومن سے دامن بچا کے

ہوئے زندہ دلی [illegible]تا ہے جو قدرت زبان کی بدولت لفظی تجربہ کے سانچوں میں ڈھل کر ستائش چاہتا ہے یہ قاری کے اپنے زاویہ نگاہ پر مبنی ہے کہ اس کو قابل ملامت سمجھے یا غم کا فراری اظہار قرار دے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ فن کا تجزیہ فنکار سے ہمدردی چاہتا ہے۔

ایک فنکار اپنے وقت اور ماضی کی تحریکوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس سے ہمدردی ایک شعوری وابستگی کی علامت ہے جس کو ہم فطری تقاضہ کہہ سکتے ہیں۔ فطرت ہمیشہ معصوم ہوتی ہے، مگر اسی سے انسان خیر و شر دونوں کا اکتساب کرتا ہے جس فرد میں جس پہلو کا غلبہ ہوتا ہے وہ پہلو فرد کے مزاج میں غالب نظر آتا ہے اس کا تجزیہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب فرد غیر جانبدار ہو کر اس کام کو انجام دے یہ غیر جانبداری تنقیدی ادب بھی ہے اور انسانی ہمدردی کا پہلو بھی۔ مگر ارباب علم و ادب نے داغ سے ہمدردی کے بجائے نفرت کی جس کا ایک ثبوت "اودھ پنچ" میں ہجو کا وہ سلسلہ ہے جو تاریخوں کی صورت میں مدت تک قائم رہا۔ جس سے اس دور کے شعوری مطالعہ میں مدد ملتی ہے مجھے "اودھ پنچ" کی ایک تاریخ ملی ہے جو بجنسہ درج کر رہا ہوں۔

کہتے ہیں لوگ داغ کی صورت
ایسی تھی جیسی زاغ کی صورت

نام گلزار داغ ہے جس کا
ہے وہ ایک اجڑے باغ کی صورت

تم کہیں دو کبھی شربت دیدار
ہوں سراپا ایاغ کی صورت

ہائے بے مغز ناریل کی طرح
سر لبیر ہے داغ کی صورت

اٹھ گئے ہائے داغ دنیا سے
عشق سے کیا ہو فراغ کی صورت

داغ کے غم سے بزم ہستی میں
جل رہا ہوں چراغ کی صورت

چشم بدعد واہ کیسا کہنا
میں نے دیکھی ہے داغ کی صورت

ایسی تاریخوں سے فنکار کی عظمت کم نہیں ہوتی کیونکہ یہ باتیں خود انحطاط کی ترجمان ہیں جن پر طنز و تمسخر کے پردے ڈالے گئے ہیں جو اس تاثر کا دوسرا روپ ہے جس کا ایک روپ داغ کا تجربہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ داغ کا کلام پرخلوص جذبات محبت سے محروم ہے اس کی وجہ تہذیب وقت کی شکستگی ہے جس نے جذبات و احساسات کی گہرائی اور گیرائی چھین کر فنکار کو کھلی معرکہ آرائی کے آداب عطا کئے اس معرکہ آرائی میں فنکار کی زندگی کا وہ حصہ نمایاں ہے جس میں لال قلعہ کی زندگی اور رنگ رلیاں بسی ہوئی ہیں ظاہر ہے اس ماحول سے جو بصیرت فنکار حاصل کرے گا اس میں ظاہر و باطن کا فرق کیسے نمایاں ہو سکتا ہے، ؟ یہ بھی حقیقت ہے کہ ماحول سب سے بڑا معلم ہے اس معلم کی تعلیم کبھی رائیگاں نہیں جاتی یہ تعلیم کبھی اپنا اظہار کھل کر تی ہے تو کبھی تہذیب نفس کے دبیز غلاف اوڑھ کر سامنے آتی ہے داغ کے یہاں فن کا اظہار دونوں روپ میں نظر آتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ داغ کا ایک روپ زیادہ نمایاں ہے اس نمایاں روپ میں مومن کے نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ ساتھ زبان کی وہ لطیف اشارت ہے جو ہمیں نہ جانے کہاں کہاں لے جاتی ہے۔

داغ کے کلام میں معاملہ گوئی کا جو رنگ غالب نظر آتا ہے وہ فغانی کے شیوہ خاص کی ایک کڑی ہے چونکہ حافظ شیرازی کے اثرات نے اردو شاعری میں حقیقت و مجاز کے امتزاج کی وہ صورت پیدا کر دی تھی جس سے غزل میں قطعیت کی کمی پیدا ہو گئی تھی جس طرح فارسی شاعری میں فغانی ایک باغی کے روپ میں سامنے آیا بالکل اسی طرح اردو شاعری میں جرأت، مومن اور داغ اپنے وقت کے رشتے سے باغی ہی تھے مگر اس بغاوت میں داغ ہوسناکی کی حد تک پہنچ گئے جس کی بدولت ہم کو احساس ہوا کہ اس نے درد دل، جذبات کی گہرائی خیالات کی بلندی اور متانت کو ہاتھ سے کھو دیا۔ مگر ان چیزوں کے کھو جانے کا احساس اس وقت بہت ہو جاتا ہے جب داغ کی رواں، سلیس اور شگفتہ زبان ہمارے سامنے آتی ہے۔

بلاشبہ شاعری کا وسیلۂ اظہار نہ بیان ہے داغ اسی کے سہارے اشاعت ذات کرتا ہے۔ اشاعت ذات کا ایک روپ جنس بھی ہے یہ قوت دبانے سے دب جاتی ہے لیکن مٹتی نہیں اور لاشعور کے تاریک گوشوں میں سمٹ کر مختلف اوقات میں مختلف ذرائع سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے اور آسودگی کی خاطر مختلف وسائل ڈھونڈتی ہے اس پر اکثر تہذیب و معاشرت اور روایات کا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے اسی کو ہم جنس کا ذہنی پہلو کہتے ہیں داغ کی معاملہ گوئی اسی ذہنی پہلو کا ایک روپ ہے لیکن داغ اس سلسلہ میں جرأت کی طرح ہوسناکی سے گریز کرکے معاملات راز و نیاز کو رعنائی عطا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ داغ ایک بدقسمت فنکار ہے جس کے لئے اس کی ماں کا روپ محترم نہیں ہے۔ داغ کی ماں کا روپ داغ کے لئے کیسا تھا؟ یہ داغ کی شاعری کے تجزیہ کا اہم سوال ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تر کیز (FIXATION) کے اعتبار سے فرد کی لبیڈو (Libido) جزوی یا کلی طور پر نشوونما کے ابتدائی ادوار میں مرتکز ہو جاتی ہے اور ابتدائی چیزوں سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے اور کسی بھی طرح ان چیزوں سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر پاتی۔ شدت و خلوص کی نشوونما کا دار و مدار اسی دور کی تربیت پر ہوتا ہے اسی پر فرد کے مستقبل کی محبتوں کی داغ بیل پڑتی ہے کیونکہ بچہ بڑا ہو کر اپنے محبوب میں اپنی ماں کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے جس کے لئے وہ مدتوں سرگرداں رہتا ہے داغ کو اس تلاش میں "حجاب" ہاتھ آئی جس کا روپ "فریاد داغ" میں اس طرح ہے۔

اف رے عہد شباب کی مستی
بے پئے ہے شراب کی مستی

ہائے تیرا کلام مستانہ
ہائے تیرا خرام مستانہ

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
ادھر آنا ادھر نکل جانا

کبھی منہ پر نقاب کا کل ہے
کبھی منہ پھیر کر تغافل ہے

کبھی سلنے سے اپنے الجھانا
کبھی کچھ بانکپن بھی کر جاتا

پہلے بات کی تو رک رک کر
پھر کہا میرے کان میں جھک کر

کیا نہیں حسرت وصال ہمیں
وضع داری کا ہے خیال ہمیں

داغ کے محبوب کی یہ تمثال ماں کی مقدس ذات کی تمثال ہے جس سے حالات نے اس کا تقدس چھین لیا تھا کیونکہ وہ حالات جس میں ایک عورت اپنی زندگی کو ایک آئیڈیل روپ دیتی ہے وہ اسے نہ مل سکے اور جو روپ داغ کے سامنے تھا وہ کسی بھی طرح محترم نہ تھا۔ یہ احترام برصغیر میں پہلی بار اس وقت ختم ہوا تھا، جب غزنوی عہد میں غلام اور کنیزیں افراط سے تھیں اور اس کا دوسرا روپ اس وقت ہمارے سامنے آیا جب سلطنت دہلی خواب و خیال بن گئی۔

معاشرتی زندگی میں عورت کے احترام کا عدم وجود ایک ردعمل ہے جس کا شکوہ ہمیں فنکار کی ذات سے نہیں بلکہ ماحول سے کرنا چاہئے کیونکہ ذات ماحول کا پرتو ہے اور عینیت کا مخالف چونکہ ہمیں اپنے ماحول نے افلاطونی عینیت عطا کی ہے جو ذہنی مطلق اور جدلیات کے منافی ہے اور اس کو ہم دور حاضر کا تقاضا بھی تسلیم نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود اسی افلاطونیت سے رشتہ جوڑ کر حقیقت سے گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ داغ کا کلام ہمارے لئے محترم نہیں۔ جہاں ہم نے بہت سی چیزوں کے احترام کو خیرباد کہا ہے وہاں اگر داغ عورت کا احترام نہیں کرتا تو ہمارے ماتھے پر کیوں شکن پڑ جاتی ہے ہم وسعت نظری کا دامن کیوں چھوڑ دیتے ہیں کیا ہم آج گلی کوچوں اور بازاروں کو آنا دمنش دیویوں کو وہی تقدس دیتے ہیں جس کا مطالبہ ہم داغ سے کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دور حاضر میں اپنے معیار سے منحرف ہو کر قدیم احترام کو جدید آزادی اور تجزیہ کا روپ دے چکے ہیں یہی روپ بہت پہلے داغ نے پیش کیا۔ اسی لئے اس نے معاشرتی پابندی کو خیرباد

[illegible]
کلام اور ان کی ذات کی حقیقت بہت کچھ [illegible] سمجھی جا سکتی ہیں
کیونکہ وہ جس چیز کو جیسا سمجھتا ہے ویسا ہی بیان کر دیتا ہے عظمت
[illegible] دل میں حقیقت کو نہیں چھپاتا یہی اس کی عظمت ہے۔

اس عظمت میں داغ کی زبان چار چاند لگا دیتی ہے اسکی
زبان کا ہر لفظ ایک لطیف اشاریت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے
ہے ان کا اردو پن دل کو موہ لینے والی چیز ہے اردو پن یہ نہیں کہ فارسی
الفاظ و کلمات سے دامن بچا لیا جائے بلکہ یہ ہے کہ ان کو اس طرح اردو
میں جگہ دی جائے کہ شعری تخلیق رمز کے اعتبار سے اردو معلوم
ہو ان اشعار کو دیکھئے کس بلا کا اردو پن ہے ؎

دیکھی ہماری محبت کسی کو کیا معلوم
کسی کے دل کی حقیقت کسی کو کیا معلوم

یقین تو ہے کہ وہ خط کا جواب لکھیں گے
مگر نوشتہ قسمت کسی کو کیا معلوم

ایک خدائی کی آفتیں دیکھیں
اے صدقے تری جدائی کا

کسی بندے کو درد عشق نہ دے
واسطہ اپنی کبریائی کا

ان اشعار میں فارسی الفاظ کے استعمال کے باوجود اردو
پن کا ایک خاص تناسب موجود ہے جس کو ہم داغ کا فن کہہ سکتے ہیں۔
یہ فن اور [illegible] نکھر جاتا ہے جب داغ ڈرامائی کیفیت
[illegible] اور اشعار ڈرامائیت کی بدولت تجزار اور رمز و ایما کی
ایک مسلسل [illegible] ہو جاتے ہیں جس میں پس منظر ابتدائی حادثہ، پیچیدگی
عروج، زوال اور انجام کی جھلک صاف نظر آتی ہے لیکن اس کا
مجموعی تاثر نشاطیہ ہے اس لئے ان اشعار کا پہلو المیاتی نہیں بلکہ طربیہ
ہوتا ہے جس میں داغ فنکارانہ ابلاغ بڑی مہارت سے کرتا
ہے ؎

تم کو وصل غیر سے انکار
اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا

[illegible]
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

داغ کے کلام میں اس قسم کے بہت سے اشعار ایسے موجود ہیں
جو فنکار کی تخلیقی بصیرت کا بین ثبوت ہیں مگر داغ کی بابت عجیب
عجیب غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان غلط فہمیوں کو جنم دینے کا اصل
سبب داغ کی تخلیقی بصیرت نہیں بلکہ شعر کا غلط تعقل ہے دراصل
شعر ایک ایسا تجربہ ہے جو داخلی اور خارجی کیفیات کی ایک رو ہے
جب اس رو میں توازن و تناسب کے ساتھ فنی ترتیب پیدا ہو جاتی
ہے تو اس میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے جمالیاتی ذوق مہیج
ہو سکتا ہے اس جمالیاتی ذوق کے سہارے صوتی اتار چڑھاؤ،
روانی اور تسلسل پیدا کر کے الفاظ کے اس مجموعہ کو ایک علامتی تجربہ
بنا دیتا ہے یہی علامتی تجربہ شعر ہے میر نے جرأت سے کہا تھا کہ تم شعر
تو کہہ نہیں سکتے اپنا چوما چاٹی کہہ لیا کرو لیکن میر کے زمانے کے فنی
معیار میں یہ بات شامل نہ تھی کہ یہ چوما چاٹی قسم کی باتیں بھی انسانی
تجربے ہیں اگر ان تجربات میں خلوص اور حسن کاری شامل کر دی جائے
تو یہ بھی شعر بن سکتے ہیں۔ داغ کے کلام میں یہی تجربات خلوص و حسن
کاری کی آمیزش کی بدولت علامتی تجربہ بن جاتے ہیں جس میں خلوص و
حسن کاری کی جھلک چمک اٹھتی ہے اور رعایت لفظی کا عیب
داغ کا ہنر بن جاتا ہے اور تجربہ خیال و احساس کی حسین آمیزش بن
کر سامنے آتا ہے۔

داغ کے اشعار میں چابکدستی، لفظی حسن کاری اور صفائی
نمایاں ہے مگر خلوص کی کمی ہے۔ چونکہ داغ کو زبان پر بلا کی قدرت
حاصل تھی، اس لئے اسے زندگی بھی ملی ورنہ وہ اپنے فن کے
ہاتھوں ختم ہو جاتا۔ اس قدرت نے میر اور غالب کے ساتھ ساتھ
آج کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں "داغ کی زبان"
کو بھی شامل کر لیا ہے۔

تلخیص و ترجمہ

سلطان کلیم

✱

● — ہم جیسوں کے لئے ہندوستان کوئی بڑا ملک نہیں ہے۔ ہم نے یہاں ہر قسم کا کام کیا ہے۔ ٹھیکے لئے ہیں۔ بوائلر فٹر اور انجن ڈرائیور رہی رہے ہیں۔

مگر اب

ہم بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔ ہم معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے اور ہمیں کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا!!

صبح کے ایڈیشن نکلنے والا تھا۔ اور مجھے کافی کام کرنا پڑا تھا۔ میں ایڈیٹر کے سب سے اہم فرض یعنی اداریہ لکھنے سے فراغت پا چکا تھا۔ لیکن مجھے اس وقت تک بیٹھنا تھا جب تک کہ آخری فارم مشین پر نہ جائے۔ رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی اور باہر کافی تاریکی تھی۔ دن بھر شدید لو چلتی رہی تھی۔ اور اس وقت بھی کافی گرمی معلوم ہو رہی تھی۔ دفتر کی نسبت پریس میں ٹھنڈک تھی اس لئے میں آرام کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اپنا پائپ سلگا لیا۔ کمپوزنگ مشین کی ٹک ٹک جاری تھی۔ نیم برہنہ کمپوزیٹر بار بار اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے اور پانی مانگتے۔ چھپائی شروع ہو گئی تھی۔ اور مشینیں تیزی سے کاغذ سیاہ کر رہی تھیں۔ جب اخبار کا آخری فارم مشین پر جا چکا تھا۔ میں جانے کے لئے اٹھا۔ جونہی دروازے تک پہنچا مجھے دو شخص سفید کپڑوں میں ملبوس کھڑے نظر آئے۔ وہ بڑی پراسرار نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھا وہ مجرم ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک بولا "یہی ہے"۔ دوسرے

ایکسنی پیر اولی کی داستان

نے متانت سے کہا "ٹھیک ہے"۔ میں حیرت سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

پھر دونوں نے سر ہلایا اور بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ میرا پہلا شبہ دور ہو گیا۔ اب میں انھیں پاگل سمجھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک جس کا قد چھوٹا تھا، بولا "ہم نے سڑک پر سے دفتر میں روشنی دیکھی۔ ہم وہاں سامنے سڑک پر ایک درخت کے تلے ٹھنڈک میں سو رہے تھے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔ دفتر کھلا ہے۔ ہم ابھی کیوں نہ چل کر بات کریں"۔ میں نے دونوں کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ دراصل ان سے ایک دفعہ مل کر انھیں کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔ چھوٹے قد والے کی گھنی سیاہ بھویں اور طویل القامت شخص کی لال داڑھی کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

سیاہ بھویں والے شخص سے میری ملاقات بی بی سی آئی کی ٹرین میں اور لال داڑھی والے سے مارواڑ جنکشن پر ہوئی تھی۔ میں اجمیر سے مہو جانے والی ٹرین کے انٹر کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ بالعموم انٹر میں سفر کرنے والے کچھ اچھی پوزیشن کے لوگ نہیں ہوتے۔ نہ ہی اس میں سفر کرنے سے آرام ملتا ہے۔ کیونکہ نہ صوفے ہوتے ہیں اور نہ ہوا اور ٹھنڈے پانی کا انتظام۔ مگر مجبوری تھی جیب میں پیسے نہ ہوں تو سب تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ میرے درجے میں سب ہی مجھ سے کم حیثیت نظر آ رہے تھے

نصیر آباد کے اسٹیشن پر ایک شخص سوار ہوا۔ اس کی بھویں گھنی اور سیاہ تھیں۔ کپڑے کچھ زیادہ اجلے نہیں تھے وہ میرا ہموطن انگریز ہی تھا مگر اس کی رنگت قدرے سنولائی تھی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہندوستان میں کافی عرصہ سے ہے مجھے دیکھ کر وہ میرے پاس آ گیا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا معلوم ہوا وہ ہندوستان میں گھومتا پھر رہا ہے۔ یوں ہی۔ محض آوارہ گردی۔ بعض دفعہ اس کے پاس کھانے کو بھی پیسے نہیں رہتے۔ بقول اس کے اس وقت بھی اس کی جیب میں صرف آٹھ آنے تھے۔ اور اسے اپنے ایک ساتھی کو ٹیلی گرام بھیجنا تھا۔ پھر وہ میری طرف مخاطب ہوا۔

"کیوں نہ ہم کسی چھوٹے اسٹیشن پر اتر کر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر کو دھمکی دے کر تار بھجوائیں؟"

پھر خود ہی بولا" مگر مجھے یہ طریقہ پسند نہیں۔ خواہ مخواہ پولیس کو اپنے پیچھے لگانے سے کیا فائدہ۔ ہاں تم نے ابھی کہا تھا کہ تم کچھ دنوں میں واپس لوٹنے والے ہو!"

" میں چار روز بعد اسی ٹرین سے واپس ہوں گا" میں نے جواب دیا۔

" ایسا نہیں کر سکتے کہ بجائے چار روز کے تین روز میں لوٹو۔ میرا ساتھی ۲۳ تاریخ کو بمبئی کے لئے دہلی سے روانہ ہوگا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ۲۳ کی رات کو اجمیر اسٹیشن پر ہوگا۔ تم اس سے اسٹیشن پر مل سکتے ہو اور میرا پیغام پہنچا سکتے ہو"

میں نے کچھ دیر تذبذب کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے راجپوتانہ جانا ہے۔

" ٹھیک ہے" اس نے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ تمہیں جودھپور کے علاقہ میں داخل ہونے کے لئے مارواڑ جنکشن پر گاڑی بدلنی ہو گی۔ اور وہ بمبئی میل سے ۲۴ کی صبح کو مارواڑ پر پہنچے گا۔ تمہیں تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ بس صرف میرے چند لفظ اس تک پہنچا دو۔ اس سے کہنا۔ "وہ اس ہفتہ جنوب کی طرف گیا ہے"۔ وہ سمجھ جائے گا کہ میرا کیا مطلب ہے۔ اس کا قد کافی لمبا ہے اور اس کے داڑھی بھی ہے لال رنگ کی وہ تمہیں سیکنڈ کلاس میں سوتا ہوا ملے گا۔ وہ بالکل بے خبر سویا ہوا ہو گا۔ اسے اسباب کی بھی پروا نہیں رہتی۔ تم بلا جھجک اسے جگا دینا اور کہنا۔ "وہ اس ہفتہ جنوب کی طرف گیا ہے"۔ وہ تمہاری بات سنے گا اور پھر کروٹ لے کر سو جائے گا۔ تمہیں صرف ایک روز اپنے پروگرام سے قبل چلنا ہوگا۔ میں تمہارے لئے اجنبی ہوں۔ مگر تم میرا یہ کام ضرور کر دو۔ نہ صرف میرے ہموطن ہونے کی خاطر بلکہ میری ماں کی خاطر"

عموماً ہم انگریز ماں کے واسطہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے مگر اس میں کچھ بات ایسی تھی کہ میں انکار نہ کر سکا۔ اور اس کا پیغام پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔

وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر گیا اور اترتے اترتے اس نے پھر مجھے یاد دہانی کرائی "مارواڑ جنکشن۔ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ اور اس میں ایک لال داڑھی والا سوتا ہوا آدمی"

میں حسب وعدہ جلد ہی کام سے فارغ ہو کر تین روز کے بعد واپس مارواڑ جنکشن پر آ کر ٹھیرا۔ بمبئی میل مارواڑ پر زیادہ دیر نہیں ٹھیرتا۔ اس لئے جونہی ٹرین آئی میں نے جلدی سے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی کھڑکی میں سر ڈال کر اس عجیب شخص کی تلاش شروع کی۔ ڈبہ میں صرف ایک شخص سویا ہوا تھا۔ وہ اپنے آدھے جسم پر کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ میری طرف نہیں تھا مگر مجھے اس کی لال داڑھی فوراً نظر آ گئی۔ میں کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور اسے جھنجوڑا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا وہ کافی رعب دار اور وجیہ معلوم ہو رہا تھا۔ میرے دو تین مرتبہ جگانے پر وہ اٹھ بیٹھا۔ اور اٹھتے ہی بولا۔

" تم لوگ ٹکٹ کے لئے مسافروں کو کتنی مرتبہ تنگ کرتے ہو؟"

" نہیں" میں نے جواب دیا" میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ وہ اس ہفتہ جنوب کی طرف گیا ہے"

اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور میری طرف غور سے دیکھا پھر میرے الفاظ دہرائے" وہ اس ہفتہ جنوب کی طرف گیا ہے۔ ہونہہ! یہ اس کی پرانی عادت ہے" پھر بولا" کیا اس نے کہا تھا

کہ میں تمہیں کچھ دوں گا۔ نہیں نہیں میں کچھ نہیں دوں گا "

ٹرین کھسکنے لگی تھی۔ میں نے جواب دیا۔" اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا۔" اور جلدی سے ٹرین سے اتر گیا۔

اس وقت ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے سر پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کے احساس سے بڑی طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔

میں اس واقعہ کو بھول گیا تھا اور اب وہ دونوں عجیب و غریب شخص میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں انھیں پہچان گیا تھا مگر مجھے اس وقت نیند آ رہی تھی اس لئے میں نے انھیں ٹالنے کی غرض سے کہا۔ فرمایئے۔ کیا خدمت کروں ؟ "

" صرف آدھ گھنٹہ آپ سے بات کرنی ہے "۔ لال داڑھی والے شخص نے جواب دیا۔" مگر پہلے اپنے دفتر میں چل کر بیٹھئے اور کچھ پلایئے۔ دیکھئے! میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ ابھی ہمارا معاہدہ شروع نہیں ہوا۔ ہاں تو ہمیں دراصل آپ سے مشورہ لینا ہے ہمیں روپیہ پیسہ نہیں چاہئے " اس نے میرے چہرے پر ناگواری کے اثرات دیکھ لئے تھے۔

بہر حال میں انھیں لے کر دفتر میں داخل ہوا۔ دفتر کی دیواروں پر مختلف نقشے لٹکے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی وہ بولا " دیکھا میں نہ کہتا تھا۔ ہم بالکل ٹھیک جگہ پر آئے ہیں "۔ پھر وہ میری طرف مخاطب ہوا۔

" اچھا صاحب۔ اب میں سب سے پہلے تعارف کراؤں۔ برادر پیچی کرنہان۔ جی ہاں یہی اس کا نام ہے۔ اور بہادر ڈینیل ڈریوٹ جی ہاں۔ یہی میرا نام ہے۔ اور ہمارے کام کے متعلق نہ پوچھیں تو بہتر ہے اس لئے کہ کون سا کام ہے جو ہم نے نہیں کیا ہے فوج میں سپاہی، پریس میں کمپوزیٹر یا پروف ریڈر، سمندر میں ملاح خشکی پر کبھی فوٹو گرافر کبھی مجمع لگانے والے۔ اور کسی اخبار کو ضرورت ہوئی تو نامہ نگار۔ ہم دونوں ہی سنجیدہ طبیعت اور محنتی ہیں اور بہت کم پیتے ہیں۔ آپ ہمیں غور سے دیکھیں تو

الشجاع

آپ کو ہماری باتوں کا یقین آ جائے گا۔ میں ایک سگار لے لوں " پھر اس نے بے تکلفی سے میرے سگار کیس میں سے ایک سگار نکال کر سلگا لیا۔

میں ان دونوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہی صحیح صحیح الدماغ تھے۔ میرا شبہ غلط نکلا۔ میں نے انھیں نیم گرم وہسکی کا ایک ایک گلاس دیا جو وہ بڑے اطمینان سے پینے لگے۔

" بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک "۔ پھر سیاہ بھووں والا شخص جس کا نام کرنہان تھا۔ بولا۔" اب مجھے بولنے دو ڈیں! جناب ہم پورے ہندوستان میں گھومتے پھرے ہیں۔ اور ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ کم از کم ہم جیسوں کے لئے ہندوستان کوئی بڑا ملک نہیں۔ ہم نے یہاں کام بھی ہر قسم کا کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹھیکے بھی لئے ہیں۔ بوائلر فٹر اور انجن ڈرائیور بھی رہے ہیں۔ مگر اب ہم بادشاہ بننا چاہتے ہیں "۔ میں مسکرایا مگر چپ چاپ سنتا رہا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔" ہم معمولی آدمی نہیں ہم نے دنیا دیکھی ہے اور ہمیں کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ سوائے شراب کے۔ اور ہم نے اپنے معاہدہ میں اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ کیوں ڈین؟"

" ٹھیک ہے! ہمیں بادشاہ بننے کے لئے اسے چھوڑنا ہی پڑے گا " ڈینیل ڈریوٹ نے تائید کی۔

" میرا خیال ہے آپ لوگ اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کریں اور اس وقت گرمی کافی ہے۔ کل کسی ٹھنڈے وقت آ کر مجھ سے جو مشورہ چاہیں لیں۔" میں نے انھیں رخصت کرنا چاہا۔

" آپ کا خیال ہے ہم پر گرمی یا شراب کا اثر ہے "۔ ڈریوٹ بولا۔" ہم نے اپنے منصوبہ پر چھ ماہ یعنی نصف سال تک غور کیا ہے اور اس کے بعد بادشاہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ اپنی مملکت کے لئے ہم نے جو علاقہ طے کیا ہے امید ہے آپ کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہوگا کافرستان! جی ہاں اس علاقہ کا یہی نام ہے۔ ہم نے حساب لگایا ہے کہ پشاور سے تین سو میل سے زیادہ دور نہیں ہے اور افغانستان کے انتہائی شمال میں دائیں کونے پر ہے۔ وہاں کے لوگ بت پرست ہیں ان کے بتیس بت ہیں اور ہم تینتیسویں اور چونتیسویں ہوں گے وہ بہت پر فضا پہاڑی علاقہ ہے اور اس علاقہ کی عورتیں بھی

خوبصورت ہوتی ہے۔"

"ڈینیل ڈریوٹ تم پھر بھول گئے کہ ہمارے معاہدہ میں یہ درج ہے۔" پیچی کرنہاں نے ٹوکا۔ "عورت اور شراب۔ دونوں سے مکمل اجتناب!"

"بس ہم کو اتنا ہی معلوم ہے۔" ڈین نے پیچی کے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب تک وہاں کوئی نہیں گیا ہے۔ وہ لوگ جنگجو اور سپاہیانہ طبیعت کے ہیں اور ہمارا خیال ہے کوئی اچھا فوجی سالار آسانی سے ان کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ وہاں کسی قبیلہ کے سردار سے ملیں گے اور اس سے پوچھیں گے کہ تم اپنے کسی دشمن پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہو۔ سردار پر ہم اپنی فوجی قابلیت کا مظاہرہ کریں گے اور پھر اس کے آدمیوں کو فوجی تربیت دیں گے۔ ہم نے جتنے بھی کام کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ اسی کام میں مہارت حاصل کی ہے۔ پھر ہم اس کے دشمن سردار سے لڑکر اسے مغلوب کریں گے۔ اس کا تخت و تاج ہمارا ہوگا اور ایک نئی سلطنت وجود میں آجائے گی۔"

"ان سب باتوں سے پہلے تمہارا وجود ہی نہیں ہوگا۔" میں ان کی حماقت پر ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔ "سرحد سے صرف پچاس میل کے اندر ہی تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ تمہارا سارا راستہ اونچے اونچے پہاڑوں اور گلیشروں سے گھرا ہوا ہے۔ اور کسی انگریز کو وہاں جانے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔ قبائلی لوگ بالکل وحشی ہوتے ہیں۔ تم اگر وہاں پہنچ بھی گئے تو کرکچھ نہ پاؤگے۔"

"تم ہمیں کیا سمجھ رہے ہو۔ خیر تم کچھ بھی سمجھو مگر ہم تمہارے پاس صرف اس علاقہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے آتے ہیں۔ کوئی کتاب ہو، نقشہ ہو یا تمہیں اور کچھ معلوم ہو۔" کرنہان نے جواب دیا اور وہ نقشہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا تم بالکل سنجیدگی سے اس پر آمادہ ہو؟" میں نے پھر پوچھا

"بالکل!" ڈریوٹ بولا۔ "اب تم ہمیں کوئی کتاب دو۔"

میں نے انسائیکلوپیڈیا کی مروّجہ کسی جلد کا وہ صفحہ نکالا جس میں کافرستان کا حال تھا اور اس کے سامنے کتاب رکھ دی۔ کرنہان کو انتشار

میں نے ایک بڑا ۳۲ میل بحساب فی انچ کا نقشہ اور دو چھوٹے سرحد کے نقشے نکال کر دے دیئے۔

"یہ دیکھو!" کرنہان نے نقشہ پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا جگدالک۔ یہاں تک تو میں اور ڈریوٹ راستہ جانتے ہیں۔ ہم رابرٹ آرمی کے ساتھ جا چکے ہیں۔ جگدالک سے ہمیں اس علاقہ میں جانے کے لئے دائیں طرف مڑنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم چودہ پندرہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں کے درمیان ہوں گے۔ یہاں سخت سردی ہوگی اور راستے انتہائی پیچیدہ ہیں۔ مگر ہم کو ان سب باتوں کی پروا نہیں ہے۔

ڈریوٹ انسائیکلوپیڈیا میں غرق تھا۔ کچھ دیر بعد بولا "وہاں مختلف قبائل آباد ہیں۔ ہمیں ان کے نام یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہاں قبیلے کافی تعداد میں ہیں۔ اور جتنے چھوٹے اور زیادہ قبیلے ہوں ہمارے حق میں بہتر ہے۔ جگدالک سے آسٹنگ تک۔ ہوں!" اور وہ پھر کتاب پر جھک گیا۔

"مگر یہ تمام معلومات ناکافی ہیں اور ان کی صحت پر بھی کچھ زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "دراصل مکمل طور پر کافرستان کے متعلق کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ دیکھو یونائیٹڈ سروس انسٹی ٹیوٹ کے فائل میں بیلو لکھتا ہے..."

"بیلو کو گولی مارو۔" ڈریوٹ بولا۔ "یہ دیکھو یہ کیا لکھا ہے کہ ان کی نسل ہم انگریزوں کی نسل سے جا ملتی ہے۔" پھر وہ بڑی نرمی سے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس وقت چار بجے ہیں۔ دو گھنٹہ بعد صبح ہو جائے گی۔ آپ چاہیں تو جا کر سو سکتے ہیں۔ ہم چھ بجے سے پہلے چلے جائیں گے۔ ہم پر اعتبار کیجئے ہم آپ کا ایک کاغذ بھی نہیں چرائیں گے۔ ہم تو بس دو بے ضرر پاگل ہیں۔ کل شام کو آپ سرائے میں آجائیں وہاں ہم آپ کو خدا حافظ کہہ کر اپنے مشن پر روانہ ہو جائیں گے۔"

"پاگل نہیں لیکن احمق ضرور ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "تم سرحد سے آگے ہی نہیں بڑھنے پاؤ گے۔ اور آگے بڑھ بھی گئے تو [illegible] افغانستان کے علاقہ میں قدم رکھا وہ لوگ تمہیں [illegible] بھی [illegible]

زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں کچھ مدد چاہیئے۔ اور اگر تم ایک ہفتہ ٹھہرو تو میں تمہیں سرحد کے گورنر کے نام سفارشی خط بھی دے سکتا ہوں۔"

"اگلے ہفتہ تو ہم اُن پہاڑوں میں سفر کر رہے ہوں گے۔"
ڈریوٹ بولا "ہمیں فوراً ہی روانہ ہونا ہے کیونکہ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ دراصل بادشاہ بننا کچھ آسان نہیں ہے۔ جب ہم اپنی سلطنت قائم کر لیں گے تو ہم تمہیں اطلاع دے دیں گے اور تم آکر حکومت میں ہماری مدد کرنا۔"

"جی ہاں۔ اور آپ ہی سوچیئے کہ کیا کوئی پاگل یا احمق ایسا معاہدہ تیار کرے گا؟" کارنیہان نے اپنی جیب سے ایک میلا سا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ یہ ایک خاکی رنگ کا فل اسکیپ سے نصف سائز کا کاغذ تھا جس پر درج ذیل کی عبارت تھی۔

یہ معاہدہ میرے اور تمہارے درمیان طے پاتا ہے۔ اور شاہد اس کا خدا ہے۔ آمین!

(۱) میں اور تم اس معاملہ کو مشترکہ انجام دیں گے۔ یعنی کافرستان کی بادشاہت۔

(۲) تم اور میں شراب اور عورت کی طرف بالکل نہیں دیکھیں گے۔ عورت خواہ سیاہ رنگ ہو سفید فام ہو یا گندمی رنگ۔ شراب خواہ تیز ہو یا ہلکی ہم ان سے مکمل احتراز کریں گے تاکہ ہمارے مقصد کو نقصان نہ پہنچے۔

(۳) ہم دونوں ایک دوسرے کی عزت کریں گے اور آپس میں مساویانہ سلوک کریں گے اور اگر ہم میں سے کوئی ایک مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو دوسرا اس کا ساتھ دے گا اور اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

آج میرے اور تمہارے دستخط اس پر ثبت ہوتے ہیں۔

پیچی ٹیلیافیرو کارنیہان

ڈینیل ڈریوٹ

دو شریف، آزاد افراد۔

اس معاہدے پر چھ ماہ قبل کی تاریخ درج تھی۔

"دراصل معاہدہ کی تیسری دفعہ کی ضرورت نہیں تھی" کارنیہان بولا "مگر اس سے ذرا باقاعدگی معلوم ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم آوارہ ہیں یا پاگل ہیں یا احمق۔ کیا ان میں سے کوئی بھی اس قسم کا معاہدہ کر سکتا ہے۔ ہم نے زندگی کی ان دو نعمتوں سے اجتناب کرنے کا عہد کیا ہے جن سے زندگی بنتی ہے۔ اور ایسا عہد وہی کر سکتا ہے جس کے مقصد میں خلوص ہو۔"

اس وقت وہ تعلیم یافتہ اشخاص کی طرح گفتگو کر رہے تھے اور میں ان کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر بھی میں نے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ "یہ خطرناک منصوبہ تم نے بنایا ہے وہ تمہیں جلد ہی زندگی کی تمام نعمتوں سے محروم کر دے گا۔ بہرحال میری طرف سے تمہیں اجازت ہے تم دفتر میں صبح آٹھ بجے تک ٹھہر سکتے ہو۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور آپ کل سرائے آنا نہ بھولئے گا۔" دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے ڈینیل کی آواز سنی۔

اگلے دن سہ پہر کو میں کمارسینا سرائے پہنچ گیا تاکہ اپنے ان اجنبی دوستوں کو خدا حافظ کہہ دوں جو کافرستان کی بادشاہت کے خبط میں روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ خاصی پر رونق سرائے تھی۔ یہاں وسط ایشیا کے اکثر قبائل کے لوگوں سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ بلخ اور بخارا والے یہ لوگ قیمتی پتھر، مشک، ایرانی بلیاں، بڑی بڑی چکیتوں والے دنبے اور چاق و چوبند خچر لے کر آتے تھے اور یہاں بنگال اور بمبئی کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔

میں نے سرائے میں اپنے دوستوں کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں دکھائی دیئے۔ مجھے خیال گزرا کہ وہ شاید کہیں نشے میں دھت پڑے ہوں گے۔ میں انھیں دیکھنے آگے بڑھا کہ اتنے میں ایک طرف ایک مجمع دکھائی دیا۔ لوگ ایک شخص کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

خوبصورت ہوتی ہیں۔"

" ڈینیل ڈریوٹ تم پھر بھول گئے کہ ہمارے معاہدہ میں یہ درج ہے۔" پیچی کرنیہان نے ٹوکا۔" عورت اور شراب۔ دونوں سے مکمل اجتناب!"

" بس ہم کو اتنا ہی معلوم ہے؟" ڈینی نے پیچی کے الفاظ کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی"۔ اب تک وہاں کوئی نہیں گیا ہے۔ وہ لوگ جنگجو اور سپاہیانہ طبیعت کے ہیں اور ہمارا خیال ہے کوئی اچھا فوجی سالار آسانی سے ان کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ وہاں کسی قبیلہ کے سردار سے ملیں گے اور اس سے پوچھیں گے کہ تم اپنے کسی دشمن پر فتح حاصل کرنا چاہتے ہو۔ سردار پر ہم اپنی فوجی قابلیت کا مظاہرہ کریں گے اور پھر اس کے آدمیوں کو فوجی تربیت دیں گے۔ ہم نے جتنے بھی کام کئے ہیں ان میں سب سے زیادہ اسی کام میں مہارت حاصل کی ہے۔ پھر ہم اس کے دشمن سردار سے لڑ کر اسے مغلوب کریں گے۔ اس کا تخت و تاج ہمارا ہوگا اور ایک نئی سلطنت وجود میں آجائے گی۔"

" ان سب باتوں سے پہلے تمہارا وجود ہی نہیں ہوگا۔" میں ان کی حماقت پر ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔" سرحد سے صرف پچاس میل کے اندر ہی تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ تمہارا سارا راستہ اونچے اونچے پہاڑوں اور گلیشیروں سے گھرا ہوا ہے۔ اور کسی انگریز کو وہاں جانے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔ قبائلی لوگ بالکل وحشی ہوتے ہیں۔ تم اگر وہاں پہنچ بھی گئے تو کچھ نہ پاؤ گے۔"

" تم ہمیں کیا سمجھ رہے ہو۔ خیر تم کچھ بھی سمجھو مگر ہم تمہارے پاس صرف اس علاقے کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔ کوئی کتاب ہو، نقشہ ہو یا تمہیں اور کچھ معلوم ہو۔" کرنیہان نے جواب دیا اور وہ نقشہ کی طرف دیکھنے لگا۔

" کیا تم بالکل سنجیدگی سے اس پر آمادہ ہو؟" میں نے پھر پوچھا

" بالکل!" ڈریوٹ بولا۔" اب تم ہمیں کوئی کتاب دو۔"

میں نے انسائیکلوپیڈیا کی موٹی سی جلد کا وہ صفحہ نکالا جس میں کافرستان کا حال تھا اور اس کے سامنے کتاب رکھ دی۔ کرنیہان کو اشتیاق

میں نے ایک بڑا ۳۲ میل بحساب فی انچ کا نقشہ اور دو چھوٹے سرحد کے نقشے نکال کر دے دیئے۔

" یہ دیکھو!" کرنیہان نے نقشہ پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔" یہ رہا جگدالک۔ یہاں تک تو میں اور ڈریوٹ راستہ جانتے ہیں۔ ہم رابرٹ آرمی کے ساتھ جا چکے ہیں۔ جگدالک سے ہمیں اس علاقہ میں جانے کے لئے دائیں طرف مڑنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم چودہ پندرہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں کے درمیان ہوں گے۔ یہاں سخت سردی ہوگی اور راستے انتہائی پیچیدہ ہیں۔ مگر ہم کو ان سب باتوں کی پروا نہیں ہے۔"

ڈریوٹ انسائیکلوپیڈیا میں غرق تھا۔ کچھ دیر بعد بولا" وہاں مختلف قبائل آباد ہیں۔ ہمیں ان کے نام یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ وہاں قبیلے کافی تعداد میں ہیں۔ اور جتنے چھوٹے اور زیادہ قبیلے ہوں ہمارے حق میں بہتر ہے۔ جگدالک سے آشنگ تک۔ ہوں!" اور وہ پھر کتاب پر جھک گیا۔

" مگر یہ تمام معلومات ناکافی ہیں اور ان کی صحت پر بھی کچھ زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔" دراصل مکمل طور پر کافرستان کے متعلق کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یہ دیکھو یونائیٹڈ سروس انسٹی ٹیوٹ کے فائل میں بیلو لکھتا ہے..."

" بیلو کو گولی مارو۔" ڈریوٹ بولا۔" یہ دیکھو یہ کیا لکھا ہے کہ ان کی نسل ہم انگریزوں کی نسل سے جا ملتی ہے"۔ پھر وہ بڑی نرمی سے مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس وقت چار بجے ہیں۔ دو گھنٹے بعد صبح ہو جائے گی۔ آپ چاہیں تو جا کر سو سکتے ہیں۔ ہم چھ بجے سے پہلے چلے جائیں گے۔ ہم پر اعتبار کیجئے ہم آپ کا ایک کاغذ بھی نہیں چرائیں گے۔ ہم تو بس دو بے ضرر پاگل ہیں۔ کل شام کو آپ سرائے میں آجائیں وہاں ہم آپ کو خدا حافظ کہہ کر اپنے مشن پر روانہ ہو جائیں گے۔"

" پاگل نہیں تو احمق ضرور ہو۔" میں نے جواب دیا۔" تم سرحد سے آگے ہی نہیں بڑھنے پاؤ گے۔ اور آگے بڑھے تو پیچھے ہی افغانستان کے علاقہ میں قدم رکھا وہ لوگ تمہیں ایک منٹ بھی [illegible] مہلت نہیں

نہ تم کہیں پھوٹے نہیں گے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں کچھ مدد چاہیے۔ اور اگر تم ایک ہفتہ ٹھہر و تو میں تمہیں سرحد کے گورنر کے نام سفارشی خط بھی دے سکتا ہوں۔"

"اگلے ہفتہ تو ہم اُن پہاڑوں میں سفر کر رہے ہوں گے۔" ڈریوٹ بولا۔ "ہمیں فوراً ہی روانہ ہونا ہے کیونکہ ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ دراصل بادشاہ بننا کچھ آسان نہیں ہے۔ جب ہم اپنی سلطنت قائم کریں گے تو ہم تمہیں اطلاع دے دیں گے اور تم آکر حکومت میں ہماری مدد کرنا۔"

"جی ہاں۔ اور آپ ہی سوچیئے کہ کیا کوئی پاگل یا احمق ایسا معاہدہ تیار کرے گا؟" کارنیہان نے اپنی جیب سے ایک میلا سا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ یہ ایک خاکی رنگ کا فل اسکیپ سے نصف سائز کا کاغذ تھا جس پر درج ذیل الوکھی عبارت تھی۔

یہ معاہدہ میرے اور تمہارے درمیان طے پاتا ہے۔ اور شاہد اس کا خدا ہے۔ آمین!

(۱) میں اور تم اس معاملہ کو مشترکہ انجام دیں گے۔ یعنی کافرستان کی بادشاہت۔

(۲) تم اور میں شراب اور عورت کی طرف بالکل نہیں دیکھیں گے۔ عورت خواہ سیاہ رنگ ہو سفید فام ہو یا گندمی رنگ۔ شراب خواہ تیز ہو یا ہلکی ہم ان سے مکمل احتراز کریں گے تاکہ ہمارے مقصد کو نقصان نہ پہنچے۔

(۳) ہم دونوں ایک دوسرے کی عزت کریں گے اور آپس میں مساویانہ سلوک کریں گے اور اگر ہم میں سے کوئی ایک مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو دوسرا اس کا ساتھ دے گا اور اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

آج میرے اور تمہارے دستخط اس پر ثبت ہوتے ہیں۔

پیچی ٹیلیا فیر کارنیہان

ڈینیل ڈریوٹ

دو شریف، آزاد افراد۔

اس معاہدہ پر چھ ماہ قبل کی تاریخ درج تھی۔

"دراصل معاہدہ کی تیسری دفعہ کی ضرورت نہیں تھی۔" کارنیہان بولا۔ "مگر اس سے ذرا باقاعدگی معلوم ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم آوارہ ہیں، پاگل ہیں یا احمق۔ کیا ان میں سے کوئی بھی اس قسم کا معاہدہ کر سکتا ہے۔ ہم نے زندگی کی ان دو نعمتوں سے اجتناب کرنے کا عہد کیا ہے جن سے . زندگی بنتی ہے۔ اور ایسا عہد وہی کر سکتا ہے جس کے مقصد میں خلوص ہو۔"

اس وقت وہ تعلیم یافتہ اشخاص کی طرح گفتگو کر رہے تھے اور میں ان کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر بھی میں نے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ "جو خطرناک منصوبہ تم نے بنایا ہے وہ تمہیں جلد ہی زندگی کی تمام نعمتوں سے محروم کر دے گا۔ بہر حال میری طرف سے تمہیں اجازت ہے تم دفتر میں صبح آٹھ بجے تک بیٹھ سکتے ہو۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور آپ کل سرائے آنا نہ بھولیے گا۔" دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے ڈینیل کی آواز سنی۔

اگلے دن سہ پہر کو میں کمہار سینا سرائے پہنچ گیا تاکہ اپنے ان اجنبی دوستوں کو خدا حافظ کہہ دوں جو کافرستان کی بادشاہت کے خبط میں روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ خاصی پر رونق سرائے تھی۔ یہاں وسط ایشیا کے اکثر قبائل کے لوگوں سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ بلخ اور بخارا سے یہ لوگ قیمتی پتھر، مشک، ایرانی بلیاں، بڑی بڑی چکیتیوں والے دنبے اور چاقو، چھریاں، خنجر لے کر آتے تھے اور یہاں بنگال اور بمبئی کے تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔

میں نے سرائے میں اپنے دوستوں کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں دکھائی دیئے۔ مجھے خیال گزرا کہ وہ شاید کہیں نشے میں دُھت پڑے ہوں گے۔ میں انھیں دیکھنے آگے بڑھا کہ اتنے میں ایک طرف ایک مجمع دکھائی دیا۔ لوگ ایک شخص کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

پھر مجھے پر معلوم ہوا کہ وہ شخص جس کے بدن پر فقیروں کے کپڑے ہیں صبح اس سرائے میں آیا ہے اور کہتا ہے کہ میں امیر کابل سے ملنے جا رہا ہوں تاکہ اسے تحفہ دوں۔ اور وہ تحفہ کیا ہے مٹی کے بدھ ڈول کھلونوں کا ایک ڈھیر جو اس کا نوکر ایک ٹوکرے میں لئے پاس ہی کھڑا تھا۔ ایک گھوڑے کا سوداگر کہنے لگا۔

"یقیناً اس کے دماغ میں خبط ہے اور یا تو وہاں جا کر اپنا سر کٹوائے گا اور یا دولت سے مالا مال ہو کر آئے گا" ایک اُزبک سردار ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہنے لگا "نہیں صاحب۔ یہ تو بڑے پہنچے ہوئے پیر معلوم ہوتے ہیں۔ ابھی وہ بڑی عجیب عجیب پیشین گوئیاں کر رہے تھے" ایک یوسف زئی سردار جس کا سازوسامان راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا۔ حسرت سے بولا "کاش یہ راستے میں میرے ساتھ ہوتے اور مجھے اس ڈاکو کے متعلق پہلے ہی بتا دیتے" پھر وہ اس فقیر کی طرف مخاطب ہوا "پیر صاحب۔ آپ کدھر سے تشریف لائے ہیں۔ اور کہاں کا قصد ہے ؟"

"ہم روم سے آتے ہیں، روم سے"۔ اس فقیر کا لہجہ بڑا دبنگ تھا۔ "سمندر میں طوفان آتے ہوتے ہیں! چوروں پر ڈاکوؤں پر۔ غداروں پر پیر جی کی لعنت ہو! کون خدا کے ایک بندے کو شمال کی طرف لے جائے گا۔ جہاں وہ امیر کابل کو نادر تحفے دے گا۔ کون ہمیں اپنے قافلہ میں شامل کرے گا۔ اس کا قافلہ تمام آسمانی بلاؤں سے محفوظ رہے گا۔ اس کے اونٹ کبھی نہیں تھکیں گے۔ اس کے بیٹے کبھی بیمار نہیں ہوں گے۔ اس کی بیویاں اس کی غیر حاضری میں وفادار رہیں گی۔ پیر جی اس کی مدد کرے گا۔"

"حضرت صاحب! آٹھ روز میں میرا قافلہ پشاور سے کابل جائے گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں" یوسف زئی سردار بولا۔

"نہیں۔ ہم آج ہی جائیں گے" پیر صاحب گرجے۔ "ہم اکیلے ہی اپنے اونٹوں پر روانہ ہو جائیں گے"

"میر خاں!" اس نے چلا کر اپنے نوکر کو آواز دی جو اس سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ "دونوں بدھے اونٹوں پر لاد دو اور روانہ ہو جاؤ" پھر وہ دونوں اونٹوں پر سوار ہو کر چل دیئے

ذرا سی دور جا کر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور زور سے بولا۔ "صاحب۔ تم آؤ اور ہمارے ساتھ سڑک تک چلو، ہم تمہیں ایک نادر تحفہ دیں گے۔ ایک تعویذ جو تمہیں کافرستان کی بادشاہت بخشے گا" لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔ میرے دماغ میں ایک بجلی سی کوندی۔ اور میں چپ چاپ ان کے پیچھے ہو لیا۔

سڑک پر قریباً ایک فرلانگ تک ہم چپ چاپ چلتے رہے وہ دونوں اونٹوں پر سوار تھے اور میں ان کے پیچھے پیدل۔ سڑک پر کوئی آمد و رفت نہیں تھی۔ تمام گہما گہمی سرائے تک محدود تھی۔

ڈریوٹ نے اپنا اونٹ روکا اور میری طرف مخاطب ہو کر انگریزی میں بولا۔ "کیا خیال ہے صاحب اس روپ کے متعلق آپ کا۔" ایک لمحہ رک کر پھر وہ بولا۔ "کارنیہان کا لہجہ اتنا صاف نہیں ہے وہ زیادہ اچھی طرح نہیں بول سکتا۔ اس لئے میں نے اسے اپنا نوکر بنا لیا ہے۔ اور وہ بڑا کامیاب نوکر ثابت ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اس حصۂ ملک میں چودہ سال رہا ہوں اسلئے ان کی زبان۔ ان کی رسمیں۔ ان کے لباس، سب سے بخوبی واقف ہوں۔ اب ہم سیدھے پشاور جا رہے ہیں۔ ایک دن میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے جگدالک۔ جگدالک سے ہمیں کافرستان جانے کے لئے اونٹوں کی بجائے گدھوں کی ضرورت ہو گی۔ اور آپ ذرا ان بوروں کو تو ٹٹولئے۔ امیر کابل کے لئے مٹی کے کھلونوں کا تحفہ!" اور پھر خود ہی زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ کارنیہان نے بھی ساتھ دیا۔ میں انھیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا "یہ سب کارتوس ہیں۔ ان بوروں میں مٹی کے کھلونوں کے ساتھ اسلحہ بھرا ہوا ہے"

"ارے!" میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "اور اگر ان سب کے ساتھ تم پکڑے جاؤ۔ تو جانتے ہو تمہارا کیا حشر ہو گا۔ پٹھانوں کے لئے کارتوس چاندی سے بڑھ کر ہے"

"پندرہ سو روپے کا سرمایہ ان میں لگا ہوا ہے" ڈریوٹ نے جواب دیا۔ "ہم نے ایک ایک روپیہ کر کے جوڑا ہے۔ مگر ہم پکڑے نہیں جائیں گے۔ ہم تنہا نہیں ہوں گے۔ نجبرے جو

قافلہ گزرے گا ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ اور ایک پاگل فقیر کی تلاشی کون لے گا۔"

"کیا تم نے اور سب سامان لے لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ابھی نہیں۔ وہ بھی آگے جا کر لے لیں گے۔ اچھا آپ نے ہمارے ساتھ دو مرتبہ احسان کیا ہے۔ ایک کل اور دوسرے مارواڑ جنکشن پر۔ اب ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمیں اپنی کوئی یادگار دیں۔ ہم بادشاہ بن گئے تو آپ کے احسانوں کو یاد رکھیں گے اور ہماری سلطنت کے ایک حصہ کے آپ حق دار ہوں گے"

میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی مگر میں ان کے خلوص مقصد اور ان کی ہمت سے بہت متاثر تھا۔ میں نے چپ چاپ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی خوبصورت اور قیمتی قطب نما۔ جو اس وقت میرے پاس تھی۔ نکال کر انھیں دے دی۔

"اچھا خدا حافظ!" ڈریوٹ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "آخری مرتبہ میں ایک اپنے ہم وطن انگریز شخص سے ہاتھ ملا رہا ہوں نہ معلوم پھر کب ایسا موقعہ آتے۔ پیچی تم بھی ہاتھ ملاؤ"

"خدا حافظ ہمارے محسن!" پیچی کارنیہان نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ" میں نے جواب دیا۔ خدا تمہاری مدد کرے"

ان کے اونٹ کچھ دیر تک نظر آتے رہے۔ میں وہیں کھڑا ان عجیب و غریب ہستیوں کے متعلق سوچتا رہا۔ میں دل ہی دل میں ان کے کامیاب بھیس کی داد دے رہا تھا۔

اب ان پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور سرائے میں میں نے جو منظر دیکھا تھا اس کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ افغانستان میں تو وہ آنا دانہ بغیر پہچانے ہوئے جہاں چاہے گھوم سکتے تھے۔ مگر اس کے بعد ان کی موت یقینی تھی۔ ایک خوفناک موت!

دس روز بعد پشاور سے ایک شخص میرے نام ایک خط لایا۔ اس میں لکھا تھا کہ راستے میں وہ مختلف جھڑپوں سے گزرے

الشجاع

اور ہر جگہ ان کا مذاق اڑایا گیا ان نوادرات کی وجہ سے جو وہ امیر کابل کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ مگر اسی وجہ سے وہ ہر جھڑپ سے محفوظ و مامون گزرتے رہے۔ انھیں ایک قافلہ مل گیا ہے جو ایک دو روز بعد روانہ ہو جائے گا قافلے والوں کے لئے وہ باعث تفریح بنے ہوئے ہیں۔ اور قافلے والے بہت خوش ہیں کہ ان کے قافلہ میں ایک پیر شامل ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہاں کے لوگ بہت وہمی ہوتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ایک پیر کی شرکت قافلہ والوں کے لئے باعث خیر و برکت ہو گی۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک وہ افغانستان پہنچ چکے ہوں گے۔ میں سوچنے لگا۔ ان کا مشاہدہ اور ان کی معلومات حیرت انگیز حد تک مکمل تھیں۔

میں نے سوچا میں اس رات سوتے وقت ان کے لئے دعا کروں گا۔ مگر اسی رات یورپ کا ایک جلیل القدر بادشاہ مر گیا اور میں اپنی اخباری مصروفیات کے باعث دعا نہ کر سکا اور نہ ان کے لئے دعا کر سکا! (باقی اگلے شمارے میں)

• • •

خوش نصیبی

سمرسٹ مام کی کتابوں کی رائلٹی کی کافی بڑی رقم اسپین میں جمع ہو گئی تھی۔ مگر اسپین کا قانون یہ ہے کہ رائلٹی کے پیسے ملک کے باہر نہیں لے جا سکتے۔ اس لئے سمرسٹ مام اسپین پہنچ تاکہ وہیں اس رقم کا مصرف لے سکیں۔ وہ وہاں کے سب سے خرچیلے اور مہنگے ہوٹل میں ٹھہرے اور کھلے ہاتھوں خوب خرچ کیا جب انھیں محسوس ہوا کہ اب رائلٹی کا زیادہ حصہ خرچ ہو چکا ہے تو انھوں نے روانہ ہونے کی سوچی اور ہوٹل کے منیجر سے بل مانگا منیجر نے جواب دیا مسٹر آپ جیسا قابل اور مشہور شخص آکر ہمارے ہوٹل میں ٹھہرے یہ ہمارے لئے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے آپ کے قیام سے ہماری بڑی پبلسٹی ہوئی ہے اس لئے آپ کا بل کچھ بھی نہیں ہے۔

ناقابلِ فراموش

فیلڈ مارشل منٹگمری کی ڈائری کے چند اوراق

تلخیص و ترجمہ:- اختر ملیح آبادی

العلمین ۱۹۴۲ء جنرل رومل کی شکست

★ — میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ جنگ محض افواج اور اسلحہ سے نہیں جیتی جاتی بلکہ بہترین جنگی پلان کے تحت ایک آدمی کی نگرانی میں اگر جنگ لڑی جائے تب کامیابی یقینی ہے بشرطیکہ اعلیٰ لیڈرشپ فوج کو ملے اور فوج اعلیٰ تربیت یافتہ بھی ہو۔

جنگ عظیم دوئم کے تاریک دن تھے — !

پانچ اگست ۱۹۴۲ء کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل ماسکو جاتے ہوئے قاہرہ پہنچے۔ مشرق وسطیٰ کے کمانڈر انچیف جنرل آکنلیک اس روز اتحادی جنرل ہیڈ کوارٹر قاہرہ میں ہونے کے بجائے اندرون صحرائے اعظم میں آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر پہ تھے کیونکہ جنرل آکنلیک نے کمانڈر انچیف کے عہدے کے ساتھ ہی آٹھویں برطانوی فوج کی کمان بھی سنبھال رکھی تھی لہٰذا برطانوی وزیر اعظم قاہرہ بذریعہ طیارہ پہنچے اور فوراً ہی بذریعہ کار جنرل آکنلیک سے ملنے کے لئے آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گئے۔ ان کے ہمراہ چیف آف جنرل اسٹاف جنرل بروک بھی تھے۔ برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل کے آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹرس پہنچتے ہی مشاورتی میٹنگ ہوئی۔ جنرل آکنلیک کو مشورہ دیا گیا کہ وہ بیک وقت دو ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ وہ قاہرہ چلے جائیں۔ اور کمانڈر انچیف کی عظیم ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ جنرل آکنلیک نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل صحرا سے قاہرہ آئے یہاں فیلڈ مارشل جنرل اسمٹ موجود تھے۔ ان سے انھوں نے مشورہ کیا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ جنرل آکنلیک کو ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے اور جنرل الیگزنڈر کو مشرق وسطیٰ کا کمانڈر انچیف بنا دیا جائے۔ اور مجھے (فیلڈ مارشل جنرل مونٹ گمری) کو لندن سے بلا کر صحرا میں جنرل رومل کے مقابلے پر آٹھویں فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا جائے۔

دوسرے دن یعنی ۶ اگست ۱۹۴۲ء کو مسٹر چرچل نے وزارت جنگ لندن جو تار روانہ کیا وہ یوں تھا۔

"مشرق وسطیٰ کے حالات کو بچشم دیکھنے اور مشورے کے بعد عراق اور ایران کو مشرق وسطیٰ سے علیحدہ کرنا ضروری ہے۔ مشرق وسطیٰ کی کمان جنرل آکنلیک کے بجائے جنرل الگزنڈر کو سونپنا مفید ہے نیز آٹھویں فوج کی کمان مونٹ گمری کے حوالے کرنا طے ہوا ہے۔"

بعد میں مجھے علم ہوا کہ قاہرہ میں پانچ اگست کو جو مشورے ہوتے اور تبدیلیاں کی گئی تھیں ان میں میرا نام سرفہرست نہ تھا۔ بلکہ آٹھویں فوج کی کمان جنرل گوٹ کے سپرد کرنا طے ہوا تھا۔ کیونکہ جنرل گوٹ مشرق وسطیٰ میں بہت ہردلعزیز اور صحرائی جنگ کے ماہر تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ اس فیصلے کے دوسرے دن یعنی ۷ اگست کو جنرل گوٹ طیارہ کے حادثے میں ہلاک ہو گئے لہٰذا دوسرا نام میرا تجویز ہوا اور منظور ہوا۔

۸ اگست کو جو فیصلے قاہرہ میں ہوئے تھے ان پر عمل درآمد ہوا۔ وزیر اعظم

برطانیہ نے سکندر شی کا خط بریگیڈیر جیکب کے ذریعہ صحرائے اعظم میں آٹھویں فوج کے ہیڈکوارٹرس جنرل آکنلیک کو بھجوا دیا ۹ اگست کو جنرل الیگزنڈر قاہرہ پہنچ گئے۔

۸ اگست کو وزارت جنگ سے مجھے یہ حکم ملا "فوراً لندن چلے آؤ۔ جنرل الیگزنڈر قاہرہ کمانڈر انچیف کی ذمہ داری سنبھالنے جا رہے ہیں لہٰذا ان کی جگہ پہلی فوج کی کمان تمہیں سنبھالنی ہے۔" مجھے معلوم تھا کہ پہلی برطانوی فوج امریکی کمانڈر جنرل آئزن ہوور کے ساتھ مل کر مغربی افریقہ پر نومبر ۴۲ء میں لشکر کشی کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اب الیگزنڈر قاہرہ جا چکے تھے لہٰذا ان کی جگہ اب مجھے امریکی کمانڈر جنرل آئزن ہوور کی ماتحتی میں کام کرنا تھا۔ فون پر مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک بریگیڈیر حملہ تصویریں دکھلائے گا۔ لہٰذا اس حکم کے بعد میں لندن آ گیا۔ بریگیڈیر سے ملا۔ اس نے تفصیلات سے آگاہ کیا لیکن میں ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ دفتر جنگ پہنچا۔ وہاں مجھے صراحت سے سب کچھ بتایا گیا اور مجھ پر زور دے کر کہا گیا کہ میرا پہلا کام یہ ہوگا کہ جنرل آئزن ہوور سے افریقہ پر لشکر کشی کا وہ پلان معلوم کروں جو ابھی تک ان کے ذہن میں ہے اور ظاہر نہیں ہوا ہے۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا اس لئے کہ افریقہ پر لشکر کشی کا وقت قریب آ گیا تھا اور ابھی تک پلان ذہن سے کاغذ پر نہیں آیا تھا۔ یہ علم ہو کر اور تعجب ہوا کہ چیف آف جنرل اسٹاف تک پلان معلوم کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اگر امریکی جنرل سے حملہ کا پلان معلوم کرنے میں سب ہی ناکام رہ چکے ہیں تب میں کیسے کامیاب ہو جاؤں گا؟ رات بھر میں یہی سوچتا رہا۔

۸ اگست ۴۲ء کی صبح میں قریب سات بجے صبح شیو کر رہا تھا اور نئی ذمہ داریوں کے متعلق سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ فون پر نیا حکم یہ ملا کہ پہلی برطانوی فوج کی کمان سنبھالنے کا حکم فوری طور پر منسوخ ہوا۔ نیا تقرر صحرائے اعظم میں ہوا ہے۔ آٹھویں فوج کی کمان مجھے فوراً سنبھالنی ہے۔ میں نے سوال کیا کہ یہ تبدیلی اچانک کیوں ہوئی؟ جواب ملا کہ جنرل گوٹ کے طیارہ کے حادثے میں ہلاک ہو جانے کی وجہ سے۔ ان کی جگہ میرا

الشجاع

انتخاب ہوا ہے۔

اس اچانک تبدیلی نے میرے ذہن کی بساط ہی کو الٹ پلٹ دیا۔ اب تک میں افریقہ پر اتحادی حملے کے تانے بانے میں مصروف تھا کہ تبدیل شدہ حالات نے مجھے صحرائے اعظم پہنچا دیا جہاں مشہور و معروف جرمن جنرل رومل کا خطرہ سر پر تھا۔ لندن سے روانگی کے وقت ہی سے میں بڑے انہماک سے نئی ذمہ داری کو کما حقہٗ طور پر پورا کرنے پر دھیان دینے لگا۔ فوجوں کی کمان حرب و ضرب کے متعلق میرا بنا پلان ذہن میں محفوظ تھا مگر وہ نئے حالات کے تقاضوں کو پورا اس لئے نہیں کرتا تھا کیونکہ براعظم افریقہ یورپ سے ہر لحاظ سے بالکل مختلف تھا۔ قدرتی بناوٹ، جغرافیہ، مقامی حالات اور جنگی پوزیشن یورپ سے بالکل مختلف تھی۔

میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ جنگ محض افواج، اسلحہ، اور کمان سے جیتی نہیں جاتی جب تک کہ قدرتی حالات و ماحول سے موافقت نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ نئے جغرافیہ کے تحت میں اپنے پلان میں ترامیم پر مسلسل غور کرتا رہا۔ میری نگاہوں نے اتنا تاڑ لیا تھا کہ افریقہ کی جنگ کا پہلا اور بنیادی جنگی مقصد بندرگاہ تریپولی پر قبضہ کرنا ہے جو الیگزنڈریہ (مصر) کے بعد ساحل افریقہ پر سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ مصر سے تریپولی تک درمیان میں کئی اور بندرگاہ بھی تھے۔ مثلاً طبروق بن غازی لیکن العلمین سے تریپولی تک صحرا بالکل ہتھیلی کی طرح چٹیل اور سپاٹ تھا۔ (۱) ساحل افریقہ کی وہ پختہ سڑک جو کالی زلف کی طرح بل کھاتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی تھی وہ بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ یہ بندرگاہ سے دوسرے بندرگاہوں کو ملاتی تھی اور سپلائی کا بہترین وسیلہ تھی ساتھ ہی فوجوں کی خاص گزرگاہ بھی تھی۔ (۲) طبروق اور بن غازی کے درمیان جبل اخضر (سبز پہاڑ) کا سلسلہ تھا جسے "ساتر نیا" بھی کہتے ہیں فوجی لحاظ سے اہم تھا۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق اس مضبوط مقام پر قبضہ کرنا لازمی تھا۔ (۳) ایک پوزیشن جسے جرمن "مرسا بریگا" کے نام سے یاد کرتے تھے، اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی تھی اس لئے کہ ہماری پیش قدمی کو روکنا اسی

…سے جنرل رومل کے لئے آسان تھا۔ برطانوی افواج نے …ن پوزیشن پر قبضہ کرنے کے لئے دو بار مارچ کیا تھا لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ لندن سے قاہرہ تک پرواز کے دوران میں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ساحلی پختہ سڑک ساحلی بندرگاہ بن غازی اور طرابلس کے درمیان جبل اخدار اور جو تھا طرابلس میرے جنگی پلان کے چار رخ ہونا چاہئے اور قاہرہ پہنچ کر جتنی مزید فوج دستیاب ہو سکتی ہے میں سمیٹنے کی کوشش کروں تاکہ قدرتی بناوٹ اور آب و ہوا سے مطابقت کرتے ہوئے اپنے پلان کو کامیاب بنا سکوں۔

جرمن جنرل رومل کی "افریقہ کورپس" کے متعلق میں جتنی معلومات حاصل کر سکا وہ یہ تھیں کہ رومل کی فوج کے دو حصے ہیں۔ اول حملہ آور حصہ ہے دوم قابض ہونے والا حصہ۔ حملہ آور جرمن "افریقہ کورپس" بکتر بند ہے۔ توپ خانوں سے مسلح ہے اس میں سب کے سب جرمن سپاہی ہیں۔ دوسرے قبضہ کرنے والا حصہ اطالوی سپاہیوں سے پُر ہے جو بکتر بند نہیں ہے۔ گویا "افریقہ کورپس" حملہ کرنے والے لڑنے والے جرمن ہیں اور بعد جنگ قبضہ کرنے والے سپاہی اطالوی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے طے کر لیا کہ آٹھویں فوج جس کی کمان مجھے سونپی گئی ہے اس کے قبضہ میں "پینزر ڈیویزن" ہونا لازمی ہے۔ ایک ایسا طاقتور بکتر بند ڈیویزن جو مضبوط ہی نہ ہو بلکہ پوری طرح مسلح بھی ہو۔ جس کو میدان جنگ سے دور محفوظ رکھ کر ہم پیش قدمی کے وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوسری اہم بات میری نظر میں فوج کا اخلاقی معیار کی اصلاح تھی۔ میرے خیال میں تک یہ بات آ گئی تھی کہ آٹھویں فوج کا اخلاقی معیار کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اور فوج کے جنرل اسٹاف میں اعتماد کا فقدان ہے۔ قاہرہ پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ دوران پرواز جو پلان ذہن میں ابھرا ہے وہ قریب قریب مکمل ہے البتہ مقامی ذمہ داروں سے سوالات کے ذریعہ مزید حالات کی تشریح ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قاہرہ پہنچ کر مشرق وسطیٰ کے کمانڈر انچیف جنرل آکنلیک سے ملنے کی مجھے عجلت محسوس نہیں ہوئی۔ جہاں تک جنرل آکنلیک کا تعلق تھا مجھے احساس تھا کہ ان کی ماتحتی میں اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام نہ دے سکوں گا اس لئے کہ جنرل آکنلیک وسیع النظر نہیں تھے۔

۱۲ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح قاہرہ کے ہوائی اڈے پر اترنے کے بعد مجھے پیرامڈ کی طرف "مینا ہاؤس ہوٹل" پہنچا دیا گیا جہاں جنرل آکنلیک کے لئے بھی ایک کمرہ مخصوص تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے غسل کیا اور بعد ناشتہ قاہرہ کی طرف ہو لیا جہاں مشرق وسطیٰ کا جنرل ہیڈ کوارٹر تھا۔ مشرق وسطیٰ کے کمانڈر انچیف جنرل آکنلیک سے میری ملاقات بڑی پھیکی رہی۔ مجھے دیکھتے ہی جنرل آکنلیک نقشوں کے کمرے کی طرف ہو لئے۔ وہاں پہنچ کر دروازے بند ہو گئے۔ ہم دونوں تنہا تھے کمرے میں۔ جنرل آکنلیک نے چھوٹتے ہی پہلا سوال پوچھا "تمہیں علم ہے کہ میں سبکدوش ہو رہا ہوں۔؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تب انھوں نے اپنے جنگی پلان پر گفتگو کی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں آٹھویں فوج کو تباہی و بربادی سے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا ہے۔ انھوں نے زور دے کر مجھے سمجھایا کہ جرمن جنرل رومل اگر طاقت سے حملہ کرے تب آٹھویں فوج کو مصر کے ڈیلٹا تک ہٹا لیا جائے۔ اگر دشمن کا دباؤ ناقابل برداشت ہو جائے تب اس صورت میں آٹھویں فوج کو دریائے نیل تک پسپا کر دیا جائے۔ نیز یہ بھی اگر ممکن نہ ہو تب آٹھویں فوج کو فلسطین تک ہٹا دینا مناسب ہوگا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہنگامی حالات میں آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر کے قیام کے لئے دریائے نیل کے کنارے انتظام کیا گیا ہے۔

انتہائی صبر و سکون سے میں جنرل آکنلیک کا پلان سنتا رہا جو پسپائی کے پروگرام کے سوا اور کچھ نہ تھا! ؟

آخر میں انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ کل صبح میں اندرون صحرا آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر روانہ ہو جاؤں ۱۳ اور ۱۴ اگست کو آرام کروں اور حالات کو سمجھ لوں مجھے ہدایت ہوئی کہ میں ڈیوٹی سے ۱۵ اگست کو چارج لوں جس روز وہ خود سبکدوش ہو رہے تھے۔ اگر ان دو دنوں کے اندر جرمن حملہ کریں یا شرارت تب انھوں تو اس معلومات تھیں

کہا کہ وہ خود آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر حالات سے نمٹ لیں گے۔ پہلا پروگرام مجھے چوں چوں کا مربہ معلوم ہوا اور میں کچھ کہے بغیر انتہائی صبر و متانت کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد میں ہونے والے کمانڈر انچیف جنرل الیگزنڈر سے ملا اور اپنے ارادے کا برملا اظہار کیا میں نے کہا کہ جنرل رومل کی طرح آٹھویں فوج کے پاس بھی مضبوط محفوظ بکتر بند ڈویژن ضروری ہے، جنرل الیگزنڈر نے اصولاً میری تائید کی لیکن ہنوز وہ کمانڈر انچیف نہیں تھے اس لئے کوئی وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔

جنرل آکنلیک کے ساتھ چیف آف اسٹاف بھی رخصت ہو رہے تھے لہٰذا میں نے ڈپٹی چیف آف اسٹاف میجر جنرل ہارڈنگ سے ملاقات کی (جو بعد میں فیلڈ مارشل لارڈ ہارڈنگ ہوئے) ہارڈنگ کیمبرلے اسٹاف کالج میں طالب علم رہ چکے تھے۔ انھوں نے دلچسپی اور غور سے میرا پلان سنا اور وعدہ کیا کہ وہ بکتر بند ڈویژن کی تشکیل کر دیں گے

میں نے اور جنرل الیگزنڈر نے شیپرڈ ہوٹل میں لنچ کھایا۔ میں نے اپنا پلان تفصیل سے واضح کیا۔ جنرل الیگزنڈر نے میرے طریق کار کو پسند کیا۔ سہ پہر کو میں نے ضروری خریداری کی۔ رات کے لئے طے ہوا کہ میں برطانوی سفارت خانے میں رہوں اور صبح صحرا کی طرف کوچ کروں۔ الیگزنڈریہ میں آٹھویں فوج کا بریگیڈیر جنرل اسٹاف مجھ سے ملے گا جو آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف میری رہنمائی کرے گا۔

شام کو جنرل الیگزنڈر کے ساتھ میں نے پھر ہارڈنگ سے حسب وعدہ ملاقات کی۔ تفصیلی گفتگو ہوئی اور میجر جنرل ہارڈنگ نے مختلف ڈویژنوں اور کمانڈروں کی فہرست بھی بنا دی۔

رات میں نے برطانوی سفارت خانے میں گزاری۔ اور علی الصباح پانچ بجے میں کار سے الیگزنڈریہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ الیگزنڈریہ میں آٹھویں فوج کا بریگیڈیر جنرل اسٹاف بریگیڈیر گوئن گینڈ (جو بعد میں ترقی کرتے ہوئے میجر جنرل سر فرانسس گوئن گینڈ ہو گیا) میرا منتظر تھا۔ اس سے مل کر مجھے اس لئے خوشی ہوئی کیونکہ وہ میرا پرانا دوست بھی تھا۔ میری اس سے پہلی ملاقات نیو پارک میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں میجر تھا اور وہ نیا نیا سکنڈ لفٹیننٹ ہوا تھا۔ بعد میں ۴۱ء میں ہم دونوں کی ملاقات مصر میں اور ۳۵ء میں کوئٹہ (پاکستان) میں ہوئی تھی اور بعد میں ۳۹ء میں جب ہم دونوں ملے تو وہ وزیر جنگ برطانیہ ہور بلیشا کا ملٹری اسسٹنٹ تھا۔ وہ بڑا زیرک اور ذہین تھا۔ الیگزنڈریہ پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو اپنی کار میں بٹھا لیا اور ہم آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گئے۔

راستے میں جب ادھر ادھر کی بات کے بعد میں نے آٹھویں فوج کے عام حالات پر سوال کیا تب اس نے وہ رپورٹ میری طرف بڑھا دی جو وہ اپنے قلم سے لکھ کر لایا تھا۔ اس وقت میں نے ہنستے ہوئے کہا "میرے دوست! حماقت نہ کرو تمہیں علم ہے کہ میں اس وقت کاغذات سے دلچسپی نہیں لیتا جب متعلقہ شخص میرے ساتھ ہو۔" یہ سن کر وہ ہنس دیا۔ رپورٹ جیب میں رکھی۔ بیگ سے نقشہ نکالا اور ہم دونوں نے گھٹنوں پر اسے پھیلا لیا اور اس نے جنگی صورت حال بڑے مؤثر انداز میں سمجھانی شروع کر دی۔ اب تک آٹھویں فوج کو جتنی بار پیچھے ہٹنا پڑا تھا اس کے اسباب بیان کئے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ آٹھویں فوج کے ہاتھ میں اس وقت جنگ کی باگ نہیں ہے اور یہ کہ دشمن اعلیٰ پوزیشن میں ہے۔ اس نے تازہ ترین خفیہ اطلاعات بھی فراہم کر دیں اس کے بعد میں نے آفیسروں اور سپاہیوں کی اخلاقی کیفیت دریافت کی۔ اس نے بڑی صفائی اور برجستگی سے اقرار کیا کہ اخلاقی حالت ابتر ہے۔ کیونکہ آٹھویں فوج اعلیٰ کمان کی خواہشمند ہے نیز بالائی گرفت سے بھی تنگ ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہماری کار نے ساحلی سڑک چھوڑ کر صحرا کا رخ کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے سامنے عظیم ذمہ داریاں ہیں آغاز سے انجام تک کا ڈھانچہ ڈھیلا ہے۔ یہ کام میں تنہا نہیں انجام دے سکتا تھا۔ مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو میرا ہاتھ تندہی اور دلجمعی سے بٹاتے۔ فوج میں مروجہ طریقہ یہ تھا کہ مختلف ذمہ دار آفیسر ٹیم بن کر کام انجام دیتے تھے۔ لیکن

[illegible] حالت میں تھی اس میں اختیارات تقسیم کرنا دشمن [illegible] سود مند ہو وجہ تھی کہ میرے پیش رو کمانڈر اب تک ناکام رہے تھے کیونکہ کمان کو مختلف ہاتھوں میں انھوں نے پھیلا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کمان سمیٹ نہ پائے اور ناکام رہے لہٰذا میں نے طے کر لیا تھا کہ ساری ذمہ داری ایک ذمہ دار آدمی کے سپرد کر دوں اور اس کے لئے میری نظر میں میرا دوست اور بریگیڈیر جنرل اسٹاف بریگیڈیر گوئن گینڈ ہی مناسب تھا۔

اس فیصلے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آٹھویں فوج کی کمان کے دوران میرے ماتحت مختلف کارپس میں اہل محنتی اور چابکدست کمانڈر ہونا لازمی ہیں۔ میں غیر ذمہ دار نا اہل اور غیر وفادار کارپس کمانڈروں سے آٹھویں فوج کو بالکل پاک کر دینا چاہتا تھا۔

آٹھویں فوج کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر جو منظر میں نے دیکھا وہ تکلیف دہ ہی نہیں بلکہ مایوس کن بھی تھا۔ ادھر ادھر ٹرک کھڑے تھے۔ خیمہ ایک بھی نہ تھا اور ہر کام جلا دینے والی دھوپ میں ہو رہا تھا۔ جنرل آکنلیک خود زیر آسمان سونے کے عادی تھے اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے آٹھویں فوج کو خیمے استعمال کرنے سے روک دیا تھا۔ جنرل آکنلیک کی تھیوری یہ تھی کہ عیش و آرام سے آٹھویں فوج کو دور رکھ کر اسے مضبوط و توانا بنایا جائے۔

اس وقت میں حیران رہ گیا جب معلوم ہوا کہ فضائی فوج کا ہیڈ کوارٹر میلوں پیچھے نزد ساحل تھا۔ گویا بری و فضائی فوج دو الگ الگ یونٹ تھے جو بغیر میل کے الگ الگ جنگ لڑ رہے تھے۔ مجھے قائم مقام کمانڈر جنرل رمیس ڈن نے ملاقات کے دوران بتایا کہ مضبوط و واضح پالیسی کا فقدان ہے۔ حد یہ ہے کہ آٹھویں فوج کے عارضی کمانڈر کا جنرل ہیڈ کوارٹر نیز فضائی ہیڈ کوارٹر سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ یہ حالات سن کر میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ ہیڈ کوارٹر نہ صرف یہ کہ غیر قدرتی ماحول کی گرفت میں تھا بلکہ از حد خطرے میں بھی تھا لہٰذا میں نے فوراً فیصلہ کیا اور رمیس ڈن کو حکم دیا کہ وہ اپنی کارپس واپس جائے کیونکہ ۱۵ اگست کے بجائے میں دو دن قبل ہی کمان سنبھالنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چنانچہ کھانا کھانے کے بعد میں نے قاہرہ کے جنرل ہیڈ کوارٹر کو تار روانہ کر دیا جو یوں تھا۔

" میں نے آج ۱۳ راگست کو دو بجے دن آٹھویں فوج کی کمان سنبھال لی ہے ! "

یہ تار کھلی نافرمانی کا مظہر تھا لیکن میں مجبور تھا۔ تار روانہ کرنے کے بعد میں نے فوراً سابقہ احکامات منسوخ کر دینے کا حکم دے دیا۔ اور اپنے حکم میں صاف ہدایت کر دی کہ "آٹھویں فوج کسی بھی حالت میں اب مزید پسپا نہیں ہوگی۔" اس لئے کہ اگر ہم زندہ رہ کر زمین کی حفاظت نہیں کر سکتے تو ہم یہیں مر جائیں گے۔ پسپا نہیں ہوں گے اور یہیں کھیت رہیں گے۔ اس وقت مجھے یونان کے قدیم بہادروں کا وہ مقولہ یاد آیا جو ایک درے کی حفاظت کرتے وقت جاں بحق ہو گئے تھے لیکن درہ پھر بھی نہ چھوڑا جسے یونانی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

" جاؤ! میرے ہم وطنو سے کہہ دو کہ وطن کے جانثار زندہ رہ کر درے کی حفاظت کرتے رہے اور مر کر بھی اس کی پاسبانی کر رہے ہیں ! ؟"

شام کو جب جنرل اسٹاف کی میٹنگ ہوئی تب میں نے یونانی شاعر کے نظریئے کی تشریح کر دی اور اعلان کیا کہ مصر کی حفاظت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ ہم یہ تہیہ کر لیں کہ ہمیں العلمین سے نہیں ہٹنا ہے خواہ ہمیں اپنی جانیں ہی کیوں نہ دینی پڑیں۔ اسی میٹنگ میں یہ اعلان بھی کر دیا کہ گوئن گینڈ آج سے چیف آف جنرل اسٹاف ہوگا اور اس کا ہر حکم میرا حکم ہوگا۔ میں نے یہ بھی اعلان کیا کہ جس آرام کو جنرل آکنلیک نے حرام کر دیا تھا میں نے اسے بحال کر دیا ہے۔ میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا اور فوج میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے دن میں نے دفاعی جنگ کی تیاری کے آغاز کے سلسلے میں اقدام کیا اور گوئن گینڈ کو ہمراہ لے کر سروے کیا۔ اس سروے میں مجھے اندازہ ہوا کہ دو مقامات پر اگر ہم جم جائیں تب جرمن جنرل رومل کو یقیناً شکست دے سکتے ہیں۔ وہ دونوں مقامات دفاع کی

جاتے تھے: "روو ے ست ریج" اور "الم ہالفاریج"۔ جبکہ صرف ایک ریج پر توجہ مرکوز کی گئی تھی اور الم ہالفاریج کو زیادہ اہمیت نہ دے کر نظر انداز کر دیا گیا تھا حالانکہ میری نظر میں یہ عدم توجہی جنگی لحاظ سے موت کے مترادف تھی، سروے کے دوران ساتویں بکتر بند ڈویژن کے کمانڈر سے گفتگو ہوئی جسے صحرا میں ٹینکوں کی لڑائی کا گہرا تجربہ تھا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا "سوال یہ ہے کہ کون اپنے ٹینک تڑوانے پر پہلے آمادہ ہوگا؟ رومل یا آپ؟" میں نے جواب دیا کہ رومل ہم پر حملہ کرے ہم حملہ میں پہل نہیں کریں گے بلکہ ہم اپنے مورچے میں بیٹھ کر اس سے نمٹ لیں گے۔ خفیہ جاسوسوں نے جتنی رپورٹیں دی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ جنرل رومل ماہ کے آخر تک حملہ آور ہوگا اس لئے کہ اسے مصری ڈیلٹا پر قبضہ کرنے کی عجلت ہے، یہ ممکن نہ تھا جنرل رومل کے لئے کہ آٹھویں فوج کو کترا کر مصری ڈیلٹا کی طرف بڑھ جائے یہ اقدام اس کے لئے خطرناک ہی نہیں بلکہ مضر تھا کہ عقب کو غیر محفوظ اور خطرناک بنا کر وہ مصر پر حملہ آور ہو۔ لہٰذا وہ مجبور تھا کہ پہلے ہمیں راستے سے ہٹا دے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ ہم پر حملہ کرے اور میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ "الم ہالفاریج" سارے دفاع کی کنجی ہے اگر اس ریج کو پورے ڈویژن کی مدد سے محفوظ اور نا قابل تسخیر بنا دیا جائے تو جرمن جنرل رومل کا خواب افریقی سلطنت کے بارے میں یقیناً پریشان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے پاس فالتو ڈویژن نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے قاہرہ وائرلیس سے پیغام بھیجا اور اصرار کیا کہ چوالیسواں ڈویژن فوراً میرے حوالے کر دیا جائے میری درخواست نہ صرف تسلیم کی گئی بلکہ فوری طور پر ڈویژن کو صحرا جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اس ڈویژن کو میں نے "الم ہالفاریج" پر تعینات کر دیا۔ خندقیں کھود کر سرنگیں بچھا کر اور تاروں سے اس مورچہ کی حفاظت کر لی گئی۔ توپ خانے اہم مقامات پر نصب ہو گئے اور بکتر بند ڈویژن کو اینٹی ٹینک توپوں کی آڑ میں ریت میں گاڑ دیا گیا۔ اور اس طرح الم ہالفاریج کو الشجاع

نا قابل تسخیر کی شکل دے دی۔ "الم ہالفاریج" کے دفاع سے فارغ ہو کر میں نے انگلینڈ سے فرمائش کی اور زور دے کر کہا کہ تیرھویں کارپس بغیر کمانڈر کے ہے لہٰذا اس جگہ کے لئے لندن سے جنرل ہورک کو بلا کر میرے حوالے کر دیجئے۔ مطالبہ کی قبولیت پر مجھے خوشی ہوئی اور یقین ہو گیا کہ میں جنرل رومل سے اب ہاتھ ملانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ اس طرح ۱۵ اگست سے قبل ہی آٹھویں فوج کی کمان سنبھال کر میں نے بگڑی ہوئی تصویر کو کافی ٹھیک کر لیا تھا اور ۱۵ اگست کو جنرل آکنلیک نے چارج دیا تو آٹھویں فوج سرگرمی سے دفاعی پلان پر نہ صرف عمل پیرا تھی بلکہ اس کا اخلاقی جوش و خروش بیدار ہو چکا تھا۔

یہ تیاریاں دو رخی تھیں۔ پہلا رخ تو جنرل رومل کے حملے کو روکنا اور ناکام بنانا تھا۔ دوسرا رخ یہ تھا کہ مجھے ستمبر میں خود جنرل رومل پر بھرپور حملہ کرنا تھا۔ لیکن میرے حملہ سے قبل سوچنا یہ تھا کہ "الم ہالفا" پر جرمن جنرل رومل کے حملہ کو کس طرح ناکام بنایا جا سکتا ہے لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر دو رخ کی کسوٹی "الم ہالفا" کی جنگ میں پوشیدہ تھی لہٰذا میں "الم ہالفا" کی جنگ کا مختصر حال تحریر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو افریقہ کی جنگ میں اور مابعد عالمی جنگ میں ریڑھ کی ہڈی بننے جا رہی تھی۔۔!

میں نے اعلان کر دیا تھا کہ احکامات کی خلاف ورزی کو قطعی برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس لئے کہ عام طور پر طریق کار یہ تھا کہ مورچے کے وقت آفیسران ہدایت پر یہ کہہ کر عمل درآمد سے کترا جاتے ہیں کہ "حالات موافق نہ تھے"

ان احکامات کا مقصد بنیادی یہ تھا کہ آٹھویں فوج جو نیا مورچہ لڑنے جا رہی ہے اس میں قطعی طور پر کامیاب ہو تاکہ مسلسل پسپائی کے اثرات نہ صرف زائل ہوں بلکہ ہمت جوش و امنگ ابھرے نیز میرے اپنے پلان کی ندرت آشکار ہو جو مستقبل کی جنگ کے لئے انتہائی ضروری بھی تھی۔

تازہ رپورٹوں سے جنرل رومل کے ارادوں اس کی طاقت اور منصوبے کا علم ہو چکا تھا کہ رومل پوری قوت سے

جنوبی ٹوٹ پڑے گا یہ بھی یقین تھا کہ ابتدائی مورچے بندیوں کو توڑ کر جنرل رومل ہماری لائن کے اندر داخل ہو جائے گا اور اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ اس کا رخ الم حالفا کی طرف ہوگا تاکہ اس طرف مورچہ بندیوں کو توڑ کر جنوب سے العلمین کے قلب پر بڑھ کر ہاتھ مارے۔ اسی لئے میں نے الم حالفا پر زیادہ زور دیا تھا چوالیسواں ڈویژن جو تازہ دم قاہرہ سے آیا پورے کا پورا الم حالفا کے دفاع کے لئے مہیا تھا اور الم حالفا و العلمین کے درمیان چھ پاؤنڈ گولے پھینکنے والی ٹینک توڑ توپوں کی دیوار کھڑی کر دی اور ان کے عقب میں چار سو ٹینک چھپا دیئے تھے تاکہ دشمن جب اندر اپنے ٹینک لے کر آ جائے تو ٹینک توڑ توپیں باڑھیں ماریں جس پر دشمن اپنے ٹینک بڑھا دے گا اور جب ٹینک گرفت میں آ جائیں تب توپیں خاموش ہو جائیں اور ٹینک اپنا کام کریں تاکہ دشمن کے ٹینک برباد ہو جائیں۔ میں نے ہدایت کر دی تھی کہ ہمارے ٹینک نکل کر حملہ نہیں کریں گے۔ اور نہ ڈویژن منتشر ہو کر اور پھیل کر لڑے گا بلکہ کسی ہوئی مٹھی کی طرح پوری ڈویژن شانہ بشانہ نبرد آزما ہو گی۔

توقع کے مطابق ۳۱ اگست کی رات کو جنرل رومل نے زور شور سے حملہ کیا اور حسب توقع سامنے سے نہیں بلکہ آٹھویں فوج کے انتہائی جنوبی گوشے پر وہ ٹوٹ پڑا۔ اور حسب توقع جنوبی دفاعی لائن کو اس نے توڑ بھی دیا اور پورے ساز و سامان و طاقت کے ساتھ مورچوں کے اندر در آیا۔ جنوب کی طرف سے کامیاب ہونے کے بعد رومل نے فوجوں اور ٹینکوں کا رخ شمال کی طرف العلمین کی طرف پھیر دیا۔ العلمین پر قبضہ کا مقصد اسکندریہ تک پہنچنا تھا جو صرف چالیس میل عقب میں تھا۔ ہمیں اس کا علم بھی تھا لہذا ہم نے اس کی تیاری بھی کر لی تھی۔ جرمن حملہ آور طوفانی دستے تین حصوں میں بٹ گئے ایک العلمین کی طرف بڑھنے لگا دوسرا الم حالفا پر قبضہ کرنے بڑھا اور تیسرے نے ریلوے سات کے مورچے پر قبضہ کرنے کے لئے دھاوا کیا۔ جرمن ٹینک جو تین رخوں پر یورش کر رہے تھے۔ الم حالفا کی طرف جوں ہی

الشجاعت

ٹینک بڑھ آئے تو ٹینک شکن توپوں نے گرجنا شروع کیا۔ جرمن ٹینکوں نے جوش مارا اور چاہا کہ توپوں کو روند کر خاموش کر دیں کہ زد میں آتے ہی ٹینکوں نے انہیں گھیر لیا اور گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ دوسری طرف یہی ریلوے سات رینج میں ہوا۔ وہاں بھی جرمن ٹینکوں کو الجھا لیا گیا۔ اور العلمین کی طرف بڑھتے ہوئے دستوں ... حملوں کا مقابلہ نیوزی لینڈ کی فوج نے کیا جو اس مورچے پر تھی۔ اس طرح وہ پیش قدمی اور بالادستی جو رومل کے ہاتھ میں تھی اب برابر تقسیم ہو گئی اور خونریز مقابلے شروع ہو گئے۔

جرمن یورش کے وقت میں محو خواب تھا۔ اس رات بھی وقت پر سویا۔ گوئن گینڈ (چیف آف اسٹاف) نے مجھے بیدار کیا رپورٹ دی میں یہ کہہ کر سو گیا۔ "شاباش! پلان پر عمل کرو اور فتحیاب ہو"۔ دوسری صبح کو میں نے وقت پر ناشتہ کیا معلوم ہوا کہ میرے نقشہ جنگ پر پورا پورا عمل ہو رہا ہے۔ میں مطمئن تھا۔ جب میں نے حملہ آور جرمن فوجوں کو خراب حالات میں دیکھا تب میں نے نیوزی لینڈ فوج کو حکم دیا کہ وہ ہلہ کر کے اس راستے کو کاٹ دے اور بند کر دے جس طرف سے رومل مورچہ بندیاں توڑ کر اندر آیا تھا۔ جوں ہی راستے کو بند کرنے کے لئے ہلہ ہوا رومل گھبرا سا گیا اور اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹانا شروع کر دیا تاکہ عقبی راستہ مسدود نہ ہو۔ جرمن فوجیں مجتمع ہو کر عقب کی طرف ہٹ رہی تھیں اور جنرل ہورک احتجاج پر احتجاج کر رہا تھا کہ میں تعاقب کرنے اور حملہ کرنے کا حکم کیوں نہیں دے رہا ہوں۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ الم حالفا کی جنگ میں تعاقب اور حملہ کرنا میرے جنگی پلان میں اس لئے نہیں تھا کیونکہ اول تو آٹھویں فوج کی ٹریننگ سے میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا دوسرے یہ کہ ہمارے پاس اسلحہ عام حملے کے لئے پورے نہیں تھے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ الم حالفا کی جنگ آخری جنگ نہیں تھی اگر رومل یہاں پیس بھی دیا جاتا تب بھی اس کی کمر نہ ٹوٹتی اور میں جنرل رومل کو کھڑے ہونے اور پھر مقابلہ کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا تاکہ فیصلہ کن فیصلہ ہو سکے یہی وجہ تھی کہ جنرل رومل کو میں نے الم حالفا کے میدان جنگ سے بخیریت گزر جانے دیا۔ اور اس طرح صحرائے اعظم میں یہ پہلی فتح تھی جس کے چرچے ہونے لگے کہ صرف افریقہ ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

بھی جرمنوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔ جنرل رومل کو بھی احساس ہو گیا کہ افریقہ میں جرمن سلطنت کا خواب شاید شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اس فتح کے اثرات گہرے ابھرے سب سے بڑا ردعمل یہ ہوا کہ آٹھویں فوج کی ہمت بلند ہو گئی اور خود مجھے یقین ہو گیا کہ بہترین جنگی پلان کے تحت ایک آدمی کی نگرانی میں اگر جنگ لڑی جائے تب کامیابی یقینی ہو سکتی ہے بشرطیکہ اعلیٰ لیڈرشپ فوج کو ملے۔ ہتھیاروں کی کمی نہ ہو اور یہ کہ نوجوں کی اعلیٰ تربیت بھی ہو۔ الم بالفا کی جنگ میرے نظریہ کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے جو بعد میں فتح عظیم کی پیشانی کا قشقہ بن گئی ۔۔۔!!!

شبنم ——— صفحہ ۹۷ کا بقیہ

خاموشی اور گہری ہو گئی۔

وہ جلدی سے وہاں سے نکلی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی

ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ واپس دبے پاؤں شبنم کے کمرے میں پہنچی۔ اس کا نپتا ہوا جسم پسینے پسینے تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں رعشہ سا طاری تھا۔

وہ شبنم کے بیڈ کے قریب آئی

شبنم بے خبر سوئی ہوئی تھی اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں بند تھیں۔ دراز پلکیں ہم آغوش تھیں۔ اس کے نتھنے آہستہ سے ہل رہے تھے۔ ہونٹ قدرے کھلے ہوئے تھے اس کی نگاہیں اس کے نتھنوں اور ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں

اچانک اس کی نظریں اس کے سارے چہرے پر پھیل گئیں

اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ سوئی ہوئی معصومیت

اف! یہ اس کے پہلے سے چہرے پر کیسی معصومیت تھی وہ بالکل دودھ پیتی بچی معلوم ہو رہی تھی۔ جو ابھی روتے روتے ماں کی گود میں سو گئی ہے۔

لمحہ بھر کے لئے وہ بھول ہی گئی کہ وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے وہ سوچنے لگی۔ وہ بارہا اسی طرح روتے روتے اس کی گود میں سو گئی تھی۔

اس کے سینے میں ایک جھرجھری دوڑ گئی۔

وہ ایک عجیب وحشت کے عالم میں پیچھے مڑی۔

اور جب وہ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس گئی تو بستر پر گرتے ہی اس نے خواب آور گولیوں کی بھری شیشی خالی کر دی!!

پندرہ پینی

پیری میسن کے خالق مشہور جاسوسی ناول نگار اسٹینلے گارڈنر نے جب شروع شروع میں لکھنا شروع کیا تھا اسے ہر لفظ پر تین پینی معاوضہ ملتا تھا۔ ان کے ابتدائی ناولوں میں ہمیشہ مجرم چھٹی گولی سے ہلاک ہوتا ہے۔ ایک بار اسٹینلے کے ناشر نے اس سے سوال کیا۔ " جناب! آپ کے ناولوں کا ہر مجرم چھٹی ہی گولی پر کیوں ہلاک ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ پہلی' دوسری' تیسری' چوتھی اور پانچویں گولی سے وہ ہلاک نہیں ہوتا۔" گارڈنر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"محترم! اگر میں اپنے مجرم کو پہلی ہی گولی میں ہلاک کر دوں تو پندرہ پینیوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ میں آپ سے پندرہ پینی زائد حاصل کرنے کے لئے مجرم کو چھٹی گولی سے ہلاک کرتا ہوں۔"

نسخہ

افرادِ تمثیل

جاوید	متوسط طبقہ کا ایک پڑھا لکھا فرد
جمیلہ	جاوید کی شریکِ حیات
شمّو	جاوید کا بارہ سالہ لڑکا
نیاز	جاوید کا بے تکلف دوست
فیروز بخت	محلے کے ایک تنک مزاج بزرگ

(صبح کا وقت۔ باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں چائے کے برتنوں کی کھنک۔ پھر جاوید کی آواز سُنائی دیتی ہے۔)

جاوید۔ (ہنستے ہوئے) کہیئے بیگم! اب تو آپ مانتی ہیں کہ ہم بھی کولمبس ــــ

جمیلہ۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) میں کہے دے رہی ہوں کہ میں آپ کو ہرگز یہ اوٹ پٹانگ دوائیں نہیں پینے دوں گی۔

جاوید۔ (تعجب سے) کیا فرما رہی ہیں آپ؟

جمیلہ۔ (تیز لہجہ میں) یہ فرما رہی ہوں کہ جاکر کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، جہاں کسی نئی دوا کا اشتہار دیکھا خرید لائے اپنے پر تجربہ کرنے کے لئے

جاوید۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں ــــ

جمیلہ:۔ (بات کاٹ کر) آپ تو ہر بات میں اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ معمولی نزلہ ہے۔ جوشاندہ پی لیجئے۔ کولمبس میں ہرگز نہیں لانے دوں گی۔

جاوید۔ (قہقہہ لگاکر) جواب نہیں ہے بیگم آپ کا۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آج کولمبس ہوتا تو وہ بھی ہمارے اِس کارنامے پر عش عش کر اٹھتا کہ ہم نے اس شہر میں اتنا اچھا مکان دریافت کیا۔

جمیلہ:۔ (ہنستے ہوئے) اوئی! میں سمجھی تھی کولمبس کسی نئی دوا کا نام ہے۔

جاوید۔ (خوشی کے لہجہ میں) آپ تو یہ بتائیے کہ مکان کیسا ہے؟

جمیلہ۔ (خوشی کے لہجہ میں) مکان تو واقعی اچھا ہے۔

جاوید۔ (زور دیکر) اچھا نہیں، بہت اچھا ہے۔ شہر میں تین کمروں کا مکان ملنا کس خوش نصیب کو ہے۔

جمیلہ ہاں جمال بھائی کے مکان سے تو یہ اچھا ہے۔

جاوید۔ (ہنستے ہوئے) اجی وہ بھی کوئی مکان تھا ــ جیسے کبوتروں کی کابک۔

جمیلہ۔ بس خدا کرے پڑوسی بھی اچھے ہوں۔ [قدموں کی چاپ]

شمّو۔ امی! امی! وہ پیلا مکان ہے نا۔ وہ دیکھئے سامنے۔ ارے وہ بجلی کے کھمبے کے پاس۔

جمیلہ۔ ہاں بھئی۔ مجھے نظر آرہا ہے۔

شمّو۔ (جلدی سے) امی! اس مکان میں ڈھیر ساری مرغیاں ہیں اتنی بڑی بڑی جیسے بکری کے بچے۔

جمیلہ:۔ (ہنستے ہوئے) چل ہٹ کہیں مرغیاں بھی اتنی بڑی ہوتی ہیں۔
جاوید:۔ (ہنستے ہوئے) اچھی نسل کی مرغیاں ہوں گی۔ یہ تمام مرغیوں سے بڑی ہوتی ہیں۔
شمو:۔ سچ ابو! بکری کے بچوں کے برابر ہیں۔
جمیلہ:۔ تین بج گئے ابھی تک اونٹ گاڑی والا سامان لے کر نہیں آیا۔
جاوید:۔ (جلدی سے) اگر آیا بھی ہوگا تو ڈاک خانہ کے پاس کھڑا ہوگا۔ یہی پتہ میں نے بتایا تھا۔
جمیلہ:۔ (زور دیکر) جلدی جائیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامان لے کر واپس ہو جائے۔ جاتے کیوں نہیں۔ کیا سوچ رہے ہیں؟
جاوید:۔ سوچ رہا تھا کہ ایک پیالی چائے۔
جمیلہ:۔ چائے آ کر پیجیے گا۔ ابھی تو کوئی دودھ والا بھی نہیں آیا۔
جاوید:۔ میں تو جا رہا ہوں۔ آپ جب تک یہ سامان اسٹور میں رکھیے۔

[قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے]

منظر بدلتا ہے

[مرغیوں کی کٹ کٹ، پھر اڑنے کی آواز
اس کے بعد جمیلہ کی آواز ابھرتی ہے۔]

جمیلہ:۔ خدا کی مار ان مرغیوں پر۔ کمبختوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ [قدموں کی چاپ]
جاوید:۔ (تعجب سے) ہائیں! یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ ہاتھ میں جھاڑو۔ ننگے پیر۔ دوپٹہ غائب۔
جمیلہ:۔ (تیز لہجہ میں) ابھی کیا دیکھا ہے۔ اگر اس مکان میں چند دن اور رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ [گلاس ٹوٹنے کی آواز]
شمو:۔ (زور سے) امی! امی! مرغی نے گلاس توڑ دیا۔
جمیلہ:۔ (زور سے) کیا بک رہے ہو۔ یہاں آؤ۔
جاوید:۔ (سوالیہ لہجہ میں) میں پوچھتا ہوں آخر یہ گلاس کب تک ٹوٹتے رہیں گے؟ ہفتہ بھر میں یہ ساتواں گلاس ٹوٹا ہے۔
جمیلہ:۔ (غصہ سے) ابھی تو صرف گلاس ٹوٹے ہیں۔ یہ مرغیاں تو میری جان لے کر رہیں گی۔ [قدموں کی چاپ]
جاوید:۔ (سوالیہ لہجہ میں) یہ گلاس کیسے ٹوٹا شمو؟
شمو:۔ (جلدی سے) ابو! میں نے نہیں توڑا۔ مرغی اڑ کر میز پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے ہش ہش کیا تو اڑ کر الماری میں جا بیٹھی اور گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔
جاوید:۔ (درشت لہجہ میں) میں پوچھتا ہوں یہ مرغیاں گھر میں آ کیسے جاتی ہیں۔ یہ گھر ہے یا پولٹری فارم؟
جمیلہ:۔ (تیز لہجہ میں) یہ تو وہی مثل ہوئی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ کتنا کتنا کہا تھا کہ جمال بھائی کا مکان لے لیجئے۔ مگر میری سنتا کون ہے۔
جاوید:۔ (طنزیہ لہجہ میں) آپ کا مطلب ہے کہ میں اس کبوتروں کی کابک میں جا کر رہتا۔
جمیلہ:۔ (تیز لہجہ میں) وہ کبوتروں کی کابک اس مکان سے لاکھ درجہ بہتر تھی۔ وہاں مرغیوں کی مصیبت تو نہیں تھی۔
جاوید:۔ (تیز لہجہ میں) میں پوچھتا ہوں آخر مرغیاں گھر میں آ کیسے جاتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ باہر کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔
جمیلہ:۔ (بات کاٹ کر) دروازہ بند ہو تب بھی یہ جھاڑو پھری مرغیاں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ دیوار پر سے اڑ کر اندر آ جاتی ہیں۔ مرغیاں تھوڑی ہیں یہ تو گدھ ہیں گدھ۔
جاوید:۔ (غصہ سے) آپ چاہتی کیا ہیں۔ کہیئے تو مکان خالی کر دوں۔
جمیلہ:۔ (تیز لہجہ میں) مکان خالی کرنے کی ضرورت نہیں۔ مرغیوں کے مالک سے جا کر کہیئے کہ وہ اپنی مرغیوں کو اپنے گھر میں رکھیں۔ پڑوسیوں کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں۔
جاوید:۔ آپ کو کچھ خبر تو ہے نہیں۔ سنا ہے بہت بدمزاج آدمی ہے محلے والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اس نے۔
جمیلہ:۔ (تیز لہجہ میں) اے تو کیا آپ کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ اگر وہ ایک کہے تو آپ دس سنائیے گا۔
جاوید:۔ (آہستہ سے) کہیں بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔
جمیلہ:۔ (درشت لہجہ میں) آپ تو بس گھر میں شیر ہوتے ہیں۔ بیوی

بچوں کے علاوہ اور کسی پر آپ کا بس نہیں چلتا۔

جاوید: (غصّے سے) آپ کا مطلب ہے میں بزدل ہوں۔ لوگوں سے ڈرتا ہوں، کانپتا ہوں۔ لرزہ براندام رہتا ہوں۔

جمیلہ: (تیز لہجہ میں) اگر ڈرتے نہیں ہیں تو مرغیوں کے مالک سے جا کر بات کیجئے۔

جاوید: (تیز لہجہ میں) ابھی جا کر اسے ٹھیک کرتا ہوں۔ آخر وہ اپنے کو سمجھتا کیا ہے؟

[قدموں کی تیز چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے]

منظر بدلتا ہے

[دروازے پر دستک۔ پھر ایک بھاری اور کرخت آواز سنائی دیتی ہے۔]

فیروز: (آواز دے کے) کون ہے؟

جاوید: (زور سے) ذرا باہر تشریف لائیے۔ [ایک لمحہ کے وقفہ کے بعد قدموں کی چاپ بلند ہو کر قریب آتی ہے]

فیروز: (کرخت لہجہ میں) فرمائیے۔ کیا کام ہے جناب کو مجھ سے۔ اور جناب کی تعریف؟ اس خادم کو فیروز بخت کہتے ہیں۔

جاوید: میرا نام جاوید ہے۔ میں گزشتہ ہفتہ زاہد صاحب کے مکان میں آیا ہوں۔ شائد آپ مجھ سے واقف نہ ہوں۔

فیروز: (تیز لہجہ میں) اچھا آٹھ روز ہو گئے آپ کو اس مکان میں آئے اور آج آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں (طنزیہ لہجہ میں) اور پھر کس ڈھٹائی سے فرما رہے ہیں کہ شائد آپ مجھ سے واقف نہ ہوں۔

جاوید: (گڑبڑا کر) جی بات یہ ہے ——

فیروز: (بات کاٹ کر) اجی بات وات کچھ نہیں۔ عذر گناہ بدتر از گناہ ——

جاوید: (جلدی سے) قبلہ اس وقت تو میں آپ کے پاس —— میرا مطلب ہے کہ مرغیوں کے سلسلے میں ——

فیروز: (جلدی سے بات کاٹ کر) مرغیاں! (قہقہہ لگا کر) میرے پاس بڑی اونچی مرغیاں ہیں —— بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ گھر نہیں، پولٹری فارم ہے۔ روڈ، مینارکا۔ لیگ ہارن ——

جاوید: (جلدی سے) میرا مطلب ہے۔ یہ مرغیاں —— انڈے۔

فیروز: (تیز لہجہ میں) بس۔ بس جناب انڈوں کی بات نہ کیجئے گا۔ میں نے انڈے بیچنے کے لئے مرغیاں نہیں پالی ہیں۔

جاوید: (گڑبڑا کر) میرا مطلب ——

فیروز: (بات کاٹ کر) مطلب وطلب کچھ نہیں۔ یہ میرا شوق ہے۔ آپ اِس زمانے کے لوگ کیا کہتے ہیں اسے —— خوب یاد آیا۔ ہابی۔ جی ہاں —— یہ میری ہابی ہے۔

جاوید: (جلدی سے) جناب آپ سمجھے نہیں۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں۔

فیروز: (بات کاٹ کر) میں خوب سمجھتا ہوں۔ آپ یہی فرمائیں گے کہ جب اتنے انڈے ہوتے ہیں تو میں انڈے فروخت کیوں نہیں کرتا؟

جاوید: (جلدی سے) جناب میں تو یہ کہہ رہا تھا ——

فیروز: (بات کاٹ کر) آپ کچھ نہ کہئے۔ اور کان کھول کر سن لیجئے میں انڈے کبھی نہیں بیچوں گا۔ کسی قیمت پر نہیں۔

جاوید: (تیز لہجہ میں) جناب میں آپ کو کب مجبور کر رہا ہوں کہ آپ انڈے فروخت کریں۔

فیروز: (بات کاٹ کر) جناب میں واقعی مجبور ہوں۔ اور مجبوری کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔

جاوید: (جلدی سے) جناب —— میں —— تو ——

فیروز: (بات کاٹ کر) پہلے سنئے تو سہی۔ چھ انڈے تو میں روز کھاتا ہوں اور دو انڈے میری اہلیہ کھاتی ہیں۔ ایک انڈا چھوٹا لڑکا ابال کر کھاتا ہے۔ کیا سمجھے جناب —— آگے چلئے۔ بارہ انڈے میں روزانہ اپنے بڑے لڑکے کو بھیجتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے ماشاء اللہ پانچ بچے ہیں۔

جاوید: (بیزاری سے) قبلہ، میں آپ سے یہ نہیں پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے کتنے پوتے ——

فیروز: (بات کاٹ کر) پہلے میری بات تو سن لیجئے۔ اعتراض بعد میں کیجئے گا۔ ہاں تو عزیزم [illegible] انڈے منجھلا [illegible] لے جاتا ہے۔

اور چار انڈے چھمن بھائی کے حصہ میں آتے ہیں۔

جاوید۔ (تیز لہجہ میں) جناب میں یہ عرض کر رہا ہوں

فیروز۔ (بات کاٹ کر) میں سمجھ گیا۔ آپ یہی فرمائیں گے کہ چھمن صاحب آپ کے بھائی کب ہیں۔ لیکن یقین کیجئے محترم چھمن صاحب دوست ہونے کے باوجود مجھے سگے بھائیوں سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ آپ خود سوچیئے کہ میرے گھر میں مرغیاں ہوں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ چھمن صاحب بازار سے انڈے خریدیں۔

جاوید۔ (نصر سے) جناب میں آپ سے انڈوں کا حساب کتاب ---

فیروز۔ (بات کاٹ کر) نہیں نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ میں انڈوں کا حساب کتاب رکھوں۔ رسی جل ضرور گئی ہے مگر بل نہیں گئے۔ (قہقہہ لگا کر) آپ اس محلے میں نئے نئے آئے ہیں آپ کو نہیں معلوم کہ منکہ فیروز بخت کس قسم کا آدمی ہے۔

جاوید۔ (درشت لہجہ میں) جناب میں آپ کے پاس آپ کی مرغیوں کی شکایت لے کر آیا تھا۔

فیروز۔ (تعجب سے) مرغیوں کی شکایت ---- یہ بھی ایک ہی رہی (قہقہہ لگاتا ہے)

جاوید۔ (تیز لہجہ میں) آپ کی مرغیوں سے میں عاجز ہوں۔ اس ایک ہفتہ میں آپ کی مرغیاں میرے گھر کے آٹھ گلاس۔ چار چائے کی پیالیاں اور دو طشتریاں توڑ چکی ہیں۔

فیروز۔ معاف کیجئے گا حضرت۔ آپ تو بہت چھوٹے دل کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اتنے برتن تو بچوں کے گھر میں ایک دن میں ٹوٹتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میرے پوتے ایک مہینے میں پچاس روپے ماہوار کے برتن توڑتے ہیں۔ (لو در یکھ) لیکن مجال ہے کہ میرے لڑکے کے ماتھے پر ایک شکن بھی آ جائے۔

جاوید۔ (بیزاری سے) خدا محفوظ رکھے ایسے بچوں سے۔

فیروز۔ (کرخت لہجہ میں) کیا فرمایا۔ میرے پوتے بدتمیز ہیں۔ آپ کی یہ ہمت ؟ ۔

جاوید۔ (میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کے کتنے لڑکے ہیں۔ پوتے پوتیوں کی تعداد کیا ہے؟

فیروز۔ (کرخت لہجہ میں) اچھا تو آپ میرا بیان لینے آئے ہیں۔ اب میں آپ کو یہ بتاؤں میرے کتنے بچے ہیں؟ مجھے کتنی پنشن ملتی ہے۔ بڑا اور منجھلا لڑکا مجھے ہر ماہ کتنے روپے دیتے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے داماد سے کیوں خفا ہوں۔ میں نے کبوتر بیچ کر مرغیاں کیوں پالی ہیں؟ یہی چاہتے ہیں نا آپ۔

جاوید۔ (تیز لہجہ میں) میں یہ پوچھنے نہیں آیا۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آئندہ آپ کی مرغیاں میرے گھر میں نہ جائیں۔

فیروز۔ اچھا تو آپ مجھے حکم دینے آئے ہیں۔ اپنی بیگم صاحبہ سے کہیے کہ گھر کا دروازہ بند رکھیں۔

جاوید۔ دروازہ تو بند رہتا ہے مگر آپ کی مرغیاں دیوار پر سے اڑ کر گھر میں آ جاتی ہیں۔

فیروز۔ اگر یہ بات ہے تو آپ دیواریں اونچی کرالیں سو ڈیڑھ سو روپے ہی تو خرچ ہوں گے۔

جاوید۔ (تیز لہجہ میں) اور آپ اس سلسلہ میں کچھ نہیں کریں گے۔

فیروز۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کی وجہ سے میں اپنی مرغیوں کے پر کاٹ دوں۔

جاوید۔ (درشت لہجہ میں) بہتر ہے۔ اب میں خود انتظام کر لوں گا لیکن پھر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔

فیروز۔ (ہنستے ہوئے) مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ آپ ہی شکایت کرنے آئے تھے۔ (چونک کر) ارے کہاں چلے۔ سنئے تو سہی۔ پان تو کھاتے جائیے۔ (قدموں کی تیز تیز چاپ)

جاوید۔ (آواز دور سے) شکریہ۔ زحمت نہ فرمائیں۔

[قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے]

منظر بدلتا ہے

[باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں۔ قہقہے۔ پھر جاوید کی آواز بلند ہوتی ہے

جاوید۔ سنے بھابھی صاحبہ بیگم لاجواب نسخہ ہے۔

نیاز۔ واہ بھابھی واہ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ صرف مرغیوں کی وجہ سے آپ اتنا اچھا مکان چھوڑ دیں۔

جمیلہ۔ نیاز بھائی ان مرغیوں سے تو میں عاجز آ گئی ہوں۔ دو مہینے میں گھر کے آدھے سے زیادہ چینی کے برتن ٹوٹ چکے ہیں۔

جاوید۔ (ہنستے ہوئے) بیگم۔ یہ حضرت یوں تو عقل سے پیدل ہیں لیکن اس معاملے میں کم از کم میں تو ان کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں۔ چکر کھا جائیں گے فیروز بخت صاحب [قہقہے]

جمیلہ۔ واقعی تجویز تو بہت شاندار ہے۔

نیاز۔ (ہنستے ہوئے) بھابی! ہم تو اپنے وقت کے لال بجھکڑ ہیں۔ یہ تو آپ کے شوہر کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے ہمیں کبھی گھاس نہیں ڈالی۔

[دروازے پر دستک]

جاوید۔ (آہستہ سے) وہ آ گئے ــ جائیے بیگم جلدی سے جا کر چائے بھیجئے۔ (قدموں کی چاپ)

نیاز۔ (آہستہ سے) انڈے کا حلوہ بھیجنا نہ بھول جائیے گا۔

[دروازہ کھلنے کی آواز۔ قدموں کی چاپ]

جاوید۔ (خوشگوار لہجہ میں) تشریف لائیے۔ (ہنستے ہوئے)
؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔

فیروز۔ (ہنستے ہوئے) میں کوئی گیا وقت نہیں ہوں عزیزم جو پھر نہ آ سکوں (چونک کر) آپ کی تعریف؟

جاوید۔ یہ میرے عزیز دوست نیاز اختر صاحب ہیں۔ صدر میں انڈوں کی دوکان ہے ان کی۔

فیروز۔ (تعجب سے) انڈوں کی دکان؟ میرا مطلب ہے کہ جناب انڈے بیچتے ہیں۔

نیاز۔ (انکسار سے) اجی دکان کیا۔ چھوٹا سا کیبن ہے۔

[قدموں کی چاپ]

شمو۔ (آہستہ سے) اسلام علیکم۔

فیروز۔ وعلیکم السلام۔

جاوید۔ چھوٹی میز پر چائے کی ٹرے رکھ دو۔ بیٹے سلام کرو۔ چچا کو۔ یہ میرا چھوٹا لڑکا ہے فیروز بخت صاحب۔

فیروز۔ ماشاء اللہ۔ عمر دراز ہو۔

جاوید۔ نیاز کیا سوچ رہے ہو۔ چائے بناؤ ــ قبلہ یہ لیجئے۔ انڈے کا حلوہ ہے۔

فیروز۔ آپ نے تو بڑا تکلف کیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟

شمو۔ ابو ذرا کرسی ہٹائیے۔ ادھر ــ وہ دیکھئے انڈے ــ دو ہیں۔

جاوید۔ (چونک کر) انڈے۔ ارے وہ میز کے نیچے بھی تو ایک انڈا رکھا ہوا ہے۔ اٹھاؤ۔

نیاز۔ (قہقہہ لگا کر) شمو بیٹے یہاں آؤ۔ وہ دیکھو صوفہ کے نیچے بھی چار انڈے ہیں۔ وہ دیکھو وہ۔

فیروز۔ (چونک کر) کمال ہے جناب۔ آپ کے ہاں انڈے اس بد احتیاطی سے رکھے جاتے ہیں۔

جاوید۔ اجی کیا عرض کروں۔ قبلہ آپ نے ہاتھ کیوں کھینچ لیا۔ اور کھائیے نا۔

فیروز۔ بس، ابھی یخنی پی کر آ رہا ہوں قطعی گنجائش نہیں ہے۔ (قہقہہ لگا کر) تکلف کا میں قائل نہیں ہوں۔

شمو۔ (زور سے) ابو آج تو کل دس انڈے ملے۔ کل تو پندرہ تھے۔

نیاز۔ (سوالیہ لہجہ میں) بھائی جاوید یہ کیا تک ہے۔ کسی ہفتہ تم چار درجن انڈے بھیجتے ہو۔ کبھی چھ درجن۔ اور کبھی صرف ایک درجن۔

جاوید۔ بھئی جتنے انڈے ہوتے ہیں اتنے تمہیں بھیج دیتا ہوں۔

فیروز۔ (سوالیہ لہجہ میں) کیا آپ نے بھی مرغیاں پالی ہیں؟

شمو۔ (زور سے) نیاز چچا ذرا ہٹئیے ــ دیکھئے آرام کرسی کے پاس ایک انڈا پڑا ہے۔

نیاز۔ جاوید بھائی سردی شروع ہو گئی ہے۔ انڈے مہنگے ہو گئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انڈے بھیجا کرو۔

جاوید۔ بھائی کوشش تو یہی کرتا ہوں۔ اب تو گھر کا دروازہ بھی ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

فیروز۔ (چونک کر) کیا فرمایا؟

نیاز۔ تمہارے گھر کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔

جاوید۔ نہیں بھئی۔ میں نے تو پندرہ دن قبل دیواریں بھی چھوٹی کرادی ہیں دو دو بلاک ہٹادئیے ہیں۔ پھر بھی زیادہ مرغیاں نہیں آتیں۔

نیاز۔ (جلدی سے) بھابی باسی روٹی کے ٹکڑے مرغیوں کو کھلاتی ہیں۔ اچھے قسم کا دانہ اگر کھلائیں تو۔

فیروز۔ (تیز لہجہ میں) جناب میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ نے مرغیاں پالی ہیں؟

جاوید۔ نہیں قبلہ۔ یہ دردِ سر کون مول لے۔

فیروز۔ (سوالیہ لہجہ میں) تو پھر آپ کے ہاں انڈے کہاں سے آتے ہیں جو آپ فروخت کرتے ہیں؟

جاوید۔ (سنجیدہ لہجہ میں) محلّے میں مرغیوں کی کمی تھوڑی ہے جناب۔ محلّہ کی ساری مرغیاں میرے گھر آجاتی ہیں۔ انڈے دیتی ہیں۔

فیروز۔ (درشت لہجہ میں) کیا فرمایا آپ نے۔ محلّہ کی مرغیاں۔ اس محلہ میں میرے علاوہ اور کسی کے ہاں مرغیاں نہیں ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم؟

جاوید۔ (خوشگوار لہجہ میں) جناب مجھے آم کھانے سے مطلب۔ پیڑ گننے کی کیا ضرورت؟

فیروز۔ (بگڑ کر) اس کا مطلب ہے کہ آپ میری مرغیوں کے انڈے فروخت کرتے ہیں۔ (نیاز سے) اور نیاز صاحب آپ چوری کے انڈے خریدتے ہیں۔

نیاز۔ (ہنستے ہوئے) قبلہ! انڈوں پر یہ لکھا تو نہیں ہوتا کہ یہ چوری کے انڈے ہیں۔

جاوید۔ (درشت لہجہ میں) قبلہ! آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ آپ مجھے چور کہیں۔ میں انڈے آپ کے گھر سے چرا کر نہیں لاتا ہوں۔

فیروز۔ (غصے سے) چوری اور سینہ زوری۔ ایک تو میری مرغیوں کے انڈے چرا کر بیچتے ہیں اور بھڑکتے ہیں کہ میں آپ کو چور کیوں نہ کہوں۔ جان کھول کر سن لیجئے۔ آئندہ میری مرغیوں کے انڈے شرافت سے میرے گھر بھیج دیا کیجئے۔ کیا سمجھے

جاوید۔ (لاپرواہی سے) ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے۔ انڈوں کے بعد میرا ارادہ ہے کہ میں مرغیاں بھی فروخت کیا کروں۔

نیاز۔ (جلدی سے) اچھی نسل کی مرغیاں ہیں اچھے داموں میں بکوا دوں گا جاوید بھائی۔

فیروز۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) شرم نہیں آتی آپ کو چوری کا درس دیتے ہوئے۔ کیا زمانہ آگیا ہے۔

جاوید۔ میں آپ کی مرغیوں کو بلانے نہیں جاتا ہوں قبلہ۔ وہ خود آتی ہیں۔ میرے گھر میں دن بھر چگتی ہیں۔

فیروز۔ (غصہ سے) ایسی کی تیسی ان مرغیوں کی۔ آج ہی سب کو بیچے دیتا ہوں۔ پھر دیکھوں گا کہ آپ انڈے کیسے بیچتے ہیں؟

[قدموں کی چاپ]

جاوید۔ (ہنستے ہوئے) ارے قبلہ! کہاں جارہے ہیں۔ سنیئے تو سہی۔ چائے تو پیتے جائیے۔

فیروز۔ (آواز دور سے) میں چوروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ آئندہ مجھے اپنی صورت نہ دکھائیے گا۔

[زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز]

نیاز۔ (ہنستے ہوئے) کہئے جاوید بھائی۔ اب تو آپ مانتے ہیں کہ ہم بھی ہیں آدمی کام کے۔

جاوید۔ ہاں بھئی۔ دو درجن انڈے تو خریدنا پڑے مگر کام بن گیا۔

[قدموں کی چاپ]

جمیلہ۔ (ہنستے ہوئے) اب وہ تمہیں سب میں بدنام کریں گے۔ ایک کی دس لگائیں گے۔ سارا محلّہ تمہیں چور سمجھے گا۔

جاوید۔ (ہنستے ہوئے) بدنام اگر ہوں گے۔

نیاز۔ (بات کاٹ کر) بھابی آپ تو چائے بنائیے۔ اور میرے حق میں دعائے خیر کیجئے۔

جاوید۔ (ہنستے ہوئے جلدی سے) کہ جلد از جلد ان کی مراد پوری ہو جائے۔ اور یہ صدر میں انڈے بیچا کریں۔ (مشترکہ قہقہے)

(فیڈ آؤٹ)

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

پروفیسر ابراہیم یوسف

ڈرامہ۔ (قسط نمبر ۲)

بادلوں کا سایہ

تیسرا ایکٹ

پہلا منظر

منظر: (ثاقب کے مکان کا وہی کمرہ۔ ثاقب بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے بیگم اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ کچھ دیر بعد)

بیگم :۔ نصرت کئی دن سے نہیں آیا کیا بات ہے۔

ثاقب : وہ مجھ سے ناراض ہوگیا ہے اور مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

بیگم :۔ کیوں ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

ثاقب :۔ (اخبار پر نظریں جمائے ہوئے) تم یہی چاہتی تھیں اور وہ ہو گیا

بیگم :۔ کل اس کی ماں آئی تھیں وہ کہہ رہی تھیں کہ کوئی نرس تجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی ہے۔

ثاقب :۔ ہاں ۔ اس لئے کہ میرے دکھوں پر اس نے آنسو بہائے تھے سب سے قیمتی آنسو۔

بیگم :۔ مگر میں اس آوارگی کو پسند نہیں کرتی۔

ثاقب :۔ تم تو یہ بھی پسند نہیں کرتیں کہ میں زندہ رہوں۔

بیگم :۔ (غصہ سے) کیا بکتا ہے میں نے اپنے لہو کے قطرہ قطرہ سے تیری زندگی کو سینچا ہے۔

ثاقب :۔ مگر میں مُردوں سے بدتر ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں۔ میں کسی سے پیار نہیں کر سکتا میں کسی کو چاہ نہیں سکتا لوگ مجھے بداخلاق اور بددیانت سمجھتے ہیں اور اب تو میرے مریض بھی میری صورت سے گھبرانے لگے ہیں۔ میں ایک ناکام ڈاکٹر ہوں ایک ناکام انسان۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ہے۔

بیگم :۔ آج بہت زیادہ زبان چلنے لگی ہے

ثاقب :۔ میری زندگی میں جو گھٹن ہے اگر اس کا علاج زبان چلنے سے ہو جائے تو کچھ مہنگا نہیں ہوگا۔

بیگم :۔ میں نے تیرے لئے کیا کچھ نہیں کیا زمانہ کے حوادث سے بچانے کے لئے میں نے اپنی جوانی کو بڑھاپے کی نذر کر دیا (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس لئے کہ ایک دن مجھے تیرے طعنے سننا پڑیں گے

ثاقب :۔ تم نے غلط کیا۔ مجھے بچپن ہی میں مر جانے دیا ہوتا کہ لوگ آج میرے باپ کی اس طرح کھوج نہیں کرتے جیسے کوئی کسی چور ڈاکو کی تلاش کرتے ہیں۔ میں لوگوں کو دکھلانے کے قابل نہیں ہوں۔ ہر شخص مجھ پر ایسی نظریں ڈالتا ہے جیسے میں سارے سماج کو گندہ کر رہا ہوں۔ آخر تم بتلاتی کیوں نہیں کہ میرا باپ کون تھا ؟

بیگم :۔ وہ ایک شریف خاندان انسان تھا کیا تجھ کو اس سے تسلی نہیں ہوتی۔

ثاقب :۔ میری تسلی سے سماج کی تسلی نہیں ہو جاتی (کھڑے ہو کر سانس بھر کر) میں تو یہی سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ وہ پاپی رہا ہوگا۔

بیگم :۔ (غصہ سے) خاموش رہ تجھے اپنے باپ کے متعلق ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔

ثاقب :۔ سماج کی طعن آمیز نگاہوں نے مجھے اسقدر بے شرم کر دیا ہے کہ اب میں شرم کو بکواس سمجھتا ہوں۔ اگر وہ ایک

شریف انسان تھا تو تم اس کو چھپائے کیوں رکھتی ہو

بیگم :۔ تیرے باپ کو مرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں اور ـــ

ثاقب :۔ (بات کاٹ کر) اور بیس سال سے وہ ایک معمہ بنا ہوا ہے تم ایک معمہ بنی ہوئی ہو اور ایک دن یہ معمے میری جان لے کر رہیں گے۔ (ایک دم بیگم کی طرف پلٹ کر) آج میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں اپنے باپ کے متعلق معلوم کر کے رہوں گا کہ وہ کون تھا۔

بیگم :۔ میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ شریف خاندان انسان تھا۔

ثاقب :۔ یہ میں کئی بار سن چکا ہوں لیکن آج یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھا کیا تھا۔ کیسا تھا۔ کیا کرتا تھا۔ اگر تم نے یہ سب کچھ نہیں بتلایا تو میں چلا جاؤں گا ہمیشہ کے لئے اور تم میری صورت پھر نہ دیکھ سکو گی۔

بیگم :۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ہاں میں نے تجھے اسی لئے تو پالا تھا کہ ایک دن تو مجھے چھوڑ کر چلا جائے۔

ثاقب :۔ نہیں۔ (طنزیہ) بلکہ اس لئے پالا تھا کہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں، آخر تم نے اس کو راز کیوں بنا رکھا ہے۔

بیگم :۔ میں نے کوئی راز نہیں بنا رکھا ہے۔ میں تیرے باپ کے متعلق تجھے سب کچھ بتلا چکی ہوں۔

ثاقب :۔ وہ کس کی تصویر تھی جو تم نے چھپا دی ہے۔

بیگم :۔ وہ تیرے باپ کی تصویر تھی اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسلئے ہٹا دیا۔

ثاقب :۔ بیس سال تک اس کی ضرورت تھی اب یکایک کیوں ضرورت نہیں رہی۔

بیگم :۔ اب تو مجھ سے بحث نہ کر۔

ثاقب :۔ (غصہ سے) کیوں بحث نہ کروں۔ تم نے مجھے دبایا میں دبتا چلا گیا۔ تم نے میری محبت چھین لی میں خاموش ہو گیا تم نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں میں نے اس کو برداشت کر لیا۔ لیکن آج میں دنیا کی نظروں میں گر گیا ہوں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ آخر میرا باپ چور ڈاکو اور قاتل نہیں تھا تو پھر اس کو راز بنانے کی کیا ضرورت ہے

(بیگم کوئی جواب نہیں دیتی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہے)

ماں! تمہارے ان آنسوؤں کی میں نے بہت قدر کی ہے مگر آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یا تو میں سب راز معلوم کر کے رہوں گا یا پھر اس گھر سے چلا جاؤں گا۔

بیگم :۔ اگر تو نے یہی فیصلہ کر لیا ہے تو چلا جا جہاں زندگی کے بیس سال دکھوں اور غموں میں گذارے ہیں وہاں دو چار سال جو باقی ہیں وہ بھی گذر جائیں گے۔

ثاقب :۔ (غصہ سے) مگر تم اپنی ضد کو نہیں چھوڑو گی۔

(گلریز داخل ہو کر)

گلریز :۔ اوہ ڈاکٹر ہم تمہارا انتظار کرتا کرتا اکتا گیا ہم نے سوچا آج اتوار ہے تمہارے ساتھ سینما چلے گا کیا تم کو فرصت ہے۔

ثاقب :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں گلریز۔ فرصت ہی فرصت ہے۔

گلریز :۔ تم صبح سے ہم کو نہیں ملا ہم بے چین رہا۔ (بیگم کی طرف دیکھ کر) یہ تمہارا مدر ہوتا ہے نا۔

ثاقب :۔ ہاں یہ میری ماں ہیں۔

گلریز :۔ تم اپنی ماں سے ہمارا انٹروڈکشن نہیں کرائے گا۔

ثاقب :۔ ضرور کراؤں گا (بیگم کی طرف دیکھ کر) ماں یہ سسٹر گلریز ہیں میرے اوپر بہت مہربان ہیں میرے دکھوں سے دکھی ہیں۔

بیگم :۔ (گلریز کو سر سے پیر تک دیکھ کر) یہی وہ نرس ہے جس کے متعلق نصرت کی ماں نے کہا تھا۔

ثاقب :۔ ہاں وہی ہیں۔

گلریز :۔ ڈاکٹر نصرت کی ماں بہت بھلا عورت ہے ہمارا بہت عزت کرتا ہے ہم جب بھی اس کے گھر جاتا ہے ہم سے بہت محبت کرتا ہے ڈاکٹر نصرت کی چھوٹی بہن تو ہمارا دوست ہو گیا ہے ہمیں اپنی برتھ ڈے پر انوائٹ کیا تھا۔

بیگم :۔ مگر یہاں تو کوئی لڑکی نہیں ہے جو تمہاری دوست بنیگی۔

گلریز :۔ ڈاکٹر ثاقب ہمارا دوست ہے ہم اس سے ملنے آیا ہے۔

بیگم :- تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم مردوں سے یوں ملتی جلتی پھرتی ہو۔

گلریز :- مرد ہم کو کھا تو نہیں جائے گا اور پھر ڈاکٹر تو ہم پہ بہت مہربان ہے ہم نے اس جیسا بھلا آدمی اپنی لائف میں نہیں دیکھا۔

بیگم :- مگر خدا کے لئے تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔

گلریز :- اوہ ہا ہا تم کیا بولتا ہے۔ ہم ڈاکٹر کے ساتھ کام کرتا ہے اسے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

بیگم :- تم کسی اور ڈاکٹر کے ساتھ کام کرو۔ نصرت کے ساتھ کام کرو۔

گلریز :- ہم اور ڈاکٹر سرجیکل میں کام کرتا ہے وہ میڈیکل میں ہے ہم اس کے ساتھ کیسے کام کر سکتا ہے۔ ہوشیار ڈاکٹر کے ساتھ کام کرنے میں ہم کو خوشی ہوتا ہے اور پھر یہ بالکل فرینڈ کی طرح ہم سے برتاؤ کرتا ہے ہم اس کو بہت پسند کرتا ہے۔ (ثاقب کی طرف دیکھ کر) کیوں ڈاکٹر تم بھی ہم کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔

ثاقب :- میں تم کو بہت پسند کرتا ہوں۔

گلریز :- (مسکرا کر) شائستہ سے بھی زیادہ۔

ثاقب :- ہاں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) شائستہ سے بھی زیادہ۔

گلریز :- وہ ایک دم لوور لڑکی ہے اونچا دماغ ہے ہم نے اس کی بیماری میں اس کا بہت خدمت کیا مگر وہ ہم سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا ہمارا احسان بھول گیا۔

ثاقب :- آجکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمانہ نے انسان کو بڑا خود غرض بنا دیا ہے۔

گلریز :- زمانہ مکار ہے ڈاکٹر جس کو ہم عزیز رکھتا ہے بہت محبت کرتا ہے وہ ایک دن ہم کو دھوکا دیتا ہے۔ تم تو ہم کو دھوکا نہیں دے گا۔

ثاقب :- نہیں گلریز میں تم کو دھوکا نہیں دوں گا۔ تم نے ہی میرے دکھوں پہ سچے آنسو بہائے ہیں وہ آنسو بہت قیمتی تھے بہت قیمتی اور جس نے بھی آنسو بہائے ہیں وہ خود غرضی کے آنسو تھے اپنی غرض کے آنسو مکاری کے آنسو مجھے دھوکا دینے کے لئے۔

(بیگم حسرت سے ثاقب کو دیکھتی ہے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں مگر انھیں پینے کی کوشش کرتی ہے)

گلریز :- تو آج تم پکچر دیکھنے نہیں چلے گا۔

ثاقب :- ضرور چلوں گا۔

بیگم :- نہیں آج تو سینما نہیں جائے گا۔

ثاقب :- کیوں نہیں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ تم نے میرے پیروں میں جو بیڑیاں ڈال رکھی تھیں انھیں میں نے توڑ دیا ہے۔

بیگم :- تو اپنی ماں کی بات نہیں مانے گا (آنکھوں میں آنسو بھر کر) یاد رکھ تمام زندگی پچھتائے گا۔

ثاقب :- اگر زندگی میں پچھتانا ہی لکھا ہے تو پچھتا بھی لوں گا اور آج تک زندگی میں کونسے سکھ دیکھے ہیں جو آئندہ کی امید رکھوں۔ (گلریز کی طرف دیکھ کر) آؤ گلریز چلو۔

بیگم :- دیکھ میں کہتی ہوں نہ جا ورنہ ماں کی بد دعا تجھے کھا جائیگی

ثاقب :- کوئی ایسی بد دعا دو کہ زندگی ایک ہی دن ختم ہو جائے یہ روز روز کی موت بہت تکلیف دہ ہے۔

گلریز :- تم کیسی ماں ہے اپنے بچے کو بد دعا کا بولتا ہے (ثاقب کو دیکھ کر) تم ایسا برا بات نہ بولے ڈاکٹر۔

بیگم :- (غصہ سے) تم چپ رہو۔ منحوس کہیں کی۔

ثاقب :- ماں ـــ

گلریز :- اوہ ہا ہا۔ یہ ہم سے کیوں لڑتا ہے۔ ہم نے اس کا برا کبھی نہیں چاہا۔ آؤ ڈاکٹر چلو اب ہم تمہارے گھر نہیں آئے گا۔ تمہارا مدر ہم سے کیوں لڑتا ہے۔

ثاقب :- بکواس کرتی ہیں۔

(گلریز کے ساتھ دروازہ کی طرف جاتا ہے بیگم چیخ کر)

بیگم :- دیکھ ثاقب نہ جا۔ (ثاقب پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا) تو سنتا ہے یا نہیں۔ (ثاقب اب بھی کوئی جواب نہیں دیتا) ثاقب! (ثاقب کمرے سے نکل جاتا ہے) اوہ میرے خدا۔

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

(پردہ)

دوسرا منظر

منظر :۔ (وہی کمرہ تین چار دن بعد۔ نصرت کرسی پر خاموش بیٹھا ہے۔ بیگم صورت سے پریشان معلوم ہوتی ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر بیگم آہستہ سے)

بیگم :۔ نصرت بیٹا! ثاقب تین دن سے گھر نہیں آیا اس کا کچھ پتہ ہے۔

نصرت :۔ وہ اسپتال کے کوارٹر میں پڑا ہوا ہے نوکری پر بھی نہیں آیا۔

بیگم :۔ بیٹا۔ خدا کے لئے اس کو سمجھا۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نہیں تو میں جان دے دوں گی۔

نصرت :۔ اس نے مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔

بیگم :۔ آخر اس کو ہو کیا گیا ہے (کچھ سوچ کر آنسو پونچھتے ہوئے) اس کم بخت نرس نے اس پر جانے کونسا جادو کر دیا ہے۔

نصرت :۔ دن رات اسی کے ساتھ رہتی ہے سارے اسپتال میں ان دونوں کے متعلق بڑے غلط چرچے ہو رہے ہیں۔ (کچھ سوچ کر) آپ جا کر اس سے وہیں کیوں نہیں مل لیتیں۔

بیگم :۔ میں نے بیس سال سے اس گھر سے قدم باہر نہیں نکالا۔ اب کیسے نکل پڑوں

نصرت :۔ یہ وقت ایسا نہیں ہے ماں کہ تم ان غلط اور بے معنی اصولوں میں پھنسی رہو (کچھ سوچ کر) اچھا میں عزیزالحسن صاحب کو فون کر کے بلاتا ہوں شاید وہ کوئی راستہ نکال سکیں۔

بیگم :۔ مگر نصرت بیٹا۔ ان کا یہاں آنا ـــــ

نصرت :۔ بس ماں اب ہم لوگوں کو کوئی راستہ تلاش کرنے دیجئے (فون کا رسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرکے) ہلو ـــ میں ڈاکٹر نصرت بول رہا ہوں۔ کون شائستہ بیگم۔ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ ذرا خانصاحب سے میری طرف سے عرض کر دیجئے۔ اچھا وہ یہیں بیٹھے ہیں۔ ذرا رسیور انھیں دیجئے۔ ہلو آداب عرض، ہے خانصاحب۔ میں ڈاکٹر ثاقب کے گھر سے بول رہا ہوں۔ آپ سے ایک فوری کام ہے۔ آپ یہاں آ جایئے۔ خدا کے لئے خانصاحب شکریہ۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں (رسیور رکھ کر بیگم کی طرف متوجہ ہو کر) ماں! خان صاحب بے حد ہمدرد اور شریف انسان ہیں۔

بیگم :۔ مجھے ان سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

نصرت :۔ کیوں ؟

بیگم :۔ یہ مجھے نہیں معلوم میں کچھ نہیں بتلا سکتی۔

نصرت :۔ لیکن وکیل سے تو سب کچھ کہہ دینا چاہئے کہ مقدمہ کی اچھی پیروی ہو سکے۔

بیگم :۔ لیکن میں کوئی مقدمہ نہیں لڑ رہی ہوں۔

نصرت :۔ لیکن کسی راز کو پوشیدہ رکھ کر آپ نے حالات کو بہت بگاڑ لیا ہے۔ جب تک حالات سے آگاہی نہ ہو اس بگاڑ کا سدھار ممکن نہیں ہے۔

بیگم :۔ مگر میں کن حالات پر روشنی ڈالوں۔

نصرت :۔ اس تصویر کا راز کیا ہے جس کو آپ نے یہاں سے اتار دیا ہے

بیگم :۔ وہ میرے شوہر کی تصویر تھی بار بار اس پر نظر پڑتی تھی اور دل کے زخم ہرے ہو جاتے تھے اسلئے اسے ہٹا دیا۔

نصرت :۔ لیکن آپ نے اس تصویر کو خاں صاحب سے کیوں چھپایا تھا

بیگم :۔ عزیزالحسن صاحب سے ؟

نصرت :۔ جی ہاں۔

بیگم :۔ میں نے کب چھپائی تھی ؟

نصرت :۔ ثاقب کہتا ہے کہ جب خان صاحب یہاں آئے تھے۔ آپ نے اس تصویر کو الٹ دیا تھا۔

بیگم :۔ میں نے کیوں الٹ دیا تھا یہ نہیں بتلایا اس نے۔

نصرت :۔ یہی تو وہ معلوم کرنا چاہتا تھا جو آپ نے نہیں بتلایا۔

بیگم :۔ لیکن اسے یہ جان کر کیا حاصل ہوگا۔

نصرت :- وہ اپنی تسکین چاہتا ہے۔

بیگم :- اسے کیا میری بات پر اعتبار نہیں۔

نصرت :- انہوں نے جس طرح آپ کی فرمانبرداری کی ہے ایسی کوئی دوسرا نوجوان نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی راز ہے تو آپ کو اسے بتلا دینے میں کیا حرج ہے۔

بیگم :- اگر کوئی راز ہے تو اسے میری خاطر راز ہی رہنے دینا چاہئے۔

نصرت :- اگر آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ اب اس کو یہ شک ہے کہ آپ اس کی اصلی ماں نہیں ہیں۔

بیگم :- (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اچھا تو اب میں اس کی ماں بھی نہیں رہی (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے نصرت خاموشی سے اسے روتا ہوا دیکھتا رہتا ہے بیگم کچھ دیر بعد خود پر قابو پا کر) اوہ میرے خدا یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا میں نے اسے اسی دن کے لئے پالا پوسا تھا کہ ایک دن وہ مجھے اپنی ماں بھی کہنے سے انکار کر دے۔

(دروازہ پر دستک، نصرت اٹھ کر باہر جاتا ہے۔ پھر دروازہ میں سے جھانک کر)

نصرت :- ماں خانصاحب آئے ہیں۔

بیگم :- (جلدی سے آنسو پونچھ کر) انہیں اندر بلا لو۔ (دوپٹہ سر پر برابر کرتی ہے۔ عزیزالحسن کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیگم کو سلام کرتے ہیں۔ بیگم سلام کا جواب دے کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھئے۔

(عزیزالحسن ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور بیگم کا چہرہ دیکھ کر)

عزیزالحسن :- آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔

بیگم :- جی نہیں بھلی چنگی ہوں۔

عزیزالحسن :- مگر آپ کی صورت سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ آپ عرصہ کی بیمار ہیں۔

نصرت :- ثاقب تین دن سے گھر نہیں آیا اسلئے پریشان ہیں۔ نوکر نے بتلایا کہ جب سے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔

عزیزالحسن :- (سوچ کر) سنا ہے وہ گرہن کے چکر میں پھنس گیا ہے

نصرت :- جی ہاں۔ دن رات اسی کے ساتھ رہتا ہے۔

عزیزالحسن :- مگر تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ خراب عورت نہیں ہے

نصرت :- بظاہر تو وہ بہت بھلی عورت ہے مگر اس کے پیٹ میں داڑھی ہے یہ اب پتہ چلا۔ (بیگم کھڑی ہوتی ہے۔ نصرت اسے دیکھ کر) آپ کہاں چل دیں۔

بیگم :- (دوسرے کمرہ کی طرف جاتے ہوئے) میں ابھی آتی ہوں۔

عزیزالحسن :- آپ اس وقت کوئی تکلیف نہ کیجئے گا۔ (بیگم کوئی جواب نہیں دیتی اور دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے) ان کی حالت تو بہت خراب ہو گئی ہے

نصرت :- بے حد پریشان ہیں

عزیزالحسن :- لیکن یہ ڈاکٹر ثاقب کو ہو کیا گیا ہے۔ اس کی فرمانبرداری اور شرافت کی تو لوگ مثال دیا کرتے تھے۔

نصرت :- جس دن آپ نے اس کے باپ کے متعلق کہا تھا کہ وہ چور ڈاکو اور قاتل نہیں تھا تو پھر اس کو راز کیوں بنایا جا رہا ہے اسی دن سے ڈسٹرب ہے۔

عزیزالحسن :- (سوچتے ہوئے) یہ کسی مبہم تصور سے خوفزدہ ہیں ان کا بیس سال تک گھر سے نہ نکلنا۔ تصویر کو چھپا دینا نجم الدین کے متعلق کچھ نہ بتلانا اور ڈاکٹر ثاقب پر اسقدر کڑی نگرانی یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ ضرور کسی راز کو چھپایا جا رہا ہے۔

نصرت :- اگر ایسا ہے تو۔

عزیزالحسن :- ایسا ضرور ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ ثاقب کی محبت میں کیا جا رہا ہے

نصرت :- (حیرت سے) ثاقب کی محبت میں!

عزیزالحسن :- شاید انہیں خوف ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کا اثر اس کی زندگی پر نہ پڑے (بیگم چائے لے کر آتی ہے عزیزالحسن اسے دیکھ کر) اسے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی

بیگم :- تکلیف کیا ہے۔

عزیز الحسن :۔ آپ دیکھ کر پریشان ہیں۔
بیگم :۔ اب پریشانیاں تو زندگی کے ساتھ ہیں۔
عزیز الحسن :۔ (مسکرا کر) بعض پریشانیاں انسان کی خود ساختہ ہوتی ہیں
بیگم :۔ (چائے بنا کر دونوں کو دیتے ہوئے) بعض انسان کی مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔
عزیز الحسن :۔ لیکن مجبوریوں سے ایسی بھی کیا محبت کہ جن کا اثر زندگیوں کے بننے اور بگڑنے سے ہو جائے۔
بیگم :۔ انسان تو زندگی بنانے ہی کی فکر میں رہتا ہے۔
عزیز الحسن :۔ اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے جس سے اس کی زندگی بگڑ جاتی ہے
بیگم :۔ کبھی کسی دوسرے کی غلطی سے بھی تو زندگی بگڑ جاتی ہے۔
عزیز الحسن :۔ ایسی غلطیوں کو سدھارا بھی تو جا سکتا ہے۔
بیگم :۔ بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو سدھارا نہیں جا سکتا۔
عزیز الحسن :۔ (چائے کا گھونٹ لے کر) کوئی غلطی ایسی نہیں ہوتی جو سدھاری نہ جا سکے (بیگم کا چہرہ غور سے دیکھ کر) ثاقب جیسا آپ کا بچہ ہے ویسا ہی میرا جتنا آپ کو عزیز ہے اتنا ہی مجھ کو اس کو بگڑتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی اسی قدر دکھ ہوگا جس قدر آپ کو۔ آپ کم از کم مجھے وہ راز بتلا دیجئے کہ اس کا علاج کیا جا سکے۔
(بیگم ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ عزیز الحسن اور نصرت دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد خود پر قابو پا کر)
بیگم :۔ کوئی راز نہیں ہے بھائی صاحب۔ کوئی راز نہیں ہے۔ خدا کے لئے آپ اس بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے
عزیز الحسن :۔ تو پھر مجھے وہ تصویر بتلا دیجئے جو آپ نے مجھ سے چھپائی تھی۔
بیگم :۔ وہ تصویر میں نے ضائع کر دی ہے
عزیز الحسن :۔ یہ ممکن نہیں ہے (کھڑے ہو کر ٹھنڈی سانس بھر کر) آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ ثاقب کی زندگی تباہ کر دیں، وہ اس غم کو اپنے سینہ میں لئے پھرے کہ اس کا باپ جانے کون تھا۔ کیسا تھا کہاں تھا۔ اور اس نے زندگی میں ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ کے متعلق کچھ بتلانا نہیں چاہتی۔ ثاقب ایک بہت اچھا لڑکا ہے مگر آج بعض اس کی صورت سے بھاگنے لگے ہیں وہ بد اخلاق ہوتا جا رہا ہے۔ وہ شریف انسان تھا مگر آج لوگ اس پر انگلیاں اٹھانے لگے ہیں کہ وہ ایک معمولی (رس کے چکر میں پھنس گیا ہے (بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) آپ کے اس طرح آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آنسو نہ کسی غم کا علاج ہو سکتے ہیں اور نہ کسی غم کا مداوا۔ آپ یہی چاہتی ہیں کہ ثاقب ایک باعزت زندگی گزارے لیکن آپ ایسے حالات پیدا کرتی جا رہی ہیں کہ آج لوگ اس کی طرف سے شک کرنے لگے ہیں۔ اس کی زندگی کیچڑ اور دلدل میں پھنستی جا رہی ہے اور اگر آپ نے جلد اپنی غلطی کو محسوس نہیں کیا تو ایک دن سوائے افسوس کرنے کے اور کچھ نہیں رہ جائے گا۔ (ایک دم پلٹ کر) مسٹر نجم الدین کیا کرتے تھے۔
بیگم :۔ (غیر اختیاری طور پر) بینک میں منیجر تھے۔
عزیز الحسن :۔ (سوچتے ہوئے) بینک میں منیجر تھے۔ (بیگم اپنی غلطی کا احساس کر کے سر پکڑ لیتی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بینک میں منیجر تھے مگر کس بینک میں۔
(بیگم کوئی جواب نہیں دیتی اور روتی ہوئی اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے عزیز الحسن سوچتے ہوئے جیسے خود سے کہہ رہے ہوں) بینک میں منیجر تھے۔ بینک منیجر۔ ٹھیک ہے (مسکرا کر) کچھ پتہ تو چلا آج سے بیس سال پہلے بینک منیجر (نصرت کی طرف دیکھ کر) آؤ ڈاکٹر چلیں۔
(دونوں دروازہ کی طرف چلتے ہیں)
(پردہ)
تیسرا منظر
منظر :۔ (وہی ثاقب کے مکان کا کمرہ۔ کچھ دن بعد۔ نصرت اور بیگم دونوں خاموش بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد)
نصرت :۔ ماں! میں نے اس کو لاکھ سمجھایا مگر وہ گھر آنے پر رضامند نہ تھی وہ اصلاحات جب

بیگم :۔ [illegible] اپنی ماں کا بھی خیال نہیں۔ (نصرت بیگم کی شکل دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ان کو اپنے دوپٹہ کے پلو سے پونچھ کر) کیا میں نے اس کو اسی دن کے لئے پالا تھا کہ وہ ایک دن مجھے یوں چھوڑ کر چلا جائے۔

نصرت :۔ جس روز سے وہ گھر نہیں آیا ہے خود بیمار دکھائی دیتا ہے۔

بیگم :۔ بیمار !

نصرت :۔ سست سست سا اپنے کوارٹر میں پڑا رہتا ہے نہ اس کو اپنی پرواہ ہے نہ نوکری اور مریضوں کی۔ آپ چل کر اس سے ملئے آخر وہ آپ کی اولاد ہے۔

بیگم :۔ مگر میں اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

نصرت :۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب آپ کو فرودے کر جاؤں گا میں نے اس کو واپس لانے کی کوشش کی مگر وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔

بیگم :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) تو پھر میری کہاں سن لے گا۔ اگر ایسا سننے والا ہی ہوتا تو یوں گھر چھوڑ کر کیوں جاتا۔

نصرت :۔ آخر آپ کو وہاں چلنے میں کیا اعتراض ہے۔

بیگم :۔ میں نے اس گھر کو چھوڑ کر کہیں جانے کی قسم کھا رکھی ہے۔

نصرت :۔ آپ نے ایسے ہی فضول قسم کے تصورات اور خیالات سے یہ حالت پیدا کر لی ہے کہ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک مسئلہ ابھی سلجھا نہیں ہے کہ گلریز کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔

بیگم :۔ تو وہ ابھی اسی کے ساتھ ہے۔

نصرت :۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ وہ اسقدر آسانی سے اس سے جدا ہو جائیگی آپ نے شائستہ جیسی اچھی لڑکی کو نظر انداز کیا اور اس کے بدلے میں گلریز کو قبول کرنے کو تیار رہیں اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

بیگم :۔ لیکن میں نے اس سے کب کہا تھا کہ وہ گلریز کے چکر میں پھنس جائے

نصرت :۔ آپ نے تو نہیں کہا تھا مگر حالات ضرور ایسے پیدا کر دیئے تھے۔ اگر وہ اسی طرح اس کے چکر میں پھنسا رہا تو اس کا سارا کیریر تباہ ہو جائے گا۔

بیگم :۔ بیٹا کسی طرح اس کم بخت نرس کو اسکے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر۔

نصرت :۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ میری سنتا بھی ہو۔ اسے تو اب جیسے میری صورت سے نفرت ہو گئی ہے کل ہی وہ مجھے برا بھلا کہنے سے نہیں چوکا۔

بیگم :۔ تو برا نہ ماننا آخر بچپن کا تیرا دوست ہے۔

نصرت :۔ یہی سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں ــــ ماں ! اب آپ کو اس گھر سے نکلنا ہوگا۔ (دروازہ پر دستک۔ نصرت اٹھ کر باہر جاتا ہے۔ پھر دروازہ میں سے جھانک کر) خاں صاحب آئے ہیں اندر بلا لوں (بیگم گردن ہلا کر اشارہ کرتی ہے اور دوپٹہ سر پر برابر کرتی ہے) آیئے خاں صاحب (دونوں کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ نصرت ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھئے۔

(عزیز الحسن کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) کہئے شائستہ بیگم کا مزاج اب کیسا ہے۔

عزیز الحسن :۔ اب تو ٹھیک ہے۔

نصرت :۔ کل میں آپ کے یہاں حاضر ہوا تھا آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

عزیز الحسن :۔ ہاں کل ہم لوگ ایک تقریب میں چلے گئے تھے لوکر نے تمہارے آنے کے بارے میں کہا تھا پھر میں نے فون کیا مگر تم نہیں ملے۔

نصرت :۔ کوئی ضروری کام تھا۔

عزیز الحسن :۔ نہیں ایسا کوئی ضروری کام تو نہیں تھا کچھ سوچ کر میرا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ چل کر ڈاکٹر ثاقب سے مل لوں۔ تم اس سے ملے۔

نصرت :۔ میری تو ہر روز ہی اس سے ملاقات ہوتی ہے مگر جانے اسے کیا ہو گیا ہے اب اس وقت ماں کے پاس آیا تھا کہ انھیں لے جاؤں شاید وہ ان کی بات مان لے مگر یہ جانے کو تیار نہیں۔

عزیز الحسن :۔ آخر آپ کو وہاں جانے میں کیا اعتراض ہے۔

بیگم :۔ بیس سال پہلے جو قسم کھائی تھی اس کو ــــ

عزیز الحسن :۔ (بات کاٹ کر) وہ قسم نہیں تھی آپ کا وہم تھا۔ جب انسان روپیہ پیسے کا حساب رکھتا ہے تو اس سے بھول بھی ہوتی ہے۔

بیگم :۔ لیکن یہ بھول نہیں تھی۔
عزیز الحسن :۔ تو پھر اور کیا تھی۔
بیگم :۔ اگر انھوں نے صرف اوور ڈرافٹ دیا تھا تو ان کو سزا کیوں ہوتی
عزیز الحسن :۔ اوور ڈرافٹ ! (مسکراتے ہیں بیگم ایک دم اپنا سر پکڑ لیتی ہے جیسے اس نے بڑی غلطی کی ہو۔ عزیز الحسن ایسے خاموش رہتے ہیں جیسے کچھ سوچ رہے ہوں پھر ایک دم جیسے پورا واقعہ یاد آگیا ہو) اوہ تو یہ وہ واقعہ ہے۔ دیکھئے وہ مقدمہ میں نے ضرور قائم کیا تھا مگر جانتا تھا کہ مقدمہ کمزور ہے اور اپیل میں ختم ہو جائے گا۔
بیگم :۔ مگر ان کو سزا ہوئی وہ جیل گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا دنیا تو یہی جانتی ہے۔
عزیز الحسن :۔ دنیا ایسے واقعات کو بہت جلد بھول جاتی ہے میں خود اس واقعہ کو بھول چکا تھا اور اگر آپ یاد نہ دلاتیں تو شاید کبھی کبھی یاد نہ آتا۔ (ہنس کر) آپ نے اتنے سے واقعہ سے اسقدر بڑا اثر قبول کر لیا کہ ساری زندگی تباہ کر دی۔
بیگم :۔ مگر میں نے تو ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ میں سماج کی نظروں میں گر گئی ہوں۔
عزیز الحسن :۔ (ہنس کر) آپ نے کبھی سماج میں آنے کی کوشش نہیں
(گلریز داخل ہوتی ہے اسے دیکھ کر عزیز الحسن اور بیگم کے چہرہ پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں)
گلریز :۔ اوہ خانصاحب آپ بھی یہاں ہے (بیگم کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر بیمار ہے تم اسے دیکھنے تک نہیں آیا۔
بیگم :۔ (طنزیہ) جب تم دیکھ بھال کر رہی ہو تو میری کیا ضرورت ہے۔
گلریز :۔ جب تم نہیں آئے گا تو ہم کو دیکھنا ہی پڑے گا۔ مگر وہ تم کو بہت یاد کرتا ہے۔
بیگم :۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو خود کیوں نہیں چلا آتا۔
گلریز :۔ وہ تم سے ناراض ہے کہتا ہے کہ اب اس گھر میں نہیں آئے گا۔
بیگم :۔ اگر وہ ناراض ہے تو رہا کرے۔ اگر بیٹے کو ماں کی پرواہ نہیں تو ماں بیٹے کی پرواہ کیا کرے۔
گلریز :۔ بیٹا لوگ تو ایسی باتیں کرتا ہی ہے مگر ماں لوگ اسے بھول نہیں جاتا وہ بہت پریشان ہے
بیگم :۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔
گلریز :۔ (عزیز الحسن کی طرف دیکھ کر) خاں صاحب تم انھیں سمجھائے یہ جاتا کیوں نہیں (نصرت کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر تم یہاں ہے اور تمہارا دوست وہاں بیمار پڑا ہے۔
نصرت :۔ میں ابھی آؤں گا سسٹر
گلریز :۔ تم خاک آئے گا۔ کل سے تم نے شکل نہیں دکھایا ہم اس کو سمجھاتا ہے مگر وہ ہماری سنتا نہیں الٹا بولتا ہے۔
نصرت :۔ تم چلو سسٹر میں ابھی آتا ہوں۔
گلریز :۔ تم جلدی آئے گا۔ ہم ڈاکٹر کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ ہمیں رات کو نیند نہیں آتا۔
نصرت :۔ اچھا اچھا سسٹر میں ابھی آتا ہوں۔ تم چلو۔
گلریز :۔ اچھا بابا ہم چلتا ہے پر تم جلدی آجانا۔
نصرت :۔ اچھا۔ (گلریز چلی جاتی ہے نصرت بیگم کی طرف دیکھ کر) آپ کا چلنا بہت ضروری ہے۔
بیگم :۔ میں نہیں جاؤں گا۔
عزیز الحسن :۔ آپ تو بلا وجہ کی ضد کرتی ہیں۔ مجبوری میں سب کو اپنی قسم توڑنا پڑتی ہے (بیگم سوچنے لگتی ہے۔ عزیز الحسن کچھ دیر خاموش رہ کر) اچھا آپ شام تک سوچ لیجئے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اب آپ کو ایسے غلط اور فضول تصورات چھوڑ دینا چاہئیں (نصرت کی طرف دیکھ کر) آیئے ڈاکٹر ہم چلیں اگر اس کو اس نرس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو پھر حالات اور بگڑ سکتے ہیں (نصرت اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ عزیز الحسن بیگم کی طرف دیکھ کر) شام کو آپ کو چلنا ہی ہوگا۔
(دونوں چلے جاتے ہیں۔ بیگم دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھنے لگتی ہے۔
(پردہ گرتا ہے) (باقی آئندہ)

سائنسی کہانی

انسانی بھیجا

تلخیص و ترجمہ

احمد صغیر صدیقی

اس نے لمحہ بھر رُک کر مجھے دیکھا اور پھر کہا — انسانی دماغ کو قابو میں کر کے سب کچھ کیا جا سکتا ہے میرے منصوبہ میں مشین سے زیادہ اہم شے انسانی دماغ ہے۔ بس انسانی بھیجا مل جائے تو میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو میں نے تھیوری میں پیش کیا ہے ....

یہ اب سے کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔

اس دن میں نے پہلی بار اس گلی میں مسٹر گرفی کو دیکھا تھا — وہ یقیناً ایک عجیب اور دلچسپ سا شخص تھا۔ ورنہ بھلا مجھ جیسے مصروف آدمی کے لئے کسی کو دیکھ کر یاد رکھنا آسان کام نہ تھا دیکھئے نا میں بار میں کاؤنٹر پر بیٹھتا ہوں۔ عام طور سے میرے بار میں خاصی بھیڑ رہتی ہے اور طرح طرح کے گاہک روز آتے جاتے رہتے ہیں ایسے میں میرے لئے یہ بیحد مشکل ہے کہ میں کسی کو پہلی بار دیکھ کر ہمیشہ یاد رکھوں۔

لیکن مسٹر گرفی کا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ وہ مجھے عجیب ہی لگا تھا۔ ورنہ بھلا میں اسے یاد کیونکر رکھتا۔

وہ ایک خاموش سی دوپہر تھی، اس دن بار میں زیادہ لوگ موجود نہ تھے۔ پھر یکایک میری نظر اس پر پڑی تھی۔ وہ سیدھا چلتا میرے کاؤنٹر کے قریب والے کیبن میں جا بیٹھا تھا۔ لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات تو نہ تھی...... عجیب چیز تو یہ تھی کہ میں نے اس سے پہلے کسی ایسے آدمی کو نہ دیکھا تھا جو بار میں اپنے ساتھ کوئی پندرہ سولہ پاؤنڈ وزن کا آہنی کباڑ بھی لیکر گھسا ہو۔ جی ہاں اس کے ہاتھ میں استعمال شدہ لوہے کا ایک خاصا بڑا وزن دبا ہوا تھا۔ جسے اس نے بڑے احتیاط سے اپنی کرسی کے قریب رکھ دیا تھا یہ کباڑ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ اس میں ٹین کا کچھ سامان بھی تھا چند ٹیڑھے میڑھے تار تھے اور اس میں ایک ٹوٹا پھوٹا سا انجن بھی شامل تھا۔

یہیں سے مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ یہ آدمی پانچ فٹ سے زیادہ لمبا نہیں تھا۔ سر کے بال اُڑے ہوئے تھے اور عمر میں ادھیڑ ہی کہا جا سکتا تھا۔ بدن کچھ ایسا فربہ نہیں تھا۔ البتہ دبلا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے بدن پر پہلی جنگ عظیم کے کسی مردہ سپاہی کی وردی تھی۔ ویسے یہ وردی صاف ضرور تھی۔ پھر اس نے بیرے کو ایک گلاس ٹھنڈے مشروب کا آرڈر دیا تھا۔ پھر بیرے کے جانے کے بعد اس نے جیب سے ایک پنسل اور کاپی نکالی تھی اور خدا جانے کیا لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے اندازے سے سوچا تھا کہ شاید وہ حساب کتاب کر رہا ہے۔

اس عرصے میں کچھ لوگ اندر آگئے تھے اور پھر میں اُن کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنا عرصہ کام میں لگا رہا۔ ویسے دو گھنٹے تو ضرور لگ گئے ہوں گے۔ پھر میں اُدھر دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ اب بھی اپنی جگہ بیٹھا بدستور حساب کتاب لگانے میں مگن تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ "بار" میں ہونے والی ریکارڈنگ سے بھی بے نیاز سا لگ رہا تھا — میری نگاہیں اُدھر ہی لگی تھیں۔ یکایک اس نے میری جانب دیکھا تھا اور اشارہ سے مجھے بلایا — میں جب اس کے نزدیک پہنچا تو اُس نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے .... کیا آپ لاؤڈ اسپیکر کو آہستہ نہیں کر سکتے؟"

"اوہ کیوں نہیں —" میں اس کے عجیب و غریب لہجے سے متاثر ہو کر بولا تھا......

اور پھر میں نے آواز مدھم کر دی تھی۔

لیکن اسی وقت اسٹاکوسکی وہاں آدھمکا تھا۔ اسٹاکوسکی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح پتا تھا۔ اس کے پاس بار کے قریب ہی دو بلڈنگیں تھیں جنہیں اس نے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ ان ہی میں سے ایک بلڈنگ کے ایک کمرے میں خود بھی رہتا تھا۔ ویسے اسٹاکوسکی بار میں اپنا کافی وقت اور پیسہ خرچ کیا کرتا تھا .... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اسٹاکوسکی نے اسی وقت آکر مجھ پر برسنا شروع کر دیا .... اس کا کہنا تھا کہ آخر میں نے ریکارڈنگ سلو کیوں کر دی ہے۔

پھر اس سے پہلے کہ میں جواز پیش کروں ـــــ سامنے کے کیبن سے نکلتے ہوئے میرے عجیب و غریب گاہک نے اسٹاکوسکی کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا "دیکھئے .... یہ میری درخواست پر مدھم کر دی گئی تھی ....."

"اچھا ـــ !" اسٹاکوسکی نے اسے گھورا تھا۔ "اور تم ہو کون؟"

"اوہ ...." اس نے آہستہ سے کہا تھا ـ "آپ تو مجھ سے واقف ہیں ...... کل میں نے ہی تو آپ کے مکان کی اوپری چھت اپنی رہائش کے لئے کرائے پر لی ہے۔"

اسٹاکوسکی نے اسے دوبارہ گھورا تھا۔ "اچھا ..... تو وہ تم ہو تم نے تو ایک ماہ کا کرایہ بھی پیشگی دیدیا ہے .... لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا .... میں ریکارڈنگ سننا چاہتا ہوں۔"

"اوہ مسٹر اسٹاکوسکی ـــ" اس عجیب سے شخص نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ـــ "دیکھئے میں ایک انتہائی پیچیدہ سوال حل کر رہا ہوں، شور سے میرے خیالات بٹ جاتے ہیں !!"

مگر اسٹاکوسکی ان آدمیوں میں سے تو تھا نہیں جو اس طرح کی بات کو سمجھ جاتا۔ اس نے ضد کرنی شروع کر دی تھی .... "میں تو آواز بلند کراؤں گا ...... دیکھوں مجھے کون روکتا ہے !" پھر اس نے آگے جھک کر آواز بڑھا دی۔

جواب میں میرا عجیب گاہک یکدم مڑ کر اپنے کیبن میں جا گھسا تھا۔ کیبن سے وہ دوسرے ہی لمحے واپس بھی آگیا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ایک فٹ لمبا چھرا بھی دبا ہوا تھا۔ یہ چھرا دوسرے چاقوؤں سے یقیناً مختلف تھا۔ اس کی نوک تیز تھی اور دھار بھی خاص تیز لگتی تھی۔ میرا خیال ہے اس نے اپنے کباڑ میں سے ہی یہ چیز برآمد کی تھی۔

چھرا نظر پڑتے ہی اسٹاکوسکی کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس نے پیچھے

کھسکتے ہوئے بار بار کہا تھا ...... "اچھی بات ہے ..... اچھی بات ہے"

پھر یہ تماشا آگے نہیں بڑھا کیونکہ عجیب و غریب گاہک خوفزدہ ہو کر اپنا بازو سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا تھا ـــــ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہ تھا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد ہی اسٹاکوسکی پیچ و تاب کھانے لگا۔ اور درشت لہجہ میں سوال کیا۔

"یہ گوفی تھا ...... میرا اپنا کرایہ دار اس نے میرے مکان کا اوپری حصہ کرائے پر کل ہی لیا ہے۔ پتا نہیں کیسا شخص ہے ان سرد دنوں میں کھلی چھت پر رہنے کی تک سمجھ میں نہ آئی مجھے تو یہ شخص قطعی پاگل معلوم ہوتا ہے ـــ کل سارا دن طرح طرح کا آہنی کباڑ ڈھو ڈھو کر یہ چھت پر پہنچاتا رہا ہے ...... میں نے اس سے پوچھا تھا کہ سب کیا ہے؟ جواب میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کوئی چیز بنا رہا ہے ..... مگر اس نے چیز کا نام بتانے سے انکار کر دیا تھا .... اور اس کا نام گوفی نہیں ہے .... خدا جانے اس کا کیا نام ہے ..... یہ نام تو میں نے اس کے پاگل پن کی باعث خود اپنے ذہن سے سوچا ہے۔ یقیناً کریک ہے یہ شخص !!"

اسٹاکوسکی اسی طرح کی باتیں دیر تک کرتا رہا یہیں سے مجھے پتا چلا تھا کہ گوفی دراصل میرا پڑوسی بھی ہے کیونکہ اسی بلڈنگ میں نیچے ایک کمرے میں میں بھی رہتا تھا .... میں نے چھت پر جانے والے زینے دیکھے ضرور تھے۔ لیکن کبھی اوپر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بہرحال یہ اطلاع میرے لئے نئی تھی۔

اس دن کے بعد سے خدا جانے کیوں مجھے اس شخص گوفی کی خاصی کھوج رہنے لگی لیکن میں نے اسے نہ تو بار ہی میں دیکھا۔ اور نہ گھر پر۔ البتہ راتوں میں مجھے اپنے کمرے کے اوپر چھت پر اکثر ایسی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا۔ کہ گوفی اوپر موجود ہے وہ تقریباً ساری رات جاگتا رہتا ہوگا مجھے راتوں میں بار بار کسی چیز کو ٹھوکنے کی آوازیں اکثر سنائی دیتی رہتی تھیں کبھی یوں لگتا جیسے کسی وزنی شے کو کھینچا جا رہا ہو۔ کبھی ایسی آوازیں سنائی دیتیں جیسے کوئی انجن آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔ یوں مجھے لگتا کہ وہ ساری رات کام میں مصروف رہتا تھا ـــ پتا نہیں وہ کیا چیز بنا رہا تھا؟ اور وہ آہنی اشیاء کباڑ کی شکل میں لا کر اوپر ڈھیر کرتا جا رہا تھا معلوم نہیں وہ یہ سامان کہاں سے خریدتا تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد وہ بار میں مستقل طور پر دکھائی دینے لگا تھا وہ دراصل روز کا ناگا نہ آتا تھا۔ وہ روز وقت پر آتا۔ اور پھر کھانے کے بعد تین گھنٹے وہیں جم کر خدا جانے کا غذ پر کیا جوڑتا گھٹاتا رہتا تھا .....

اس کے بارے میں عجیب عجیب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ انہیں دنوں جبکہ میں گھر پر تھا ایک روز دروازہ پر اسٹاکوسکی نے دستک دی...... پھر اندر آکر اس نے مجھے بتایا کہ کون اس وقت کہیں گیا ہوا ہے..... اور میرا پروگرام ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں پتا چلایا جائے کہ آخر یہ شخص چھت پر کیا کرتا رہتا ہے۔

پھر میں اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ یہ چھت کافی وسیع تھی۔ ایک جانب سائبان تھا اور بس۔ ہم جب اوپر پہنچے تھے تو ہمیں وہاں کا ماحول کچھ عجیب سا ہی دکھائی دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی ورکشاپ میں آگئے ہوں۔ ہر طرف آہنی جال، فلں، تار، ڈبے اور انجنوں کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ سامنے کی میز پر کاغذات کا ایک پلندہ دھرا تھا۔ جس میں نجانے کیا کیا لکھا ہوا تھا..... کہیں بنڈے تھے کہیں تار مولے ساتھ ہی ایک طرف کتابوں کا ایک انبار پڑا تھا یہ تمام کتابیں انجینئرنگ سے متعلق معلوم ہوتی تھیں اور کافی پرانی تھیں.... پھر ہماری نظریں کونے کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ جہاں ایک بہت بڑی مشین دھری تھی۔ بہت بڑی اس لئے کہ اس کی لمبائی ۔۔ فٹ سے کسی طرح کم نہ ہوگی ایک آدمی کے قد سے بھی زیادہ اس کی اونچائی تھی۔ اور جال، تار اور انجنوں کے بیچ میں کافی جگہ تھی۔ اس میں ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر مزے سے بیٹھا جا سکتا تھا۔ اس کرسی کے سامنے ہی ایک بڑا سا سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا جس میں بہت سے بٹن اور تار جڑے ہوئے تھے۔ اس کے چاروں طرف سپرنگ کوائل اور گلاس ٹیوب بکھرے ہوئے تھے......... یہ مشین واقعی عجیب سی تھی...... اور دیکھنے پر کافی متاثر کرتی تھی۔

"کمال ہے...... "میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا ــــ "ایک مہینے میں اتنی بڑی مشین تیار کر کے رکھ دی ہے اس شخص نے۔"

"ہوں ــــ" اسٹاکوسکی نے ناک سکوڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "کچھ ہو۔ میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا کل مہینہ ختم ہوگا ــــ اور میں اسے نکال باہر کروں گا۔ میں اپنے مکان میں پاگلوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

"مگر بھلا اتنی بڑی مشین نیچے کیسے اتر سکے گی" میں نے ... دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ وہ جانے ــــ میں اسے اب یہاں نہیں ٹھہرنے دوں گا۔" اسٹاکوسکی نے غصے سے کہا تھا ــــ "میں کل ہی اپنے آدمی بلوا کر اسے باہر نکال کروں گا۔" اس شیوا کے

میں اس دن رات گئے تک اس کی مشین کے بارے ہی میں سوچتا رہا تھا...... پھر یہ کوئی دس بارہ بجے رات کی بات ہے کہ مجھے سرگونی کی شکل دکھائی دی تھی۔ اس بار وہ اپنے کیبن میں گھسنے کے بجائے سیدھا میرے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

"آج کوئی عمدہ سی برانڈی پلا دو" اس نے درخواست کی تھی۔

"کیوں ــــ" میں نے پوچھا تھا..... "کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ــــ آج میں کافی خوش ہوں"

"مجھے تو بتاؤ ــــ" میں نے اصرار کرتے ہوئے دلچسپی ظاہر کی۔

"آج میں نے اپنا کام ختم کر لیا ہے۔ اور اب میں تیار ہوں کہ دنیا کے سامنے اپنے کارنامہ کو پیش کر سکوں۔"

"کون سا کارنامہ؟!!" میں نے مزید دلچسپی ظاہر کی۔

"ٹھیک ہے" اس نے جام کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا ــــ "تم میرے ساتھ اچھی طرح پیش آتے رہے ہو اس لئے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا.... ابھی تک میں کام میں لگا ہوا تھا۔ اور سب مجھ پر ہنس رہے تھے۔ لیکن اب کوئی بھی نہیں ہنس سکے گا....... یہ امریکہ کے بڑے بڑے لوگ جو خود کو پروفیسر کہتے ہیں۔ اور جنہوں نے میری تھیوری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا مجھے یقین ہے کہ اب میرے ایک ایک لفظ کو کان لگا کر سنیں گے.........
میری وہی تھیوری جو ان کے لئے بے معنی تھی۔ اب بے حد اہم بن جائے گی ــــ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں صحیح خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ لیکن انہیں خبر دی تھی...... اور اب میں اپنی تھیوری پر کام ختم کر چکا ہوں۔ ٹھیک ہے کہ میرے منصوبے کا ایک حصہ مشین بھی تھا۔ لیکن اہم چیز کوئی اور ہے...... میرے منصوبے میں مشین سے زیادہ اہم شئے انسانی دماغ ہے...... بس انسانی بھیجہ مل جائے تو میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو میں نے تھیوری میں پیش کیا تھا۔"

اس نے رک کر ایک چسکی لیتے ہوئے دوبارہ کہا تھا ــــ "اور جب میں نے انسانی دماغ کے حصول کا ذکر کیا تھا تو سب نے کان بند کر لئے تھے ــــ میں نے ان سے کہا تھا کہ دماغ کو قابو میں کر کے اسے مشینی ساز و سامان سے لیس کر کے سب کچھ کیا جا سکتا ہے ــــ مگر انہوں نے نہیں سنا تھا ... سب ہنس پڑے تھے ... خیر ... اب ... دیکھیں گے

کہ ہم میں سے کون صحیح تھا۔ اور کون غلط !!

اس نے لمحہ بھر رک کر مجھے دیکھا تھا۔ اور پھر سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اور میرے دوست ——— میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے آج کامیابی کے ساتھ دنیا کا پہلا خلائی جہاز تیار کر لیا ہے۔"

میں دل ہی دل میں اس کی باتوں پر ہنس پڑا تھا..... ارے تم مسٹر گونی کے گونی ہی !!

"اور اب میری مشین چاند پر اترنے کے لئے بالکل تیار ہے...... اگر میں چاہوں تو آج ہی چاند کی جانب روانہ ہو سکتا ہوں..... مجھے اب کسی شے کی ضرورت نہیں ہے...... صرف دماغی توانائی کی ضرورت ہے اور بس !! تم یقین کرو کہ انسانی دماغ لاانتہا توانائی کا مخزن ہے۔ ایسی توانائی کا مخزن جسے ابھی تک دریافت ہی نہیں کیا گیا ہے ——— اس کے سامنے اٹامک توانائی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

میں نے اس کی باتیں اوپری دل سے سنیں تھیں ——— بیچارہ مسٹر گونی واقعی پاگل ہے...... میں نے سوچا تھا اور مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی تھی پھر میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھو...... میں تمہیں ایک خاص بات بتاتا ہوں۔ اسٹاکوسکی تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے وہ تمہیں صبح ہی صبح نکالنے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ مجھے لسے تمہاری مشین سے چڑ ہو گئی ہے۔"

"مشین ؟" اس نے رک کر مجھے گھورا تھا ——— "مگر اسے مشین کے بارے میں کیا پتہ ؟"

"وہ اوپر گیا تھا....." میں نے اسے بتایا ——— "تمہاری عدم موجودگی میں۔"

"لیکن میں مشین کو اب وہاں سے ہٹا نہیں سکتا ؟ ——— اسے سوچنا چاہئے میں لوگوں کو بلانے والا ہوں۔ کہ وہ دیکھ سکیں میں اپنی مشین کی پرواز کا مظاہرہ کرنے والا ہوں۔

"کچھ بھی ———" میں نے پھر اصرار کیا ——— "وہ بے حد خراب شخص ہے اور شاید تمہیں کو بلانے گیا ہوا ہے۔ صبح ہی تم نکال دئے جاؤ گے"

"ہوں ——— [illegible] اداس ہو گیا...... "تم ٹھیک کہتے ہو [illegible] کچھ کرنا ہی ہوگا"

پھر وہ جیب سے پنسل اور کاغذ نکال کر حسب دستور کچھ جوڑنے گھٹانے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے کچھ تبدیلی کرنی ہوگی۔ صرف چند منٹ کی محنت..... اور پھر دنیا کو میری مشین کے بارے میں عملی ثبوت مہیا ہو جائیگا.... لیکن یہ میرے پلان کے مطابق بات نہ ہوئی...... افسوس !!"

"اچھی بات ہے......" یکایک وہ اٹھ گیا ——— "خدا حافظ"

میں اسے دروازہ سے نکلتے دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے بھی بار بند کرنے کا آرڈر دے دیا۔ میں خود بھی گھر جانا چاہتا تھا۔ رات کا کوئی ایک بجنے والا تھا۔

بار بند کراتے کراتے مجھے کوئی دو بج گئے تھے۔ باہر گلی سنسان پڑی تھی یہیں سے کوئی فرلانگ بھر دور پر اسٹاکوسکی کا مکان واقع تھا جس میں ایک کمرہ میرے قبضے میں تھا ——— میں گلی میں کوئی سا سو سو قدم چلا ہوں گا کہ یکایک ہوں ہوں...... !! ہلکی سی آواز فضا میں ابھری اور جیسے تھرا اٹھی۔ رات اندھیری اور منجمد تھی۔ اس لئے میں کچھ دیکھ نہ سکا مگر اوپر آسمان میں بکھرنے والی یہ آواز میں نے صاف سنی تھی۔

میں نے پہلے یہی سمجھا کہ شاید میرے اپنے مکان کے اندر ہی کوئی دھماکہ ہو گیا ہے پھر میں تقریباً دوڑتا ہوا بلڈنگ تک پہنچا بلڈنگ حسب سابق اندھیرے میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ تبھی میرے دماغ میں مسٹر گونی کا تصور ابھرا اور میں تیزی سے بغیر چھت کی جانب جانے والے زینوں پر دوڑتا ہوا اچھلتا چلا گیا تھا۔

پھر اوپر پہنچ کر سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا تھا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن چھت پر پہنچنے کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی وہاں مسٹر گونی کا نشان تک نہ تھا۔ وہ رخصت ہو چکا تھا ——— البتہ جابجا مختلف آہنی اشیا کے ٹکڑے ادھر ادھر بھی بکھری پڑی تھیں۔ جابجا جلے کاغذ بھی نظر آ رہے تھے شاید مسٹر گونی نے جاتے وقت اپنے نوٹ جلائے ہوں گے۔

سب سے بڑے تعجب کی چیز تو یہ تھی کہ وہاں وہ عظیم مشین ——— یا راکٹ موجود نہ تھا۔

میں نے قریب جا کر روشنی کرتے ہوئے دیکھا تھا تو جہاں مشین دھری تھی۔ وہاں زمین پر چاروں طرف جلے ہوئے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی ——— یہی نہیں بلکہ ایک وسیع گول دائرے کی شکل میں اس جگہ چھت پر ایک بڑا سا سوراخ

کی جھاڑی گمان نے دبا تھا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پھر میں نے اس واقعہ کو سنانے کے لئے مناسب سمجھا کہ جا کر اسٹاکوسکی کو جگا دوں پھر میں تقریباً دوڑتا ہوا نیچے اسٹاکوسکی کے کمرے تک پہنچا تھا ـــــ میں نے دروازے کو ہاتھوں سے تھپتھپایا تھا مگر وہ کھلتا چلا گیا تھا۔

اس کے بعد کے واقعات کو خوش گوار نہیں کہا جا سکتا۔

پولیس آئی اور خوامخواہ میرے ہی گلے پڑ گئی۔ وہ تو کہئے کہ بار کا مالک میرے کام آیا اور مجھے گلو خلاصی ہوئی۔

میں نے مسٹر گونی، اس کے خلائی جہاز اور چاند کے سفر وغیرہ کے بارے میں ہر چند بہت کچھ کہا تھا مگر پولیس نے میری ایک نہ سنی تھی۔ پھر میرے "باس" نے آکر میری جان چھڑائی تھی ـــــ اس دن کے بعد سے میں مسٹر گونی، اسٹاکوسکی اور اس دہشت ناک منظر کو بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا ہوں جو میں نے دیکھا تھا۔

جی ہاں اس رات میں نے ایک دہشت ناک منظر بھی دیکھا تھا.....

..... جب میں اسٹاکوسکی کے کمرے تک پہنچا تھا۔ تو مجھے دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔ میں جب اندر گھسا تھا تو اس وقت وہ یقیناً اندر ہی موجود تھا ...... لیکن وہ زندہ نہیں تھا۔ اس کی لاش کے نزدیک ہی مسٹر گونی کا وہ لمبا سا عجیب و غریب چھرا پڑا ہوا تھا۔ جو میں نے ایک روز بار میں جھگڑے کے دوران دیکھا تھا...

..... مسٹر گونی رات میں مجھ سے رخصت ہو کر یقیناً سیدھا اسٹاکوسکی کے پاس گیا ہوگا۔ اور پھر یہ بات تو سمجھ میں آہی جاتی ہے کہ اس نے اسٹاکوسکی کو ختم کیوں کیا لیکن اس کے بعد.........!

اس کے بعد......... جی ہاں آپ کا اندازہ میرے ہی اندازے کے مانند ہی ہے......... پولیس والے آج تک اس معاملے میں کوئی سراغ نہیں پا سکے ہیں حتیٰ کہ وہ مسٹر گونی کے اتے پتے تک سے واقف نہیں ہو سکے ہیں .... کوئی نہیں جانتا مسٹر گونی کون تھا کہاں سے آیا تھا......... اس نے واقعی مشین بنائی تھی یا نہیں۔ اگر بنائی تھی تو کیا وہ واقعی چاند کی جانب پرواز کر گیا تھا......... ہر معاملہ پر تا حال پردہ ہی پڑا ہوا ہے .... یہ باتیں کسی کو بھی معلوم نہیں ہو سکتیں۔ البتہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

مسٹر گونی نے اسٹاکوسکی کو صرف قتل ہی نہیں کیا تھا بلکہ جاتے جاتے وہ اس کا بھیجہ بھی نکال لے گیا تھا۔

جی ہاں......... اسٹاکوسکی کے سر میں ایک بڑے گول سوراخ کے سوا اندر کچھ بھی نہ تھا۔

اس کے اندر جو کچھ بھی تھا وہ مسٹر گونی اپنے ساتھ ہی لے چکا تھا پھر شاید اس نے اپنی مشین میں چند ایک تبدیلیاں کی ہوں گی جس میں اس کے چند منٹ خرچ ہوئے ہوں گے۔ اور پھر باقی مرحلے تو خود بخود آسان ہو چلے گئے ہوں گے کیونکہ بقول مسٹر گونی اس خلائی جہاز کو اڑانے کے لئے سب سے اہم شئے انسانی دماغ ہی تو تھا۔

(رابرٹ بلاک سے ماخوذ)

اس عنوان کے تحت
اردو جرائد میں شائع ہونے والی بہترین تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے (ادارہ)

• ● •

کرشن چندر

● — مجھے معلوم ہوا کہ انسان کی محبت بھی بدلتی ہے اگر اس کی سوجھ بوجھ، اس کی ذہنی سطح اور تجربے کے انداز بدل جائیں تو اس کی محبت بھی بدل جاتی ہے۔ بہت حیرت ہوتی یہ سوچ کر محبت بھی کوئی الوہی چیز نہیں ہے بلکہ ایک ذی روح شے ہے۔ اور جانداروں کے سارے قوانین اس پر عائد ہوتے ہیں۔

الشجاع

ایک دن من موہن سنگھ ہمیں لندن کی ہیرا منڈی دکھانے لے چلا۔ ایک بیس مینٹ (BASEMENT) میں سے گزار کر ہماری آنکھوں پہ پٹی باندھ کے دو تین غلام گردشوں میں چلتے ہوئے کبھی چند زینے اور چڑھتے ہوئے ہم لندن کی ہیرا منڈی میں پہنچے۔ جو پھر ایک بیس مینٹ میں واقع تھی اور میرے خیال میں اسی بلڈنگ میں تھی۔ یہ آنکھوں میں پٹی باندھنا اور بھول بھلیوں میں سے گزارنا محض ایک سنسنی کے خاطر تھا یا آتشِ شوق کو ہوا دینے کے لئے یا الف لیلوی ماحول پیدا کرنے کے لئے۔ یہ چکر بازی پولیس سے بچنے کے لئے نہیں تھی۔ لندن کی پولیس کسی طرح ہمارے ملک کی پولیس سے مختلف نہیں ہے۔ اس دنیا کا کون سا ایسا قحبہ خانہ ہے جو پولیس کی نظروں سے بچا ہوا ہے۔ پولیس سے مصلحت آمیز گریز کے بغیر اس طرح کا کاروبار کہیں بھی چل ہی نہیں سکتا۔

"ہیروں" کی اس منڈی میں ایک دوسرے سے ملحق چھ کمرے تھے اور ان میں چوکھٹے والیاں تھیں اور ان کمروں کے باہر ایک نیم دائرے کی صورت میں ایک چھتا ہوا برآمدہ گھومتا تھا جس میں جا بجا چوبی ستون کھڑے تھے۔ ایک پھول ہار گجرے والا۔ ایک عطر والا اور ایک پان والا بھی۔ یہ بھی اس برآمدے میں اپنی اپنی دوکان سجائے بیٹھے تھے۔ کسی چھوٹے سے فلمی سیٹ کی طرح اس چھوٹی سی جگہ میں ایک ہندوستانی قحبہ بازار کا مکمل نقشہ پیش کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی اور تجارتی اعتبار سے کامیاب بھی تھی۔ من موہن نے مجھے بتایا کہ اس کاروبار کو عبدالعزیز اور منسارام ساندے والا مل کر چلاتے ہیں۔ میں اسے ابھی جواب دینے ہی والا تھا کہ میری نظر چار نمبر کے کمرے کے اندر جو پڑی تو میں اس کوٹھے والی کو پہچان کر اندر چلا گیا۔

چند لمحے تو ہم دونوں حیرت میں ڈوبے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ کوٹھے والی اپنے سامنے رکھے ہوئے ستار کو پرے سرکا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر میری طرف بڑھی اور میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ رونے زور سے کہ سب لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

یہ درشنا تھی۔ میری۔ کالج کے زمانے کی محبوبہ! میرا مطلب ہے وہ میری محبوبہ تھی۔ میں اس کا محبوب نہیں تھا۔ کیونکہ میں ایک غریب متوسط گھرانے کا لڑکا تھا تھی تو درشنا بھی ایسی ہی۔ اس کا باپ ایک معمولی وکیل تھا۔ لیکن درشنا خوبصورت تھی۔ اس لئے وہ بہت اونچا اڑنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ مجھے کبھی پسند نہ کر سکتی تھی۔ پسند تو میں بھی اسے نہ کرتا۔ لیکن وہ زمانہ ایسا تھا جب مجھے لمبے قد کی چوڑی چکلی ہنس مکھ لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ ایسی لڑکیاں جو مجھ سے تن و توش میں کچھ ہی کم دکھتی ہوں۔ ایسا کیوں

تھا کہ کہ زمانے میں اب ایسا یقین نہیں ہے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان دنوں کالج کے کچھ زمانے میں ایسی ہی لڑکیاں پسند آتی تھیں۔ میں دل و جان سے درشنا پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ لیکن درشنا نے میرے پیار کو ٹھکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تو اسی لڑکے سے محبت کر سکتی ہے جو اسے لندن لے جائے۔ نہ جانے کیوں بچپن ہی سے درشنا کے دل میں لندن جانے کی تمنا تھی اور وہ ہمیشہ لندن کے خواب دیکھا کرتی تھی اور میں اسے لندن تو کجا لنڈی کوتل تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس لئے محبت کے بازار میں میری مساعی مشکور نہ ہو سکیں۔ وہ اپنے قد میں مجھ سے تین انچ اونچی تھی۔ اس لئے اس کے دیکھنے کی سطح بھی مجھ سے اونچی تھی۔ وہ ٹینس کی بہت اچھی کھلاڑی تھی۔ ہمارا کالج اس کا ٹشن مشنریوں کا کالج تھا۔ درشنا کا اونچا لمبا قد، اس کی بے باک ہنسی، مغربی عورتوں کی طرح اس کا تیز تیز چلنے کا انداز، گورا رنگ اور مضبوط بدن اسے "آوٹ ڈور گرل" کی تمام صفات سے متصف کرتے ہیے اور اس زمانے میں "ایک آوٹ ڈور گرل" میرے نزدیک اعلیٰ حسن کا معیار تھی۔ درشنا نے کبھی میری محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تھا۔ کبھی اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہ دیا۔ کبھی اپنے سر کو میرے کندھے پر نہیں رکھا۔ وہ میرے ساتھ کبھی سینما نہیں گئی تھی اس نے مجھے اپنا ہاتھ تک چومنے نہ دیا۔ کبھی اپنی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہ دی۔ کیوں کہ وہ لندن جانا چاہتی تھی اور میں اسے لندن نہیں لے جا سکتا تھا

اس نے جن دنوں یونیورسٹی کا میڈل جیتا تھا اور یونیورسٹی کی ساری لڑکیوں میں ٹینس کے سنگل میچ میں اول آئی تھی۔ ان دنوں ہمارے کالج میں پروفیسر میک فرسن صاحب نے درشنا کو چند ماہ کے لئے کالج کے خرچ پر ٹینس کے سلسلے میں مزید تربیت حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ شاید ان دنوں درشنا چلی بھی جاتی۔ اس نے نئے کپڑے سلوا بھی لئے تھے۔ پاسپورٹ بنوا لیا تھا۔ گھر والوں سے اجازت لے لی تھی۔ لیکن عین وقت پر نہ جانے کیا ہوا کہ درشنا کی جگہ مس روبی رام لعل چلی گئی۔ روبی ایک رئیس زادی تھی اور ٹینس کے کھیل میں درشنا کے بعد دوسرے نمبر کا اشیاء تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں میں موقعے پر پروفیسر میک فرسن نے درشنا کے سامنے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جسے درشنا پورا نہ کر سکی۔ لیکن جسے روبی نے پورا کر دیا۔ اس لئے روبی چلی گئی اور درشنا رہ گئی۔ لیکن اس بات کی تصدیق کبھی درشنا سے نہ ہو سکی۔ اصل واقعہ کیا تھا۔ درشنا نے مجھے کبھی نہ بتایا۔ اس کے لندن نہ جانے پر میں نے طنز کیا تھا تو وہ دانت پیس کر بولی تھی۔ "دیکھ لینا میں ایک دن لندن ضرور جاؤں گی۔" اس پر میں دیر تک ہنستا رہا اور وہ غصے سے ہونٹ چباتی رہی۔

دوسرے سال درشنا نے مشن کالج چھوڑ کر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں پر اس کی دوستی انگریزی کا پڑھانے والے لیکچرر نویت رام سے ہو گئی۔ نویت رام کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا تھا اور اب وہ ہندوستانی سول سروس میں آنے کی کوشش کر رہا تھا وہ درشنا پر بری طرح فریفتہ ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے جتنے چیتھ، دبو، کمزور طبیعت کے۔ لیکن علم و فضل میں اعلیٰ معیار رکھنے والے نوجوان ہوتے ہیں۔ انھیں درشنا ایسی لڑکیاں بہت بھاتی ہیں۔ نویت رام گھر کا امیر نہ تھا۔ لیکن ذہین ایسا تھا کہ اس کا سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ درشنا نے بہت سوچ سمجھ کے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ جب نویت رام ہندوستانی سول سروس کے مقابلے پر بیٹھا تو دوسرے نمبر پر امتیازی شان سے کامیاب ہوا۔ لیکن سول سرجن نے میڈیکل رپورٹ اس کے خلاف دی۔ اس لئے بے چارہ نویت رام ایک طرف سول سروس۔ دوسری طرف درشنا سے شادی کرنے میں ناکام رہا۔ اسی زمانے میں ایک دن درشنا مجھے ایکسلسر تھیٹر کے لاؤنج میں مل گئی۔ وہ پکچر دیکھ کر نکل رہی تھی اور میں پکچر دیکھنے جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے ہم دونوں ملے تھے۔ میرا خیال ہے وہ میری طنز برداشت کرنے کی تاب نہ لا کر دوسری طرف مڑ گئی تھی اور مجھ سے کوئی بات کہے بغیر ہجوم میں غائب ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو جھینپ کا رنگ آیا تھا اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

پھر بہت سے سال گزر گئے اور میں درشنا کو بھول گیا۔ کون

کچھ ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ اگر خدا نے انسان کو بھولنے کی قوت نہ دی ہوتی تو زندگی ہر لحظہ اس کے لئے عذاب بن جاتی۔ اسی لئے یہ قوتِ انتخاب انسان کو مل گئی ہے کہ وہ چند چیزیں ہمیشہ کے لئے بھلا دے اور کچھ چیزیں یاد رکھ لے۔ جب تک یاد رکھنا اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے اور جب ضروری نہ رہے تو انھیں بھی بھلا دے اور اگر پھر کسی وقت وہ امر ضروری ہو جاتے تو پھر بھولی ہوئی چیز یاد آ جائے۔ یاد کا عمل بھی انسانی زندگی کے مسلسل عمل کے تابع ہے اس لئے جو سمجھتا تھا کہ درشنا میری زندگی کی سب سے بڑی چوٹ ہے جسے میں کبھی بھی نہ بھول سکوں گا۔ چند ہی سالوں میں درشنا کو اس طرح بھول گیا جیسے وہ کبھی میری زندگی میں آئی ہی نہ تھی۔

پھر ایک دن میں نے اسے بہت سالوں بعد اپنے دوست جیٹھا لی کے کیبن میں دیکھا جیٹھا لی ایک مشہور بزنس مین تھا اور درشنا اس کی اسٹینو تھی۔ پرسنل اسٹینو! مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پہچان کی ایک چمک نمودار ہوئی تھی لیکن پھر دوسرے لمحے ہی بجھ گئی۔ اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ہلکی سی تلخی آ چلی ہے اور جب اس نے مجھے نہیں پہچانا تو میں اسے پہچاننے والا کون ہوتا ہوں۔ اس لئے میں نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اس طرح زندگی میں ہم دونوں پہلی بار اجنبیوں کی طرح سے ملے اور اسے دیکھ کر پہلی بار دل میرا اس کے لئے نہیں دھڑکا وہ دل جو کبھی اس کے قدموں کی چاپ سن کر تیز تیز دھڑکنے لگتا تھا۔ اب میری پسند دوسری تھی اور دوسری طرح کی اور اسے دیکھ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیوں اور کیسے اس طرح کی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ انسان کی محبت بھی اس کی سوجھ بوجھ۔ اس کی ذہنی سطح اور زندگی کے تجربے سے عاری نہیں ہوتی اور اگر زندگی کے کسی مرحلے پر اس کی یہ سوجھ بوجھ۔ ذہنی سطح اور تجربے کے انداز بدل جائیں تو اس کی محبت بھی بدل جاتی ہے۔ بہت حیرت ہوئی یہ سوچ کر کہ محبت بھی کوئی اٹوٹ چیز نہیں ہے۔ ایک زمینی جاندار مخلوق ہے جو بدل سکتی ہے۔ جسے زخمی کیا جا سکتا ہے۔ بھلایا بھی جا سکتا ہے جس پر فخر بھی کیا جا سکتا ہے۔ محبت ایک ذی روح شے ہے اور جانداروں کے سارے قوانین اس پر عائد ہوتے ہیں۔

میں جیٹھا لی کے یہاں اس سے ایک سفارشی خط لینے آیا تھا۔ جیٹھا لی نے درشنا کو بلا کر وہ خط اسے ٹائپ کرنے کو دیا۔ درشنا وہ خط ٹائپ کر کے لاتی۔ جیٹھا لی نے دستخط کئے۔ دستخط کرتے وقت میں نے دیکھا۔ ایک خاموش سمجھوتہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ بظاہر وہ مالک تھا اور وہ ملازم تھی اور بظاہر میرے سامنے وہ دونوں انتہائی ضبط اور سلیقہ شعاری کا ثبوت دے رہے تھے۔ لیکن میں نے دیکھ لیا اور سمجھ گیا کہ یہ رشتہ کس طرح کا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ جیٹھا لی کے چہرے کی مالکانہ رعونت اور رعونت کے ساتھ ساتھ ایک شفیق لیکن بالاتر شفقت کا احساس خفی رعونت کے ساتھ کہ ہاں تم تو ہو۔ لیکن ہم جو ہیں سو تم سے ذرا بلند ہیں اور جو سلوک ہم تم سے کرتے ہیں۔ اس میں ہماری محبت کے علاوہ ہماری مہربانی کا بھی دخل ہے۔ محبت اس رشتے میں تو یوں ہی داخل ہوتی ہے۔ ایک اسٹینو کی طرح ہاتھ میں کنٹریکٹ کا کاغذ لئے ہوئے۔ جس پر کئی شرطیں ٹائپ شدہ ہیں۔ اگر تم یہ تو میں وہ — اگر تم یوں تو میں ووں — اور اگر یوں نہ ہو سکا تو — ووں بھی نہ ہوگا اور اگر ہو گیا تو — یہ بھی ہو جائے گا — ورنہ — آخر میں تصدیق کرتی ہوں — کہ مجھے یہ شرط منظور ہیں۔ (درشنا) .... اُدھر دستخط جیٹھا لی کے اور یہ محبت کا پرزہ۔ ذہن کے صفحے پر لکھا ہوا۔ ٹائپ کیا ہوا ہر محبت نامے پر موجود رہتا ہے۔ غیر مشروط محبت کس نے کی ہے اور اگر کسی نے کی ہے تو نباہی نہیں۔ ناممکن!

درشنا کی کھلی بے باک ہنسی غائب تھی اور نگاہیں بھی نیچی تھیں اور چہرے پر وہ تلخی تھی۔ جو چند بے مہر تجربوں کے بعد آتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ٹوٹی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسے اعتماد کی جھلک تھی جسے چند ناکامیوں نے اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ اس کے جسم سے دلربائی سے کنوارپن کا الھڑپن غائب ہو گیا تھا۔ جیٹھا لی نے اس خط پر دستخط کر کے مجھے پڑھنے کو دیا۔ میں نے پڑھ کے اسے واپس کر دیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔" تو جیٹھا لی نے وہی

خط درشنا کو دے کر کہا: "اسے لفافے میں ڈال کر لفافے پر پتہ لکھ کر
صاحب کو دے دو۔" درشنا خط لے کر چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد
واپس آئی۔ اس نے ٹائپ شدہ لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں
نے لے کر جیب میں ڈال لیا۔ گھر آکر خط دوبارہ پڑھنے کے لئے
میں نے جب لفافہ کھولا تو اس سفارشی خط کے ساتھ درشنا کا
بھی ایک خط تھا۔ جس پر جلی ٹائپ میں صرف اتنا لکھا تھا۔

"میں لندن ضرور جاؤں گی"

درشنا

خط پڑھ کر میں مسکرا دیا۔ وہ لندن جائے نہ جائے۔ اب
مجھے اس سے کیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ کہیں پاس کی روح کے اندر
میری وہ طنزیہ ہنسی اور نگاہ پھنسی ہوئی ہے۔ مچھلی کے کانٹے کی
طرح اور درشنا بالکل بے بس ہے۔ وہ اس کانٹے سے آزاد نہیں
ہو سکتی۔

مکتی حاصل کرنے کے بھی کئی طریقے ہیں اور مردوں اور
عورتوں نے گزشتہ ہزاروں برسوں میں زندہ رہنا تو سیکھا نہیں
پوری طرح۔ ہاں مکتی حاصل کرنے کے لئے کئی طریقے اپنائے ہیں۔ چندہ
لے کر، چالیس دن کا چلہ کھینچ کر۔ پارلیمنٹ میں لگاتار پندرہ دن
تک بول کر یا زندگی بھر نہ بول کر۔ کانٹوں پر سو کر یا ٹوئسٹ ناچ کر
یا چھ ماہ ایک ٹب میں نہائے بغیر پڑے رہ کر اس دنیا میں مکتی
حاصل کرنے کے اتنے ہی طریقے ہیں۔ جتنے لوگ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا
لوگ زندہ ہو کر، زندگی کو بہتر بنانے کی بجائے زندگی سے مکتی پانے
کی کیوں سوچتے ہیں۔ مکتی پا کر انھیں کیا مل جائے گا۔ نیکی بدی، عذاب
ثواب، سزا و جزا کی دلکش شخصیت سے الگ ہو کر مکتی کے اس خلائی
ماحول میں انھیں کیا مل جائے گا۔ جہاں کسی لذت کا وجود نہیں۔
کسی گناہ کا ثبوت نہیں۔ کسی نیکی کی لطافت نہیں۔ کسی سزا کی ہلاکت
نہیں۔ جہاں کسی تخلیق کا درد نہیں۔ کسی چاہت کی مسرت نہیں۔
کسی کاوش کا جمال نہیں۔ کسی ناکامی کا ملال نہیں۔ نہ جانے
آدمی آدمی ہو کر پتھر بن جانے کی خواہش کیوں رکھتا ہے۔؟ لیکن
درشنا کی خواہش تو ایسی کوئی خواہش نہیں۔ وہ تو لندن جانا
چاہتی ہے۔ جیسے کوئی ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنا چاہتا ہے۔
اور کوئی چاند پر پہنچنا چاہتا ہے۔ اس میں کیا برائی ہے جناب؟
اور آپ شاید اس لئے جل رہے ہیں کہ یہاں پر آپ کا واسطہ ایک
ایسی لڑکی سے پڑا ہے۔ جو اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے آپ کی محبت
کو بھی ٹھکرا سکتی ہے اور تم اس کے ٹھکرانے کو کبھی نہ بھلا سکے۔ اسی
لئے تو کبھی طنزیہ قہقہے لگاتے ہو۔ کبھی شرر بار نگاہوں سے اسے
گھورتے ہو۔ کبھی بالکل اجنبی ہو کر اس سے مخاطب ہوتے ہو۔ ایک
خاموش جنگ ہے جو اس کے اور تمہارے درمیان چل رہی ہے۔ اس
کے بجائے کہ تم اس کے عزم کی داد دو تم اس کے استوار وعدے سے
ہراساں ہو۔ جو اس نے اپنی شخصیت سے کیا ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی
میں کچھ وعدے کرتا ہے اپنے آپ سے اور پھر ساری زندگی ان کی تکمیل
میں لگا رہتا ہے۔ ایک سیدھی لکیر کی طرح نہیں بلکہ زندگی کے طویل تر
پر پیچ ٹیڑھی لکیر کی طرح مختلف نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی۔ بظاہر
بالکل بے معنی اور بے مقصد نظر آتے ہوتے بھی اپنے اندر کسی مخفی
خواہش یا خواب کا اہتمام کرتی ہے۔ کسی بھی آدمی کو اس کی ناکامی
یا کامیابی سے نہ پہچاننا چاہئے۔ صرف اس کے خوابوں سے
پہچاننا چاہئے۔

" ENDS اور MENNS کی اس بحث میں تم کہاں پر
ہو درشنا؟"

میں نے بہت دیر باتیں کرنے کے بعد اس سے سوال کیا
"اب جب کہ تم اپنی زندگی کی منزل پا چکی ہو یعنی لندن پہنچ گئی ہو
لیکن ایک طوائف بن کر! تم نے کبھی یہ تو سوچا ہو گا کہ تمہیں اپنی
منزل پر پہنچنے کے لئے کتنی بڑی قیمت دینا پڑی ہے؟"

"میں نے کبھی قیمت کا اندازہ نہیں کیا تھا۔" درشنا نے
سوچ سوچ کر کہا۔
کم از کم پہلے دنوں میں نہیں کیا تھا۔ جب میں یہاں پہنچی
تھی تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی چاند پر پہنچ جائے۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔"

حالانکہ لندن نے بہت سے کنویں جھنکوا دیئے مجھ سے۔ جیتھائی کو تم ملے تھے، وہ تمہارا دوست تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لندن لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن راستے میں طہران ہی میں اس نے مجھے اتار دیا اور خود اکیلا ہی ہو آیا اور پھر واپسی میں اس نے مجھے طہران سے لے لیا۔ دو اور تاجروں نے مجھے اسٹینو رکھا اور لندن لے جانے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ میں تو لندن پہنچنے کے لئے بیتاب تھی اور ہر ناکامی میری روح میں اپنی منزل تک پہنچنے کی ناقابل بیان تڑپ پیدا کر دیتی تھی۔ ان دنوں مجھے محسوس ہوتا تھا۔ لندن پہنچنے کی کوئی بھی قیمت ہو کم ہے۔ میں پھر ان تاجروں کی باتوں میں آ گئی لیکن وہ دونوں مجھے بمبئی سے آگے کہیں نہ لے گئے۔

"پھر میں ایک اسمگلر کے ہتھے چڑھ گئی، آنکھیں بند کر کے نہیں۔ جان بوجھ کر۔ اور وہ مجھے لندن لے آیا۔ لیکن لندن لانے سے پہلے اس نے میرا خوب خوب امتحان لیا۔ مجھے تین سال گجرات کچھ اور راجستھان کے باڈر پر اسمگلر کا کام کرنا پڑا اور بمبئی میں بھی ــ اور اگر میں تمہیں وہ سب واقعات سناؤں اور اگر ثابت ہو جائیں تو مجھے اتنا عرصہ جیل میں رہنا پڑے کہ میری وہ زندگی اس کے لئے کم ثابت ہو۔ لیکن میں نے بالکل پروا نہیں کی۔ میں لندن پہنچنے کے لئے اتنی بے تاب تھی کہ ہر بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔ اس کا بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔"

"پھر تم اس حالت تک کیسے پہنچیں؟"

اس اسمگلر کو یکایک لندن سے بھاگنا پڑا۔ پولیس اس کے پیچھے تھی۔ وقت اتنا کم تھا کہ وہ مجھے اطلاع نہ کر سکا۔ اس میں اس کا بھی کچھ قصور نہیں۔ ہوٹل کا بل ادا نہ ہوا تھا اور میں لندن میں اس کے سوا کسی اور کو پہچانتی بھی نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھیرا تھا۔ مجھے گریٹ رسل میں رکھا تھا۔ اپنی شرافت جتانے کے لئے۔ اس کے یکایک بھاگ جانے پر میں بہت پریشان ہو گئی۔ چند دن اسی انتظار میں گذرے کہ مجھے وہ اطلاع دینے کی کوشش کرے گا۔ لیکن جب اخباروں میں خبر آ گئی کہ پولیس نے اسے ہانگ کانگ میں گرفتار کر لیا ہے تو ہوٹل والے میرے سر ہو گئے کہ بل ادا کرو۔ میں کہاں سے ادا کرتی؟ ہوٹل والوں نے مجھے پولیس میں دینے کی دھمکی دی۔ بھلا ہو میرا کمرہ دیکھنے والے ویٹر کا۔ اس نے مجھے راہ سجھائی کہ میں اگر برے راستے پر لگ جاؤں یعنی ٹھیک راستے پر لگ جاؤں تو میں مستقل طور پر اس ہوٹل میں قیام کر سکتی ہوں اور میرے ہوٹل کا بل بھی ادا ہو جائے گا۔ اور لندن میں میرے مستقل قیام کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ اس وقت میں کیا کرتی؟۔ ناچار میں نے منظور کر لیا اور گریٹ رسل میں ـ گویا لندن کے دل میں ـ ہوٹل کے مخصوص اور امیر ترین گاہکوں کی دلداری کے لئے رہنے لگی۔ اس زندگی کی طرف یہ میرا دوسرا قدم تھا۔ پہلا قدم تو میں ہندوستان میں اٹھا چکی تھی۔ گریٹ رسل سے اس انڈو پاک قحبہ خانے میں آنا کوئی بہت زیادہ حیرت خیز بات تو نہیں ہے جس پر تم یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے ہو۔ دیکھ لو میں آخر لندن پہنچ گئی! اور میں نے اپنا وعدہ تم سے پورا کر دیا۔" اور وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"اور اب کیا سوچتی ہو؟"

"اب میں سوچتی ہوں۔ اگر میں نے شروع ہی میں تمہارا کہا مان کر تم سے شادی کر لی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ کہیں اچھا ہوتا۔" اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں اس کے لئے پگھلتے ہوئے نرم انسانی رحم کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں پھر اسے شادی کی دعوت دینے والا تھا کہ وہ یکایک ایک تلخ بیزار کن قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"لیکن اب کون شادی کرے گا مجھ سے۔"

اس کا چہرہ پھیکا۔ تلخ۔ ایک زرد سی چٹان کی طرح بدنما نظر آنے لگا تھا۔ زبان جھوٹ بول سکتی ہے۔ ہونٹ جھوٹ بول سکتے ہیں۔ آنکھیں جھوٹ بول سکتی ہیں۔ لیکن پورا چہرہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ درشنا لندن آنے سے پہلے اور لندن آنے کے بعد جن منزلوں سے گزری تھی۔ وہ ایک غبار راہ کی طرح اس کے چہرے پر بکھری پڑی تھیں۔ اب یہ کسی کی بیوی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس چہرے کی برسوں دھلائی کرنی پڑے گی۔ دھلائی۔ پونچھائی اور پالش

کہیں یہ چہرہ اس قابل ہوسکے گا کہ اس پہ اس گھریلو سکون اور اطمینان کے آثار نمودار ہوں۔ جن سے اکثر گھروالیوں کے چہرے عبارت ہوتے ہیں۔ لیکن اتنا وقت کہاں ہے میرے پاس؟ زندگی بہت مختصر ہے اور درشنا نے اپنی زندگی میں اتنا کوڑا کرکٹ بھر لیا ہے کہ اسے صاف کرتے کرتے میری پوری زندگی صرف ہو جائے گی۔ نہیں جناب! یہ رومانیت مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کہانیوں میں بہت اچھی لگتی ہے۔ اس طرح کی جذباتیت لیکن میں بیسویں صدی کا آدمی ہوں۔ جس کے عہد نے اسے بتا دیا ہے کہ شاعروں کا چاند بھی ایک بنجر زمین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بہت جلد وہ لوگ چاند پر اتر جائیں گے پھر اس پر ہوائی اڈے قائم کریں گے۔ چاند کے ہوائی اڈوں سے کسی ملک پر کتنی آسانی سے بمباری ہوسکتی ہے۔ کتنی آسانی سے راکٹ پھینکے جاسکتے ہیں اور میں لگا ہوں گا درشنا کی غلیظ زندگی دھونے میں۔ ہشت! میں کوئی دھوبی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی نوجوانی میں سچے دل سے درشنا کو ایک چانس دیا تھا اور اس دنیا میں کسی کو بس ایک ہی چانس ملتا ہے۔ اس نے اس چانس کو ٹھکرا دیا اور اب وہ لندن میں ہے اور وہ لندن آنا چاہتی تھی تو اب وہ خوش کیوں نہیں ہے؟

جس درشنا سے میں شادی کرنا چاہتا تھا یہ وہ درشنا بھی نہیں ہے۔ خدا جانے یہ کون ہے؟ لوگ چاند پر میزائیں فٹ کر رہے ہیں۔ کس کے پاس گندی زندگیاں دھونے کا وقت ہے؟۔ چلو اپنے پھٹے چیتھڑوں میں حشر کے میدان میں چلے چلو۔ سامنے آگے پیچھے ہر جگہ قیامت ہے۔ آل رائٹ! اگر یہ سچ ہے کہ انسان اپنے خوابوں سے پہچانا جاتا ہے تو درشنا بے قصور ہے۔ اگر اس نے لندن جانے کا خواب دیکھا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اور کیا غلطی کی تھی اس نے؟ کوئی بھی پیرس۔ نیویارک۔ بمبئی۔ راولپنڈی۔ جیزوریا ٹوکیو جانے کا خواب دیکھ سکتا ہے۔ اس میں کون سی بات غلط تھی؟۔ میں بتاتا ہوں تمہیں درشنا! تمہارا خواب برا نہیں تھا۔ لیکن آخر تھا کیا اس خواب میں؟ لندن آکر تم کیا کرنا چاہتی تھیں۔ لندن تم کیوں آنا چاہتی تھیں۔ کوئی ایک شہر دوسرے شہر سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ صرف سڑکوں پارکوں کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ بولنے والوں کے لباس اور ان کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ لیکن بھاؤ کرنے والوں اور خریدنے اور بکنے والوں کے ضمیر مختلف نہیں ہوتے۔ ہر آدمی کو اپنے خواب کا مکمل تانا بانا یاد رکھنا چاہئے۔ ورنہ وہ کسی وقت بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔ کیوں کہ جس عہد میں ہم رہتے ہیں اس کا ضمیر شکستہ ہو چکا ہے وہ کسی ٹیکسی کے خراب میٹر کی طرح اب چلتا نہیں ہے۔ صحیح بھاؤ نہیں بتاتا۔ ورنہ درشنا کو لندن پہنچنے کے لئے اپنا سب کچھ لٹانا نہ پڑتا۔ گڈ بائی درشنا! میری محبوب! ایک دن تم سے ہندوستان میں ملاقات ہوگی۔ کسی سڑے ہوئے ہسپتال کے گندے کمرے میں یا کسی اندھی گلی کی متعفن موری کے کنارے تم پڑی ہوگی۔ ہوسکتا ہے تم لندن ہی میں مر جاؤ اور کوئی تمہاری لاش کا دعوے دار تک نہ ملے کیونکہ کسی کو فرصت نہیں ہے۔ ہم چاند تک جا رہے ہیں۔ (بیسویں صدی دہلی)

شفیقہ فرحت

تماشائے اہلِ ادب دیکھتے ہیں

راوی کہتا ہے......

"جھوٹ بولنے والے پہ خدا کی مار اور دنیا کی پھٹکار رکھو کہ اہل ہمت دونوں سے بے نیاز ہیں ——— ! "ایک صبح جو انتہائی غیر سہانی تھی۔ شہر کے ایک برسرِ اقتدار گروہ نے (کہ جن کے اقتدار کی خبر سوائے ان کے کسی کو نہ تھی ——— !) جو ادیبانہ، شاعرانہ، اور نقادانہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تلاش میں رکشوں اور بسوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہمارے دولت کدے پر چھاپا مارا ——— ان کے سوال ہمارے لئے فلسفہ اور منطق سے کم نہ تھے۔ پھر بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہم نے کچھ ایسے گول مال جواب دیئے کہ سننے والوں کے پلے کچھ نہ پڑا اور انہوں نے گھبرا کے ہمیں ایڈیٹر بنا دیا —!

ویسے یہ راز تو بہت بعد میں کھلا کہ ہم نہ صرف ایڈیٹر بلکہ منیجر، کلرک اور چپراسی بھی تھے ——— کتابت بھی کرتے اور تصویریں بھی بناتے، اور اگر ممکن ہوتا تو طباعت بھی خود ہی کر کے لگے ہاتھوں ادبی دنیا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیتے ——— !!

ہمارا ادارہ "نیا نیا" تھا، اور پھر رندوں اور مردوں سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ شہرت یافتہ ادیبوں کی چیزیں (خواہ وہ کتنی ہی اوٹ پٹانگ کیوں نہ ہوں اور خواہ ان میں سے ہر ایک پچھلے دس برس سے ملک کے مختلف رسالوں میں کیوں نہ شائع ہو رہی ہوں —!) رسالے کے حق میں ہلدی پھٹکری اور خریداروں کے حق میں کرشن جیسی ثابت ہوتی ہیں۔ سو ہزار کے آزمائے اس نسخے کی آزمائش کا "بیڑہ" ہم نے بھی سنایا۔

ایسے تمام ادیبوں اور شاعروں کی فہرست تیار کی گئی، ان کے سرکاری اور غیر سرکاری، حالات اور عہدِ رفتہ کی تصویریں مہیا کی گئیں اور ان کے سہارے ایک ایک قصیدہ (کہ جسے عرفِ عام میں خط کہتے ہیں!) لکھا جس میں ہر ایک کو یقین دلایا کہ ہندوستان میں آپ سے بڑا کوئی ادیب نہیں۔ کوئی رسالہ اس وقت تک ادب کی بلندیوں کو چھو نہیں سکتا جب تک آپ اس میں جلوہ گر نہ ہوں! اور چونکہ ہم جانتے تھے "جو وہ لکھیں گے جواب میں" سو قاصد کے آتے آتے ہم نے ایک نہیں کئی خط لکھ لئے۔ اور پندرہ پندرہ بیسوں پر فاتحہ بھی پڑھتے جاتے تھے اور ہجر و فراق کے اشعار بھی —! خدا خدا کر کے "ایک عمر کی آہیں اثر" بنیں اور "ر۔ب۔ج" صاحب کے تندرست لفافے نے اس کرب ناک کیفیت کو ختم کیا۔ ابھی ہم لفافے سے مضمون بھانپ لینے والے الہامی درجے پر نہیں پہنچے تھے۔ لہٰذا ضخامت سے کہانی کی امیدیں وابستہ کر لیں اور جان نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے، دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔

کہانی تو خیر اس میں کیا ہوتی۔ کہانی کا "میر" البتہ تھا! اور یہ وعدہ خوش آئند بھی کہ.....

"آپ کے لئے کہانی ضرور لکھوں گا" ——— دو تین ہفتے بعد آپ نے تسلی دی "بس ایک تھوڑی سی فرصت اور ———!"

"ابھی ہم "تھوڑی سی فرصت" کی ضرب اور تقسیم میں ہی الجھے تھے کہ آپ نے مژدہ سنایا ——— "کہانی کا عنوان سوچ لیا ہے۔ بلکہ پلاٹ بھی۔ اور پہلا پیراگراف بھی لکھ لیا ہے ———"

جب کئی ہفتے گزر گئے۔ تو ہم نے عرض کیا۔ جس کہانی کا پہلا پیراگراف آپ لکھ چکے تھے۔ امید ہے اس کا آخری پیراگراف بھی لکھ لیا ہوگا!"

وہ دن اور آج کا دن۔ آپ کا "عنقریب" قریب نہیں آیا۔"

محترمہ "ر۔ز۔ر" صاحبہ نے (کہ جن کی شہرت کا راز لبس راز ہی رہنے دیجئے) بڑے پر مقارا نداز میں اطلاع دی۔

"میرا اصول ہے کہ میں پیشگی رقم لئے بغیر کہانی نہیں بھیجتی۔"

یہ ۔۔۔۔ یہ ۔۔۔ پہل والوں سے ہم ہمیشہ مرعوب ہو جایا کرتے ہیں۔ اور پھر وہ ان کے پیڈ کا قیمتی چکنا کاغذ۔ دلفریب پستئی رنگ موتیوں کی طرح خوبصورت حروف۔ ان کے انداز کی شفقت اور وقار۔ اور پھر خود ان کا اپنا شاہکار حسن (کہ تصویر آنکھوں میں سے ہمارے سامنے رہتی تھی)، تیس روپے تو کیا، کونین کی دولت بھی لٹا دیتے ۔۔! لیکن جب منی آرڈر کی رسید کے مہینہ بھر بعد بھی کہانی نہیں ملی تو ہمارا سارا عشق ہوا ہو گیا۔ اور کانوں میں نوٹوں کی دل آویز کھڑکھڑاہٹ گونجنے لگی۔ تب اپنی ادبیت کا سارا سرمایہ داؤ پر لگایا اور انہیں خط لکھا جس میں پہلے ان کی، ان کے شوہر اور بچوں، محلے والوں اور مرغیوں اور بھینسوں کی خیریت پوچھی۔ ان کے ادبی اور غیر ادبی اور گھریلو اور سرکاری مشاغل کو تفصیلی طور پر سراہا اور آخر میں ڈرتے ڈرتے دبے دبے الفاظ میں کہانی کا ذکر کیا ۔۔۔۔۔ جواب ملا ۔۔

"اے ہائے ۔ تمہیں کہانی نہیں ملی ۔! وہ تو میں نے کب کی بھیج دی۔ شاید ڈاک میں گڑبڑ ہو گئی۔ نیا رسالہ جو ہے ۔! بہرحال دوسری بھیج رہی ہوں!!"

ایک شاعر صاحب تھے۔ بڑی خوبصورت نظمیں کہنے والے، غلطی سے آپ سے افسانے کی فرمائش کر دی گئی۔ ترنگ میں آ کر آپ نے بھی لکھ دیا۔

"تعمیل حکم ہوگی ۔۔۔۔۔"

دو تین دن بعد ہوش آیا تو ہڑبڑا کر اطلاع دی۔

"جی مگر میں افسانے لکھتا کب ہوں ۔۔۔۔۔ !!"

کوئی درجن سوا درجن خطوں کے جواب میں جناب ع۔ غ۔ ف۔ ق صاحب نے خوردبین کی مدد سے پڑھے جانے والے خط میں کاغذ کا صرف ایک پرزہ بھیجا جس میں بقول ان کے مکمل کہانی تھی۔ اور پرزہ بھی میر اور غالب کے دیوان کا شکستوں سے اس درجہ چور کہ ہاتھ آنے تو ہاتھ لگانے نہ دینے۔

ہم نے اسے ہر طرف سے الٹا پلٹا۔ گھنٹوں سر مارا۔ پر جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ماہر لسانیات کی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ انتہائی غور و خوض کے بعد کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ رسم الخط ہے تو اردو صرف اس میں نقطے نہیں ہیں مرکز نہیں ہیں اور شوشے نہیں ہیں ۔۔۔۔

لہٰذا ع۔ غ۔ ف۔ ق صاحب کو کرایہ بھیج دیا گیا کہ آپ خود آ کر اسے پڑھ دیجئے ۔۔۔۔ ! محترم ع۔ غ صاحب نے ہم پر اور بڑے حضے

والوں کی دس باسٹھ پشتوں پر احسان کرتے ہوئے ایک ڈرامہ داغ دیا جس کے کردار کچھ اس قسم کے تھے۔

لرزتی آواز

بوڑھی آواز

جوان آواز

زنانی آواز

مردانی آواز

لڑکھڑاتی آواز

بل کھاتی آواز

اور جب ان بل کھاتی لہراتی آوازوں کو ایک ایک عدد نام دینے کی درخواست کی گئی تو ان کا ادیبانہ جوش لہریں مارنے لگا۔ تب وہ کاغذی بم گولے چلے کہ اگر فاصلہ اتنا زیادہ نہ ہوتا تو ہم میں سے ایک آدھ کی شہادت یقینی تھی ۔!

ادیبوں اور شاعروں کی محبوبانہ اداؤں اور وعدوں سے جب ہم پوری طرح متعارف ہو گئے تو ہمارے بھی پر پرزے نکل آئے اب ہم ان پر اعتبار کر کے خوشی خوشی راہیٔ ملک عدم ہونے کے بجائے ان سے چیزیں بھیجنے کی صحیح تاریخیں مانگتے تھے لیکن یہاں بھی "ک۔ گ۔ ن۔ م" صاحب ہمیں وہ مات دے گئے کہ جب تک جئیں گے ماہیٔ بے آب (بلکہ مردے آب ۔ کہ آج کل پانی بھی کسے نصیب ہے ۔!) کی طرح تڑپیں گے اور اگر ہم میں ذرا بھی خودداری باقی ہوتی تو کب کا سنیاس لے چکے ہوتے!

وہ قصہ یوں ہے کہ ہمارے تقاضوں کے جواب میں آپ نے انتہائی وثوق سے فرمایا۔ "نظم آپ کو اپریل کے آخری ہفتے میں مل جائے گی۔"

اپریل کا آخری ہفتہ گزرا مئی کا آخری ہفتہ گزرا اور پھر جون جولائی اگست ستمبر سب کے پہلے اور آخری تمام ہفتے اسی سبک رفتاری سے ہمارا منہ چڑاتے ہوئے گزر گئے اور آں جناب کے اطمینان میں ذرا فرق نہیں آیا۔ پتہ چلا کہ یہاں بھی قصور اپنا ہی ہے ک۔ گ۔ صاحب کا نہیں ۔! انہوں نے اپریل کا آخری ہفتہ کہا تھا۔ اور اپریل تو ہر سال آتا ہے۔ اگر ہم اس سے آدھے بھی عقلمند ہوتے جتنا خود کو سمجھے ہوئے تھے تو ہمیں چاہئے تھا کہ ان سے سن بھی لکھوا لیتے

تو صاحب اگر آپ اپنے جسم پر چڑھی ہوئی چربی کی تہوں کو بغیر ڈائٹنگ کے اتارنا چاہتے ہیں۔ اپنے دن کے چین اور رات کی نیند کو عنقا بنانا چاہتے ہیں، تو آپ کے لئے کرسی ادارت حاضر ہے۔!" خدا جانے سچ یا جھوٹ ۔۔۔۔ راوی کہتا تو یہی ہے ۔!

انور معظم

تنہا

رشتے، ناتے، دوست، شناسا
زلفیں، چہرے، ہونٹ، تبسّم
منظر، آنکھیں، پلکیں، آنسو
عقل، جنوں، ٹکراؤ، تصادم
لفظ، معانی، جملے، مضموں
شعر، فسانہ، نقش، ترنم
دل، احساس، تصورِ پیہم
شخص، زمانہ، ربطِ مسلسل

ہر منظر تاکید بہ لب ہے
دیکھو، سمجھو، برجا، ہردم
دیکھ رہا ہوں، سوچ رہا ہوں
یہ دنیا آباد بہت ہے!

(رہنم حیدرآباد)

میرا جی

جنوں

عُمر گزر گئی تمام
راہِ طلب میں عشق کو مِل گئی شہرتِ دوام
حاصلِ کار کچھ نہیں
منزلِ آخری ملی
ریگِ رواں کے سیل میں بہتا ہوا پہنچ گیا
فلسفۂ حیات کی ایک عجب مثال ہے
جذبۂ دل کی روشنی
عشق والم کی بندگی
قدرتِ خام کار نے ایک کو دی ہے ساحری
ایک کو دی ہے عاجزی
حاصلِ کار کچھ نہیں۔

حسن یہ پوچھنے لگا عشق سے۔ آرزو ہے کیا؟
عشق نے سُن کے یوں کہا حُسن سے۔ آہ کچھ نہیں
عمر گزر گئی تمام
راہ طلب میں عشق کو مل گئی شہرتِ دوام
منزلِ آخری ملی،
غور کرو تو کچھ نہیں

(سیپ کراچی)

شہریار

رات کا صحرا

جسم کے قہر کی فریادی ہے
روحِ تنہائی
پھر بھی آنکھوں میں مری دور تلک
نیند کی پرچھائیں نہیں
اور افق دھند کا زندانی ہے
اور سنّاٹوں کی سرگوشیاں
تلواریں لئے
صف بہ صف بڑھتی چلی آتی ہیں
دل کی جانب
دھڑکنیں چھیننے
سانسوں کا گلا کاٹنے کو
ہونٹ اُس سمت ہیں آنکھیں اِدھر
ہاتھ اُدھر
اور میں ہل نہیں سکتا ذرا اپنی جا
بچ کے جاؤں گا کہاں رات کے اس صحرا سے

(شب خون الہ آباد)

خلیل الرحمٰن اعظمی

کیوں شمع بجھ کے رہ گئی، کیسی ہوا لگی
"اے اہلِ بزم! کوئی تو بولو خدا لگی"

وہ لوگ اب کہاں ہیں؟ وہ چہرے کدھر گئے؟
اے شہرِ حسن! کس کی تجھے بد دعا لگی

ہم کیوں نہ اپنے آپ پہ نازاں ہوں صاحبو
ہم پر ہی کیوں یہ تہمتِ مہر و وفا لگی

سائے سے کچھ قریب سے ہو کر گزر گئے
پچھلے پہر کو آنکھ ابھی تھی ذرا لگی

یہ آئینے میں کون ہے، ہم جانتے نہیں
صورت ذرا ذرا سی ہمیں آشنا لگی

کیا اب ادھر نہ آئیں گے خوشبو کے قافلے
تجھ کو خبر کہاں سے یہ بادِ صبا لگی

ہم جل کے خاک ہو گئے یہ اور بات ہے
کچھ ان کے دل میں آگ تھی ہم سے سوا لگی

کچھ دن رہے تھے زلفِ پریشاں کی قید میں
پھر اپنے ساتھ اور نہ کوئی بلا لگی

ہم تشنہ لب تو تیرے دعا گو ہیں پھر بتا
ہے کون جس کی تجھ کو نظر ساقیا لگی

(شب خون الٰہ آباد)

محمد علوی

جب خوشی آئے تو محسوس نہ ہو
کوئی اتنا بھی تو مایوس نہ ہو

یہ ستارے نہ ہوں پروانے کہیں
یہ قمر بھی کہیں فانوس نہ ہو

جسم کی قید میں دم گھٹتا ہے
دل کے جیسا کوئی محبوس نہ ہو

کیا غضب ہے کہ رہے خاروں میں
اور گل خار سے مانوس نہ ہو

کوئی تیرا بھی خدا ہے علوی
یوں خدا کے لئے مایوس نہ ہو

(شاعر بمبئی)

فراقؔ گورکھپوری

مستیوں کی جان ہے تیرا بدن
اک خمارستان ہے تیرا بدن

زندگانی ہے عبارت درد سے
درد کا درمان ہے تیرا بدن

سُنتے ہیں تکرارِ جلوے کو نہیں
اور کچھ ہر آن ہے تیرا بدن

کاش اس کے ساتھ رہتے عمر بھر
دل کا ہر سامان ہے تیرا بدن

خود خبر اس کو نہیں کیا چیز ہوں
کس قدر انجان ہے تیرا بدن

کافرِ عشقم کہ اے جانِ جہاں!
جان ہے ایمان ہے تیرا بدن

ہاں دو عالم میں نہیں جس کا جواب
وہ سوالستان ہے تیرا بدن

راز اندر راز ہے یہ زندگی
اِس کی اک پہچان ہے تیرا بدن

سو رہے ہیں جس میں فتنے بے شمار
حشر کا امکان ہے تیرا بدن

(بیسویں صدی دہلی)

۱۹۶۸ - ۱۹۷۸
ترقی کے اگلے دس سال آیئے ہم سب انہیں شاندار بنانے کیلئے جدوجہد کریں

یہ ہم سب کے سوچنے کی بات ہے۔
کتنے بہت سے کام درپیش ہیں
یہ سب ہمیں کو کرنے ہیں
آپ کا کام، ہمارا کام
جتنا آپ کریں گے اتنا ہی ہوگا
جو آپ بنائیں گے وہی بن پائے گا
قدم بہ قدم، لمحہ بہ لمحہ
خشت بہ خشت، سنگ بہ سنگ
ہمت، حوصلہ اور مستعدی کے ساتھ
دل پر رکھ کر اور جان لڑا کر
تعمیری کاموں کو جاری رکھنا ہے
یہ ہمارے، آپ کے، سبھی کے کام ہیں
سوال یہ ہے!
کیا آپ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوئے ؟
کہیں کوئی کسر تو نہیں رہی ؟
کیا آپ اس سے کچھ زیادہ بھی کر سکتے تھے ؟
اور کیا آپ واقعی کچھ کر بھی رہے ہیں ؟
چلئے اس بات کو جانے دیجئے
اس سوال و جواب کا وقت کہاں ہے
یہ تو عمل کی گھڑی ہے
آج، اس لمحہ
اس صدی کی پانچویں دہائی گزر چکی ہے
چھٹی گزرنے والی ہے
کیا آپ ساتویں دہائی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں؟
آپ کے پاس استعداد بھی ہے اور امنگ بھی
اور انہیں بروئے کار لانے کا یہی موقع ہے
یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے
موجودہ دہائی میں ہم نے دوسرے پنج سالہ منصوبہ کو بخیر و خوبی مکمل کیا
ہم اپنے تخمینوں سے بھی آگے نکل گئے

آج خدا کے فضل سے ہمیں پہلے سے زیادہ کپڑا، پٹرولیم، کیمیائی مصنوعات
کیمیائی کھاد، دوائیں اور دوسری بے شمار چیزیں بنانے کی استطاعت حاصل ہے
برآمد پہلے سے بڑھ چڑھ کر!
خوراک پہلے سے وافر!
ہمارے بچوں کے لئے ہر روز دس نئے سکول کھل رہے ہیں
یہ سب آپ کے اپنے کارنامے ہیں
چاہے آپ اس سے باخبر ہوں
خواہ آپ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ آپ سے کہاں کوتاہی ہوئی
لیکن ایک بات بالکل صاف اور عیاں ہے
کہ آج پاکستان قائم ہے تو آپ ہی کے بل پر ہے
اور مستقبل کی ترقی آپ ہی کے ذریعہ ہوگی
کیا آپ واقعی اس کے لئے تیار ہیں؟
عزم و اعتماد کے ساتھ ایک نئی منزل کی طرف قدم بڑھایئے
مستعد ہو جایئے
آپ نے ایسے بہت سے معرکے سر کئے ہیں
زمانہ امن میں بھی اور ہنگام جنگ میں بھی
ترقی کا ایک باب ختم ہو رہا ہے
دوسرے کا آغاز ہے

• آیئے ہم مل جل کر تعمیر کریں، آیئے ہم مل جل کر اس کو پورا کریں
تاکہ پاکستان قائم و دائم رہے، پھولے اور پھلے

آپ کے ساتھ ہم بھی شریک ہیں
نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی میں معاون

FRIENDS NOT MASTERS (OUP, P 349)

مبارک فریضہ
خصوصی خدمات

حج بونس واؤچر پر ہو یا اس کے بغیر
حبیب بینک کی خدمات بلا معاوضہ ہیں

حکومت کے اعلان کے بموجب عرشہ جہاز پر سفر کرنے والوں کے سوا تمام عازمین حج کو زرِ مبادلہ اور جدّہ کی فیس کے لئے بونس واؤچر دینا ہوگا۔ مغربی پاکستان میں مندرجہ ذیل رقومات واجب الادا ہوں گی۔

عرشہ جہاز	فرسٹ کلاس	سیکنڈ کلاس	کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز
۱۶۰۹/۵۰ روپے	۶۱۰۷/۵۰ روپے	۴۸۶۴/۵۰ روپے	۵۹۴۳ روپے

حبیب بینک کی ۵۰۵ شاخوں میں سے کسی سے بھی آپ حج کے فارم حاصل کر سکتے ہیں یہ شاخیں آپ کی خدمت کی منتظر ہیں۔ حبیب بینک آپ کو فارموں کی خانہ پُری، واجبات حج کی وصولی اور بونس واؤچر کی خریداری وغیرہ میں مدد دیگا۔ شام کے اوقات بینکاری میں بھی یہ خدمات بلا معاوضہ انجام دی جاتی ہیں۔ حج کے فارم متعلقہ دفاتر میں ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء تک وصول کئے جائیں گے

حج بونس واؤچر پر ہو یا اس کے بغیر، حقِ سفر کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا۔

حبیب بینک لمیٹڈ